

# مجھے پتہ ہے حکم ازاں

ضربِ مؤمن میں شائع ہونے والے کالم

اوریا مقبول جان



urdukutabkhanapk.blogspot

# مجھے پتہ حکم ازاں

ضرب مؤمن میں شائع ہونے والے کالم

اور یا مقبول جان



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

## علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور۔

فون: 37223584، 37232336، 37352332 فکس:

[www.ilmoirfanpublishers.com](http://www.ilmoirfanpublishers.com)

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

## جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

## فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
11	☆ حرف آغاز	
13	1 قابل رشک لوگ	
15	2 تری بربادیوں کے مشورے	
17	3 نئے نظام کے تین بنیادی تصورات	
20	4 محبت وطن لوگوں سے ایک سوال	
22	5 کہاں گئے وہ لوگ	
24	6 سود: ظاہر اور حقیقت	
26	7 محبتوں کا بیج بونے والے	
28	8 جرم و دہشت کی زمسری	
30	9 لوہ بھی کہہ رہے ہیں	
32	10 قصاب مسیحا	
35	11 جڑواں دہشت گرد	
37	12 صرف ایک گولی.....!	
39	13 کو اچلا نہس کی چال	
41	14 یہ کیسے لوگ تھے؟	
43	15 شارتری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں	

نام کتاب ..... مجھے ہے حکم اذال  
رشحات قلم ..... اور یا مقبول جان  
ناشر ..... گل فراز احمد

مطبع ..... علم و عرفان پبلشرز، لاہور  
زادہ نوید پرنٹرز، لاہور

پروف ریڈنگ ..... رخسانہ نازلی  
کمپوزنگ ..... انیس احمد

سن اشاعت ..... اگست 2012ء  
قیمت ..... 600/= روپے

..... ملنے کے پتے .....

ویکم بک پورٹ ..... خزینہ علم و ادب  
اُردو بازار، کراچی ..... انکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور  
اشرف بک اینجینی ..... کتاب گھر  
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی ..... اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی  
کلاسیک بکس ..... کشمیر بک ڈپو  
بوہر گیٹ، ملتان ..... تلہ گنگ روڈ، چکوال  
رائل بک کمپنی ..... مکتبہ رشیدیہ، جنرل مارکیٹ  
فصل داد پلازہ، کمیٹی چوک راولپنڈی ..... چکوال فون: 0301-5785262

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طبعیت، صحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

102	ایک تیردو شکار	44
104	ہے اگر کوئی خطرہ مجھ کو اس امت سے ہے	45
107	بے گناہ	46
109	ان سے ہیر و چھین لو	47
111	تاریخ ڈہرائی جاتی ہے	48
113	پاکستان سے رشتہ کیا؟	49
115	تاریکی کا شہزادہ	50
117	تنہا اور منقسم امریکا	51
119	بش کے نئے دور کی بدلتی ہوا	52
121	ریت کی بوریاں	53
123	محمود غزنوی کے منتظر استھان	54
125	پسماندہ لوگ	55
127	غدار کی باوجود	56
129	تباہی کا سفر	57
132	وارننگ	58
134	تدبیریں الٹ دی گئیں	59
136	آخری پناہ	60
139	بسنت	61
141	بلوچستان کا مسئلہ کیا؟	62
143	سلگتی آگ کی زد میں کون؟	63
146	پتھر نہیں مورچہ	64
148	دنوں کو پھیرنے والا	65
151	اسرائیل سے نفرت قابل معافی نہیں	66
153	امریکا کا زوال (امریکی میڈیا کی نظر میں)	67
156	صرف ایک سوال	68
158	شہید روحوں کی فریاد	69
160	فتنہ کے مقابل ڈھال	70
162	کیا کچھ ہونے والا ہے؟	71

45	پاسان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے	16
47	خاموش عوام	17
49	بے وفا معشوق نامراد عاشق	18
51	سوئے مقتل	19
53	بٹ مین	20
56	محاذ	21
58	دوقوی نظریے کی لکیر	22
60	گٹے اور کھچی کی جنگ	23
62	منافقت کے زخم	24
64	بغداد میں علم و آگہی پر قیامت	25
66	گٹا یونٹ کے سپاہی	26
68	میڈیا کی عدالت	27
70	کیا ہم زندہ ہیں؟	28
72	شناخت	29
74	امریکہ کے خفیہ قید خانے	30
76	فاطمہ بنام امت مسلمہ	31
78	انجام سے بے خبر حکمران	32
80	تیسرا راستہ	33
82	حمیت نام تھا جس کا	34
84	غندوں کے غول	35
86	اس آواز کا انتظار	36
88	ٹرائے کا گھوڑا	37
90	خوفزدہ یورپ	38
92	ایک ہی منظر	39
94	کلمہ کی لڑی	40
96	گھائے کا سودا	41
98	دہشت گردوں کی جائے پناہ	42
100	امت مسلمہ کی کثرت سے خائف	43



228	محتاجی کا دروازہ	100
230	ڈرو اس وقت سے	101
233	ریت کی بوریاں	102
235	ایک مسلمان ملک سے دوسرے مسلمان ملک تک	103
238	شر پسند، غدار، دہشت گرد	104
241	قوموں کے زوال کا کارگر نسخہ	105
244	خوف، دلا سے، دھمکیاں، الفاظ کی جادوگری	106
248	الکفر ملتہ واحدة	107
251	کوئی ہے.....؟	108
253	ہمارے مجرم..... ہمارے حوالے	109
255	بتوں سے تجھ کو امیدیں	110
258	روشن خیالی کی جڑیں	111
260	سوہنی دھرتی، اللہ رکھے	112
263	سہا خونزدہ شہر	113
266	توکل کی دولت	114
268	دنیا کے نئے رخ	115
271	دنیا جنوں اور پاگل پن کے زرخ میں	116
274	اللہ ہمیں اس انجام سے بچائے	117
276	ان شہیدوں کی دیت، اہل کلیسا سے نہ مانگ	118
278	صرف نصاب تعلیم بدلنے سے	119
281	انجام کی دستک ہو رہی ہے	120
283	اعزاز	121
285	نہ رات سکھ نہ دن چین	122
287	محو حیرت ہوں!	123
289	سیلاب	124
292	ایک تھا بادشاہ	125
295	تماشا گاہ	126
298	دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش	127

165	طاقت کی کہانی	72
167	فتنے کی علمبردار خواتین	73
170	خوف میں مبتلا بھگوڑے	74
172	مادی آسائش میں الجھی امت مسلمہ	75
175	کون کس کا ساتھی؟	76
178	صیاد کے دن تھوڑے ہیں	77
180	پجاری اور شکستہ بُت	78
182	پہچان	79
184	بشارت کے دن	80
186	تمہارے آباؤ اجداد کون تھے؟	81
189	یہ انعام تو ملنا ہی تھا	82
191	ہر میدان میں عورت کا ساتھ کیوں؟	83
194	اصل خوف کیا ہے؟	84
196	خلافت کی واپسی	85
198	نور ہدایت کے راستے پر	86
200	بھاری پانی کی بھاری قیمت	87
202	تھے تو آباؤ تمہارے ہی	88
204	اس کا ایمان نہیں جس کا عہد نہیں	89
206	ماضی سے کون سیکھتا ہے؟	90
208	آفت زدہ لوگ اور امریکی معاشرہ	91
210	اللہ کی حکمت	92
212	رب کی پکڑ بڑی سخت ہے!	93
214	چیلنج نہیں..... استغفار	94
217	موت کو یاد کرنے کا وقت	95
220	مرے تھے جن کے لیے	96
222	سائنس کی بے بسی	97
224	وارننگ	98
226	دوست کون، دشمن کون؟	99

مقدمہ

## حرف آغاز

اس دفعہ معرکہ خیر و شر غضب کا ہے۔ صدیوں کی نفرت، دلوں کا بغض اور دماغوں کا فتور سب کھل کر سامنے آ گیا۔ وہ لوگ جو اپنی علیحدہ شناخت، مختلف رنگ و نسل اور جدا جدا مذاہب رکھتے تھے، سب ملت واحدہ کے طور پر متحد ہو گئے۔ سب کا ہدف ایک، سب کا نشانہ ایک ہی جانب..... اور وہ ہے علاقہ، گروہوں اور عقیدوں میں بنی امت مسلمہ۔ مدتوں اس امت کو تقسیم کرنے کی سازشیں ہوئیں۔ کبھی اسے قومیت کے نام پر لڑایا گیا اور خلافت عثمانیہ کا زوال سامنے آیا، کبھی ان میں رنگ و نسل اور امارات و غربت کے نام پر تقسیم کیا گیا تو اشتراکیت کے زیر اثر مسلمان ممالک وجود میں آئے۔ یہ امت جس کے دلوں میں اللہ کی وحدانیت کے نعرے گونجتے تھے انہیں دنیا کے دلکش اصنام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ترغیبیں دی گئیں، معاشی خوشحالی کا صنم، آزادی، جمہوریت اور حقوق نسواں کا بت کدہ، عالمی طاقت کا صنم خانہ۔ غرض جب امت نہ اپنے مرکز پر مستحکم رہی اور نہ ہی اس کے افراد کے دلوں میں جذب دروں کی چنگاری باقی رہی تو پھر سب اس پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے بھوکے بھیڑیے منتشر بھیڑوں کے گلے پر ٹوٹتے ہیں۔

خیر کا ساتھ دینا اور ظالم کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ یہ انبیاء کی سنت، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل اور اہل ایمان کا خاصہ ہے۔ یہ سعادت جن کے بھی حصے میں آئی ان کے مقدر میں زنداں کی تاریکی، بربریت کا تشدد اور شہادت کا اعزاز بھی لکھ دیا گیا۔ قید خانوں کا سفر دنیا نہیں ہے، حق کی آواز پر لبیک کہنے والوں کا یہ ازل سے مقدر ہے اور گوانتا نامو بے اور شہر غان دور حاضر کے نمونے۔ شہادتیں وہ اعزاز ہیں جو مسلم امہ کا افتخار رہی ہیں۔ مکہ کی وادیوں سے بدر کے میدان تک اور کربلا کے ریگزاروں سے بالاکوٹ کے پہاڑوں تک سب اس کے گواہ ہیں۔ اسی گواہی میں آج افغانستان کے بے آب و گیاہ پہاڑ اور عراق کے ریگستان بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ گواہی تو اپنے خون سے دی گئی ہے جس کی عظمت کی گرد کو چھونا بھی سعادت ہے۔

اس کا رزار کفر و دین میں امت مسلمہ میں جذب دروں تو بہت ہے لیکن کفر کی طاقت سے مرعوب ہونے کی ذلت بھی کچھ لوگوں کے مقدر میں آئی۔ یہ ذلت جسے اس دور کے حکمرانوں نے سر کا تاج سمجھ کر سر پر سجایا اور ان لوگوں سے منہ موڑ لیا جن کے دل اس دور کے ظلم، جبر اور تشدد پر کڑھتے تھے۔ وہ اس سیلاب کو خود اپنے گھر لے آئے جسے صدیوں سے ماتھوں پر سجدوں کے نشانوں اور دلوں میں قوت ایمان رکھنے والوں نے روک رکھا تھا۔ تو میں جنگوں کے میدان میں ہار جائیں تو آئندہ جیتنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہیں لیکن اگر تہذیب، اقدار اور روایات کے میدان میں

300	دہشت گردی کے بانی	128
303	اب دفاع کون کرے گا؟	129
306	یادگار نہیں مزار	130
308	یہ دن بھی آنا تھا	131
310	ستیزہ کار رہا ہے ازل سے	132
313	وطن کی فکر کر ناداں	133
315	صرف اللہ پر ایمان سے	134
317	دو خودنوشت سوانح عمریاں	135
319	جھوٹ کی اپنے گھر کو واپسی	136
322	دن گئے جا چکے	137
324	خدائے رحیم و کریم کی نشانیاں	138
327	ایسا تاریخ میں پہلی بار ہوا	139
329	اب نشانے پر کون ہوگا	140
331	تحفظ حقوق نسواں "خصوصی" بل	141
333	یہ پٹی تو اللہ کی توفیق سے پڑھی جاتی ہے	142
335	واپسی	143

تقریظ

## قابل رشک لوگ

مجھے ان لوگوں پر بڑا رشک آتا ہے جو معصیت زدہ ماحول میں رہتے ہوئے دامن زندگی کو آلودہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

جو مال و دولت کی فراوانی کے باوجود گردن کو اکڑنے نہیں دیتے، ان کی چلت پھرت، نشست و برخاست اور قول و عمل میں تواضع کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔

جو ایسے مناصب پر فائز ہیں جو حرام مال کے لیے مقناطیس کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں رہتے ہوئے سادہ زندگی گزارنا بہت بڑا عیب تصور ہوتا ہے مگر وہ ”کثیر حرام“ کی بجائے ”قلیل حلال“ پر اکتفا کرتے ہیں اور سادگی کو اپنے لیے عیب نہیں، زینت کا باعث سمجھتے ہیں۔

جو ایسے ایوانوں میں دفاتر میں رہتے ہیں جہاں جھوٹ، منافقت اور خوشامد کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے مگر وہ اپنے صداقت شعاری، خلوص اور استغنا کی برکت سے ناممکن کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔

جن کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے اپنی خصوصی عنایات سے انہیں ظاہر و باطن کے تضاد سے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔

جو موسم اور اقتدار کے بدلنے کے ساتھ اپنے نظریات نہیں بدلتے۔ وہ ہر حال میں سچ بولتے ہیں، خواہ نازک مزاج حکمرانوں کی جبین شکن آلود ہی کیوں ہو جائے۔

وہ اپنے جیسوں کو بحر عسایاں میں غوطے لگاتے، گردن اکڑا کر دوسروں پر رعب بھاڑتے، دونوں ہاتھوں سے مال حرام سمیٹتے، جھوٹ، منافقت اور خوشامد کا کاروبار کرتے، ظاہر و باطن کے تضاد کا کھیل کھیلتے اور چہروں کے ساتھ قلم اور زبان کا قبلہ بدلتے دیکھتے ہیں مگر ان کے دلوں میں ٹھنڈا ایمانی دیکھ اور ان کے رگ و ریشہ میں پیوست اخلاقی روایات کی پاسداری انہیں ایسا کرنے سے روک دیتی ہے۔ مگر ایسے لوگ اب جنس نایاب کی طرح کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہیروں اور موتیوں کی طرح انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔

محترم اور یا مقبول جان صاحب کا تعلق بھی اسی جنس نایاب سے ہے۔ وہ کئی سالوں سے ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ مال و زر کے بندوں کے منہ سے اس عہدہ و منصب کے تصور ہی سے رال منپنے لگتی ہے اور جنہیں اس عہدے کی کرسی پر بیٹھنا نصیب ہو جائے ان کے خاندان کے سارے دلزدہ دور ہو جاتے ہیں۔ انہیں ہر مادی تمنا کی تکمیل

شکست کھا جائیں، اساس اور دین کا دامن چھوڑ دیں تو ایسے میں مستقل شکست ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔

تہذیبوں کی اس جنگ میں اپنی اساس، اپنی اقدار اور دین کی حرمت کی حفاظت قلم کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ تحریر کا شعلہ ہی ان اقدار کو جلا کر خاکستر کرتا ہے، طوفان کا پتہ دیتا ہے، دشمن کی خبر دیتا ہے اور یہ اللہ کا خاص فضل و کرم اور مہربانی ہوتی ہے کہ کس کو یہ توفیق عطا کر دے۔ میں پوری زندگی اپنے رب کے حضور سجدہ شکر میں گزارا ہوں تو شاید یہ حق ادا نہ ہو سکے کہ اس نے مجھے ”ضرب مومن“ میں ایسے وقت میں لکھنے کی توفیق دی جب چاروں جانب باطل کی یلغار تھی، سازشوں کے جال تھے، امت مسلمہ پر حملے تھے۔ یہ کالم نہیں المیہ کی لمحہ بہ لمحہ روداد ہے۔ وہ دکھ کے آنسو ہیں جو میری آنکھ سے ٹپکے۔ وہ خون جگر کے قطرے ہیں جو قلم نے تحریر کیے۔ انہیں پڑھتے ہوئے اگر آپ کو کبھی یا کسی وقت اپنی امت کے لئے کا احساس ہو اور دل میں ایمان کی تڑپ جاگے تو میرے لیے دُعا ضرور کیجیے گا کہ شاید اس دنیا میں میرے جیسا گنہگار سب سے زیادہ آپ کی دُعا کا طلب گار اور مستحق ہے۔

اور یا مقبول جان، لاہور

9 جولائی 2005ء

## نظام تعلیم کا بحران (1)

## تری بربادیوں کے مشورے

(9 جمادی الثانی 1424ھ بمطابق 8 اگست 2003)

یہ ایک چھوٹا سا پانچ کمروں کا اسکول تھا جہاں پڑھنے کے لیے ٹاٹ گھر سے لانا پڑتا تھا۔ درمیان میں پانی کا ایک ٹنکا اور چھوٹا سا حوض تھا جس میں ہم تختیاں دھوتے اور ان پر گاجنی (ملتان میٹھی) مل کر دھوپ میں سکھاتے۔ صبح کی اسبلی میں قطار در قطار کھڑے جب اقبال کی دُعا ”لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری“ یک زبان ہو کر پڑھتے تو میں اپنے دینیات کے ماسٹر جی کا چہرہ دیکھ رہا ہوتا۔ خوشی سے تمنا ہوا اور پھر جب ان کا ہاتھ دُعا کے لیے بلند ہوتا اور ہم بچے ان کی دُعا کے بعد بلند آواز سے آمین کہتے تو پتہ نہیں کیوں ان کی آنکھوں کے اتنے آنسو چھلکتے کہ ان کی سفید داڑھی بھیگ جاتی۔ مجھے آج بھی وہ دعایاد ہے جو انہوں نے ہمارے پرائمری کے نتیجے والے دن ہمیں خدا حافظ کہتے ہوئے گڑگڑا کر کہی تھی: ”اے اللہ! یہ بچے تیرے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے پھول ہیں ان کو کامیابیاں عطا فرما۔ ان کی زندگیوں میں صدیق اکبر کی صداقت، عمر فاروق کی عدالت، عثمان غنی کی سخاوت اور حیدر کرار کی شجاعت کی جھلک پیدا کر۔“

معلوم نہیں یہ اس نیک انسان کی دُعا کا اثر تھا یا ہمارے نصاب کی کتابوں میں جگمگ کرتے ماضی کے ذکر کی تاثیر تھی کہ میں یا میرے اسکول کے ہزاروں ساتھی جو زندگی کی کامیابیوں کے کتنے زینے طے کر چکے ہیں لیکن ان کے دلوں سے ہیر و اور ان کی یادوں سے یہ کہانیاں محو نہ ہو سکیں گی۔ دنیا میں پرستش کا کوئی بھی معیار آجائے ہمارے لیے صداقت، عدالت، سخاوت اور شجاعت کا معیار یہی لوگ رہے۔ لیکن آج ان ہیر و زکوہم سے جدا کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ آج ایسا نہیں ہو رہا بلکہ اس کا سفر بہت طویل اور کہانی بڑی دلگداز ہے۔ آئیے! میں آپ کو تاریخ کے ایک چھوٹے سے سفر پر لیے چلتا ہوں۔ یورپ جب نپولین کے زمانے میں ہونے والی طویل جنگوں سے فارغ ہوا اور لاکھوں انسانوں کے قتل و غارت کے بعد قدرے سکون کی حالت میں آیا تو اسے گیارہویں اور بارہویں صدی کی صلیبی جنگوں کے دکھ اور ضد سے یاد آنے لگے۔ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو ان کا مکمل ادراک تھا کہ خواہ جنگ ہو یا تبلیغ، مسلمان ایک ایسی قوم ہے جس کو مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

1219ء میں سینٹ فرانس کی مثال بہت اہم ہے جو شدید صلیبی جنگ کے بعد جب مصر پہنچا تو وہاں لوگوں نے کسی قسم کی مذہبی بحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھی نہ تو مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہوئے نہ مارے گئے اور نہ ہی لوگوں نے ان کی باتوں پر کان دھرا۔ جس کا بدلہ انہوں نے اسپین اور مراکش کی آبادیوں میں تشدد اور

آسان دکھائی دیتی ہے۔ ان کے بچے جتنے ترین انگلش اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کی ٹیبل پر دنیا کی مشہور ٹوارزم کمپنیوں کے بروشر بکھرے رہتے ہیں لیکن اور یا صاحب کی معمول کی زندگی کو اس منصب نے ہرگز متاثر نہیں کیا۔ وہ نہ ہوس میں مبتلا ہوئے، نہ تکبر کا شکار ہوئے، نہ ہی ایمانی رشتے کو انہوں نے کمزور ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں امت مسلمہ کے لیے تڑپنے والا دل، گہرائی میں اتر کر دیکھنے والی نظر اور انتہائی جاندار قلم عطا کیا ہے۔ اس قلم کو وہ بت کدے میں اذان دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر مسلمان کو حکم اذان ہے اور اس پر لازم ہے کہ ہر حال میں اس حکم کی تعمیل کرتا رہے۔ ”لا الہ“ سے لے کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تک اسی حکم کی تعمیل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اذان کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ایک مسلمان بھی دنیا میں باقی ہے۔ آئیے! دیکھیں کہ اور یا صاحب نے حکم اذان پر کیسے عمل کیا ہے۔

محمد اسلم شیخوپوری شہید

30 اگست 2005ء



## نظام تعلیم کا بحران (2)

نئے نظام کے تین بنیادی تصورات  
(16 جمادی الثانی 1424ھ بمطابق 15 اگست 2003)

مگر اس قوم کی خاکستری کہیں نہ کہیں چنگاریاں سلگتی رہیں۔ بھوسے کے ڈھیرے میں اندر ہی اندر جذبوں کی آگ بھڑکتی رہی۔ یہ خواہ مسجدوں کے منبروں سے ہونے والے ماضی۔ کہ تہذیبوں سے ہوا یا ہمارے نصاب تعلیم اسلاف کے ذکر سے یا پھر کسی دینیات کے اس جیسے بوڑھے استاد کی دُعاؤں سے..... مگر پوری دنیا کے وہ مغربی حکمران جو اطمینان کر بیٹھے تھے ان کو اس آگ کا دھواں نظر آنے لگا۔ اعداد و شمار جمع ہوئے تو یہ لوگ انگشت بدندان رہ گئے کہ گزشتہ 50 سال میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی میں 235 فیصد اضافہ ہوا ہے۔

سترہویں صدی میں افریقہ سے لوگوں کو پکڑ کر امریکا لایا جاتا تھا۔ ان بے چارے مظلوموں میں سوسے بھی کم افراد ایسے تھے جو اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے لیکن یہ صرف ایک سو افراد دو سو سال کے اندر آج ایک کروڑ ہو چکے ہیں اور ان میں 30 فیصد لوگ ایسے ہیں جو اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے اور سب سے زیادہ مذہب اس وقت تبدیل ہوا جب یہ لوگ جیل میں تھے۔ قتل کر کے، چوری کر کے ڈال کر مجرمانہ زندگی گزارتے ہوئے جیل پہنچے اور نور ہدایت لے کر باہر آئے۔ ایسا صرف امریکا میں نہیں ہوا بلکہ دنیا میں یہ نور پھیلنے لگا۔ امریکا میں مسلمانوں کے اضافے کی شرح 25 فیصد ہے جب کہ یورپ میں 143 فیصد اور آسٹریلیا میں 257 فیصد اور حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں ان کے اضافے کی شرح بہت کم ہے۔ ایشیا میں 12 فیصد اور افریقہ میں صرف ڈھائی فیصد۔

1996ء میں مسلمان ایک ارب 28 کروڑ تھے اور آج ایک ارب 90 کروڑ ہیں۔ یہ جنگ کی آگ پھیلی تو حیرت زدہ طاقتیں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں، اس کھوج میں لگ گئیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی؟ کہاں اس قوم کا رابطہ اپنی اقدار اور اپنے اسلاف سے قائم رہ گیا؟

پوری دنیا میں محققین کا جال پھیلا دیا گیا۔ ورلڈ بینک کے تعلیمی فنڈز، یو ایس اور یونیسکو نے رپورٹیں مرتب کرنا شروع کیں اور پھر گزشتہ 20 سال میں نئے نئے نعرے تخلیق کیے گئے۔ انسانی حقوق، حقوق نسواں، بچوں کے حقوق، فری مارکیٹ، گلوبلائزیشن، لیبر لائزیشن، پوری دنیا کی منڈیوں، اسکولوں، اسپتالوں اور کارخانوں میں ایک طرح کی اقدار، روایات اور ماحول کو جنم لینا چاہیے۔ ہر خاندان ایک طرح کی طرز زندگی پر پہنچے پرورش کرے۔ ہر اسکول ایک طرح کی عالمی اخلاقیات کو نافذ کرے۔

ورلڈ بینک کی رپورٹ Globalisation & Poverty وہ راستے متعین کیے گئے، ایک نکاتی ایجنڈا تھا، جسے 1980ء سے آہستہ آہستہ رو بہ عمل کیا گیا۔ ورلڈ بینک اس سارے عمل کو تاریخی طور پر تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

1۔ پہلی پالیسی پارہائی ملتیں، برطانیہ، فرانس، پرتگال اور ولندیزی مسلمان ملکوں پر چڑھ دوڑی۔  
2۔ لیٹنل لیٹن سے 1798ء کی ولندیزیوں کی انڈیز کے علاقے پر کنٹرول سے لے کر 1956ء میں سیزنبر پر فرانس اور برطانیہ کی جنگ تک 70 سے زیادہ لڑائیاں لڑی گئیں اور دنیا بھر کی مسلم آبادی ان حکومتوں کے زیر اثر آگئی لیکن تاریخ کے صفحات اب اس حیثیت سے پوری طرح آشنا ہو چکے ہیں کہ یہ قومیں صرف تجارتی مقاصد اور توسیع سلطنت کے لیے نہیں نکلی تھیں بلکہ عیسائی مشنریوں کی منظم کوشش بھی تھی کہ مسلم دنیا کو کیسے عیسائی بنایا جاسکتا ہے۔  
یوں ان چاروں قوموں کے چرچ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے پوری دنیا سے چھ علاقوں کو چنا جہاں مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیت کی ترویج کی جاسکتی ہے۔

1۔ ہندوستان، 2۔ انڈیا، 3۔ مشرق وسطیٰ، 4۔ شمالی افریقہ یعنی مصر، سوڈان، مراکش وغیرہ  
5۔ افریقہ یعنی اتھوپیا، کینیا، تنزانیہ وغیرہ 6۔ چین اور دیگر علاقے۔ ان صدیوں میں جب تک ان قوموں کا اقتدار رہا حکومت خواہ کسی ملک کی بھی ہوتی ان تینوں ملکوں کی مشنریاں ایک ساتھ مل کر کام کرتیں۔ یہاں میں کہانیاں نہیں بیان کرنا چاہتا کہ کیسے انڈونیشیا میں حج پر پابندی سے لے کر مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند کرنے تک۔ الجزائر میں جابجا کر جاگھر کھولنے سے کابلہ کے علاقے میں کئی سوشلریوں کو بھیجنے تک کیا کیا اقدام نہ کیے گئے؟  
350 سال کی محنت جن میں ہسپتال کھولے گئے لیکن سالوں میں صرف چند ہزار لوگ مسلمان ہو سکے جن میں اکثر وہ یتیم تھے جو ان اداروں میں پلے پڑے تھے۔ کابلہ سب سے زیادہ پر اسلام سے دور لیکن نام اور نسب کے اعتبار سے مسلمان ہو۔ یوں برصغیر میں 1873ء میں پہلا عیسائی مبلغ بنگال آیا جو زراعت اور تعلیم کا ماہر تھا۔ اس نے ان دونوں شعبوں میں کام کیا اور صرف 50 سال کے عرصے میں وہاں 83 گاؤں ایسے تھے جو عیسائی آبادی پر مشتمل تھے۔ 1757ء میں جب انگریز اس خطے پر برسر اقتدار ہوئے تو انہیں معلوم تھا کہ مسلمان سے زیادہ ”سخت جاں“ قوم اس خطہ ارضی پر نہیں پائی جاتی۔

یہ جنگوں میں ہمیں سپاہی مہیا کرتے ہیں، کالا پانی جیسی سزائیں برداشت کرتے ہیں، تنگ آ کر ہجرت کرتے ہیں لیکن اپنا مذہب نہیں چھوڑتے۔ اس زمانے کے نوآبادیاتی حاکم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانوں کے ملکوں میں ایک ایسا تعلیمی نظام رائج کر دیا جائے جو ان کے اپنے اسلاف اور اپنی اقدار سے محبت چھین لے تو پھر ان کی آئندہ نسلیں ایسی ہوں گی جن کے نام تو مسلمانوں جیسے ہوں گے لیکن جن کے ہیروز، جن کے معیارات، جن کی زندگی گزارنے کے طریقے، سب ہمارے جیسے ہوں گے، انہیں مجلس شوریٰ کے لفظ سے چڑھوگی اور پارلیمنٹ سے محبت، ان کو دو کمروں کے کچے مکان میں رہ کر آدھی دنیا پر حکمرانی کرنے والے فاروق اعظم کا کردار اچھا نہیں لگے گا، بلکہ وہ سیزر کی کہانیوں اور نپولین کے قصوں کو یاد کریں گے۔

انہیں محفلوں میں بیٹھ کر اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آئے گی اور وہ روسو، سارتر، جان آف آرک اور شیکسپیر جیسے نام لے کر اپنا سرفر سے بلند کیا کریں گے اور پھر ایسا صرف ایک سو سال کے اندر ممکن ہونے لگا اور ایک شرمندہ قسم کی مسلمان قوم بنتی گئی۔

1870ء سے 1914ء تک جب ان کی نظر میں بہت معاشی ترقی ہوئی۔ 1950ء سے 1980ء تک جب ترقی یافتہ ملک متحد ہوئے اور ایک نئے انسانی نظام کو جنم دیا اور تیسرا دور 1980ء سے شروع ہوتا ہے جب اس انسانی نظام کو پوری دنیا تک پھیلا نا باقی ہے۔ اس نظام کے تین بنیادی تصورات ہیں:

1..... کثیر المعاشرتی نظام Multi Culturation

2..... اجتماعیت Pluralism

3..... عالمی نظام Globalisation

ان سارے منصوبہ سازوں کے نزدیک ایک نکتہ سب سے اہم تھا کہ جب تک تعلیم کے نظام حکومتی اختیار سے لے کر ایک منظم قسم کے پرائیویٹ سیکٹر میں نہیں دے دیا جاتا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ پرائیویٹ سیکٹر دنیا بھر کی تجارت کے مطابق لوگوں کو تعلیم دے گا اور حکومتوں پر جو لوگوں کا اخلاقی اور مذہبی دباؤ ہو گا وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس سارے کاروباری حملے کی ایک مثال میں آپ کو اپنے ملک پاکستان سے دوں گا۔

اس وقت پورے پاکستان میں 36109 پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں۔ یہ ادارے ایک سال میں لوگوں کی جیبوں سے 22 ارب روپے کماتے ہیں اور ان کا کل خرچہ صرف 12 ارب روپے ہے۔ یوں آمدنی کا 50 فیصد ان کاروباری لوگوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں صرف تین فیصد کسی یونیورسٹی یا بورڈ سے منظور شدہ ہیں۔ 64 فیصد رجسٹرڈ ہیں اور باقی نہ رجسٹرڈ ہیں اور نہ ہی منظور شدہ۔

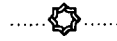
ان اداروں میں 94 فیصد پرائمری تعلیم دیتے ہیں۔ ان 36 ہزار اداروں میں صرف تین لاکھ استاد ہیں اور یوں فی ادارہ صرف آٹھ استادوں کی شرح بنتی ہے۔ پرائمری سے ہائی اسکولوں تک 65 فیصد استاد ہیں جو غیر تربیت یافتہ ہیں اور ان میں 15 فیصد تو صرف میٹرک ہیں اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ ادارے جو سالانہ 22 ارب روپے کماتے ہیں ان کی 28 فیصد آمدنی داخلے کی فیس سے ہوتی ہے یعنی لوٹ مار کی انتہا داخلے کے وقت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی ادارے گزشتہ 20 سال سے ایک ایسے ماحول کو جنم دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس راستے کو آسان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں پڑھنے والوں کی ساری نگاہیں آکسفورڈ سے کیمرج تک اور کولمبیا سے برکلی تک مرکوز ہیں۔ وہ صوفی تہذیب، اسماعیل میرٹھی اور الطاف حسین حالی کی نظموں کی بجائے نرسری Rhymes کی گود میں پروان چڑھے۔ اس سارے نظام کو گزشتہ تین سال کی مغرب زدہ حکومت نے اپنے اور اپنے آقاؤں کے ایجنڈے کے مطابق آگے بڑھانے کی کوشش کی اور یہ ایجنڈا کوئی خفیہ نہ تھا۔ 23 اپریل 1999ء کو برلن میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور اس کا موضوع ”مغربی اور اسلامی معاشروں کے تعلقات“ تھا اس کانفرنس میں ایک برلن ڈیکلریشن جاری کیا گیا جس کا مقصد تھا:

Golbal Wholound, Global Unity, Global Motiality

اس ڈیکلریشن میں کہا گیا کہ ہمیں پرائمری اور سینڈری تعلیم کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ ایک ایسے نظام تعلیم کو مرتب کرنا ہوگا جو آسٹریلیا کے شہر سڈنی سے امریکا کے شہر ہوائی تک ایک طرح کے ہیروز، ایک جیسی اقدار اور ایک جیسی سوچ کو جنم دے اور اس سارے کام کے لیے پیسوں پر پلنے والی این جی اوز کو سامنے لایا جائے اور پھر اس ملک میں این جی اوز پر مشتمل ایک حکومت وجود میں آگئی۔

MSU, DFID, JEKA, CEDAW جیسے ڈونرز نے پیسوں کے منہ کھول دیے۔ 40 سے زیادہ سفارت خانوں نے اپنے سفارت خانے میں ایک سیل قائم کیا جو ان این جی اوز کو امداد دینے لگا۔ انسانی حقوق، حقوق نسواں، بچوں کے حقوق، عورتوں پر تشدد اور گراس بوٹ جمہوریت جیسے نعرے دیے گئے اور مجبور کیا گیا کہ ان کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ وہ قوم جو انسانی حقوق کا چارٹر 1400 سال پہلے دیے گئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہء حجتہ الوداع کو سمجھتی تھی اسے بتایا جانے لگا کہ 1995ء کی بیجنگ کانفرنس نے عورتوں کو حق دیا۔

C.R.C کے بچوں کو حقوق دینے کے لیے انسانوں کو انسان سمجھا۔ وہ یہ تمام تر اپنے نصاب میں دیکھنے لگے جو کبھی یہ سنتے تھے کہ تم پر کسی انسان کی جان اس مقام اور اس پسینے سے زیادہ مقدس ہے۔ تم میں سے کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فوقیت نہیں۔

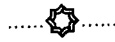


بتایا کہ ہم کیسے مسلمانوں سے ان کی روح اور اقدار کو ان سے دور کر سکتے ہیں؟ پہلا کام ان ملکوں میں نظام تعلیم سے ان حصوں کو نکالنا ہے جن سے ان کے اسلاف کے کارناموں کی بو آتی ہو۔ ان کی اقدار جن میں انصاف، اخلاق، شرم و حیا، عدل اور حاکمیت الہی شامل ہے اس کی جگہ حقوق نسواں، عالمی برادری، انسانی حقوق اور مذہبی جبر کے خلاف تحریک وغیرہ کو شامل کرنا ہے۔ لبرل تعلیم کا نعرہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔

اس پالیسی کے نفاذ کے آغاز میں امریکا کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی (US AID) نے پاکستان کو 100 ملین ڈالر کی امداد کا اعلان کیا تا کہ تعلیمی میدان میں اصلاحات کی جائیں۔ یونیسکو کے ایک اہم رکن اور ٹاسک فورس کے چیئر مین ہنری روکی کو اس کام کے لیے مخصوص کیا گیا اور ورلڈ بینک کی رپورٹ 239/6-PAK میں مدارس کو کنٹرول کرنے کا راستہ دکھایا گیا۔

بروکنگز انسٹیٹیوٹ کی یہ رپورٹ اپنی نوعیت کی پہلی رپورٹ ہے جس میں کھل کر کہا گیا ہے کہ تمام این جی اوز اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں لبرل اور مذہب سے بیگانہ لوگ موجود ہیں ان کو ڈھیروں امداد دی جائے۔ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو اسکا لرشپ دی جائیں اور جن اداروں میں مذہبی لوگ شامل ہیں ان سے حکومت کے ذریعے معاشی ناکہ بندی کروائی جائے اور غیر فعال کیا جائے۔ یہ انسٹیٹیوٹ کہتا ہے کہ تعلیمی اداروں کو جتنا ممکن ہو سکے پرائیویٹ سیکٹر میں دیا جائے تا کہ ان کے بورڈوں کو مالی امداد کے ذریعے مجبور کیا جاسکے کہ وہ ہماری مرضی کا نظام تعلیم اپنے اسکولوں میں رائج کریں اور پورے ملک میں گزشتہ ایک سال سے اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ احتجاج کریں ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہمیں کھٹکنا ہے ہوئے ڈالروں میں ملنے والی امداد چاہیے۔ کتابیں مرتب ہو رہی ہیں۔ ورکشاپ منعقد ہو رہے ہیں۔

کنسلٹنٹ اسلام آباد کے سرسبز ماحول میں بیٹھے کام کر رہے ہیں اور 100 سال پہلے اس ملک کو ایک بے سرو پا نظام تعلیم دینے والے ایک بار پھر اسی مسلمان قوم کا خواب دیکھ رہے ہیں جن کی نصاب کی کتابوں میں ڈھونڈنے سے بھی صدیق اکبر کی صداقت، فاروق اعظم کی عدالت، عثمان غنی کی سخاوت اور حیدر کرار کی شجاعت (رضی اللہ عنہم) کا تذکرہ نمل سکے اور اگر ایسے میں دینیات کا کوئی بوڑھا استاد آنسوؤں میں بھیگی دُعاؤں میں ان شخصیات کا ذکر کرے گا تو بچے حیرت سے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں تھے؟ ہمارا ان کے ساتھ کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں.....؟



## محبت وطن لوگوں سے ایک سوال

(23 جمادی الثانی 1424ھ بمطابق 23 اگست 2003ء)

لیکن اس سارے معاملے میں دکھ کا پہلو یہ تھا کہ تعلیم عام آدمی کی دسترس سے دور ہوتی گئی اور پنجاب کی تاریخ میں بورڈ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی طالبہ کمرڈ میں داخلہ نہ لے سکی کیونکہ اس کے والدین کے پاس داخلہ فیس کے لیے 38 ہزار روپے موجود نہ تھے۔ این جی اوز کے سرکردہ آغا خان کے ادارے سے جناب لاکھا کو تعلیم میں ریفارمز کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ جن کا نعرہ یہ تھا کہ تعلیم کم از کم اتنی تو مہنگی ہو کہ والدین کو اس کا احساس ہو سکے۔ اس لیے کہ ان کے سامنے 36 ہزار پرائیویٹ تعلیمی ادارے موجود تھے جو لوگوں کی کھال کھینچ کر پیسے وصول کر رہے تھے۔ یوں تعلیم کو صرف ایسے طبقوں تک محدود کر دیا جائے جہاں ان کے منظور نظر کلچر کی آبیاری آسانی سے ہو سکتی ہو۔ تعلیم کو ایک Comondity یعنی ایک جنس بنا دیا جائے اور جس کی جیب میں پیسے ہوں وہ اسے خرید سکے اور یہ ایک ایسی قوم کو سکھایا جا رہا تھا جو بغداد کے مدرسوں، مصر کی جامعہ الازہر، سرقند بخارا کی تعلیمی درس گاہوں کے وارث تھے۔ جہاں تعلیم کے نام پر پیسے لینے یا منافع کمانے کو حرام سمجھا جاتا تھا اور اسی روایت کو انہوں نے ماڈرن تعلیمی اداروں تک قائم رکھا۔ 1973ء تک کوئی پرائیویٹ تعلیمی ادارہ، اسکول، کالج یا یونیورسٹی ایسی نہ تھی جس کے دروازے سے غریب گھر کے طالب علم کو خوف آتا ہو، جہاں مزدور اور غریب کے بچے نہ داخل ہو سکتے ہوں۔ یہ وہ ادارے تھے جن کی عمارتیں لوگوں کے چندے سے تعمیر ہوئیں، علی گڑھ سے لے کر دیوبند تک اور انجمن حیات اسلام سے لے کر سندھ مدرسۃ الاسلام تک۔

جہاں محمد علی جناح سے لے کر اقبال تک اور سر شاہ سلیمان سے لے کر فیض احمد فیض تک پڑھتے رہے۔ جہاں کے پڑھے لکھے لوگ نہ اپنی سن کے خوف کھاتے تھے اور نہ کانٹوں اور گرامر اسکولوں سے مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایسے ہی بوریا نشین اسکولوں سے بوبلی سینا نے جنم لیا تو یورپی دنیا میں طب کا باب کھلا، جابر بن حیان پیدا ہوا تو سائنس کی راہیں متعین ہوئی، ابن الہیثم نے علم حاصل کیا تو ریاضی کے اصول متعین ہوئے اور آج دنیا کی کوئی ماڈرن سے ماڈرن یونیورسٹی علوم کی اس سیڑھی پر قدم رکھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی..... لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اپنی روایت پر قائم اپنی انفرادیت برقرار رکھیں اور پوری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھنے والے خاموش بیٹھے رہیں۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھے کہ 11 ستمبر آ گیا۔ اب تو لوہا گرم ہو، یا نہ ہو..... وار ضروری ہو گیا تھا امریکا کے دفتر خارجہ نے 11 ستمبر کے فوراً بعد لاکھوں ڈالر دے کر بروکنگز انسٹیٹیوٹ کو ایک پروجیکٹ دیا کہ ہم مسلمان ملکوں میں تعلیم کے نظام کو کیسے ”درست“ کر سکتے ہیں؟ ستمبر 2002 میں پی ڈبلیو سکر کی سربراہی میں ایک رپورٹ بنائی گئی اور

زیادہ اور کیا ہے جیسی ہوگی کلدن کے بازاروں میں ہزاروں افراد اسرائیل کے خلاف باہر نکل آئے اور ان میں کئی یہودی بھی تھے جو ایریل شیرون کو دنیا کا دوسرا ہٹلر کہہ رہے تھے۔ جرمنی اور یورپ کے دیگر ممالک میں مسلمانوں نے نہیں بلکہ غیر مسلم لوگوں نے مسلمانوں کے قتل عام پر مظاہرے کیے۔ مراکش میں 10 لاکھ لوگ اس ظلم کے خلاف سرپا احتجاج بن گئے۔ مصر اور اسرائیل کی سرحد پر مصری قوم کے لاکھوں بوڑھے، نوجوان، عورتیں اور بچے جمع ہو گئے کہ یہ سرحد کھولو اور ہمیں اپنے بھائیوں کی مدد کو جانے دو۔ ملائیشیا جیسے آزاد خیال ملک کا لیڈر مہاتیر محمد جس جرات مند طریقے سے اس ظلم کے خلاف بولا اس کی نظیر نہیں ملتی..... لیکن ایک ہم ہیں کہ نہ ہماری آنکھ میں آنسو ہیں، نہ دل میں غم و غصہ، ہمارے سیاست دانوں کے بیانات اپنے مظلوم بھائیوں کے ذکر سے خالی تھے۔ ہماری انسانی حقوق کی تنظیموں کے دفاتریوں لگتا ہے کہ ان پر تالا لگ چکا ہے۔ بلکہ تالے پر بے حسی کی مٹری نے جالا بن دیا تھا۔ ہمارے حساس شاعر اور ادیب خاموش تھے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم کو مسلمانوں کی پہچان بتا دو؟“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا۔ ”ہاں“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان میں سے اگر کوئی ایک تکلیف میں ہوتا ہے تو سارے بھائی مضطرب اور پریشان ہو جاتے ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایمان کے تین درجے ہیں۔ اول: اگر کسی برائی کو دیکھو تو ہاتھ سے پکڑ کر روک دو۔ دوم: نہیں استطاعت رکھتے تو زبان سے روک دو۔ سوم: اور اگر اتنی بھی استطاعت نہیں رکھتے تو دل میں برا ضرور کہو کیونکہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس کے بعد پھر ایمان نہیں، بس کفر ہے۔“

گجرات اور سرگودھا کی سرحد پر ایک قصبہ ہے جس کا نام ہڈالی ہے، اس قصبہ میں انگریزوں نے پنجاب رجمنٹ کے ان سپاہیوں کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی ہے جو مسلمان تھے لیکن انگریزوں سے وفاداری اور نوکری کی خاطر اس سپاہ میں شامل ہو گئے تھے جنہوں نے کعبہ پر گولیاں چلائی تھیں لیکن میرے بچپن میں مجھے یاد ہے ہم اس مقام، اس جگہ اور ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ جن کے وہ آباء و اجداد تھے وہ بھی اس یادگار پر اپنا کوزا کرکٹ پھینک کر آتے تھے۔

مجھے بچپن سے کبھی ایسی محبت نہیں رہی کہ جیسے اکثر لوگوں کو ہوتی ہے کہ انہیں واپس لوٹ جانے کی خواہش رہتی ہے کیونکہ میں نے بچپن بہت محنت اور مشقت سے گزارا ہے لیکن پتہ نہیں کچھ دنوں سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں اپنے بچپن میں واپس لوٹ جاؤں۔ جہاں ایک فلسطینی کے قتل پر پورا ملک جاگ اٹھا تھا۔ ایک کشمیری مجاہد مرتا تھا تو جگہ جگہ غائبانہ نماز جنازہ منعقد ہوتی، لوگ ہڈالی کے گاؤں سے نفرت کرتے تھے اور لیلیٰ خالد کی تصویریں لگاتے تھے۔ کوئی بھی فرد باوازا بلند یہ کہہ سکتا تھا: ”دیکھو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا سچ کہا تھا، مسلمان ایسے ہوتے ہیں ایک تکلیف میں ہو تو سارے بھائی مضطرب اور پریشان“ ”نیل کے ساحل سے لے کر تباہ خاک کا شغریٰ۔“



## کہاں گئے وہ لوگ

(05 رجب 1424ھ بمطابق 05 ستمبر 2003ء)

پورا شہر غیظ و غضب کے عالم میں تھا، صبح ہی سے دکانیں بند تھیں، لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد دیوانہ وار گلیوں میں نکل آئے، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مل کر ایک بہت بڑا جلوس بنتا گیا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جس سے انکارے نہ پھوٹ رہے ہوں اور کوئی زبان ایسی نہ تھی جو نعروں کے شعلے اگل نہ رہی ہو۔ ایک نوجوان کسی کے کاندھے پر سوار ہو کر امریکا کا لفظ منہ سے نکالتا اور ہزاروں افراد کا مجمع مردہ باد کہتا ہوا اپنی ایڑیوں پر اچھلنے لگتا۔ میں صرف چند سال کا تھا، اپنے والد کی انگلی پکڑے ایک دکان کے بند ذروازے کے ساتھ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا: ”ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

انہوں نے کہا: ”یہودیوں نے قبلہ اول بیت المقدس کو آگ لگا دی ہے۔“

میں نے کتنے بوڑھوں کی آنکھیں اشک بار دیکھیں اور کتنے جوانوں کے دل جہاد کے جذبے اور بدلے کی آگ میں ابلتے نظر آئے۔ یہ اسی ساٹھ کی دہائی کی بات ہے کہ سری نگر میں حضرت بل کی درگاہ سے موئے مبارک چوری ہو گیا تو پاکستان کا کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ اس کے بوڑھے بچے، جوان، آنکھوں میں آنسو، دل میں درد اور زبان پر نہرو حکومت کے خلاف غم و غصہ لے کر سڑکوں پر نہ آ گئے ہوں۔

وہ قوم جس کے دل پوری امت کے مسلمانوں کے ساتھ دھڑکتے تھے، اقبال کے خواب ”نیل کے ساحل سے لے کر تباہ خاک کا شغریٰ“ کی تعبیر تھی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں اس وقت پاکستان کی عزت و تکریم ایسی تھی کہ جب 1967ء میں اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان جنگ ہو رہی تھی تو فضائی حملے کے خطرے کی وجہ سے رات کو مسجد نبوی اور کعبہ کی روشنیاں بند کر دی گئیں تو لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ مسجد نبوی اور کعبہ اللہ کو روشن کر دو، ابھی پاکستان اس دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ جنگ عظیم اول میں جب مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں کا ساتھ دیا تو محبت کا رشتہ یوں قائم ہوا کہ آج بھی ترک قوم کسی پاکستانی کو دیکھ کر اس کے احترام میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ کسی بھی ترک سے ملیں خواہ حرم کے اندر یا ترکی کے بازاروں میں، بس تعارف کرنے کی دیر ہے کہ آپ پاکستانی ہیں اس کی آنکھوں میں محبت کا سیلاب اٹھ آتا ہے۔

لیکن چند سال میں ہم اس قدر بدل جائیں گے کہ رملہ، جنین اور ہاشمیہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے، روتی ہوئی عورتیں اور بچے اپنے پیاروں کی لاشوں، ٹوٹے ہوئے مکانات اور تباہ شدہ شہروں کے ساتھ روز میڈیا پر دکھائے جا رہے ہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے ہماری آنکھوں نے دیکھنے اور کانوں نے سننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس سے



اب ان چالاک اور مکار سناروں نے جو اعلیٰ بینکر بن چکے تھے ایک چال چلی۔ کہا کہ اے سادہ لوگو! تم کیوں روز روز نفع نقصان کی فکر میں رہتے ہو، پیسہ لگاتے ہو، ڈوبتا ہے، پریشانی ہوتی ہے، بس آپ کا سارا غم ہمارا۔ اپنا پیسہ ہمیں دے دو اور ہر سال یا ہر ماہ ایک مقررہ (Fixed) منافع لیتے جاؤ اور یوں عام لوگوں کا سرمایہ ان چند چالاک ساہوکاروں اور اعلیٰ مرتبت بینکاروں کے قبضے میں آ گیا جسے وہ جیسے چاہیں استعمال کریں۔

جب عام لوگوں کا یہ تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہوا روپیہ ان کے قبضہ قدرت میں آیا تو دنیا نے کیا کیا تماشے نہیں دیکھے؟ میں پوری دنیا کا ذکر تو نہیں کرتا صرف ہمارے ملک میں کیا ہوا؟ غور کیجیے لوگوں کے پیسے سے کوئی عام سا لوہار ایک بڑی کاروباری سلطنت کا مالک بنا جس میں کئی اسٹیل ملیں تھیں، 30 سے 40 ہزار روپے تنخواہ لینے والے جرنیل کے بیٹے کروڑ پتی ہو گئے۔ پولیس میں معمولی سپاہی کی نوکری کرنے والے کے پاس بے انتہا دولت آئی اور وہ ملوں، کمپنیوں اور بینکوں کا مالک بن گیا۔

بینکوں پر قبضے ہوئے کبھی حکومتوں نے کئے اور کبھی سرمایہ داروں نے اور بے چارے عام آدمی کی محنت اور پسینے کی کمائی عالیشان پلازوں، دفاتر، ایئر کنڈیشنڈ کاروں اور مزین دفاتروں پر اڑائی گئی۔ یہ رقم حکومت نے قرض لی تو رشوت خوروں کے ہتھے چڑھی، پھر کیا کچھ نہ ہوا؟ لیکن کمال ہے میرے ملک کے اعلیٰ ماہرین معاشیات، صاحب کمال دانشوروں کا کہ کسی نے اس سسٹم کو گالی نہ دی جس کی بنیاد میں دغا، چالاک اور لوٹ مار شامل تھی، بس ایک دوسروں پر لوٹ مار کا الزام دھرتے رہے اور ہر سال آنسوؤں، اشکوں، آہوں اور بددعاؤں میں اضافہ ہوتا رہا جو بینکوں، فنانس کمپنیوں اور کوآپریٹوز کے ہاتھوں لٹنے والے غریب لوگوں کا مقدر تھا۔

جہاں حکومتیں بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کا تحفظ نہ کر سکی، بے روزگار کو چوری، ڈاکے اور خودکشی کرنے سے روکنے کے لیے اس کی مالی مدد کا نظام تخلیق نہ کر سکیں جہاں لوگ اپنے پڑوس میں پلنے والے یتیم، بیوہ، بے روزگار اور معذور کی مدد اپنے فرائض میں شامل نہ کریں۔ وہاں ایسے ہی ساہوکار ایک لالچ سے پر سسٹم لے کر آتے ہیں اور ان کی رہی سہی جمع پونجی بھی کریڈٹ اسکیموں اور کبھی تاحیات منافع کے نام پر لوٹتے رہتے ہیں۔

حیرت ہے اگر ایک شخص ایک دکان یا فیکٹری میں سرمایہ لگاتا ہے تو اسے ڈرایا جاتا ہے کہ یہ ڈوب جائے گا، نقصان ہو جائے گا لیکن پوری دنیا میں پھیلا بینک ڈوب جاتا ہے تو کوئی اُف نہیں کرتا۔ کوئی اس گولڈ اسمتھ کو گالی نہیں دیتا، کوئی نہیں کہتا کہ چند یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داری اور غریبوں کی جمع پونجی پر عیش کرنے والا یہ سسٹم غلط ہے اقبال نے کہا تھا:

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے

سود ایک کا، لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

لوگ سوال کرتے ہیں ہم پر رحمتیں نازل کیوں نہیں ہوتیں؟ ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ ہم پوری دنیا میں ذلیل و رسوا کیوں ہیں؟ لیکن میرا رب صرف ایمان والوں سے کہتا ہے: ”اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان جنگ قبول کرو۔“

جس امت کے ہر چور ہے، شرک، عمارت اور شہر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ قبول کرنے کی دکانیں کھلی ہوں، پوسٹر لگے ہوں، نیون سائن جگ مگار ہے ہوں وہ اسی سے رحمت کی توقع بھی کرتی ہے۔



## سود: ظاہر اور حقیقت

(14 رجب 1424ھ بمطابق 12 ستمبر 2003ء)

کیا آج دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود ہے جس نے کبھی بھی بیواؤں، یتیموں، معذوروں اور بے کس لوگوں کی ایسی قطار نہ دیکھی ہو جو ایک عمارت کے گرد چچ و پکار کر رہی ہوں جسے کچھ عرصے پہلے بینک کہتے تھے، جس کے خوبصورت شیشوں والی عمارت میں لاکھوں کروڑوں روپے کی چمک دمک رہتی تھی اور پھر ایک دن اعلان ہوا کہ اس بلندو بالا ایئر کنڈیشنڈ بلڈنگ کے مکین دیوالیہ ہو گئے اور لاکھوں لوگوں کی آنکھوں میں آنسو، مایوسی، سسکیاں، چیخیں اور بددعائیں چھوڑ گئے۔ یہ موجودہ بینکنگ کا صرف ایک چہرہ ہے جس کے بارے میں آج میرے ملک کے دانشور کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ سسٹم نہ رہا تو پورا ملک ڈوب جائے گا۔

لیکن شاید تاریخ سے ناواقف لوگ جو اس ملک کے سادہ لوگوں کو فریب دینے میں تو کامیاب ہو جائیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سارے بینکنگ سسٹم کا آغاز کس طرح بددیانتی، فراڈ اور استحصال سے ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کرنسی نوٹ نہیں تھے، لوگ اپنی بچت سے سونا خریدتے اور سناروں کے پاس اسے امانت رکھ دیتے اور وہ انہیں رسید لکھ دیتے کہ اس کاغذ کے عوض اتنا سونا میرے پاس موجود ہے، پھر اگر کسی نے کوئی چیز خریدنی ہوتی یا قرض اتارنا ہوتا تو وہ رسید اس کے حوالے کر دیتا جو آگے چلتی رہتی اور سونا سار کے پاس رہتا۔ ان چالاک اور ہوشیار سناروں نے اندازہ لگایا کہ لوگ دس حصوں میں سے صرف ایک حصہ سونا خرچ کرتے ہیں اور باقی نو حصے جمع رکھتے ہیں تو یوں انہیں نے لالچ، حرص اور بددیانتی میں لوگوں کی ان امانتوں کے بدلے قرض پر لوگوں کو رسیدیں جاری کرنا شروع کر دیں اور اس پر سود لینا شروع کیا۔ یہ دغا بازی دوہری نوعیت کی تھی جس کا سونا ہوتا اس سے حفاظت کے پیسے الگ لیے جاتے اور جس کو دیتے اس سے سود کے پیسے الگ۔ حرص بڑھتی ہے تو بے ایمانی بھی بڑھتی ہے۔

رسید کا میاب ہوئی تو 9 حصوں کے بدلے میں 90 رسیدیں بھی جاری ہوتی رہیں یعنی وہ مال جسے نہ ان سناروں نے کمایا تھا اور نہ وہ ان کی ذاتی بچت تھی، ایک امانت تھی جس پر روپیہ بنورنا شروع کیا گیا اور ایک دن ایسا آیا کہ ملک کے بادشاہ، امیر، وزیر سب ان سناروں کے محتاج ہو گئے۔ ملک چلانے، جنگیں لڑنے، شادیاں کرنے کے لیے سب ان سے قرض لینے لگے اور یہ سنار اس قدر طاقتور ہو گئے کہ حکومتوں نے ان کی دغا بازی کو قانون کا درجہ دے دیا اور پھر ان کو اختیار دے دیا کہ وہ کرنسی نوٹ جاری کر سکیں۔

ادھر پوری دنیا میں صنعتی انقلاب آ رہا تھا صنعتیں لگ رہی تھیں، چالاک سرمایہ دار کو پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ صرف دو جگہ تھا، سناروں کے پاس یا پھر عام غریب آدمی کے پاس تھوڑی سی بچت کی صورت میں۔ یہ عام آدمی جو پس اندازہ کرتا وہ یا تو کسی دکان یا فیکٹری میں حصہ ڈالتا یا حصص خرید لیتا۔

کہ وہ سارے زخم بھول کر مجھے بھائیوں سے زیادہ پیار دے رہا ہے۔ تو میری نظریں اس مدرسے کے اس بوڑھے استاد پر جا کرکیں جو چٹائی پر بیٹھ کر صرف یہی بات کرتا ہوگا کہ تمام مسلمان ایسے ہیں جیسے عمارت کی اینٹیں، یہ تو ایک جسم ہیں۔ اگر ایک کو تکلیف ہو تو دوسرا بے چین۔ معاف کرنے والوں کو اللہ محبوب رکھتا ہے۔ اسلام کا یہ درس جب اس نوجوان کو ملا ہوگا تو وہ کیسے مجھ سے نفرت کر سکتا تھا؟

میرے ملک کی یہ درسگاہیں اور یہ مدارس جو گزشتہ 55 سال سے امت مسلمہ کے نوجوانوں کو دین کی تعلیم دے رہے ہیں۔ یہاں دنیا کے ہر ملک سے نوجوان انہیں اسلامی تعلیمات کی آکسفورڈ اور کیمبرج سمجھ کر یہاں آتے تھے اور پھر میرے ملک پاکستان سے ایک محبت کا رشتہ لے کر جاتے تھے لیکن آج اس رشتہ محبت کی تعلیم دینے والی ان درس گاہوں پر پوری دنیا کے مسلمانوں کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ وہ طلبہ جو دنیا بھر کے ممالک سے کشاں کشاں یہاں آتے تھے اب ہندوستان اور مغربی افریقہ میں قائم مدارس میں جا رہے ہیں کہ میرے دین کا علم دینے والے تو ہر جگہ موجود ہیں انہیں کوئی علاقہ یا حکومت محدود نہیں کر سکتی۔ جو طلبہ اس سال چھٹیوں میں اپنے گھروں کو گئے اب پاکستان کی وزارت خارجہ امریکی دباؤ میں ان کو واپسی کا ویزا نہیں دے رہی۔ اب یہی طلبہ ہندوستان جا رہے ہیں جہاں ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہو گئی ہے اور یورپ کے مسلمان طلبہ اور عرب دس ہزار سے زیادہ جنوبی افریقہ کے مدارس میں چلے گئے ہیں۔

11 ستمبر 2001ء سے قبل میرا پاکستان یہ افتخار رکھتا تھا کہ یہاں دین کی تعلیم حاصل کرنے والے غیر ملکیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ صرف پچھلے سال 500 سے زیادہ غیر ملکی طالب علم ایف بی آئی، رینجرز اور پولیس کے چھاپوں سے گھبرائے اور یہ ملک چھوڑ گئے۔ ایک ہزار ایسے تھے جن کے ویزوں پر طرح طرح کے سوالات ہوئے اور انہیں یہاں سے تعلیم چھوڑ کر جانا پڑا۔ 105 ایسے تھے جنہیں این او سی نہ دیا گیا اور اب اس وقت صرف 900 طلبہ ایسے رہ گئے ہیں جو اگر اس ملک میں تعلیم مکمل کر گئے تو ان کا اس سے محبت کا رشتہ قائم رہے گا لیکن اگر وہ ایک دفعہ چھٹیوں پر اپنے گھر روانہ ہو گئے تو خوفزدہ پاکستانی دفتر خارجہ انہیں کہاں واپس آنے دے گا۔

میں سوچتا ہوں کہ جو تعلیم مشرقی پاکستان کے ظلم و ستم کی داستان کا دکھ بھلا کر محبت کے بیج بو سکتی تھی ہم نے نفرت کے سامان پیدا کرنے والی تعلیم کو اس پر مقدم کیا۔ آج میرے ملک کے عیسائی مشنری کالجوں میں پرنسپل سے لے کر ہاسٹل کے وارڈن تک اور طالب علموں تک کتنی آسانی سے ویزا لے کر آ رہے ہیں اور میرے ملک کے نوجوانوں کو اپنی مخصوص مغربی تعلیم سے آگاہ کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے پرائیویٹ اسکولوں میں کتنے ایسے اساتذہ ہیں جو لندن، آسٹریلیا، نیپال، سری لنکا اور امریکا سے آ کر یہاں وہ تعلیم دے رہے ہیں جو میرے ملک کے نوجوانوں کو اپنے ہی ماحول سے متفرق کرتی ہے۔ ہم اس بد نصیب دور میں زندہ ہیں جہاں ”اولیول“ یا ”اے لیول“ پاس کرنے کے بعد ایک طالب علم کو اپنے شہر کی گلیوں سے بو آنے لگتی ہے اپنے ملک کی درس گاہوں سے نفرت ہونے لگتی ہے مگر ہم ان کالجوں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو ترجیح دے رہے ہیں اور اس درس گاہ سے نفرت جہاں پر پڑھنے والا ہمارے ظلم، ہماری زیادتیوں، ہماری نا انصافیوں کو بھول کر صرف ایک بات کہتا ہے: تمہارا میرا رشتہ تو کلمہ طیبہ ہے۔ تم تو میرے جسم کا حصہ ہو، تمہیں تکلیف ہوگی تو میری آنکھ میں آنسو ضرور آئیں گے۔



## محبتوں کا بیج بونے والے

(28 رجب 1424ھ بمطابق 26 ستمبر 2003ء)

میں مکہ معظمہ کی گلیوں میں زیارتوں پر جانے کے لیے کسی ایسے ٹیکسی ڈرائیور کی تلاش میں تھا جو اردو جانتا ہو۔ یہ 1997ء تھا اور ابھی تک وہاں غیر ملکی ٹیکسی چلانے والے مل جاتے تھے۔ باب عبدالعزیز کے قریب ایک سانولے سے نوجوان نے اردو میں مجھے زیارتوں پر جانے کے لیے پکارا اور میں فوراً اس کی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین میں گھومتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا کہ تم کس شہر سے آئے ہو تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے جواب دیا کہ میں بنگلہ دیش کے شہر نواکھلی کا رہنے والا ہوں۔ میں نے پوچھا، تم اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتے ہو کہ مجھے گمان ہی نہ ہوا کہ تم بنگالی ہو۔ کہنے لگا: میری ساری تعلیم کراچی کے ایک بہت مشہور دینی مدرسے میں ہوئی، استاد کی زبان اور پھر اس شہر سے اس کی محبت نے اتنا بدل دیا کہ مجھے یقین نہیں آیا۔ گزشتہ کئی سالوں سے دنیا کے جس ملک میں مجھے کسی بنگالی سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کی زبان پر گلے، شکوے اور شکایتیں تھیں۔ وہ اردو جانتے ہوئے بھی اردو نہیں بولتا تھا لیکن یہ عجیب شخص ہے نہ اس نے مجھ سے 1971ء کے کشت و خون کا ذکر کیا، نہ یہ بتایا کہ میرے سامنے کیسے فوجی گمروں میں گھستے تھے اور کیسے نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے تھے۔

مجھے یک دم سان فرانسسکو کی وہ بنگال ڈاکٹر یاد آ گئی جس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ میں اس خطے سے تعلق رکھتا تھا جہاں کے سپاہیوں نے اس کے بزم اس کی دو بہنوں کی آبروریزی کی تھی۔ میں انہی سپاہیوں میں گم تھا کہ میدان عرفات کی سڑک آ گئی۔ میں نے خالی سڑک دیکھی اور اچانک کہا: ”یہاں گاڑی چلانے کا التزام آئے گا؟“

اس نے ٹیکسی روک دی اور بڑے احترام سے کہا: ”آئیے! آپ گاڑی چلائیں۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اس سے سوال کر دیا: ”تم 1971ء میں کہاں تھے؟“

اس نے کہا: ”میں نواکھلی میں تھا۔“

میں نے پوچھا: ”تم نے مجھ سے کوئی گلہ کیوں نہیں کیا؟“

اس نے کہا کہ میں نے بھی ظلم دیکھے تھے، زیادتیاں برداشت کی تھیں، لیکن میرا اور آپ کا رشتہ تو کلمہ طیبہ سے بندھا ہوا ہے۔ اس رشتے کو دنیا کی کسی زبان بولنے والے کا ظلم اور زیادتی ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے جتنی محبت کراچی میں ملی شاید ہی کہیں اور ملی ہو۔ میں اور میرے جیسے اور بھی میرے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لڑے نہیں، ہمیں لڑا دیا گیا تھا۔ ہمارے اہل میں نفاق پیدا کیا گیا تھا۔ ہم جو ایک کلمہ طیبہ کی لڑی میں تھے اس رنگ نسل اور زبان میں دشمنوں نے تقسیم کیا تھا۔

وہ جذباتی طور پر بولے جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا اس کے دل میں میرے لیے اتنی محبت کہاں سے آ گئی

اسکول جسے فخر حاصل ہے کہ اس نے برطانیہ کے سب سے زیادہ وزیر اعظم پیدا کیے۔ یہ سب لوگ ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں معاشی مجبوری، بھوک، افلاس، غربت اور بیماری کا دخل نہیں ہوتا لیکن حیرت ہے کہ دنیا بھر کے میڈیا پر کسی نے ان یونیورسٹیوں کو دہشت گردی کی زسری نہیں کہا۔ ان پر ڈاکومنٹری نہیں بنائی کہ یہاں ایسے ظالم اور انسانیت کے دشمن پیدا ہوتے ہیں، انہیں فوری طور پر بند کر دیا جائے یا کم از کم ان اداروں کو دس پندرہ سال کے لیے سخت نگرانی میں لے لیا جائے اور اگر ان سے مزید دہشت گرد نہ پیدا ہوں تو ٹھیک ورنہ ان پر سخت پابندیاں عائد کر دی جائیں۔ یہ ادارے کامیابی، نوکری اور عزت کا سٹوٹھلیٹ جاری کرتے ہیں۔ کیریئر کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ترقی کی منزل ہیں۔

ہر روز شام کو مغرب کی نماز کے بعد کوئی معصوم طالب علم میرے دروازے کی گھنٹی بجاتا ہے اور اپنے لیے ایک یا دو روٹیاں لے کر خوشی سے چلا جاتا ہے۔ یہ طالب علم اس میراث کا امین ہے ان مدرسوں کا وارث ہے کہ جن سے بوعلی سینا پیدا ہوا تو اسے طب کا آدم کہا گیا۔ ابن الہشیم نکلا تو کیمسٹری کا درخشاں باب طلوع ہوا۔ جابر بن حیان نے جنم لیا تو الجبر اور حساب کی گتھیاں دنیا کے سامنے سلجھیں۔ البیرونی کے افکار نے ہیئت دانی اور فلسفہ کا دروازہ کھولا اور ابن خلدون نے آنے والے دنوں تک بلکہ آج تک کے آنے والے مفکرین کے لیے رہنمائی مہیا کی۔

میں سوچتا ہوں کہ معصوم طالب علم کے چہرے پر دہشت گردی کا طعنہ کس نے تحریر کیا۔ ان درسگاہوں پر طنز کے تیرکس نے بر سائے جب دنیا کے پچاس Most Wanted پیدا کرنے والی یونیورسٹیاں آج بھی مہذب کہلاتی ہیں۔ شرمندہ قوموں کے اداروں کے ساتھ یہی کرنا چاہیے کیونکہ جب یہ افراد اپنے بچوں کو فزکس اور کیمسٹری پڑھانے کے لیے ہزاروں روپے ٹیوشن فیس دینے کو تیار ہوں اور اپنی میراث کو باسی روٹیاں تو ان کو دنیا میں عزت مانگنے کا کوئی حق نہیں۔ انہیں بھول جانا چاہیے کہ ان کے آباء و اجداد بھی علم کا سرچشمہ تھے۔ جب یورپ، رچرڈ جیسے ظالم پیدا کرتا تھا تو ہم صلاح الدین ایوبی جیسا سپہ سالار پیش کرتے تھے۔ جسے گیارہویں صدی میں جنگ میں اخلاقیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ سر جھکائیے! خاموش رہیے! طعنہ سنئے! اور ہاتھ باندھ کر عرض کیجیے۔

حضور! چھوڑیے ہمارے اسلاف کو جو جہالت میں رہتے تھے۔ علم تو اب ہمیں ملا ہے۔ ہاروڈ سے، بوسٹن سے، کیمبرج سے اور اپچی سن سے اخلاق تو اب ہم نے سیکھا ہے۔



## جرم و دہشت کی زسری

(27 شعبان 1424ھ بمطابق 24 اکتوبر 2003ء)

سترکی دہائی جہاں المیہ مشرقی پاکستان کا زخم اپنے دامن میں رکھتی ہے وہاں ایک واقعہ ایسا ہے جو بہت دنوں تک انیاریات کی زینت بنا رہا۔ یہ تھا شبنم ڈکیتی کیس۔ چند نوجوان اس زمانے کی اداکارہ کے گھر داخل ہوئے اور ڈکیتی کے علاوہ تمام تر انسانی حدود کو پھلانگ گئے۔ یہ نوجوان نہ تو معاشرے کے ستارے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی کسی دینی مدرسہ یا اردو میڈیم اسکول کے ٹائٹل پر پڑھے ہوئے تھے۔ سب کے سب پنجاب کے اعلیٰ ترین حسب و نسب رکھنے والے اور صاحب ثروت گھرانوں کے فرزند تھے۔ انہوں نے ایسے اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی جنہیں اہل مغرب کے نزدیک تہذیب، اخلاق اور رواداری کی شناخت کہا جاتا ہے۔ اپچی سن کالج ان میں سے اکثر کی مادر علمی رہا تھا جس کے بڑے بڑے دروازوں کے اندر جھانکنے کا شرف بھی تیرہ کروڑ عوام میں سے بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا۔ نوایوں، سرداروں، جاگیرداروں، وڈیروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا ادارہ۔

اس واقعہ کو گزرتے آج کئی سال ہو گئے ہیں لیکن آج ایک عجیب تعلق سے یہ قصہ یاد آ رہا ہے کہ کیونکہ گیارہ ستمبر کے بعد سے پوری دنیا کے اخبارات اور لیڈر دہشت گردی کی زسری کے طور پر اگر کسی ادارے کو پیش کرتے ہیں تو وہ کچے مکانوں، سہولیات سے محروم درسگاہوں اور انتہائی غریب گھرانوں کے بچوں کی تعلیم کے مراکز ہیں جنہیں ہم دینی مدرسہ کہتے ہیں۔ دنیا کے ہر ٹیلی ویژن پر کئی کئی گھنٹے ان مدرسوں کو دہشت گردی کی زسری کے طور پر پیش کیا گیا۔ ڈاکومنٹریاں بنیں، ان کے چہروں، پگڑیوں اور لباس کا مضحکہ اڑایا گیا، ان کی آنکھوں کے کلوز اپ لے کر ان میں بربریت ڈھونڈی گئی۔

میں بھی شاید قائل ہو جاتا اگر مجھے میڈیا کے سحر کا علم نہ ہوتا اور ان کی منافقتوں کا ادراک نہ ہوتا۔ میرے سامنے اس وقت امریکا کے محکمہ اطلاعات کی تازہ ترین کتاب پڑی ہے جس کا نام The Network Of Terrorism ہے۔ اس کے صفحات پر ان عالمی دہشت گردوں کی تفصیل ہے جو سارے کے سارے مسلمان ہیں لیکن کمال کی بات ہے کہ ان میں کوئی بھی کسی ایسے مدرسے کا تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہ یونیورسٹیاں جنہیں رواداری، انسانیت، جنسی آزادی اور کیریئر کا معراج کہا جاتا ہے۔

شیخ اسامہ بن لادن جو ان کی نظر میں دہشت گرد ہے، ہارڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ وہ انیس لوگ جو طیارے اڑا کر ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینا گون پر حملہ آور ہوئے امریکا، لندن اور جرمنی کی ان یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے جہاں داخلہ لینا بھی ایک خواب ہے۔ ڈینیئل پریل کے اغوا کا ملزم شیخ عمر لندن اسکول آف اکنامکس کا پڑھا ہوا ہے، وہ

میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ اسلام عورت کے بارے میں متعصب ہے اور دنیا کا کوئی مذہب یا کوئی معاشرہ عورت کے حق میں اتنا متعصب نہیں جتنا اسلام ہے۔ ہادی برحق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات ماننے رکھتا ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور اس نے ان کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئیں تو قیامت کے دن میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے شہادت کی انگلی کے ساتھ درمیانی انگلی۔“

پھر فرمایا: ”جس کے گھر میں تین بیٹیاں ہوں اس کے حق میں ڈرتے رہو کیونکہ وہ جنت میں میرا سایہ ہوگا۔“

مجھے اپنے ناقص علم کے مطابق قرآن و حدیث میں کوئی ایسا فرمان نہیں مل سکا جو لڑکوں کے پالنے کے اجر میں اس سے بڑھ کر ہو۔

جنت میں جانے کا سب سے آسان راستہ ماں کے قدموں کے نیچے رکھ دیا گیا، یہاں بھی مجھے کسی مرد کے حق میں کوئی ایسی روایت نہ مل سکی جو ماں کی عظمت کے برابر ہو۔

وہ کالی کملی، سرور کائنات کی وہ چادر جس کی تکریم و محبت میں پوری مسلمان قوم دیوانی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر صرف تین عورتوں کی تکریم میں بچھائی تاکہ وہ اس پر بیٹھ سکیں۔ ایک اپنی بیاری بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، دوسری اپنی رضاعی والدہ سیدہ حلیمہ اور تیسری آپ کی رضاعی بہن شیماء۔ مجھے تاریخ میں کوئی مرد ایسا نہیں ملا جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر عزت و تکریم کی ہو۔

قرآن حکیم کی سورہ التکویر کی ابتدائی آیات پیش کروں گا جن میں اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب کا اظہار ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: ”جب آفتاب بے نور ہو جائے گا، جب ستارے ٹوٹ گریں گے، جب پہاڑ ہوا ہو جائیں گے، جب وحشی جانور بھی ایک جگہ جمع ہو جائیں گے، جب دریاؤں کو آگ لگا دی جائے گی۔“

قیامت کی منظر کشی کے بعد اللہ تعالیٰ قتل کی گئی لڑکی سے سوال کرے گا کہ تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا، اللہ اس باپ کی شکل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا بلکہ مقتول لڑکی سے سوال کرے گا۔

عورتوں کو عزت و توقیر احترام اور پروٹوکول دینے والا یہ دین آج پوری دنیا میں مورد الزام ہے۔ جو مذہب عورت کے حق میں متعصب ہے اسے آج عورتوں کے خلاف متعصب سمجھا جاتا ہے۔

حیرت ہے ہمیں طعنہ وہ لوگ دیتے ہیں جن کی مائیں بوزھوں کے اداروں میں تہام توڑ دیتی ہیں جب کہ آج بھی ہماری مائیں اپنے بیٹوں کے کندھوں پر قبرستان پہنچتی ہیں۔ وہاں بیٹیاں اکیلے گھر میں اپنے باپ سے بھی خوف زدہ ہوتی ہیں جب ہمارے ہاں بڑے سے بڑا بے راہ رو بیٹی کے پیدا ہونے کے بعد اپنی زندگی بدل لیتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس آقا کی ملت سے ہوں جو عورت کو مساوی حق نہیں دیتا بلکہ اس کے حق میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ متعصب ہے۔

## لو وہ بھی کہہ رہے ہیں

(11 رمضان 1424ھ بمطابق 07 نومبر 2003ء)

تحریک آزادی نسواں کا کمال یہ ہے کہ ان میں اکثر نے تصور بنالیا ہے کہ دنیا میں عورتوں کی آزادی اور برابری کا حق بیجنگ کانفرنس سے شروع ہوا اور ان کی مظلومیت، مقہوریت اور پست مرتبے کو بہتر بنانے کے لیے 1995ء میں عالمی برادری نے پہلی دفعہ اعلان کیا۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے حقوق کے ترجمان اس اعلان کو کسی بڑے اعلان نبوت سے کم نہیں سمجھتے۔ دکھ کی بات یہ کہ اس ساری تحریک میں جس مذہب کو سب سے زیادہ خواتین کی آزادی کے راستے کی رکاوٹ سمجھا جاتا ہے وہ اسلام ہے اور جس قوم کو عورتوں کے سلسلے میں اُجڑ، گنوار اور ظالم کہا جاتا ہے وہ مسلمان ہیں۔

دنیا بھر میں عورتیں قتل ہوتی ہیں بلکہ مہذب معاشروں میں تو ایسے قاتلوں کی ڈائریکٹری بنائی جاسکتی ہے جہاں جنسی تشدد یا نفسیاتی جنون کی بنیاد پر ایک ایک شخص نے درجنوں عورتوں کا خون کیا، ان کی لاشوں کو مسخ کیا، ڈیپ فریئر میں بند کیا لیکن دنیا کے کسی اخبار، بڑے میگزین یا ٹیلی ویژن نے ان افراد کی وجہ سے پوری قوم کو ظالم قاتل یا عورتوں کا دشمن قرار نہ دیا۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان میں روزانہ کم جہیز لانے کی پاداش میں عورتیں زندہ جلا دی جاتی ہیں لیکن کبھی مغربی میڈیا پر ہندو معاشرے کو خواتین کا دشمن قرار نہیں دیا گیا۔ امریکا میں ہر دو منٹ بعد ایک عورت جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہے لیکن کوئی شخص امریکا کو بحیثیت قوم درندہ کہنے پر تیار نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوتا ہے جب مغرب جیسی قوم مسلمان معاشرے میں عورتوں کو غیر محفوظ قرار دیتی ہے جہاں دفاتروں میں خواتین کے ہاتھ روم پر نمبروں والے تالے لگا دیئے گئے ہیں اور ان کے نمبر صرف خواتین کو معلوم ہوتے ہیں تاکہ کوئی مرد ان ہاتھ روموں میں گھس کر زیادتی نہ کرے۔ جہاں پر ایسے دفاتر ہوں جہاں عورتیں کام کرتی ہیں ان میں موٹے موٹے لفظوں میں کمروں کے دروازوں پر لکھا ہے کہ شام چھ بجے کے بعد اپنے دروازے بند کر دیں اور بغیر پوچھے دروازہ نہ کھولیں۔

ظلم کی بات یہ ہے کہ عورتوں کو خاوند کی میت کے زندہ جلانے کی رسم حتیٰ کو مذہبی تقدس کا درجہ دینے والے عورت کو برائی کا سرچشمہ کہنے والے اور جون آف آرک کو زندہ جلانے والے اسلام اور مسلمانوں کو عورت کے حوالے سے متعصب قرار دیتے ہیں۔ پردے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور مسلمان ملکوں سے جانے والوں سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تمہاری چار بیویاں ہیں؟ کیا تم اپنے ملک میں چہرہ ڈھانپتی ہو؟ دنیا میں کتنے کارٹون اخباروں کی زینت بنے جو حجاب سے متعلق تھے۔ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ مسلمان عورت کے بارے میں کتنے متعصب ہیں۔



قیمت 30 ہزار روپے ہے لیکن پھر بھی زندہ رہنے کی امید صرف تین فیصد ہے۔ دوسرا ہے Bone Marrow کو تبدیل کرنا ہے جس پر 11 لاکھ روپے لاگت آئے گی۔ غریب سپروائزر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اپنی لٹی ہوئی قسمت اور بچے کے کمزور وجود کو لے کر وہ واپس کوئٹہ آ گیا اور پھر مایوس نظروں سے اس قوم کی طرف دیکھنے لگا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

ابھی کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں باقی ہیں

اور ایک دن اسے کہا گیا۔ سامان باندھو، کراچی جانا ہے۔ اس نے کہا کیوں.....؟ کہا گیا ایک شخص نے تمہارے بیٹے کے لیے 11 لاکھ روپے دیئے ہیں۔ سچ بتاؤں تو یہ فقرہ لکھتے ہوئے بھی میز کی آنکھ میں خوشی کے آنسو ہیں اور جب صرف چند دن پہلے مجھے یہ خبر ملی تھی تو میری کیا حالت ہوگی اور اس باپ کی کیفیت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میرے درخواست ہے کہ ایک لمحے کے لیے یہاں رک جائیں اور اس شخص کے لیے رحمت خداوندی سے دعا کی بھیک مانگیں کہ اس نے پورا اہتمام کیا کہ کوئی اس کا نام تک نہ جان سکے۔ مجھے بتا دیتا تو شاید میں کالم کا آغاز ہی اس سے کرتا۔ لیکن یہ بچہ اس انجام تک کیسے پہنچا اور اس درد دل رکھنے والے شخص کے 11 لاکھ روپے جو کتنے گھروں کو سکون دے سکتے تھے کس ظالم کی وجہ سے اس بچے پر خرچ ہوئے۔ آپ کبھی ادویہ کے کاروبار میں اربوں ڈالر منافع کماتی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ہوس زر اور انسانی بے حسی کو سامنے رکھیں تو آپ کو ظالم کا چہرہ خود نظر آ جائیگا۔ نئی دوائیٹ کرنے کے لیے ایک Helsenkideclaration ہے جس کی پابندی صرف اور صرف ترقی یافتہ ممالک میں یہ کمپنیاں کرتی ہیں لیکن غریب اور پس ماندہ ممالک کو خرگوش، چوہ اور بندر کی طرح لیبارٹری کا جانور بنا دیا جاتا ہے۔ 1953ء میں جب مانع حمل گولیاں ابتدائی طور پر ایجاد ہوئیں تو پورٹرائیکوں کی ایک کمپنی کو پٹنا گیا جس نے اسے اس ملک کی غریب عورتوں پر ٹیسٹ کیا جنہیں اس کا علم ہی نہیں تھا۔ اسی سال Steriod ایجاد ہوئے تو ایک اور ملٹی نیشنل کمپنی کے کرہیہ صفت لوگوں نے جنوبی امریکا کے ممالک کو چنا جن میں ہیٹی اور میکسیکو جیسے غریب ممالک شامل تھے۔ 1960ء کی دہائی میں ایک دوا ایجاد ہوئی جو عورت کی زچگی سے متعلق تھی اسے برازیل، تھائی لینڈ، چلی، فلپائن، سری لنکا اور پاکستان جیسے غریب ممالک پر ٹیسٹ کیا گیا جب کہ امریکا اور برطانیہ میں اس پر قانوناً پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ٹیسٹ اور تجربے کے نام پر غلط دوا تو ایک طرف ہے لیکن زائد المعیاد ادویہ بھی نئی پیکنگ دے کر غریب ممالک کو بھیجی جاتی ہیں۔

صرف ادویہ کی کمپنی میں ایک قسم کے کپسول جنوبی ویتنامیوں کے ہاتھ 10 ملین کی تعداد میں فروخت کیے جو زائد المعیاد تھے۔ کینیا کے دو اہلکاروں کو صرف اس لیے 1970ء کی دہائی میں سزا ہوئی کہ وہ ایک کمپنی سے ادویہ کا کاروبار کرتے تھے اور پھر یہ ناقص دوا مفت یا سستی نہیں بلکہ انتہائی مہنگی فروخت کی جاتی ہے۔ 1990ء میں ساری ادویہ ساز کمپنیاں مل کر پاکستان میں 11 ارب روپے کی ادویہ فروخت کرتی تھیں لیکن صرف پانچ سال بعد یہ سیل 28 ارب روپے ہو گئی یعنی 151 فیصد..... لیکن تعداد نہیں بڑھی قیمت بڑھی۔ تعداد میں اضافہ صرف تین فیصد تھا۔

لیکن میرا سوال اس وقت نہ ایسی ملٹی نیشنل کمپنیوں سے ہے اور نہ ہی اس معصوم، مفلوک الحال بچے کے خاندان سے جو یہ جانتا ہی نہیں کہ دوا میں کیا ہے؟ لیکن کیا وہ ڈاکٹر جس کی تعلیم پر اس قوم نے اپنے خون پسینے کی کمائی صرف کی، ٹیکسوں سے میڈیکل کالج بنوائے، اسے زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ کیا اسے بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ جس کمپنی کی دوا کھا رہا ہے یا جو دوا تجربہ کر رہا ہے اس میں کیا زہر پوشیدہ ہے؟ اگر مجھے اخبار پر ان کمپنیوں کے ٹوٹ پڑنے کا خوف نہ

## قصاب مسیحا

(10 شوال 1424ھ بمطابق 5 دسمبر 2003ء)

کسی بھی مزاحیہ یا سنجیدہ فلم میں اگر آپ نے سائنس داں کا کردار دیکھا ہو تو اس کے ساتھ آپ کو ایک بہت بڑی لیبارٹری نظر آئے گی جس میں انواع و اقسام کے رنگ برنگی ششے کی بوتلوں میں محلول ہوں گے۔ ایک اسپرٹ لیپ کی آگ پر کوئی چیز پک رہی ہوتی ہے لیکن ان سب کے ساتھ پنجرہ میں بند خرگوش، چوہے اور بندر بھی نظر آئیں گے اور ایک بکھرے بالوں اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی والا سائنسدان کبھی ان معصوم جانوروں کو ٹیکے لگا رہا ہوتا ہے یا دوا پلا رہا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی چوہا یا خرگوش مرجاتا ہے تو اس کے بارے میں تمام معلومات نوٹ کرتا ہے اور پھر اسے کسی آلے سے پکڑ کر ایک بہت بڑے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا ہے جہاں سے یہ سربمہر ڈسٹ بن شہر سے میلوں دور کسی بڑے سے کوڑے کے ڈھیر پر الٹ دیا جاتا ہے۔ سائنسدان کی تحقیق میں شہادت پانے والے معصوم جانور کو ضرورت ختم ہونے کے بعد اس کی عزت اور حیثیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔

یہ سب فلمی دنیا یا سلور سکرین پر ہی نہیں ہماری روزمرہ کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اگر گزشتہ چند دنوں سے یہ منظر بار بار میری آنکھوں میں لہرا رہے ہیں۔ اذیت، کرب اور دکھ کا باعث بن رہے ہیں اس لیے کہ گزشتہ چند ماہ سے کوئٹہ شہر کا ایک غریب اور سفید پوش خاندان اسی عذاب سے گزر رہا ہے۔ ایک دس سال کی عمر کا بچہ جس کا والد ٹیلی فون کے محکمہ میں لائن مین کی حیثیت سے کام کرتا ہوا سپروائزر کی پوسٹ تک پہنچ چکا تھا اور اپنے خاندان کی باعزت طریقے سے پرورش اور دیکھ بھال میں مصروف تھا کہ اچانک یہ بچہ بیمار ہو گیا اور باپ اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ دوا ملی اور بچے کو چند دن بعد صحت یاب ہو گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ بچہ کمزوری اور فقاہت کی شکایت کرنے لگا۔ والدین نے کوئی توجہ نہیں دی، پھر ایک دن بچہ اسکول سے گھر لوٹا تو اس کے گال پر کسی زوردار تھپڑ کے نشان تھے۔ ماں باپ پریشان ہوئے۔ نشان اتنے گہرے تھے کہ صاف ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ بچے نے بتایا کہ اسے اسکول میں نمچر نے تھپڑ مارا تھا۔ باپ اسکول گیا لیکن پتہ چلا کہ تھپڑ تو ہلکا سا تھا لیکن نشان صاف کیوں نہ ہوا؟ باپ خاموش ہو کر گھر آ گیا لیکن اس دن سے بیٹا بیمار سا رہنے لگا۔ کوئٹہ کے سب بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن مرض سمجھ میں نہیں آیا۔ پریشان حال والد بچے کو کراچی کے ایک بہت بڑے اسپتال لے گیا۔

ٹیسٹ ہوئے اور ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ تو ایک بہت ہی خطرناک مرض EPLASTIC ANEMIA ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ڈاکٹر نے اسے کوئی ایسی دوا لکھ دی ہے جو یا تو تجرباتی طور پر چلائی جا رہی تھی یا پھر جان بوجھ کر خراب بنائی گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے علاج کی دو صورتیں بتائیں۔ ایک تو 10 انجکشن لگیں گے اور ایک انجکشن کی

## جرڑواں دہشت گرد

(24 شوال 1424ھ بمطابق 19 دسمبر 2003ء)

ٹھیک 19 سال بعد 3 دسمبر کو غریب افلاس اپنے چہرے پر سجائے، آنکھوں میں مایوسی اور ناامیدی کے آنسو لیے، اپنے کمزور اور کانپتے ہاتھوں میں خواتین ایک احتجاجی پوسٹر لیے بازاروں میں نکل آئیں۔ بوڑھے مدوق چہرے، بکھرے بال اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لیے ہوئے ایک خاتون نے، ہاتھ میں ایک پوسٹر تھا جس پر ”جرڑواں دہشت گرد“ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور نیچے دو افراد کی تصویریں تھیں، ایک وہ جسے اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ اور خوفزدہ ملک سب سے بڑا دہشت قرار دے رہے ہیں یعنی ”اسامہ بن لادن“، لیکن دوسری تصویر کو شاید وہ لوگ بھی نہیں پہچانتے ہیں جن کے پیاروں نے اس کے ہاتھوں سسک سسک کر اور تکلیف دہ حالت میں جان دی تھی۔

یہ تصویر ”وارن اینڈ رن“ کی ہے جو امریکا کی مشہور ملٹی نیشنل کمپنی یونین کاربائیڈ کا سابق سربراہ ہے۔ اس پوسٹر میں دونوں تصویروں کے نیچے دونوں کے جرائم کی تفصیل تھی۔ ”اسامہ بن لادن“ کے جرم میں صرف ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے واقعہ میں ہلاک ہونے والے 2823 افراد درج ہیں جب کہ معذور، بیمار اور سسک سسک کر مرنے والے اور موت کا انتظار کرنے والے کسی شخص کا ذکر نہیں۔

اب ذرا ”وارن اینڈ رن“ کے جرائم کی تفصیل دیکھیے اور حیرت میں گم ہو جائیے۔ ”3 دسمبر 1984ء وہ قیامت خیز دن تھا جب بھوپال کے شہر میں کھیتوں میں جرائم کش ادویہ بنانے والے ایک کارخانے سے زہریلی گیس خارج ہونا شروع ہوئی۔ وندیا کے پہاڑی سلسلے اور دریائے کاویری کے نزدیک یہ سرسبز و شاداب شہر اس زہریلی گیس کے دھوئیں کی لپیٹ میں آ گیا۔ فیکٹری میں کام کرتے مزدوروں، گلیوں میں ہنستے کھیلتے بچوں، ماؤں کی گودوں میں کلکاریاں لیتے نونہالوں، بوڑھے اور جوان سب کے سب ایک تکلیف دہ اور اذیت ناک موت کی طرف بڑھنے لگے۔ ایسی موت جس میں آہستہ آہستہ دم گھٹتا ہے، سانس اکھڑتا ہے، آدمی درد کی شدت سے تڑپتا ہے اور پھر بالآخر ایک اذیت ناک موت مر جاتا ہے۔ صرف چند گھنٹوں کے اندر 3 ہزار لوگ لقمہ اجل بن گئے اور جن کی نعشوں کو ان کے پیارے دور سے دیکھتے رہے کہ پورے علاقے میں اس زہریلی گیس کا دھواں پھیلا ہوا تھا جس نے محبت کی شدت میں پاس جانے کی کوشش کی وہ بھی اسی اذیت ناک موت کے راستے پر چل نکلا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت تو دھڑام سے گر گئی اور اپنے ساتھ 2823 افراد کی جانیں لے گئی، لیکن آج 19 سال گزرنے کے باوجود بھی روز کوئی نہ کوئی جنازہ ان لوگوں میں سے کسی کا اٹھتا ہے جو اس زہریلی گیس سے متاثر ہوئے تھے۔ تقریباً تین لاکھ افراد ایسے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس گیس کے حملے سے کسی نہ کسی بیماری یا معذوری کا شکار ہو

ہو تو شاید میں ایک طویل سلسلہ دے دوں جنہیں دنیا جانتی ہے کہ یہ زہر بچ رہے ہیں لیکن اس قوم کی کمائی پر چلنے والے مریضوں سے مسیحا کا لقب حاصل کرنے والے ڈاکٹروں کو بھی علم نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے..... لیکن کیا کیا جائے؟ میرے شہر کی طرح ہر شہر کے بازاروں میں ڈاکٹروں کی دکانوں پر گھومتے آپ کو ان کمپنیوں کے ایجنٹ نظر آئیں گے جو ڈاکٹروں کی آنکھوں کے سامنے نت نئے ماڈلز کی کاروں کی چابیاں لہرا رہے ہوتے ہیں۔ افطار کی دعوتیں کر رہے ہوتے ہیں، کانفرنسز پر ہوائی ٹکٹ اور گھر والوں کے لیے سیر و تفریح کے پیسے بجز دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسا صرف ایک قلم کی جنبش سے حاصل ہو سکتا ہو تو بڑے بڑوں کے پاؤں کانپ جاتے ہیں لیکن شاید صرف ایک چھوٹی سی قلم کی جنبش کی قیمت کسی صاحب دل کو گیارہ لاکھ روپے دے کر چکانا پڑتی ہے.....

لیکن میرا فسوس یہ کہ قلم کی جنبش سے موت لکھنے والے ہزاروں ہیں اور گیارہ لاکھ دینے والا کوئی کوئی.....! ایسے میں حرص و ہوس اور خواہشات کی سولی پر انسان کی لاش جھولتی ہے تو اسے لیبارٹری کا بندر، خرگوش یا چوہا سمجھتے ہیں انسان نہیں.....!

جہاں تو جس زندہ ہوں وہاں انسان ایسے نہیں مرا کرتے۔



چکے ہیں۔ گرین پیس تنظیم نے آج تک مرنے والوں کی تعداد 8 ہزار سے زائد بتائی ہے اور یہ سب لوگ مدتوں اسپتالوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔ دکھ اور تکلیف کی بات یہ تھی کہ ان میں اکثریت ان خاندانوں کی تھی جو جھوپڑیوں، کچے مکانوں اور کھولیوں میں رہنے والے تھے۔ جن کے اہل خانہ ان کو ترپتے تو دیکھ سکتے تھے لیکن ان کے علاج کے لیے دوا مہیا نہیں کر سکتے تھے۔

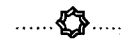
امریکا کے کسی خوبصورت علاقے کے وسیع و عریض محل نما مکان میں رہائش پذیر ”وارن اینڈرسن“ ان سب اذیتوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کی ماری مخلوق سے بے نیاز اپنی کاروباری مصروفیات میں مگن ہوگا۔ اس کے کاروبار کی سلطنت وسیع تر ہو رہی ہوگی اور عالمی ضمیر جس کی کوکھ میں ایسے کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک پروان چڑھ رہے ہیں، مزے کی نیند سو رہا ہے۔

ہم کس بے حس دنیا میں زندہ ہیں؟ اور کس انسانی جذبوں سے عاری کائنات میں سانس لے رہیں جہاں 2823 امریکی مرے ہیں اور پوری دنیا میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ایک شخص کی تلاش میں افغانستان جیسے غریب، پسماندہ اور مفلوک الحال ملک پر میزائل برسائے جاتے ہیں۔ ہم ان کے جسموں کے پرچے اڑاتے ہیں، ہزاروں قید ہوتے ہیں، کبھی بارات پر حملہ ہوتا ہے اور شادی کا گھر غم کدہ بن جاتا ہے اور کبھی بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کے سروں کی فصل کاٹ دی جاتی ہے۔ 1500 سے زیادہ افراد کو کنٹینرز میں بند کر کے دھوپ میں صحرا کا سفر کروایا جاتا ہے اور وہ لوگ پانی پانی چیختے پیاس کی شدت میں دم توڑ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ حال ان 9 معصوم بچوں کی ہلاکت تک آ پہنچتا ہے جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں جو روکھی سوکھی کھاتی ہے لیکن غیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی ہے۔

دوسری جانب آج بھی معصوم بچے ”وارن اینڈرسن“ کی کمپنی سے خارج ہونے والی زہریلی گیس سے مر رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے بھوپال کے تازہ شکار ہونے والے لوگوں کی تصویروں کی نمائش جو ہانس برگ میں ہوئی جس میں ایک ایسے معصوم بچے کی بھی تصویر تھی جس کے والدین غربت کی وجہ سے اسے ریت میں دفن کر گئے تھے اور اس کا آدھا جسم ریت سے باہر تھا کہ ہوا چلی اور ریت اڑا کر اس کی مظلومیت کو اس بے رحم دنیا کے سامنے آشکار کر گئی۔

کیسے لوگ ہیں ہم؟ اور کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آج آپ کو ”اسامہ بن لادن“ کے خلاف ہزاروں زبانیں بولتی مل جائیں گی، مغرب میں بھی اور مشرق میں بھی..... لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان 19 سال میں کسی اخبار، کسی ٹیلی ویژن، کسی ریڈیو، عوام کی کسی محفل یا کسی پوسٹر پر ”وارن اینڈرسن“ کا نام یا اس کی تصویر نظر آئی ہو۔ اسے نفرت اور حقارت سے دیکھا گیا ہو حالانکہ یہ وہ دہشت گرد ہے جس کی دہشت گردی کے شکار لوگ آج بھی موت کی آغوش میں جا رہے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہی موت کی آغوش میں جاتے رہیں گے اس لیے کہ ان کو مظلوم کہنے سے کسی کی غیر ملکی امداد میں اضافہ نہیں ہوگا۔ کسی کی حکومت کو مزید استحکام کی ضمانت نہیں ملے گی۔ کسی کے بیٹوں، بھائیوں اور دوستوں کو یونیورسٹیوں میں داخلے، نوکریاں اور غیر ملکی ڈونرز اور این جی اوز کی سرپرستی حاصل نہیں ہوگی۔

ان کے لیے کوئی احتجاج نہیں کر سکتا، کوئی ”وارن اینڈرسن“ گرفتاری کے لیے انعام مقرر نہیں کر سکتا۔ انہیں تو مرنے اور مرتے رہنا ہے۔ کیا ہوا آج زہریلی گیس سے مرے ہیں کل بھوک سے مرجائیں گے.....!



## صرف ایک گولی

(یکم ذیقعدہ 1424ھ بمطابق 26 دسمبر 2004ء)

بیسویں صدی کی کوئی ایجاد ایسی نہیں جس کا سہرا، بنیاد یا حرف آغاز گزشتہ صدیوں میں نہ ملتا ہو۔ پہیہ اور سواری کی ایجاد نے انسان کو بھاپ کے انجن کا راستہ دکھایا اور تیز رفتار ریل گاڑی وجود میں آ گئی یا پھر بجلی بنانے کا جزیئر جو بہت پہلے بن گیا تھا۔ انسان نے اس کا اصول الٹ دیا۔ جزیئر میں پاور استعمال ہوتی اور کرنٹ پیدا ہوتا لیکن انسان نے کرنٹ استعمال کیا تو پاور پیدا ہو گئی تو عالیشان موٹر گاڑیاں سڑکوں پر دوڑنے لگیں۔

کمپیوٹر کی تاریخ اور اس کا مخد تلاش کریں تو ہورل ریت اور اس کے سینسر (Census) کارڈ تک جا پہنچتا ہے۔ ٹیلی ویژن بھی ایک ارتقا ہے، فوٹو گرافی سے چلتی ہوئی تصویروں تک۔ رائٹ برادران نے جہاز تو 1905ء میں ایجاد کیا لیکن ایسا ہی ایک ماڈل موقوفول فائر برادران نے 120 سال پہلے بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ ایٹم بم کی خواہش کی بنیاد بھی اس دن رکھ دی گئی تھی جس دن گن پاؤڈر ایجاد ہوا تھا۔ ان تمام ایجادات کا حرف آغاز کئی صدیوں پر محیط ہے۔

لیکن آج سے ایک ہزار سال بعد اگر کوئی مورخ ڈھونڈنے نکلے (اور اگر وہ مورخ خاتون ہو) کہ وہ کون سی ایجاد تھی جس نے صرف اور صرف بیسویں صدی میں جنم لیا اور اس نے اس صدی کے اخلاق، معاشرت، اصول خاندان اور تہذیب کو یکسر بدل کر رکھ دیا وہ 1956ء میں ایجاد ہونے والی ایک چھوٹی سی گولی ہے جسے مانع حمل گولی کہا جاتا ہے جس کا گزشتہ تاریخ میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سے پہلے تک بچوں کی پیدائش پر کنٹرول کا اختیار بھی مردوں کے ہاتھ میں تھا لیکن اس ایجاد نے اس معاملے میں عورتوں کو خود مختار، آزاد اور مردوں کے برابر اکھڑا کیا۔

مورخین تحریک آزادی نسواں کا آغاز چاہے فرانس کی متمول اور آزاد خیال عورتوں کی انجمن کو قرار دیں یا پھر برطانیہ اور امریکا کے ان قوانین کو جن میں عورتوں کو برابری کے حقوق دیئے گئے لیکن سب باتیں کاغذ اور قلم یا پھر نعرے کی حد تک تھیں لیکن عورتوں کی آزادی کا اصل آغاز اس مانع حمل گولی سے ہوا جس نے عورتوں کے ہاتھ میں وہ ہتھیار دے دیا جس سے وہ رازداری سے مرد کا مقابلہ کر کے اس کے برابر آ کر کھڑی ہو جائے۔

تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کے ہر ادارے، فوج، سرکاری نوکری سب میں عورتوں کی بھرتی کا قانون پہلے سے موجود تھا اور ان کو پورا حق بھی حاصل تھا لیکن حق اور اس کے اطلاق میں بڑا فرق تھا۔ پہلے بچوں کی اچانک آمد اس کے کیریئر اور نوکری کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی کیونکہ اس کا سراسر اختیار مرد کے پاس تھا لیکن وہ بلا شرکت غیرے اس اختیار کا استعمال کر سکتی تھی۔ یوں عورت اور مرد کے درمیان تفریق جسے یورپ ایک بیماری سمجھتا تھا اس کا علاج ہو گیا۔

## کواچلا ہنس کی چال

(29 ذیقعدہ 1424ھ بمطابق 23 جنوری 2004ء)

پورا قبیلہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا، چشتی خاندان کے ایک فرد نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات پڑھ کر سنائے جس میں معاف کرنے اور بخشنے کو اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ خود اللہ کی سنت ہے۔ پھر قبیلے نے قاتل کو سامنے کیا، سربراہ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں رومال میں لپی خون بہا کی رقم لے کر آگے بڑھا۔ مقتول کے قبیلے کے افراد بیٹھے ہوئے تھے، قاتل کا قبیلہ نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ کھڑا معافی مانگ رہا تھا۔ بندوق اور رقم سامنے رکھ دی گئی اور قبیلہ انتظار میں کھڑا ہو گیا اور ساتھ میں پشتو میں وہ الفاظ دہرانے لگا جس میں معافی اور بخشش مانگی جاتی ہے۔ مقتول کا والد اٹھا، اس نے رقم والے رومال سے کچھ روپے اٹھائے اور باقی پیسے رومال میں رکھ کر واپس کر دیئے۔ مبارک سلامت کا شورا اٹھا۔ قاتل قبیلہ کے لوگوں کو بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ چشتی خاندان کے بزرگ نے دعا کی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دسترخوان پر اکٹھے تھے۔

میں عالم حیرت میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، یہ کوئی ہزاروں سال پہلے کی بات نہیں صرف 15 سال پہلے پشین سے چند میل دور ملکپار گاؤں کا قصہ ہے۔ اس قتل کا مقدمہ میری عدالت میں ایک سال سے چل رہا تھا، بندوق سے مسلح افراد کا لے کوٹوں میں ملبوس وکیل عدالت کے احاطے میں جمع ہوتے اور امن و امان نافذ کرنے والوں کی جان پر بنی ہوتی۔ جرگہ بیٹھا تو پھر نہ قانون شہادت کی کتابیں کھلیں اور نہ PLD کے صفحات اُلٹے گئے، نہ جھوٹے گواہ تیار ہوئے اور نہ دوسرے فریق کو عدالت کے احاطے میں قتل کرنے کی کوشش ہوئی۔ قاتل اپنے قبیلے کے ساتھ پشین حاضر تھا اور معاف کرنے والے اپنے اللہ کے حضور مقبولیت کے نشے میں سرشار۔

ٹھیک 10 سال بعد جب میں نے امریکا کی ریاست ٹیکساس کے شہر آسٹن کی سٹی کونسل کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو وہاں پر موجود کونسلروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک خاتون نے کھڑے ہو کر پوچھا:

(Where is that heaven) ”یہ جنت کہاں ہے؟“

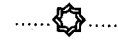
اس زمانے میں ٹیکساس میں پھانسی کی سزا کے خلاف تحریک چل رہی تھی اور چونکہ وہاں جج الیکشن لڑ کر آتے ہیں اس لیے جج ہر الیکشن کی موقع پر پوسٹر شائع کرواتے ہیں کہ میں نے اتنے لوگوں کو پھانسی دی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ جرگہ کے قانون میں پھانسی نہیں ہوتی تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ دم بخود رہ گئے۔

ایک تو پاکستان جیسا پس ماندہ ملک اور پھر بلوچستان۔ ان کو مشکل سے یقین آ رہا تھا لیکن سب سے زیادہ حیران کن بات ان کو یہ لگی کہ ہم صدیوں پرانے اس نظام کو بدل رہے ہیں کہ اس میں دیگر مہذب ملکوں کی طرح وکیل،

سائنس دان کہتے ہیں کہ اس گولی کی ایجاد اس بنیاد پر ہے کہ عورت کے اندر موجود پیدائش کے نظام کو کیسے بڑھایا جاسکتا ہے ایک ایسے ENZYME کی نقل تیار کی گئی جو عورت کے اندر موجود تخلیقی نظام کو بالکل اصل لگے، وہ بھی سمجھ کہ وہ تخلیقی مرحلے میں داخل ہو گئی ہے لیکن یہ فراڈ، یہ اداکار اور یہ نقل اسے تخلیق کی نعمت سے محروم رکھے۔

عورت نے اس تخلیق نظام کو تو بے وقوف بنالیا اور سائنس نے بھی اپنے سینے پر کامیابی کا سہرا اور تمنغہ سجالیا لیکن پھر کائنات کے مالک نے عزت و توقیر اور محبتوں کے دروازے بند کر دیئے جو عورت کو اس تخلیقی عمل کے احترام سے حاصل ہوتے تھے۔ ایسے گھرانے وجود میں آنے لگے جو سالوں بغیر شادی کے اکٹھے رہتے اور اگر شادی کا ارادہ کر لیتے تو چند ماہ بعد طلاق ہو جاتی اور آج دنیا میں ایسے گھر کثرت سے موجود ہیں۔ شک کا ایسا بیج بویا گیا کہ شرح طلاق آسمان کو چھونے لگی۔ کوئی کہانی، ناول، ہالی ووڈ کی فلم یا ڈرامے ایسے نہ رہے جن میں شادی شدہ عورتوں کی بے وفائی کی داستان موجود نہ ہو۔ دن بھر کی تھکی ہاری، دفتر میں مرد باس کی بھوکی نظروں کا سامنا کرتی عورت گھر واپس آئی تو گھر کی ذمہ داری سے لے کر بچوں کی دیکھ بھال تک کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا، ادھیڑ عمر ہوئی تو خاندان چھوڑ گیا۔ بوڑھی ہوئی تو بچے چھوڑ گئے۔ ایک فتح کا نشہ کہ وہ مرد کے برابر آگئی ہے اس نے اسے احترام کے اس اعلیٰ مقام سے کتنا گرا دیا جہاں روس کا میکسم گورکی ”ماں“ لکھتا ہے تو پاکستان کا قدرت اللہ شہاب بھی۔

یاد کیجیے! کیا 1956ء کے بعد اس کردار پر کوئی اتنا بڑا ناول لکھا گیا؟ اس وقت مغرب میں سب سے زیادہ عورتیں اپنے سابقہ خاوندوں یا بوائے فرینڈز کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔ بے وفائی کے سفر کا آغاز بھی ایک گولی سے ہوتا ہے اور انجام بھی ایک گولی سے۔





## یہ کیسے لوگ تھے؟

(21 ذی الحجہ 1424ھ بمطابق 14 فروری 2004ء)

آپ دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں چلے جائیں جہاں چاروں طرف ترقی اور آسائش کی ریل پیل ہو، جہاں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں سے لے کر ملک کے بڑے بڑے شہر تک سہولت میں، آسائش زندگی میں، سڑکوں کے جال میں، بڑی بڑی دکانوں اور آرام دہ ہوٹلوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لوگوں کو نہ دو وقت ردی کی فکر ہوتی ہے اور نہ روزگاری، نہ گھروں میں بجلی بند ہوتی ہے اور نہ ٹیلی فون منقطع۔ یوں لگتا ہے سب کچھ آرام سے چل رہا ہے، زندگی حسین ہے، قابل دید ہے اور ہر جانے والا اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے..... لیکن ان تمام ملکوں میں ایک انڈر ورلڈ (Under World) ہے، خوفناک چہرے اور بدترین اعمال سے مزین، ان ملکوں کا ہر شہری اس سے خوفزدہ اور ہر شریف آدمی اس سے ہراساں ہے۔ ان کی اپنی ایک سلطنت ہے جو کسی بارڈر یا کسی حدود و قیود کی محتاج نہیں۔ ان کے ذاتی گارڈ اور ملکوں کی پھیلی ذاتی سپاہ ہے۔ یہ لوگ شراب خانوں سے لے کر جو خانوں اور ڈانس گھروں تک کا ہر مکروہ دھندہ کرتے ہیں لیکن ان سب دھندوں کے پیچھے سب سے بڑا کاروبار منشیات اور ہیروئن کا ہے۔

تھائی لینڈ کے جنگلات سے، افغانستان کے پہاڑی سلسلوں سے، برما کی سطح مرتفع سے اور جنوبی امریکا کے ممالک کے قافلے لاکھوں من منشیات لے کر چلتے ہیں، تیز رفتار گاڑیوں پر مسلح لوگ میزائلوں، کلاشنکوفوں اور اینٹی ایئر کرافٹ گنوں سے مسلح ان کا پہرہ دیتے ہوئے ان کی حفاظت کرتے ہوئے ہر کاب ہوتے ہیں اور پھر یہ لاکھوں من منشیات کبھی نیویارک کے بازاروں میں، کبھی لندن کے سوہو میں، کبھی جرمنی کے ہائیڈل برگ میں اور کبھی ناروے کے اوسلو میں بکتی نظر آتی ہے۔ لاکھوں لوگ ہر ملک میں اس کا شکار ہوتے ہیں اور فٹ پاتھوں، شراب خانوں، تھڑوں اور کوڑے دانوں کے قریب گندگی بکلت اور رسوائی کی زندگی گزارتے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

امریکا سے لے کر جرمنی تک اور لندن سے لے کر برازیل تک ہر ملک کروڑوں ڈالر اس منشیات کی اسمگلنگ کو کنٹرول کرنے پر خرچ کرتا ہے۔ امریکا میں یہ ذمہ داری اس کی فوج کو دی گئی ہے اور اسی فیشن کو اپناتے ہوئے پاکستان میں بھی فوج ہی کو یہ ذمہ دار سونپی گئی۔ تیز رفتار گاڑیوں، وائریس سیٹوں، اعلیٰ قسم کے اسلحے اور بہترین تنخواہوں پر کام کرنے والے افسران یہ سب کام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ دنیا کا ہر ملک لاکھوں ڈالر اس وبا کو ختم کرنے میں صرف کرتا ہے، اس وبا کی ایک صورت حال دیکھیں۔

1990ء میں صرف ہیروئن کی اسمگلنگ تقریباً 4 ہزار میٹرک ٹن تھی جو 1991ء میں ساڑھے چار ہزار، 1995ء میں ساڑھے پانچ ہزار اور 2000ء 6 ہزار میٹرک ٹن تک جا پہنچی۔ نہ اعلیٰ اسلحہ کام آیا اور نہ ہی بہترین فوجی

عدالتیں اور کتاہیں نہیں ہیں۔ اسی کونسل کی ایک رکن میری اس اطلاع پر تقریباً چیخ اٹھی۔ مجھے کہنے لگی: ”مہذب دنیا کے قوانین تو نفرتیں پیدا کرتے ہیں، ہم سے تو وہ ریڈ انڈین اچھے ہیں جو قتل کے فیصلے 4 لوگوں کو بٹھا کر کر لیتے ہیں اور پھانسی دے کر نسل در نسل دشمنی نہیں چلاتے۔ تم پاکستان والوں کو ہمارا چہرہ دکھاؤ، دکھ بتاؤ کہ یہاں پیچیدہ قوانین انسانوں کی نہیں صرف (Attorney) وکیل کی جیب کی مدد کرتے ہیں۔“

میں خاموش ہو گیا کیونکہ میرے ہاں تو ہر بڑا چھوٹا، مفکر، مدبر اور قانون دان اس خوبصورت روایت کو ذبح کرنے پر ٹٹلا ہوا تھا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ پورے ملک میں ضابطہ فوجداری نافذ ہے تو بلوچستان میں کیوں نہیں؟ ہم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں حالانکہ ان لوگوں نے باقی صوبوں میں ضابطہ فوجداری کے دکھ دیکھے تھے۔ جہاں آوارہ گردی میں چالان ہو جائے تو سالوں غریب آدمی کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں آتا، جہاں سائیکل کی بتی نہ ہو اور پولیس مقدمہ بنادے تو عدالت کی پیشیاں بھگتتے بھگتتے مزدور اپنی نوکری سے چلا جاتا ہے، جہاں تھانیدار صاحب بہادر کے اختیارات اتنے لامحدود ہیں کہ کسی شریف آدمی کی عزت اس کے ہاتھ میں چند سیکنڈ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

صدیوں پشتون اور بلوچ قبائل ان اصولوں پر گامزن رہے اور انصاف لوگوں کے دروازے سے دور نہ ہوا۔ انتقام کی آگ پر قبائل کے بزرگ محبتوں کا پانی چھڑکتے رہے۔ دنیا کا کوئی عدالتی نظام یہ نظیر پیش نہیں کرتا کہ Talk of Court of town ہوتی ہے۔ جھوٹے گواہ پیش نہیں ہوتے، قاتلوں کی لمبی فہرست نہیں بنائی جاتی، جرگہ کے بزرگ اس بات پر بحث نہیں کرتے کہ قتل کب؟ کیسے؟ اور کس طرح ہوا؟ انہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ پورا قبیلہ جانتا ہے کہ قاتل کون ہے؟ بس فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اس بدلے کی آگ کو آگے بڑھنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟

یہ ساری باتیں امریکا کے شہریوں کو کہانیاں لگیں۔ ان کے لیے ناقابل یقین تھا کہ ایسی بستیاں بھی ہوتی ہیں لیکن آج یہ حقیقتیں ہمارے ہاں بھی خواب ہو گئی ہیں۔ اس لیے ہم نے صدیوں پرانے نظام کو چھوڑ کر انگریز کا بنایا ہوا ضابطہ فوجداری اپنا لیا ہے، ہم نے نوات اور میٹرک کی جگہ وکیلوں کی جرح کے سامنے گواہوں اور PLD کی کتابوں کو ترجیح دی۔ ہمارا انصاف پوسٹ مارٹم رپورٹوں، پولیس کی ضمنیوں، فرد مقبوضگیوں، جھوٹے گواہوں اور وکیلوں کی دلیلوں کا محتاج ہو گیا۔ ہم عدالتوں کے دروازوں پر قتل کرنے لگے اور مفرور ہو کر تہہ انسانوں کی گردنیں اڑاتے رہے۔ اس لیے کہ اب اس آگ کو ٹھنڈا کرنے والے اور غفور و درگزر کی بات کرنے والے نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ ہی قانون کی موٹی موٹی کتابوں سے آشنا۔ ہم نے پڑھے لکھے لوگوں کا رزق چلانے کے لیے اور دنیا میں مہذب کہلانے کے لیے کتنی بڑی روایت قربان کر دی۔

میں تو اس خوبصورت دور کی کہانی بیان کر سکتا ہوں لیکن اگر کسی آئینہ نسل کا کوئی فرد اسی سٹی کونسل میں گیا اور کسی بوڑھے نے سوال کر دیا کہ کیا تمہارے ہاں اب وہ ڈریم لینڈ ہے؟ تو شاید وہ یہی جواب دے: ”ہمارے آباء و اجداد نے ترقی خرید لی اور دشمنیاں ورثے میں دے دیں۔“



## نثار تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں.....

(28 ذی الحجہ 1424ھ بمطابق 21 فروری 2004ء)

پھر اسے گھسیٹ کر اس بڑے ایوان میں لایا گیا جہاں بڑی بڑی کرسیوں پر عوام کے خون اور پسینے پر پلنے والے غاصب حکمران اور ان کے خوشامدی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی چھوٹی سی لیبارٹری سے اس ایوان تک کا سفر اس نے ذلت و رسوائی اور حق و صداقت سے لڑتی غضبناک حکومت کے کارندوں کے جبر میں طے کیا۔ اسے گھورتی ہوئی خوفناک آنکھوں نے حکم دیا: ”گلیو! گھٹنوں کے بل جھک جاؤ۔“

اس نے ایک ایک کر کے آس پاس بیٹھے لوگوں کی طرف نظر دوڑائی۔ لوگوں کے خون میں رنگے ہوئے ہاتھوں، جہالت اور غرور سے تنی گردنوں، زمینوں اور جائیدادوں کی ہوس میں موٹی ہوتی ہوئی توندوں کو دیکھا اور پھر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ گرجدار آواز گونجی ”اب تم اپنے اس جرم کا اعتراف کرو کہ تم نے جو سچائی تلاش کی ہے وہ غلط ہے، جھوٹ ہے، فریب ہے اور معافی مانگو اور وعدہ کرو کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

کانپتے جسم اور شرم سے جھکے سر کے ساتھ اس نے معافی مانگی اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے مقتدر لوگوں نے فخر سے گردنیں اونچی کر لیں اور پھر وہ 16 سال تک اپنی زندگی کی تنہائیوں میں قید ہو گیا..... لیکن کون جانتا تھا کہ وہی ملک اور وہی شہر اپنے اس محسن سائنسدان کے مجسمے نصب کرے گا اور شرمندہ کرنے والوں کے نام تک لوگوں کو یاد نہ ہوں گے۔ بس نفرت، گالی اور حقارت ان کا مقدر بن جائے گی۔

تاریخ صرف ایک گلیلو کی معافی سے بھری ہوئی نہیں۔ گلیلو تو وہ خوش قسمت تھا جسے معافی مانگنے کا اختیار دے دیا گیا تھا ورنہ وہ عورت جس نے شکست خوردہ فرانس کے عوام کے دلوں میں جذبہ حریت کی مشعل دکھائی جس نے انہیں خود پر اعتماد کرنا، فاتح کے سامنے نہ جھکنا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جنگ جیتنے کا ہنر سکھایا، جو صرف چار ہزار سپاہیوں کی قیادت میں اپنے ملک پر قابض انگریزوں کو دریائے لوار سے پار بھاگنے میں کامیاب ہو گئی..... لیکن اسے معافی کی مہلت بھی نہ دی گئی اس لیے کہ اس کے زندہ نہ رکھنے کے پیچھے انگریز سپاہیوں کا خوف چھپا ہوا تھا۔ فیصلہ سنانے والے جب غصیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے تو وہ اس کی مقبولیت سے خائف تھے۔ ڈر سے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ فرانس کی اس محسن سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہیں اس کی لاش تک قبول نہ تھی۔ دون کے بازار میں آگ جلائی گئی، وہ اس آگ میں کود گئی اور پھر ٹاں وارک کا جسم راکھ ہو گیا..... لیکن یہ راکھ جن لوگوں کے چہروں پر گری وہ چہرے نہ آج تاریخ جانتی ہے اور نہ ہی اس سے آشنا..... لیکن ان کے کالے سیاہ، مکروہ اور تاریخ کے بدنام چہرے آج بھی نفرت کی علامت ہیں اور فرانس کے دل میں ایک ہی نام دھڑکتا ہے ”ٹاں وارک۔“

مہارت۔ پہلی کاپٹروں سے گولیاں برسائی گئیں، کھیتوں کو آگ لگائی گئی، چھانسی کی سزائیں دی گئیں لیکن منافع کے اس کاروبار میں کسی کے کان پر جوں تک نہ رہنمائی۔

لیکن اس سب کے مقابلے میں گزشتہ ہفتے انگلستان کی یونیورسٹی لوغم برگ کے پروفیسر گراہم فیئرل نے دنیا کو یہ کہہ کر ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی تحقیقات منظر عام پر لاتے ہوئے کہا: ”منشیات کے کنٹرول کے لیے دنیا میں سب سے بہترین ماڈل طالبان نے پیش کیا۔“ سہول گراہم فیئرل 1990ء کے تمام ممالک میں افغانستان دنیا کا سب سے بڑا افیون کاشت کرنے والا ملک تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جیسے ہی طالبان نے افیون کاشت پر پابندی لگائی تو 2001ء میں افیون کی کاشت میں 2/3 حصے کا آگئی۔ پروفیسر نے کہا کہ جولائی 2000ء میں جب یہ پابندی عائد ہوئی دنیا کے اکثر حصوں میں ہیروئن بنانے والی فیکٹریاں بند ہونے لگیں۔

اس نے اپنی تحقیقات پر 19 جنوری کو بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں حیران رہ جاتا ہوں کہ پورے ملک میں صرف 50 ہزار فوج رکھنے والے بے سروسہ مان طالبان جن کے ہاں کوئی مضبوط پولیس، وائرلیس سسٹم اور گاڑیاں بھی نہیں تھیں یہ سب کیسے کرنے میں کامیاب ہوئے؟ پھر اس نے خود اس کا جواب دیا۔ یہ صرف ان مذہبی رہنماؤں جن کو لوگ مسجد کا ملا کہتے ہیں، ان کی ترغیب اور ان کے اثر و رسوخ سے ممکن ہوا، وہ جن کے بیان میں اس لیے جادو تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کا بھائی یا بیٹا داما بھی افیون اگانے کا مرتکب ہوا تو سزا سے نہیں بچ پائے گا۔ اس کے بعد گراہم جنرل نے کہا کہ طالبان نے افیون کاشت کرنے کی بڑی سخت سزا رکھی تھی اور اس ”سخت“ سزا کو ملاحظہ کیجیے۔ جو بھی کاشت کرتے پکڑا جاتا اس کا منہ کالا کر دیا جاتا اور اگر پھر بھی باز نہ آتا تو اسے اس کالے منہ کے ساتھ گلیوں میں گھمایا جاتا یا پھر جیل میں ڈال دیا جاتا۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ ملک جہاں منشیات بیچنے پر عمر قید اور موت کی سزا ہو، وہاں کا پروفیسر حیران ہو کر اسے سخت سزا بتاتا ہے۔

لیکن شاید ایک نکتہ جو مسائل سے بھر مار ملک آج تک نہیں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ جب صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے اور صالح قیادت اقتدار پر متمکن ہوتی ہے تو پھر کسی شہر، گاؤں اور قصبے میں بدکار کو، بدکردار کو، مجرم کو پناہ نہیں ملا کرتی۔ وہاں معاشرہ خود سزا بن جاتا ہے، خود سپاہ اور خود عدالت بن جایا کرتا ہے۔ پھر منہ کالا ہوا یا نہ ہو، کسی کو جرم کرنے کی جرات نہیں ہو پاتی لیکن جہاں معاشرے میں طاقت، جبر، زور سے قانون نافذ کرنے کی کوشش ہو اور نافذ کرنے والوں کے ہاتھ بھی جرم میں رنگے ہوں وہاں کارہنے والا حیرت میں صرف یہی کہتا ہے۔ ”یہ کیسے لوگ تھے بے سروسامان، گڈڑیوں میں رہنے والے، نہ سیٹلا سٹ نہ جدید آلات اور صرف چھ مہینے میں دنیا بھر کی منشیات میں 65 فیصد کمی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

لیکن شاید وہ غور سے دیکھیں تو ان حسینوں پر سجدوں کے نشان اور ان کی دعاؤں میں عجز و انکسار نظر آجائے..... لیکن یہ اسے ہی نظر آتا ہے جو صالح معاشرے کی طلب میں ہو یا تعصب کی عینک کے بغیر۔

## پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

(07 محرم 1424ھ بمطابق 29 مارچ 2004ء)

وہ اکیاسی آرمر بریگیڈ میں ایک معمولی رینک کا فوجی تھا۔ اس کا حلیہ، رنگ و روپ، شکل و شبہت اور انگریزی لہجہ بھی بالکل اس گوری نسل سے ملتا جلتا تھا جو آج سے 300 سال قبل اپنے ملکوں میں ڈاکے، چوریاں اور قتل کی سزاؤں سے بھاگ کر امریکا میں داخل ہوئے تھے اور لاکھوں ریڈ انڈینز کو قتل کر کے اس سرزمین کے مالک بن گئے تھے۔ اس کا نام بھی اپنے انہی آباؤ اجداد کی طرح ریان جی اینڈرسن تھا..... لیکن جنوری کی صبح جب اس کے بریگیڈ کا دستہ عراق کے گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلنے اور آزادی کے متوالوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا تو امریکی خفیہ ایجنسی کے اہلکار دندناتے ہوئے آئے، ریان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اور اسے دھکے مارتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔

فوجی عدالت میں پیش کرنے سے پہلے کئی دن وہ امریکی ایجنسیوں کی پرتشدد تحویل میں رہا۔ تشدد، دھونس، مار پیٹ سب کچھ گزرا، پھر اسے 12 فروری کو ایک فوجی عدالت کے سامنے خفیہ طور پر پیش کیا گیا۔ فرد جرم عائد کی گئی، جرم یہ تھا کہ ریان اینڈرسن نے القاعدہ کو خفیہ معلومات فراہم کی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان خفیہ معلومات فراہم کرنے کا الزام سننے کے بعد، پرسکون ریان اینڈرسن نے کہا کہ ان سب الزامات کا خوبصورت جواب یہ ہے کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں اور اس مذہب میں داخل ہوتا ہوں جو صبر، سلامتی اور امن کا مذہب ہے۔

ریان کون ہے؟ اسے اللہ نے یہ توفیق کیسے عطا کی اور اسے ہدایت کی نعمت کس طرح ملی؟ یہ سب باتیں شاید تھوڑی دیر بعد منظر عام پر آجائیں لیکن اب تک اتنا پتہ چلا ہے کہ 26 سالہ امریکی نوجوان امریکا کے شہر واشنگٹن میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں تاریخ کا طالب علم تھا۔ اس کے اساتذہ کا کہنا ہے کہ تاریخ پڑھتے ہوئے وہ چند ایسے سوال کرتا جو ہم سب کو حیران و پریشان کر دیتے۔ جب اس نے 1999ء میں اس مضمون میں داخلہ لیا تو وہ مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں مغربی دنیا کے متعصب رویے کی باتیں کیا کرتا۔ اس کے دوستوں کے بقول وہ اسلام پر لکھی گئی مغرب کی کتابوں کی بجائے اصل مآخذ تلاش کرنے کی کوشش کرتا اور پھر اس کے سوالات ایسے ہوتے کہ ان کا جواب متعصب اساتذہ سے نہ بن پاتا تو وہ زچ ہو کر کہتے تم مسلمان ہو کر دیکھ لو۔ پھر اس کا شوق اور اس کا جذبہ بڑھتا گیا۔ ریان اینڈرسن چونکہ ایک ذہین طالب علم تھا اور اس میں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی اس لیے اس نے ذرائع ابلاغ تک اپنے ذہن میں چلتی جنگ پہنچانا شروع کی۔

اس کے ابتدائی خطوط جو 2001ء میں اخباروں میں شائع ہونے شروع ہوئے اس میں صرف امریکا پر تنقید

مجھے آج لوگوں کی محبتیں اور نفرتیں برابر یاد آرہی ہیں۔ میں نے شاید ہی کبھی کسی تحریر کو لکھتے ہوئے اتنی دفعہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو صاف کیا ہو..... لیکن کیا کروں انسانوں کی تاریخ ہی ایسی ہے، اس کے حکمران اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے آئے ہیں۔ مجھے بھی آنکھوں میں سترط کا چہرہ نظر آتا ہے جس کے ملک کے اقتدار پر جب سپارٹا کے جرنیلوں کا قبضہ ہوا تو وہ شخص جو دو ہزار سال گزرنے کے باوجود بھی آج تک یونان کی پہچان ہے، اسے ہی کٹھرے میں کھڑا کیا گیا اور ان خونخوار نظروں کے سامنے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا: آؤ دیکھیں کہ وہ کون سا الزام ہے جس کے باعث میں یہاں موجود ہوں۔ میں نے ایک خاص دانائی کے سبب یہ نام کمایا۔ دوستو! موت سے بچ رہنے کی نسبت بدی سے بچ جانا دشوار تر ہے کیونکہ وہ موت سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ میں تم سے موت کا سندیسہ پا کر جا رہا ہوں اور تم نا انصافی کا لقب پا کر چلے جاؤ گے..... لیکن یاد رکھو بہت سے ایسے لوگ ہیں جو تم سے حساب طلب کریں گے اور یہ وہ ہیں جنہیں میں نے دیکھ لیا ہے لیکن تم نہیں دیکھ پائے۔“ سترط کے یہ الفاظ ایسے سچ ثابت ہوئے کہ تاریخ کے ماتھے پر محسنوں کو رسوا اور عالموں کو حقیر بنانے والوں کے عبرت کا نشان بن گئے۔

لیکن کتنے بڑے ہوتے ہیں وہ لوگ اور کتنی عظیم ہوتی ہیں وہ شخصیتیں جو قوم کو کسی دردناک عذاب سے نکالنے کے لیے خود مجرم کے کٹھرے میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک مجرم میں نے صرف چند دن پہلے دیکھا جس وقت میں اس شخص کا چہرہ دیکھ کر پریشانی کے عالم میں لاہور کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو طرح طرح کے سوالات نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اس 64 سالہ شخص کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟

اس قوم کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے جس کو اس نے جینے کی تڑپ دی، سروا نچا کر کے دنیا کے ظالموں، جابروں اور چشم زدن میں ہیر و شیماء اور ناگاساکی میں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا حوصلہ دیا، جس نے اس قوم کی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کی کمزوری کو برتری میں بدل دیا۔ وہ سوچتا ہوگا مجھے اسی قوم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ وہ قوم جس کے سامنے آج تک کوئی لٹیرا، کوئی ظالم، کوئی عداوتک شرمندہ نہ ہو سکا۔ میں سوچوں میں گم لاہور کی سڑکوں سے گزر رہا تھا کہ عین اسی وقت میرے سامنے جنرل نیازی کا جنازہ گزرا۔ وہ جس نے میرے ملک کے آدھے حصے کو دشمن کے حوالے کرنے کی دستاویز پر دستخط کیے۔ میں دم بخود رہ گیا اس لیے کہ صرف چند ہفتے پہلے اس شخص نے کہا تھا: ”جب میں ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر لاہور پہنچا تو میرے گلے میں ہار پہنائے گئے تھے، میرے گاؤں تک مجھ پر پھولوں کی پیتاں پھجوا دی گئی تھیں.....“ اور پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا..... میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

کتنی بد قسمت ہے وہ قوم جس کے محسن شرم سے سر جھکائے اس سے معافی کے طلب گار ہوں اور غدار گلے میں ہار ڈالے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ اس کی سرزمین پر قدم رکھیں۔

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن.....!



## خاموش عوام

(15 محرم 1424ھ بمطابق 08 مارچ 2004ء)

- 0.....80 فیصد پاکستانیوں نے کہا کہ ہم امریکی خیالات، رسوم اور عقائد سے نفرت کرتے ہیں۔  
 0.....پورے ملک میں صرف 10 فیصد لوگ ایسے تھے جو امریکا سے نفرت نہیں کرتے۔  
 0.....60 فیصد نے کہا کہ ہم امریکا کی جمہوریت کے تصور کو بھی پسند نہیں کرتے۔  
 0.....53 فیصد نے کہا کہ ہم امریکی کاروبار پر لعنت بھیجتے ہیں۔  
 0.....45 فیصد نے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شرکت ایک حماقت ہے۔  
 0.....59 فیصد نے کہا کہ ان سالوں میں ہماری معاشی حالت ابتر ہوئی ہے اور 42 فیصد نے کہا کہ ہم بدترین حالت میں آگئے ہیں، صرف 22 فیصد ایسے تھے جو کہتے ہیں کہ ہم اچھے ہوئے۔  
 0.....50 فیصد ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہم زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہو گئے۔  
 0.....84 فیصد لوگوں نے کہا کہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ جرم یعنی امن عامہ ہے۔  
 0.....55 فیصد لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو پینے کا صاف پانی بھی نہیں ملتا۔  
 0.....54 فیصد ایسے تھے جو عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کرتے تھے۔

یہ اعداد و شمار 4 دسمبر 2002ء کو امریکا میں واشنگٹن کے ایک تحقیقاتی ادارے PEW نے شائع کیے۔ یہ سروے دنیا کے 44 ممالک میں لوگوں سے رو برو انٹرویو کر کے کیا گیا اور ہر طبقہ خیال کے لوگوں کو اس میں شامل کیا گیا۔ یہ اعداد و شمار پاکستان کی کسی اپوزیشن پارٹی، کسی متحدہ مجلس عمل یا کسی ملک دشمن تنظیم نے شائع نہیں کیے۔ اس سروے کا مقصد بھی کسی ملک کے بارے میں منفی اعداد و شمار جمع کرنا نہیں تھا بلکہ جائزہ لینا تھا کہ دنیا کے ممالک میں لوگ اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور امریکا کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔

0.....میں اعداد و شمار کی بھول بھلیوں میں نہیں پڑنا چاہتا اور نہ ہی اس سارے کھیل کو لوگوں کی زندگی بدلنے کا راستہ تصور کرتا ہوں لیکن صرف چند سوالات ہیں جو میرے ذہن میں ابھرتے ہیں اور ہر انسان کے ذہن میں ابھرتے ہوں گے، اس کے لیے کسی سروے یا کسی تحقیق کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ ہر کوئی روزمرہ زندگی گزارتے ہوئے اس بات کا احساس کر سکتا ہے اگر اس کا دل دھڑکتا ہے، آنکھ دیکھتی ہے اور ذہن محسوس کرتا ہے۔

0.....کیا ہم روز اخبار میں کسی ایسے شخص کی خبر پڑھنے کی عادی نہیں ہو گئے جس نے بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کر لی ہو اور اس نے ابھی زندگی کی 20 یا 25 بہاریں ہی دیکھی ہوں۔

0.....کیا ہم اس واقعہ کو بھول گئے کہ گزشتہ سال پشاور کی میونپل کارپوریشن نے بھنگیوں کی 138 ساسیوں کے

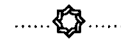
تھی..... اس کا کہنا تھا کہ یہ وہی ملک ہے جس کے بارے میں ہمیں اسکولوں کی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ یہ آزادی سے محبت کرنے والوں کا وطن ہے۔ یہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا سرخیل ہے لیکن یہ تو ایسا ملک نہیں ہے۔ یہ تو خود ظالم ہے، آزادی اور حریت کا دشمن ہے، اس نے خود پوری دنیا کے 50 کے قریب ممالک میں قتل، غارتگری اور دہشت پھیلانی ہوئی ہے۔ ایسے خطوط چھپتے رہے لیکن اسے ایک آزاد منش قسم کا نوجوان سمجھ کر برداشت کیا جاتا رہا اور ان خطوط کے باوجود اسے فوج میں کمیشن مل گیا اور اپنی ٹریننگ کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بغداد جا پہنچا۔ ابھی تک اس کے خطوط صرف امریکا کے نظام کی مخالفت تک محدود تھے۔ اس نے امریکا کی منافقت صرف پڑھی تھی دیکھی نہ تھی۔ اس نے مسلمان صرف سنے تھے دیکھے نہ تھے۔ عراق میں اسے جس کیفیت کا ادراک ہوا اس نے اس پر سوچنا شروع کیا اور گزشتہ سال اس نے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اس مضمون کے شائع ہوتے ہی ایف بی آئی، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ اور امریکی فوج اس کی ٹوہ میں لگ گئی۔

مضمون بھی کمال کا تھا۔ اس نے امریکا کے متعصب دانشوروں کے تکبر، نفرت، کینے اور جھوٹ کا موازنہ..... مسلمانوں کے صبر، نرم دلی، نرم خوئی اور عفودرگزر سے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ امریکا کے نام نہاد دانشوروں کے دماغ اور دل بے وجہ نفرت، تعصب اور اشتعال سے بھرے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا بڑے سے بڑا عالم دھیمے پین، نرم خوئی اور صبر جیسی نعمتوں سے مالا مال ہے۔

بس پھر چند مہینوں بعد ایف بی آئی نے ایک رپورٹ تیار کی۔ کہا گیا ہم اینڈرسن کے انٹرنیٹ پر برابر نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اس نے انٹرنیٹ کے ذریعے القاعدہ سے رابطے کی کوشش کی ہے اور اس تک معلومات پہنچائیں۔ اینڈرسن کا یہ جرم تناخت ہے کہ اسے موت کی سزا ہو سکتی ہے..... لیکن پاک ہے وہ ذات جس کے تصرف میں انسانوں کے دل ہیں۔ اس نے اس جسم کو اس سزا تک پہنچنے سے پہلے ہی ہدایت کے نور سے سرفراز کر دیا۔

میں سارا رخ کے جھروکوں میں جھانکتا ہوں تو صلیبی جنگیں یاد آ جاتی ہیں۔ جب عیسائی سپاہی یہ جنگیں لڑ کر واپس یورپ پہنچے تو ایک پیغام لے کر آئے۔ وہ جو کچھ سے بھری گلیوں اور رات کی تاریکی میں ڈوب جانے والے شہروں میں رہا کرتے تھے بولنے لگے دیکھو مسلمانوں کے ہاں شہر کے شہر پختہ گلیوں، نالیوں اور بہترین عمارتوں سے مزین ہیں۔ وہاں رات کو لینپ جلتے ہیں، وہاں کتب خانے ہیں جہاں ہزاروں کتابیں ہوتی ہیں اور پھر مسلمانوں کا علم، ان کی تہذیب، یورپ میں پہنچی۔

الغرضی سے بوعلی سینا تک سب یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہوئے اور آج حق کی تلاش کرنے والے کو میسر ہیں لیکن آج امریکا کے حملوں اور تشدد کے بعد مسلمانوں کی صفات مغرب تک پہنچ رہی ہیں اور ریان اینڈرسن جیسے لوگ پکار کر کہتے ہیں: دیکھو! یہ کیسے لوگ ہیں ان پر ظلم ہوتا ہے یہ صبر اور شکر کرتے ہیں۔ ان پر طعنہ زنی ہوتی ہے یہ نرم خوئی اور عفودرگزر سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھوک، افلاس اور غربت میں بھی سینہ سپر رہتے ہیں لڑتے ہیں، یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ تو اس دنیا کے باشندے ہی نہیں لگتے.....





## بے وفا معشوق نامراد عاشق

(27 محرم 1424ھ بمطابق 19 مارچ 2004ء)

میرے سامنے اس وقت امریکی کانگریس کے لیے مرتب کی گئی دور پورٹیں موجود ہیں، ایک LB94041 جس میں امریکا اور پاکستان کے تعلقات کی تاریخ مرتب ہے اور دوسری RL316234 جس میں امریکا اور پاکستان کے درمیان دہشت گردی کے خاتمے میں تعاون کی مفصل کہانی دی ہوئی ہے۔ یہ رپورٹیں اگرچہ امریکا کے اعلیٰ دماغ ممبران کانگریس کے لیے مرتب کی گئی ہیں اور اس میں نفع و نقصان کا جائزہ بھی اسی حوالے سے لیا گیا ہے..... لیکن پتا نہیں کیوں میں انہیں پڑھتا جاتا تھا اور حیرت میں گم ہوتا جاتا تھا کہ ہم اپنی سرزمین، اپنی غیرت و حمیت اور اپنے مسلمان بھائیوں کی جانیں اتنی ارزاں قیمت پر بیچ سکتے ہیں۔ ایسا تو شاید ریڑھی پر سبزی بیچنے والا بھی نہ کر سکے جو شام کے وقت گھر جا رہا ہو اور اس کو خطرہ ہو کہ صبح آنے تک سبزی خراب ہو جائے گی لیکن وہ اتنا ضرور سوچے گا کہ اسکو بے قیمت ارزانی میں بیچنے سے بہتر ہے کہ اپنے بچوں کا پیٹ ہی بھر لیا جائے، اپنے کسی بھوکے رشتہ دار یا ہمسائے کے گھر کے چولہے کو آباد کر دیا جائے لیکن ہم نے مسلم اخوت کی لڑی میں بندھے ہوئے مسلمان بھائیوں، زمین اور علاقے کے تعلق میں جڑے ہوئے پڑوسیوں کے خون، عزت اور آبرو کو بھی اس ارزاں سودے میں بیچ ڈالا۔ آئیے ذرا اس 55 سالہ سودے پر ایک نظر ڈالیں۔

1950ء میں ہم نے علاقائی خوف اور امریکا نے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خوف سے ایک دوسرے کے قریب آنے کا قصد کیا اور یہ محبت 1955ء تک علاقائی دفاعی معاہدوں تک جا پہنچی اور 1961ء تک ہم ایک دوسرے کے حلیف بننے لگے۔ یوں امریکا نے ہمیں ان 9 سال میں صرف 5 کروڑ 8 لاکھ ڈالر کا ملٹری سامان امداد میں دیا اور 1947ء سے 2000ء تک ملٹری اور سول یعنی انسانوں کی امداد ملا کر کل 11 ارب 80 کروڑ ڈالر بنتی ہے۔ جب کہ اس وقت افغانستان میں امریکا جنگ پر ہر ماہ ایک ارب ڈالر خرچ کر رہا ہے اور عراق میں ہر ماہ 4 ارب ڈالر..... لیکن اس سب خرچے کے باوجود افغانستان میں اس کی افواج پر ہر ماہ اوسطاً 18 ملے ہوتے ہیں اور عراق میں ہر روز اوسطاً دو امریکی سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں لیکن ہم نے اس قلیل رقم کے بدلے اسے کیا دیا اور ہمیں اپنے اس ”عظیم دوست“ سے کیا انعام ملتا رہا؟ یہ سب بھی انہی دور پورٹوں میں درج ہے۔ اس میں سے کوئی ایک بھی جائزہ یا اعداد و شمار میں اپنی طرف سے نہیں لکھ رہا۔ آئیے تاریخ کے جھروکوں میں اس ”یار کی وفا“ ملاحظہ فرمائیں اور ہماری بلا شرط غلامی بھی۔ جب ہم امریکا کے ساتھ دفاعی معاہدے میں شریک تھے 1965ء کی جنگ چھڑی تو اس عظیم طاقت نے ہماری فوجی مدد بند کر دی، ہم نے معاہدہ پھر بھی نہ توڑا یہاں تک کہ 1971ء آ گیا۔ اس دفعہ پھر امداد بند کر دی گئی اور میرا ملک دو لخت ہو گیا اور جب ملک ٹوٹ گیا تو 1975ء میں امداد بحال کر دی گئی۔ لیکن 1979ء میں پھر ہم پر ایٹمی

لیے اشتہار دیا تو اس کے لیے تقریباً ایک ہزار مسلمانوں نے بھی درخواستیں جمع کروائیں جن میں اکثریت میٹرک پاس تھی اور ان میں بی اے اور ایم اے بھی شامل تھے۔

0..... اگر ہم کسی دفتر میں کام کرتے ہیں تو کیا ہم سے نوکری کے لیے منتیں، درخواستیں اور عرضیاں کرنے والوں کے تعداد بڑھ نہیں گئی جو کہتے ہیں ہمیں خدا کے لیے کہیں چراسی، مالی یا مزدور بھرتی کروادو؟  
0..... کیا ہم آج سے چند سال پہلے گاڑیوں میں چور لاک لگوا کر کرتے تھے؟ گھروں میں برگر الارم لگتے تھے؟ کیا ہمارے ملک میں کبھی پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسیاں ہوتی تھیں جو لوگوں کو تحفظ فراہم کرتیں؟  
0..... کیا کبھی کسی نے سوچا تھا کہ وہ امریکن جو صرف ایک سال پہلے تک اس ملک میں گھومنے کے لیے پاکستان کی پولیس سے گڈ رڈ کی درخواست کرتے تھے اور تحفظ مانگا کرتے تھے..... اب جس گھر سے جب چاہیں، جس وقت چاہیں اور جس کو چاہیں اٹھا سکتے ہیں اور جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں؟

ان سوالوں کا جواب ہر کوئی سوچ سکتا ہے اور ہر کوئی دے سکتا ہے اور اگر اس کا ضمیر زندہ ہے تو فیصلہ بھی کر سکتا ہے اور PEW کی رپورٹ بھی یہی کہتی ہے کہ پاکستان میں لوگوں کو اپنے مسائل، اپنے حالات اور اپنی حکومت کی کارکردگی کے بارے میں پورا پورا ہے اور اس ملک کا جاہل ترین آدمی بھی ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ وہ نہ خاموش ہے اور نہ خاموش اکثریت کا حصہ۔ وہ بے اطمینان ہی، افسردہ ہے، رسوا ہے، پسماندہ ہے..... لیکن وہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا پہلا کام لوگوں کو تحفظ دینا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جہاں لوگوں کی جانیں محفوظ ہوں وہاں تلاش رزق میں آسانی آتی ہے۔ ایک بادشاہ کے دربار میں ایک شخص فریاد لے کر حاضر ہوا اور کہا: ”میرے گھر میں چوری ہوگئی، چور سب سامان لوٹ کر لے گئے۔“

بادشاہ نے شخص سے کہا: ”جب چور یہ کام کر رہے تھے تم کہاں تھے؟“

فریادی نے کہا: ”میں سو رہا تھا“

بادشاہ نے شخص سے کہا: ”تم کیوں سو رہے تھے؟“

حیرت میں گم فریادی نے کہا: ”میرا یہ گمان تھا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔“

جس رعایا کے حاکم جاگ رہے ہوں وہاں کسی سروے، کسی رپورٹ، کسی تقریر، کسی بیان، کسی اشتہار کی ضرورت نہیں پڑتی کہ دیکھو ہم نے تمہارے لیے یہ کیا کیا، ہم تمہیں بہترین مستقبل دے کر جا رہے ہیں۔ ہم جرم، ظلم اور غربت کا خاتمہ کر چکے ہیں۔ ہماری پالیسیاں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں، لوگوں کی خاموش اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ وہاں لوگوں کے چہرے خود بولتے ہیں، ان کی آنکھیں ہنسی ہیں، ان کی زبانیں گیت گاتی ہیں..... لیکن جہاں حاکم سو رہے ہوں وہاں لوگوں کو ہمیشہ ایک لمبی چیپ لگ جاتی ہے، ایک طویل عرصے کی خاموشی لوگوں کے چہروں پر چھا جاتی ہے اور سب سمجھنے لگتے ہیں کہ یہاں چین ہے، آرام ہے، امن ہے۔ غبارے میں جب ہوا بھری جا رہی ہوتی ہے تو ہوا بھرنے والے کو اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ اسے لمبا کرنے کے شوق میں مزید پھونک تیز کرتا جاتا ہے اور پھر اسے علم بھی نہیں ہوتا اور غبارہ جب اچانک پھٹتا ہے تو اس کا نشانہ کوئی اور نہیں بنتا، ہوا بھرنے والے کا منہ ہوتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس سارے عرصے میں نہ غبارہ فریاد کرتا ہے، نہ چیختا ہے، نہ ہوا کے بوجھ سے بلبلاتا ہے..... بس ایک دم دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔



## سورۂ مقل

(11 صفر 1425ھ بمطابق 2 اپریل 2003ء)

کینڈے کے پھول پہنے اور ہولی کے رنگ چہروں پر لگائے جب میں اپنے ملک کے لوگوں کو ٹی وی کیمروں کے ماتھے منبتوں کے گیت گاتے دیکھتا ہوں، اداکاروں کے جھرمٹ اور ان کے فقروں پر داد دیتے ہوئے نوجوانوں کے لہو لہو سنتا ہوں..... ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور انسانی حقوق کے علمبردار کے جوق در جوق سفر اور منعقد ہوتی ہفت روزوں کی خوش فہمیوں میں ڈوبی پُر امید نظموں اور سرحد توڑتے مقالوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے سان فرانسسکو میں ایشیا لاء انڈیشن کی 1996ء کی وہ تقریب یاد آ جاتی ہے جس میں ہندوستان کا قونصلر جنرل مہمان خصوصی کے طور پر مدعو تھا۔ امریکا کے شعبہ اطلاعات کی دعوت پر میں بھی اس تقریب میں موجود تھا۔

ایک پاکستانی کی موجودگی پر حیران ہو کر قونصلر جنرل نے اپنی تقریر کا رخ بدلا اور ہندوستان اور پاکستان کی ثقافت اور کلچر کی ہم آہنگی کے بارے میں گفتگو کرنے لگا اور آخر اس بات پر گفتگو ختم کی کہ مجھے حیرت اس بات سے ہوتی ہے کہ ایک سرزمین کو یوں تقسیم کر دیا گیا ہے کہ بکریاں تو سرحد پار کر کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں ہالٹی ہیں لیکن انسان نہیں..... تقریر کے بعد میں نے قونصلر جنرل سے اتنا کہا کہ اگر بکریوں کو اس بات کا علم اور ادراک ہو جائے کہ وہ سرحد کے اس پار جا کر ذبح ہو جائیں گی تو وہ شاید بھول کر بھی یہ سرحد عبور نہ کریں۔

مجھے یہ سب لوگ بھی سرحد عبور کرنے کی خوشی میں یہ بات بھولے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سرحد کے پار ان سے وہی سلوک ہونے والا ہے جو معصوم اور بھولی بھالی بکریوں سے ہوا کرتا ہے۔ میں گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ اور اس میں ہونے والے کشت و خون کو دہرانا نہیں چاہتا، میں مسلمانوں سے نفرت کے پس منظر میں برسوں پیچھے نہیں جانا چاہتا۔ مجھے ماضی میں بازاروں، محلوں، بسوں اور ریلوے اسٹیشنز پر بکنے والے علیحدہ علیحدہ..... ہندو پانی اور مسلم پانی کا تذکرہ بھی نہیں کرنا، اس لیے میرے ملک کے یہ فریب خوردہ لوگ یہ خیال کر چکے ہیں کہ ماضی ہمارا حصہ نہیں ہے اور ہم اب کچھ بھول کر دوستی کے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

میں آج کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جہاں دوستی کی نوید چاروں جانب سنائی دیتی ہے، ایسی محبتوں کی شہنائیوں سے ایک عجیب آواز سامنے آئی ہے۔ ہریانہ کے شیم چند نے ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ہے Saffron یعنی گیروی فاشزم۔ یعنی وہ فاشزم جو زرد رنگ سے پہننے والے اور زرد رنگ لگانے والے پھیلا نا چاہتے ہیں۔ میان چند کئی سال تک مجلس قانون ساز کا ممبر رہا ہے اور بہت دفعہ وزیر کے عہدوں پر بھی فائز رہا جن میں محکمہ خوراک، ماہی، بہبود اور اربن ڈیولپمنٹ شامل ہیں۔ شیم چند نے اپنی کتاب میں بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی حلیف کڑ جماعت راشنریہ سیوک سنگھ کے ایک خفیہ سرکر نمبر 411 کا ذکر کیا ہے۔ سرکر کے اہداف پڑھتے جاتے اور سوچتے

پروگرام کا بہانہ بنا کر امداد بند کر دی گئی اور پھر دسمبر 1979ء میں روس افغانستان میں آ بیٹھا، ہم پھر اپنے دوست کی مدد کو جانچے اور 1981ء میں 3.2 ارب ڈالر کی پانچ سالہ امداد حاصل کی اور 1986ء میں چار ارب ڈالر لے کر خوش ہوئے اور پھر جیسے ہی مئی 1988ء میں آخری روسی فوجی افغانستان سے نکلا ہماری امداد پر پریسلر ترمیم سے پابندی لگ گئی..... لیکن خود اس رپورٹ کے مطابق پاکستان نے اس جنگ میں مدد کی جو قیمت آج تک ادا کی ہے اس کو ڈالروں میں نا پائی نہیں جاسکتا۔

لیکن ایک مدد ہم نے اب تک بلا قیمت اور بلا مول پیش کی جسے امریکا اور مغربی دنیا ”دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مدد“ کہتی ہے۔ صرف امریکی افواج کی مدد کے لیے رپورٹ کے مطابق دو ہوائی اڈوں جیکب آباد اور ولہندین سے افغانستان کی سرزمین پر 57000 حملے کیے گئے۔ ڈبیری کٹر بم پھینکے گئے، میزائل داغے گئے اور ایک اللہ کے نام لینے والے نہتے مسلمانوں کے جسموں کے پرچے اڑا دیے گئے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ امریکی افواج نے پاکستان کے تین ایئر فیلڈ پر ایسارٹڈ اسٹم نصب کیا ہے کہ پاکستان کا کوئی کونہ اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ پاکستان نے افغانستان کے بارڈر پر ایک لاکھ 15 ہزار فوجی تعینات کیے تاکہ بھاگتے ہوئے افغانوں کا تعاقب کر کے پکڑا جاسکے۔ رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ ایف بی آئی نے پاکستان آرمی کے سابق افسران پر مشتمل ایک Spider گروپ ترتیب دیا ہے جس کا کام ایک غیر رسمی انٹیلی جنس گروپ کے طور پر کام کرنا ہوگا جو پاکستان کے اسلامی گروپوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے گا، اس کے علاوہ پاکستان نے اس سارے تانے بانے میں جو ایف بی آئی کی ٹریننگ اور اعلیٰ جاسوسی آلات کی مدد سے مرتب ہوا، 400 سے زیادہ ایسے مسلمانوں کو گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کیا جنہیں ”القاعدہ“ کا نام دے کر موجودہ تاریخ کے سب سے خوف ناک قید خانے گوانٹانامو بے میں بھیجا گیا۔

اس رپورٹ میں ان تمام تر قربانیوں کے صلے میں ایک اعزاز درج کیا گیا اور وہ اسی رپورٹ کے آغاز میں ہے جسے پڑھ کر آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتی ہیں کہ 12 مارچ 2003ء کو بش انتظامیہ نے تمام حقائق کا جائزہ لیا اور پاکستان کو شمالی کوریا کو ایٹمی ٹیکنالوجی دینے کا مجرم قرار دیتے ہوئے 12 مارچ کو ایکزیکوٹو آرڈر 1293B جاری کر کے قدیر خان ریسرچ لیبارٹری کوہ پرائیمی عدم پھیلاؤ کے ایکٹ کے تحت سزا دیتے ہوئے اس پر تمام کاروبار اور امداد کے دروازے بند کر دیئے۔

کیا عجیب رشتہ ہے.....؟ یوں لگتا ہے کہ امریکا ایک بے وفا ہرجائی معشوق ہے اور ہم نا کام و نامراد عاشق جو اپنا گھر جلا کر سر پر خاک ڈال ننگے پاؤں آبلے ڈالے اس کے پیچھے بھاگتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی بے وفائی پر بھی پیار آتا ہے۔ ہم اپنے گھربار، بہن بھائی، والدین، دوست یا سب اس کے لیے قربان کرنے کو تیار ہیں لیکن وہ بھی عجیب معشوق ہے۔ ہمیشہ دشمن یا رقیب کی گلی میں ہوتا ہے اس کی گود میں بیٹھا ہوتا ہے..... لیکن تاریخ شاہد ہے کہ تو میں اپنے آپ سے عشق کرنے سے سنورتی ہیں، ابھرتی ہیں، نکھرتی ہیں۔

کاش! 55 سال میں ہمارے فرمانرواؤں نے جتنا عشق امریکا سے کیا اس سے آدھا بھی اس ملک کے غریب عوام سے کیا ہوتا تو وہ انہیں آنکھوں سے لگاتی، سروں پر بیٹھاتے، ان کے ہاتھ چومتے، ان کے ذکر پر آنسو بہاتے..... لیکن یہ کیا ہے جو حکمران بھی جاتا ہے ہر کوئی جانے والے کو یہی کہتا ہے۔ ”خس کم جہاں پاک۔“

## بٹ میں

(11 صفر 1425ھ بمطابق 12 اپریل 2004ء)

میں نے اپنی زندگی کے تین ماہ وردی میں گزارے ہیں۔ میں جس ”میس“ میں رہتا تھا وہاں ساتھ والے کمرے میں ایک میجر صاحب تھے جو اکیلے رہ رہے تھے، گھر خاندان سے دور، ان کا بٹ مین تھا سیدھا سادا سا ہر وقت کام میں جتے رہنے والا۔ علی الصبح اٹھتا، بیڈی سے لے کر جوتی پالش کرنے تک اور صاحب کے جانے کے بعد کمرہ آراستہ کرنے سے لے کر چھوٹے موٹے کپڑے دھونے، بازار سے سودا سلف لانے اور ڈھیروں ایسے کام کرنے میں مصروف رہتا۔ میں اس کی سعادت مندی کا بڑا قائل تھا..... لیکن جب بھی کبھی میں نے اسے میجر صاحب کے روبرو دیکھا ڈانٹ کھاتے ہی دیکھا، وہ کبھی جرائیں، موزے یا رو مال دھو کر لاتا تو ڈانٹ سہتا، کبھی وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا کہ ”میں نے بڑی محنت سے دھوئے ہیں“ تو ڈانٹ مزید بڑھ جاتی۔

میجر صاحب چیختے: ”محنت سے دھوئے ہیں..... ایسے دھوئے جاتے ہیں!“

اور آخر میں اس فقرے پر تان ٹوٹی، ”ایک تو تم جھوٹ بہت بولتے ہو۔“

یہ فقرہ اتنی زور سے بولا جاتا کہ مجھے اپنے کمرے میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی۔ بے چارہ بٹ مین چھٹی ماگنے کے لیے کسی کی بیماری کا تذکرہ کرتا یا اگر کیسٹ لینے بازار جاتا اور کیسٹ نہ ملتی اور وہ کہتا: ”میں نے بہت سی دکانیں گھومیں لیکن کیسٹ نہ ملی۔“

صبح صفائی کرتا اور کوئٹہ کی مٹی پھر کمرے کو گندہ کر دیتی اور وہ کہتا: ”سر میں نے صفائی کی تو تھی۔“

ان سب تفصیلات کے باوجود بھی میجر صاحب یہی کہتے: ”میں تنگ آ گیا ہوں تم سے، ایک تو تم جھوٹ بہت بولتے ہو۔“ اور وہ سر جھکائے جی سر کہتا رہتا۔

ایک دن میں نے میجر صاحب سے پوچھا: ”آپ اسے اتنا ڈانٹتے رہتے ہو، اپنا اتنا گلا پھاڑتے ہو، آپ اسے بدل کیوں نہیں دیتے۔“

میجر صاحب بولے: ”آپ کو پتہ ہے اگر میں اس سے تھوڑا سا نرم ہو جاؤں تو یہ سر پر چڑھ جائے گا، یہ جو تھوڑا بہت صحیح کام کرتا ہے یہ بھی چھوڑ دے گا۔“

میں نے کہا: ”کام تو وہ جی جان سے صحیح طرح کرتا ہے پھر آپ اس کی حوصلہ افزائی کیوں نہیں کرتے؟ اس سے اس کا حوصلہ بڑھے گا، آپ پر اعتماد کرے گا۔“

کہنے لگے: ”مجھے اس اعتماد کی ضرورت نہیں جو اس کی کارکردگی خراب کر دے۔ میں اس کے سامنے ہمیشہ

جائے کہ اس تیز رفتار آمدورفت کے بعد کون سی کھائی تیار کی جا رہی ہے کہ ساری ٹریفک اس میں دھڑام سے جا گرے۔ سرکلر کے مطابق ہدایت کی گئی ہے:

☆ پورے بھارت میں ایک خاص منصوبے کے تحت چھوٹی ذات کے لوگوں کو راشن یہ سیوک سنگھ میں بھرتی کیا جائے تاکہ ان مفت کے کارکنوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

☆ ڈاکٹروں، کمپنیوں اور ادویہ فروخت کرنے والوں میں مسلمانوں اور شوروروں سے نفرت کی ترویج کی اس شدت کے ساتھ کی جائے اور انہیں اس بات پر قائل کیا جائے کہ وہ مسلمانوں اور شوروروں کو خفیہ طور پر ایسی ادویہ استعمال کروائیں جن کی مدت گزر چکی ہو اور جن کے استعمال سے ان میں Epalstic Enemia پیدا ہو اور ان کے بچے چند ماہ بعد جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اگر کوئی بچ نکلے تو ڈاکٹروں کے ذریعے خون کے عطیات کے شو کروائے جائیں اور اس دوران مسلمانوں کو ایسے انجکشن لگائے جائیں کہ وہ معذور ہو جائیں۔

☆ مسلمانوں اور شوروروں کے خلاف جگہ جگہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ غربت، بے روزگاری اور مردوں کے قتل کے بعد ان کی عورتیں جا بجا جسم بیچنے پر مجبور ہو جائیں۔

☆ اس طرح کا خفیہ منصوبہ بنایا جائے کہ کھانے پینے کی اشیاء استعمال کرنے سے مسلمان یا تو زہر خورانی سے ہلاک ہوں یا معذور ہو جائیں۔

جب بھی کہیں دنگا فساد ہو تو مسلمانوں کی عورتوں کو اجتماعی زیادتی کا شکار کیا جائے اور راشن یہ سیوک سنگھ کے کارکنان سن لیں: اس ضمن میں دوستوں یا جاننے والوں کی عورتوں کا بھی لحاظ نہ کیا جائے۔

☆ مسلمانوں کے خلاف لکھی گئی تحریروں کو ہر کوئے تک پھیلا یا جائے اور بدھوں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے اشوک کو ظالم اور ہندوستان کا دشمن بنایا جائے۔

☆ تمام سرکاری اداروں پر نظر رکھی جائے تاکہ مسلمان اور بچ ذات لوگ نوکریاں حاصل نہ کر سکیں اور جو نوکریوں میں ہیں ان کی ترقیوں کو رکوا یا جائے۔

☆ سادھوؤں اور سنتوں کی خدمات حاصل کی جائیں جو بچ ذات کے لوگوں کو اعلیٰ ذات کی خدمت کے عوض سورگ (جنت) کے وعدے کریں تاکہ وہ اپنی بچ ذات پر قائل ہو جائیں۔

☆ مسلمانوں اور بچ ذات والوں سے لکھنے والوں کو اعلیٰ معاوضہ دے کر رکھا جائے اور ان سے مسلمانوں کے خلاف اور بچ ذات والوں کے خلاف تحریک کھوائی جائیں۔

☆ اپنے خاص پولیس والوں کی مدد سے صالح ذہن رکھنے والے مسلمانوں کو جعلی پولیس مقابلوں میں مروایا جائے۔ یہ کتاب جسے یونٹی پبلشرز نے چھاپا صرف چند گھنٹوں کے لیے دکانوں پر رہی اور پھر یوں غائب کر دی گئی جیسے خوف اور سراسیمگی میں پرندے درختوں سے اڑ جاتے ہیں۔

جس ملک میں لکھے گئے چند صفحے چند گھنٹوں میں غائب کیے جاسکتے ہیں وہاں دوستی اور محبت کا پیغام لے کر آنے والے اور جانے والوں کو شاید اس بات کا علم ہی نہیں کہ یہ وہ جال ہے جس میں پہلے دشمن کو نہتا کیا جاتا ہے محبتوں کے گیت گا کر مطمئن کیا جاتا ہے اور پھر اسے جب، جیسے اور جس وقت چاہا ذبح کر دیا جاتا ہے۔

ایک آئیڈیل رکھتا ہوں ایسا جس تک وہ نہ پہنچ سکے۔“

میں نے آخری سوال کیا: ”تو پھر آپ ایسا بٹ مین لے لیں جو اس آئیڈیل تک پہنچ سکتا ہو۔“

کہنے لگے: ”پھر وہ میرا بٹ مین نہیں رہے گا، فوج میں بھی نہیں رہے گا، چھوڑ جائے گا۔“ میں مایوس ہو گیا۔

میں نے بٹ مین سے کہا: ”تمہارا گاؤں کہاں ہے؟“

کہنے لگا: ”جہلم میں۔“

میں نے کہا: ”وہاں تمہاری زمینیں ہیں؟“

کہنے لگا: ”کچھ ہیں۔“

میں نے پوچھا: ”ان کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟“

اس نے کہا: ”ایک بھائی ہی، اس کے لیے بھی مشکل ہے سنبھالنا۔“

میں نے کہا: ”تم روز اتنی ڈانٹ سہتے ہو تم اپنی زمین پر جا کر کام کیوں نہیں کرتے؟“

لیکن اس کے جواب پر میں حیران رہ گیا۔ کہنے لگا: ”میرے گاؤں میں کسی کو کیا پتا ہے کہ مجھے ڈانٹ پڑتی

ہے، وہاں تو میں کلف والے کپڑے والا فوجی جوان ہوں جسے سول کے لوگ فخر سے دیکھتے ہیں، زمینوں پر چلا گیا تو میں

ہل چلانے والا..... پسینے میں ڈوبا زمیندار بن جاؤں گا، اب چاہے جیسی بھی ڈانٹ ملے میں واپس عام کسان نہیں بن سکتا۔“

یہ واقعہ میرے ذہن پر اس لیے تھوڑے کی طرح برس رہا ہے کہ غلامی کی یادگار کے طور پر قائم دنیا میں ایک

تنظیم ہے جسے دولت مشترکہ کہتے ہیں۔ یہ ان ملکوں کی تنظیم ہے جو انگریز کے محکوم رہے۔ اس نے اپنے ایک سابقہ غلام

ملک پاکستان کی رکنیت معطل کر رکھی ہے کہ یہاں جمہوریت نہیں ہے۔ ہم نے کہا دیکھو ہم نے جمہوریت قائم کر دی،

بالکل اسی بٹ مین کی طرح جو موزے صاف کر کے صاحب کے پاس لے کر گیا تھا، دولت مشترکہ نے کہا تم نے دیکھا

ہے جمہوریت کیسی ہوتی ہے؟ یہ جمہوریت ہے! ہم نہیں مانتے، نہ تم لوگوں کو کام آتا ہے اور اوپر سے تم جھوٹے دعوے

بہت کرتے ہو۔

ہمارا یہ حال صرف دولت مشترکہ کے ساتھ ہی نہیں کہ وہ تو ہماری غلامی کی یادگار ہے جس سے پتا نہیں کیوں

ہم محبت کرتے ہیں۔ ہم تو جہاں بھی۔ جس کے سامنے بھی جاتے ہیں وہ فوراً میجر صاحب بن جاتا ہے اور ہم بٹ مین۔

ہم اکٹا تک سروے لے کر دنیا کے سامنے جاتے ہیں..... ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کہتی ہے: سروے ایسے ہوتے

ہیں، اس طرح Facts پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں غربت کے خاتمے کے لیے ہم نے بہت سے پروگرام بنائے

ہیں اور اب غربت ختم ہو رہی ہے لیکن کسی بھی بینک یا امداد دینے والے ملک کا چھوٹا سا نمائندہ کسی کانفرنس میں یا میٹنگ

میں ہمارے منہ پر ہماری بے عزتی کر دیتا ہے اور پھر مثالیں دینے لگتا ہے وہ دیکھو ملائیشیا..... وہ دیکھو کوریا..... غربت

ایسے ختم ہوتی ہے۔

ہم 500 لوگ پکڑ کر امریکا کے حوالے کرتے ہیں لیکن پھر بھی بی بی سی کے Question Hour میں امریکا

کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا نمائندہ کہتا ہے: ”ابھی آپ نے کچھ اتنا زیادہ کام نہیں کیا دہشت گردی کے خلاف، یہ کوئی

خاص ایکشن نہیں ہے۔“

ہم اپنی معاشی پالیسیوں کا گراف لے کر جاتے ہیں اور انٹین بینک کا چیف بالکل اسی طرح کہتا ہے: ”تم

لوگوں کی نیت ہی ٹھیک نہیں۔“

جیسے میجر صاحب نے بٹ مین کو کہا تھا: ”تمہاری نیت ہی کام چوری کی ہے ورنہ بازار سے کیسٹ ضرور

مل جاتی۔“

لیکن اس سب کے باوجود بھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہماری بے عزتی ہوتی ہے تو کون سا گھر والوں کو

اس کا علم ہوتا ہے۔ خاران میں، لالہ موہی میں، بنوں میں یا شکار پور میں کسی کو کیا پتا ہمیں روز کتنی جھاڑ پڑتی ہے؟ ہمیں

کتنی دفعہ کہا جاتا ہے تم ٹھیک طرح کام نہیں کرتے؟ ہمیں کتنے موقعوں پر یاد دلایا جاتا ہے کہ تم جھوٹ بہت بولتے ہو۔

عام لوگوں کے سامنے تو ہم معزز ہیں، ہمارے پسینے سے بو نہیں آتی، ہماری ایئر کنڈیشنڈ گاڑی کو لوگ حیرت

سے دیکھتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات کہ وہ لوگ ہمیں طاقتور سمجھتے ہیں اس لیے کہ ہم بڑی طاقت کے بٹ مین

ہیں۔ ہماری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آقا اس کی آنکھیں نکال دے گا۔

ہم یہ نوکری کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟

ہم یہ غلامی کا پھندہ کیسے اتار سکتے ہیں؟

یہ اتر گیا تو ہم اس غریب کسان، مزدور، ریزہ والے کے برابر آ جائیں گے جس کے پسینے سے بو آتی ہے،

جس کا کوئی مقام نہیں.....!





کچھ بہا کر لے گیا۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بھارتی جینٹل پر تو ایسے پروگرام پیش ہوں کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں اور ہم سیدھے ساوے پروگراموں پر اکتفا کر لیں۔ کیا خوب محاورہ ہے کہ پڑوسی کا منہ لال ہو تو اپنا تھپڑ مار کر کر لینا چاہیے۔ ہم نے بھی ایسے ہی کیا لیکن یہ تھپڑ سیدھے اس درٹے پر پڑے جسے میرے آباء و اجداد نے کئی سو سال سے سنبھال رکھا تھا، وہ ورثہ جس میں بد معاش سے بد معاش شخص بھی محلے میں آتے ہی نظریں نیچی کر لیتا تھا، بیٹی کے پیدا ہونے پر باپ شراب چھوڑ دیا کرتے تھے، کسی بھی عورت کے منہ سے بھائی کا لفظ سن کر ان کی آنکھوں میں شرم اور غیرت سب کچھ جاگ جایا کرتی تھی اور پھر ہم نے اس منہ لال کرنے کی دوڑ میں جس کو بھی چاہا جیسا چاہا نچوایا، جیسا ڈائلاگ چاہا بلوایا، جو لباس بھی آنکھوں کو گرمی دے سکتا تھا پہنوا یا اور سوچتے رہے کہ ہم مقابلے کی دوڑ میں کتنا آگے نکل سکتے ہیں؟

مجھے آج سے دس سال پہلے کھنڈو کے اسکول کے ایک پرنسپل سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس نے کہا ہمارے ہاں نیپال میں اکثر لوگ پاکستانی ثقافت سے محبت کرتے ہیں اور ہم بھارتی پروگراموں اور فلموں سے نفرت کرتے ہیں لیکن شاید اب میں نیپال جاؤں اور اس سے سوال کروں تو ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرمسار ہوں گے۔

لیکن کبھی کسی نے سوچا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد آج بھی گوادر کے شہر جیوانی سے لے کر گلگت کے شہر گھانچی تک دکانوں پر پوسٹر ملیں گے تو بھارتی اداکاراؤں کے، ویڈیو شاپس پر کیسٹس ملیں گی تو ہندوستانی فلموں کی، گھروں، ہوٹلوں، دکانوں میں گانے سننے جائیں گے تو بھارتی گلوکاروں کے۔ جس ملک میں دکانوں پر پاکستانی فلم ڈھونڈنا کسی نایاب کتاب ڈھونڈنے سے بھی مشکل ہو وہاں نیلم نورانی یا کوئی اور مقابلہ حسن جیت بھی آئے تو کیا ایٹھو ریا رائے یا سشمیتا سین کے پوسٹر اتروا سکے گی؟

ہو سکتا ہے کل ہم بھارت سے اس مقابلے، مسابقت اور دوڑ کو بھی جہاد کہنے لگ جائیں۔ جس ملک میں چینپا، بوسنیا، فلسطین اور افغانستان کے مظلوم مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑنا دہشت گردی ہو اور بھارت سے لڑنا جہاد، وہاں عثمان جیسے جنگجو ہی جہنم لیتے ہیں اور ایسے ہی مقابلہ حسن جیتنے کے محاذ کھولے جاتے ہیں۔



## محاذ

(18 صفر 1425ھ بمطابق 09 اپریل 2004ء)

شاید یہ حیران کن خبر میرے ملک کے بہت کم لوگوں تک پہنچی ہو کہ 9 جنوری 2002ء کو روشنیوں کے شہر کراچی میں ایک نوجوان محمد عثمان نے پاکستانی لڑکیوں کا مقابلہ حسن منعقد کروایا۔ اس میں 18 نوجوان لڑکیوں نے شرکت کی جن سب کا تعلق کراچی سے تھا۔ اس مقابلے میں 21 سالہ نیلم نورانی کو ”مس پاکستان“ کا تاج پہنایا گیا۔ یہ خاتون 30 ستمبر کو ٹوکیو میں ہونے والے ”مس ارتھ“ کے مقابلے میں شرکت کے لیے بھی پہنچ گئی۔ معلوم نہیں وہ اس مقابلے میں شریک ہوئی یا نہیں اور اگر شریک ہوئی تو کس نمبر پر آئی؟

پانچ فٹ چھ انچ قد اور ایک سو دس پونڈ وزنی نیلم امریکا کی ریاست ورجینیا میں ایک کالج میں پڑھتی ہے، یہ ریاست وائٹ ہاؤس سے چند میل کے فاصلے پر ہے، اس کا خاندان یہاں اس وقت منتقل ہوا جب وہ صرف تین سال کی تھی، وہ ڈانس کی ماہر ہے اور باسکٹ بال کھیلتی ہے۔ پاکستان میں ڈینیل پرل کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے والے اخبار ”وال اسٹریٹ جرنل“ نے مارچ میں نیلم کا انٹرویو چھاپا، اس نے کہا: ”ہم اللہ کی تخلیق ہیں اور ہمیں اس کی نمائش کرنا چاہیے۔“

کراچی شہر میں منعقد ہونے والا یہ پہلا مقابلہ حسن نہیں بلکہ عثمان کی کوششوں سے ایسے مقابلے اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں، ابھی چند ماہ پہلے اس نے ”مس کراچی“ کا مقابلہ حسن منعقد کروایا جس میں وفاز کی نے 19 سال کی عمر میں ”مس کراچی“ کا اعزاز حاصل کیا اور 23 سالہ صبا بلوچ 18 سالہ سعدیہ خان دوسری پوزیشن پر رہیں۔

یہ مقابلے 1994ء میں شروع ہوئے جب بھارت کی سشمیتا سین اور ایٹھو ریا رائے نے مس ورلڈ اور مس یونیورس کے ٹائٹل جیتے۔ اس سال کراچی میں منعقد ہونے والے مقابلے حسن میں جیتنے والی خاتون سحر ناز تھی، یہ عثمان کی پہلی کوشش تھی، عثمان کا کہنا ہے کہ اگر ہم ایٹھو ریا رائے پر بھارت کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو حسن کے محاذ پر کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا عجب مقابلہ ہے اور کیسی زبردست مسابقت ہے لیکن اس ساری دوڑ میں ہم کہاں جا نہیں گے؟ شاید بہت کم لوگ سوچتے ہوں گے لیکن میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کو تاریخ کے ایک چھوٹے سے سفر پر لیے چلتا ہوں۔

1970ء کی دہائی میں ہم نے آزادی اور اخلاقی پابندیوں کے طوق گلے سے اتارنے کا آغاز کیا۔ ہمارے ایک ہونہار سپوت نے ایک فلم بنائی جس کا نام تھا ”خطرناک“ یہ فلم جس سنیما میں لگتی وہاں نوجوانوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ دھینگا مشتی، لڑائی، بلک کیا کچھ نہ ہوا مگر فلم جہاں سنیما مالکان اور پروڈیوسر کی جیبیں بھر گئی وہاں بہت کچھ لوٹ کر بھی لے گئی..... چند ماہ بعد ایک اور اسی طرح کی فلم ”خانزادہ“ بنائی گئی، عریانی، تشدد اور فحاشی کا ایک ریلہ آیا اور سب

دیواروں پر سینٹ میں شیشے کے ٹکڑے کاٹ کر لگائے گئے ہیں۔

احمد آباد کے شہر کے وہ مکانات جو جلا دیئے گئے ہیں جن کے کھلے درپچوں اور صحنوں میں خزاں کے گرتے پتوں اور پھینکے جانے والے کوڑا کرکٹ کے سوا اب کچھ نظر نہیں آتا۔

ہاں! اگر کوئی جو ہاپور کا مسلمان وہاں آ نکلتا ہے تو اسے دلدوز چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ہندو غنڈوں کے ہاتھوں لٹی ہوئی مسلمان عورتوں کی آہ و بکا سے اس کے کان پھٹتے ہیں، جلتے ہوئے معصوم بچوں کے چہرے اسے یاد آ جاتے ہیں اور وہ اس منظر سے بھاگ کر اسی بستی میں جا بیٹھتا ہے جسے مسلمانوں کی بستی کہتے ہیں اور جس کے چہرے پر بے خانماں اور بے یار و مددگار ہونے کا دکھ لکھا ہوا ہے۔

یہ وہ دو قومی نظریہ ہے جو آج احمد آباد کی سرزمین پر تحریر ہوا ہے لیکن اس سارے المیے میں ایک واقعہ مجھے خوف کے ایک عجیب عالم میں لے جاتا ہے۔ احمد آباد سے تھوڑی دور مسلمانوں کی ایک بستی نارودہ پاتہ ہے، اسی چھوٹی سی بستی کے 91 مسلمان بچے اور عورتیں قتل کر دیئے گئے تھے، اس بستی میں کوئی اسکول نہ تھا، یہ معصوم بچے اور بچیاں احمد آباد کے علاقے میں پڑھنے جاتے تھے، چند دن پہلے اس بستی کے مسلمان اینٹ اور گارے میں لت پت کھڑے تھے اور اس بستی کے بالکل مرکز میں اپنے بچوں کے لیے اسکول تعمیر کر رہے تھے۔

ایک سماجی کارکن عبدالحمید اکبر جو اس اسکول کی عمارت تعمیر کرنے میں پیش پیش تھا جب اس سے سوال کیا گیا کہ صرف چند سو گز پر اسکول واقع ہے تو ایسا کیوں کر رہے ہو اس کا صرف ایک جواب تھا۔ دنیا کی کوئی تسلی، کوئی وعدہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ خوف نہیں نکال سکتا کہ ان کے بچے اور بچیاں اگر ہندوؤں کے علاقے میں پڑھنے جائیں گے تو شام کو زندہ گھر واپس آئیں گے بھی یا نہیں؟ ان کے عزتیں بھی محفوظ ہوں گی یا نہیں؟

مجھے معلوم ہے کہ میرے ملک کے بہت سے صاحبان جاہ و حشم کو، نوجوانوں کی ٹولیوں کو اور دانشوروں کے گروہوں کو ایٹھو ریا رائے کی مسکراہٹ اچھی لگتی ہے، ارمیلا کی آمد پر ان کی باجھیں کھل جاتی ہیں، سونوگم اور دلیر مہندی کے گانوں پر انہیں رقص کرنے کو جی چاہتا ہے..... مگر میں اپنی اس بے خوابی کا کیا کروں جو صرف اس لیے میرے گھر میں بسیرا کر لیتی ہے کہ عین ان مسکراہٹوں، گیتوں اور رقص کرتی خوبصورتیوں کے ساتھ ساتھ وہ جو بیڑ پٹی ہے جس میں دو سال سے ایک لٹی پٹی قوم آباد ہے، خوفزدہ ہے، مجبور ہے، تعفن زدہ علاقے میں رہتی ہے۔

بس میرا اور اس کا ایک ہی رشتہ ہے وہ اس اللہ پر ایمان رکھتی ہے، اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتی ہے، اس دین سے وابستہ ہے جس سے میں ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میرے آنسو نکل آتے ہیں جب میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ ارمیلا اور ریشم کے لیے واہمہ بارڈر عبور کرنا کتنا آسان ہے..... لیکن جو ہاپور، نارودہ پاتہ کا مسلمان احمد آباد کے ہندو علاقے میں جاتے ہوئے خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ گھر والے اس کی واپسی تک دست بدعا رہتے ہیں۔

دو قومی نظریے کی جو لکیر ہم پھولوں کے ہاروں سے منانے کی کوشش کرتے ہیں اسی بھارت کے تنگ نظر ہندو مسلمانوں کے خون سے پھر کھینچ دیتے ہیں۔

## دو قومی نظریے کی لکیر

(02 ربیع الاول 1425ھ بمطابق 23 اپریل 2004ء)

خواب دیکھنے والوں اور مسکراہٹوں، پھولوں کے ہاروں اور ہزاروں سال پرانی موسیقی کی تانوں پر جھومنے والے اس مختصر ہجوم کو جو آج کل میرے ملک کے اخبارات اور ٹیلی ویژن اسکرین پر چھایا ہوا ہے۔ میں صرف چند لمحوں کے لیے حقیقت کی دنیا کے ایک جہنم میں لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ وہ عبرت کدہ ہے جو اس برصغیر کی تاریخ ہے، یہ وہ زخم ہے جو کتنے سال سے رس رہا ہے، یہ وہ چیخ ہے جو مسلسل گونج رہی ہے، یہ منظر تو اگست 1947ء کا ہے اور نہ ہی اس دور کا جب ہمارے اور بھارت کے درمیان نفرتیں عروج پر تھیں۔

یہ آج کے شب و روز کا چیتا چلاتا منظر ہے۔ یہ جو ہاپورہ کی کچی آبادی ہے جسے بھارت میں رہنے والے جھوپڑ پٹی کا نام دیتے ہیں۔ یہ جو ہاپورہ آج سے دو سال پہلے آباد نہیں تھا۔ فروری 2002ء سے پہلے یہاں کسی بستی کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ بے خانماں، اُڑے اور لٹے پٹے مسلمانوں کی بستی ہے جو احمد آباد سے صرف پانچ کلومیٹر دور خوف کے عالم میں آباد ہو گئی تھی۔ اس بستی میں زمینوں پر بچھانے والے بستر بیچنے والے ایک 19 سالہ نوجوان علی نور منصور رائٹر (Reuters) کے ایک صحافی کے سامنے صرف چند دن پہلے بچکیوں سے رونے لگ گیا۔

اس نے کہا کہ میں گجرات کے 50 لاکھ مسلمانوں میں سے ایک ہوں، میرے 19 رشتے دار بلوایوں نے قتل کر دیئے اور میری 70 سالہ ماں کو زندہ جلا دیا۔ میں زندہ بچ کر اس متعفن علاقے میں آ گیا لیکن آج بھی رات کو آگ میں پھینکے ہوئے بچوں اور عورتوں کی وہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جو بار بار اللہ کے نام پر مدد کے لیے بلند ہو رہی تھی۔

علی نور منصور صرف ایک نہیں اس جیسے ہزاروں لٹے پٹے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ ان مسلمانوں میں ڈاکٹر بھی ہیں انجینئر بھی اور سرکاری ملازم بھی۔ یہ سب اس کچی آباد سے روزانہ اسی احمد آباد شہر میں جا کر ملازمت کرتے ہیں جہاں اب مسلمانوں کا ٹھکانہ تک نظر نہیں آتا۔ البتہ مسلمانوں کے جلے ہوئے گھر اور دکانیں آج بھی نشانِ عبرت کے طور پر موجود ہیں۔

گلبگر کے علاقے میں ممبر اسمبلی احسان جعفری کا گھر وہ تماشہ گاہ ہے جس کی جلی ہوئی خاکستر سے اس کے خاندان کے 38 مرد و زن کی لاشیں نکلیں تھیں، اس گھر کے دروازے اور کھڑکیاں لٹکی ہوئی ہیں اور عین اس گھر کے سامنے ہندوؤں کی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی دکانیں ہیں جہاں دن رات وہ گیت اونچی آواز میں بلند ہوتے رہتے ہیں جن سے اب میرے ملک کا ہر کوچہ اور محلہ بھی آشنا ہو چکا ہے۔ جو ہاپورہ کی بدبودار اور ناقابل رہائش آبادی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مکانات کی ایک لمبی قطار ہے جس کے ارد گرد خاردار تاریکی باڑ ہے، اونچی اونچی دیواریں ہیں اور ان

مالا مال مشرقی علاقہ علیحدہ ہو جائے جہاں امریکی حکومت کا اثر ہو اور عرب صرف مکہ اور مدینہ تک محدود ہو جائیں، آج عراقیوں کی جدوجہد پر انگشت بندناں ہیں۔ بش کی تقریریں لکھنے والا رچرڈ پریل جو انہیں کا حصہ ہے اور اس کے ساتھ جو امریکی انٹرپرائز انٹیلیجنس میں کام کرتے ہیں اس بوکھلاہٹ میں کبھی ”حزب اللہ“ کا نام لیتے ہیں کبھی ایران کا۔ انہی کا ایک ساتھی روبن لاس اینجلس ٹائم میں یہ تیہوری لے کر آ گیا کہ عراقی عوام ہمارے ساتھ ہیں یہ چند لوگ تو ایران کی مالی مدد کی وجہ سے لڑ رہے ہیں۔

لیکن جس وقت یہ سب لکھا جا رہا تھا اور امریکا کو تسلیاں دی جا رہی تھیں اور کہا جا رہا تھا کہ بس چند دن کی بات ہے آپ ایران پر حملہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا، ٹھیک اسی ہفتے عیسائیوں کے تہوار ایسٹر کے دن لوگ اچانک امریکا کے 50 سے زائد شہروں میں عراق کی جنگ کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

واشنگٹن کے شہری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایسا تو صرف 30 سال پہلے ویتنام کی جنگ میں ہوا تھا کہ لوگ ایسٹر کی چھٹیاں چھوڑ کر سڑکوں پر احتجاج کرنے نکل آئے ہوں۔ بالٹی مور، بوٹن، نیویارک سے لے کر سان فرانسسکو اور لاس اینجلس تک ایک کونے سے دوسرے کونے تک کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں یہ مظاہرے ہوئے ہوں اور انہوں نے انہیں مستقل طور پر کرنے کا اعلان نہ کیا ہو۔

ادھر کمیوں کی اس جھنجھلاہٹ میں لڑنے والے اور جھنجھلاہٹ کا شکار بڑا حجم رکھنے والی فوج بھی چیخ اٹھی۔ کرنل ڈیوڈ بیک روتھ نے چاروں طرف دہائی دے دی اور اپنی ویب سائٹ www.Sftt.org میں کہا کہ امریکی حکومت اپنے سپاہیوں کو آگ میں دھکیل رہی ہے۔ موت کے منہ میں پھینک رہی ہے۔ جسے دنیا کی سب سے زیادہ مضبوط اور ہتھیاروں سے لیس فوج کہا جاتا ہے اس کے سپاہیوں کے پاس بلٹ پروف جیکٹس بھی نہیں۔

اس نے کہا میں نے ان سپاہیوں کو جو عراق بھیجے جا رہے ہیں بازار سے ایسا سامان خریدتے ہوئے دیکھا ہے جو جان بچانے کے لیے ضروری ہے۔ امریکی حکومت انہیں جان لینے کا سامان تو دے رہی ہے لیکن جان بچانے کا نہیں دیتی..... اس نے ہزاروں سپاہی مردوں اور عورتوں کے انٹرویو لیے اور کہا کہ جان دینے والوں اور آگے جا کر لڑنے والوں میں میجر کے رینک سے اوپر کوئی شخص نہیں ہے اور سب سے خوفناک بات یہ ہے کہ عراق میں کام کرنے والے سپاہیوں کو ایک خط کی کاپیاں دے گئیں کہ اسے اپنی تحریر میں لکھو اور اپنے گھر والوں کو بھیجو کہ عراق میں سب ٹھیک ہے۔ لوگ ہمیں بہت محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ اسے فوج میں Boiler Plate Letter کہا جاتا ہے۔

میں یہاں ان 800 امریکی لاشوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو تابوتوں میں بند واپس جا چکی ہیں۔ ان خوفزدہ امریکیوں کا ذکر کیا کروں جن کے بیانات روز اخبارات میں چھپتے ہیں اور وہ روتے ہوئے کہہ رہے ہوتے ہیں: ”ہم ابھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں موت سے خوف آتا ہے اور عراق تو موت ہے۔

لیکن میرا خوف عجیب ہے اس کتے اور مکھی کی جنگ میں یہ تو طے ہے کہ کتا بھاگنا چاہتا ہے، وہ زچ ہو گیا ہے جھنجھلاہٹ کا شکار ہے لیکن اس جھنجھلاہٹ میں وہ ایک بات کرنا چاہتا ہے اپنی جگہ اپنی قامت اور سائز کا ایک کتا کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ بیشک اسے بنانے کی لیے دنیا جہاں سے سپاہی لانا پڑیں، ایسے میں سب سے زیادہ زور اسی پر چلتا ہے جو سب سے زیادہ مطیع ہے، فرمانبردار ہے، ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔



## کتے اور مکھی کی جنگ

(09 ربیع الاول 1425ھ بمطابق 30 اپریل 2004ء)

دیت نام کی جنگ میں جہاں اس ملک کے بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے وہاں دنیا بھر سے لوگ امریکی استعمار کے خلاف لڑنے کے لیے آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کے لیے جنگ لڑنے والوں اور ان کی مدد کو آنے والوں کو دہشت گرد نہیں کہا جاتا تھا اس لیے اس وقت امریکی خفیہ اداروں کو بدنام کرنے کے لیے ایک لفظ کمیونسٹ ملا ہوا تھا۔ اس جنگ میں فرانس کی اشرافیہ کا ایک امیر ترین شخص بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر دیت نام جا پہنچا اور جب تک امریکی شکست کھا کر وہاں سے روانہ نہیں ہوئے یہ وہاں ان غریب دیت نامیوں کی اپنے پیسے اور اپنی صلاحیتوں سے مدد کرتا رہا۔

اس نے اس گوریلا جنگ کے بارے میں واپس جا کر ایک کتاب تحریر کی جس کا نام (War Of Flea) یعنی کتے اور مکھی کی جنگ۔ اس نے کتاب میں گوریلا کو مکھی اور قابض فوج کو کتے سے تعبیر کیا ہے۔

وہ کہتا ہے: ”جب مکھی کتے سے انتقام لینے پر آتی ہے تو کبھی وہ اس کی دم پر بیٹھتی ہے، وہ وہاں کاٹتا ہے، پھر پشت پر، پھر کان پر، کبھی آنکھ پر اور پھر کتا اپنے آپ کو کاٹ کاٹ کر پاگل ہو جاتا ہے اور پھر آخر کار دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔“ کتے اور مکھی کی جنگ آج بھی جاری ہے اور میدان جنگ اتنا گرم ہو چکا ہے کہ نہ صرف کتے کے پاگل پن میں اضافہ ہوتا رہا ہے بلکہ یوں لگ رہا ہے کہ اس کے کاٹنے کی وجہ سے اس کے اپنے اعضا نے بھی اس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ عراق جہاں مسرت کے شادیانے بجاتے امریکی سپاہی، دنیا بھر کے سرمایہ دار امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں داخل ہوئی تھیں اور آئندہ آنے والے 50 سال کی منصوبہ بندیاں کر رہی تھیں آج کمزور، نحیف اور بے سروسامان مکھیوں کی طرح جھنجھکتا ہوئے عراقی عوام کے سامنے بے بس ہو چکی ہیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اور کہاں سے ہو رہا ہے؟

ویتنام میں سپاہی مرتا تو وہ روس اور چین کا کوئی الزام دے دیتے کہ سب ان کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اسلحہ دے رہے ہیں، گوریلا بھرتی کر کے ٹریننگ دے کر بھیج رہے ہیں..... لیکن یہاں ان نہتے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے مسلمانوں کا کوئی ملک بھی تیار نہیں، سب خوفزدہ سب سہمے اور امریکا کے حضور ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔

یہ پاگل پن اور جھنجھلاہٹ چاروں طرف ہے، امریکا میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا گروہ (Neocons) جس میں 50 کے قریب شدت پسند یہودی شامل ہیں اور جو امریکی نائب صدر ڈگ چینے کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں اور جو مشورہ دیتے نظر آتے تھے کہ صدر بش کے اس دور اقتدار سے پہلے شام، ایران، پاکستان اور دیگر مسلم ممالک پر حملہ کر کے دہشت گردی ختم کر دی جائے اور سعودی عرب میں ایک ایسی تحریک چلائی جائے کہ اس کا تیل کی دولت سے

گا۔ مسلمان ہمارے دشمن ہیں اور ہم مسلمانوں کے دشمن۔“

اور پھر صدیوں تک ہر بچے کو جب وہ 12 سال کی عمر میں پہنچتا یہ حلف دیا جاتا رہا۔ خلافت عثمانیہ کے حکمرانوں کو خبر ملتی، تفتیش شروع ہو جاتی تو یہ لوگ گھروں سے یہودیت کے آثار تک مٹا دیتے۔ حکمران کچھ نہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کے دلوں میں شک یقین کی حد تک گہرا تھا اور جب ان کی تعداد بڑھی تو انہوں نے اپنے لیے علیحدہ علاقہ منتخب کیا۔ اپنی مسجد بنائی یہ وہاں بظاہر قرآن پاک وغیرہ رکھتے لیکن اندرون خانہ ”تورات“ کی تعلیم دیتے۔ باہر عمارتیں پہنتے اور گھروں میں مخصوص یہودی ٹوپی۔ رات کو تراویح کا اہتمام اور افطاری کی مجلس کرتے لیکن دن کو دوپہر میں کھانے پر اکٹھے ہوتے۔ ان میں اکثریت عماموں کے نیچے اپنی مخصوص ٹوپی پہنے رہتے۔ کئی بار اس کی وجہ سے پکڑے گئے لیکن عذر کر کے صاف بچ نکلتے۔

ان کا ایک رہنما جوزف زی جی کرنے اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ مکرمہ بھی گیا۔ وہاں بھی یہ لوگ مسلمانوں سے الگ رہے۔ اسی نے ان کے قواعد و ضوابط وضع کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مکہ میں داخل ہونے کی توفیق نہ دی اور وہ راستے میں مر گیا اور پھر اس کی موت کے دن کو یہ لوگ تہوار کے طور پر منانے لگے، یہ اپنے روحانی پیشوا اشیتا کو ”سرنا کامیجا“ کہتے تھے۔ اور پھر سالوں بعد ان کا خواب پورا ہونے کے دن آ گئے۔ مسلمانوں اور عیسائی طاقتوں کو آپس میں لڑنے کا خواب۔ ایسے میں ”ودن ماہ“ کے علاقے سے یگ ترکس (نوجوان ترکوں) کی مہم شروع ہوئی اور اسی قبیلے کا ایک فرد اتاترک اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ سالونیکا کے اس محلے میں رہائش رکھتا تھا۔

یہ اس تحریک کو لے کر آگے بڑھا اور پھر مسلمانوں سے ان کی شناخت چھیننے کا وہ کام جو یورپ صدیوں تک نہ کر سکا اتاترک نے کر دکھایا۔ عبادت اور دعائیں اور اذان ترکی زبان میں ہو گئی، مسجدوں میں آرگن اور پیانو رکھ دیئے گئے۔ مسلمان عورتوں کی غیر مسلم مردوں سے شادی کو رواج دیا گیا، پردہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور صرف 10 سال میں خلافت عثمانیہ کا دھڑکتا ہوا دل ترکی بدترین لامذہبیت کا مرکز بن گیا اور اسی کے حکم نامے سے اللہ کو ترکی نام ”تاتھری“ سے پکارا جانے لگا۔ حیرت کی بات یہ کہ اس شخص کو اسلام کا شیدائی اور مسلمانوں کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا کہ وہ عیسائیت کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ وہ شخص جس نے اپنی کابینہ کے ایک شخص کے منہ پر نعوذ باللہ قرآن پاک کھینچ کر مارا تھا کہ اس نے صرف یہ کہا تھا مسلمان عورتیں رقص گاہ نہیں جائیں گی۔ جس نے اپنی تقریر میں کہا اسلام جو ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب تھا اب مردہ ہو چکا ہے۔

یہ صرف صحرا کے بدوؤں کے لیے بہتر تھا ایک جدید اسلامی ملک کے لیے نہیں۔ ایک دفعہ کسی موزن نے مسجد سے اذان دی، وہ اس وقت موسیقی سن رہا تھا اس مسجد کے مینار گرانے کا حکم دے دیا۔ آج بھی یہ مسجد میناروں کے بغیر ترکی کے شہر قسطنطنیہ میں موجود ہے۔

جارج ٹینٹ کا سی آئی اے کا پروگرام پڑھتا ہوں تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔ خوف سے دل دھڑکنے بند کر جاتا ہے۔ جو مسلم امت آج تک عبد اللہ بن سبا کے لگائے گئے زہموں سے لہو لہان ہے، جس کے دامن پر اتا تاک کے یہودی خاندان کے لگائے گئے داغ اتنے بدنما ہیں کہ دھونے سے نہیں دھلے، پتا نہیں آج اس کی صفوں میں، مسجدوں اور مدرسوں میں کتنے ایسے لوگوں کو داخل کر دیا گیا ہو جو کل کو نکلیں تو نہ انہیں ہم شکل و صورت سے پہچان سکیں اور نہ قول و فعل سے..... اور پھر ہم ایک عمر اس منافقت کے لگائے ہوئے زہموں سے چھڑکا رہا حاصل نہ کر سکیں۔



## منافقت کے زخم

(16 ربیع الاول 1425ھ بمطابق 07 مئی 2004ء)

”اب ہم مسلمان نہیں خریدیں گے، ہمیں اسلام کے اصولوں کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کے لیے کسی ماڈریٹ لیڈر کی ضرورت نہیں۔ یہ کسی نہ کسی وقت عوام یا ملاؤں کے خوف میں آ جاتا ہے، ہم اپنے ملا خود بنائیں گے، انہیں مسلمانوں کے مدارس میں تعلیم دلوائیں گے، انکی وضع قطع، گفتگو اور چال ڈھال کو ایسے رنگ میں رنگ دیں گے کہ کسی کو شک تک نہ گزرے کہ یہ کہاں سے، کیوں آئے؟ اور ان کا مقصد کیا ہے؟ سب ان کی باتوں پر ایمان لائیں گے اور پھر جو ہم چاہتے ہیں وہ مننوں میں ہو جائے گا۔“

یہ الفاظ امریکی سے آئی اے کے موجودہ ڈائریکٹر جارج ٹینٹ کے ہیں۔ اس نے یہ الفاظ رونا لڈکسلر کو کہے جسے اس نے سی آئی اے کی جنگی حکمت عملی پر کتاب لکھنے کے لیے مدعو کیا۔ اپنی تمام تر معلومات اس کے سامنے رکھ دیں اور پھر اس نے ایک کتاب لکھ ڈالی ”CIA at war“ اس کتاب میں آئندہ کے لیے سی آئی اے کے عزائم اور گزشتہ ناکامیوں سے سبق، سب کچھ موجود ہے۔

یہ سب پڑھنے کے بعد پتہ نہیں کیوں میرا ذہن دسمبر 1886ء کے سرد موسم کی طرف لوٹ گیا۔ خلافت عثمانیہ کا ایک شہر سالونیکا جو مسلمانوں کے خطے بوسنیا کا دل سمجھا جاتا تھا، یہ وہ علاقہ تھا کہ جب اسپین میں فرڈیننڈ اور ازابیلا نے اقتدار سنبھالا تو خوف کھائے ہوئے یہودی بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی اس سرزمین پر پناہ کے لیے آئے تھے۔ انہیں یہاں آباد ہوئے کئی صدیاں بیت چکی تھیں۔ پوری دنیا ان کے خون کی پیاسی تھی اور اگر کہیں امان میسر تھی تو مسلمانوں کے ہاں..... لیکن دسمبر 1886ء میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہو گیا۔

سالونیکا کے شہر میں آباد 300 سے زائد یہودی خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سب اپنے ایک مذہبی اور سیاسی رہنما اشیتا نامی شخص کی ترغیب پر مسلمان ہوئے۔ سب مسلمانوں کے لیے یہ خبر حیران کن بھی تھی اور اچھنبے کا باعث بھی۔ انہیں ان خاندانوں جنہیں مارانوز (Marnoz) کہتے تھے، کی مسلمان دشمنی کا علم تھا لیکن اچانک یہ لوگ مسجد جانے لگے، نماز شوق سے پڑھتے اور رمضان کے مہینوں میں روزے بھی رکھتے اور رات بھر عبادت بھی کرتے..... لیکن پڑوسیوں کو حیرت ہوئی کہ گھروں میں ابھی تک یہودی رسوم و رواج اور عبادت کے طریقے برقرار ہیں۔ مسلمانوں نے باطن کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا اور انہیں ”ودن ماہ“ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

بعد میں ان کے علم میں آیا کہ یہودی رہنما نے مسلمان ہونے والوں سے کہا تھا، میں اللہ کی طرف سے خاص بندہ ہوں اور دس شتوں پر مشتمل ایک حلف تم سے لیتا ہوں۔ حلف کے الفاظ تھے: ”میں کبھی ترکوں کے رسوم و رواج اختیار نہیں کروں گا لیکن اس طرح کہ انہیں اس کا شک بھی نہ ہو۔ میں صرف لوگوں میں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کروں گا لیکن اندر سے کبھی مسلمان نہیں ہوں گا میں کبھی مسلمان خاندان میں شادی نہیں کروں گا اور نہ ان سے کوئی تعلق رکھوں



اب تک بے شمار سائنسدان، انجینئر، فزکس کے ماہر اور ذہین لوگ قتل کیے جا چکے ہیں۔ یہ نئے لوگ نہ تو گرفتار کیے جاتے ہیں اور نہ ہی ان پر کوئی روک ٹوک ہے۔ بس چپکے سے خبر ملتی ہے کہ وہ کسی چپک پوسٹ سے گزرے تھے اور ایک کولی ان کو خون میں نہلا گئی۔ یہ وہ ذہین لوگ تھے جو اس قوم کا سرمایہ تھے۔

پروفیسر نے لکھا یہ کام خفیہ طور پر اسرائیل اور سی آئی اے مل کر رہی ہیں تاکہ کل کسی بھی وقت اگر عراقی عوام آزادی حاصل کر لیتے ہیں تو اس جذبوں سے بھری قوم کو جس نے خون دے کر آزادی حاصل کی ہوگی، یہ سائنسدان اپنے علم سے دوبارہ ایٹمی ٹیکنالوجی کی طرف گامزن نہ کر دیں۔ چند ہفتے پہلے جب ان پروفیسروں کے ایک نمائندہ عبداللطیف المایہ نے ان تمام ہلاکتوں کا ذکر عربی ٹیلی ویژن کے ایک نمائندہ کے سامنے کیا تو الجزیرہ ٹی وی کے دفتر سے نکلنے سے گھر پہنچنے تک وہ قتل کیا جا چکا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کوئی پروفیسر، سائنس دان یا عالم ٹیلی ویژن پر انٹرویو دینے نہیں آیا۔

اس سارے پس منظر اور خاموش ہلاکتوں کے بعد عراق سے ایسے صاحبان علم کا انخلاء شروع ہوا ہے۔ عراق سے بھاگ کر کینیڈا آنے والے ایک معتبر سائنسدان نے کہا کہ عراق کے عوام ہمیں اب کئی کئی دن چھپا کر گھروں میں رکھتے ہیں جیسے یہ ان کی کوئی قیمتی متاع ہو، پھر ہمیں خاموشی سے ملک سے بھاگ جانے میں مدد دیتے ہیں۔

جاتے ہوئے ان لوگوں کے فقرے عجیب ہوتے ہیں: ہم لڑ رہے ہیں، ہم تو ایک دن فتح یاب ہوں گے، خواہ شہادت کی موت حاصل کریں..... لیکن ایک دن جب ہمارے خون سے آزادی کی تحریر لکھی جائے، اس لئے بچے بغداد پر بہار آئے تو تم واپس آ جانا اس لیے کہ ہمارا خون اس گلستان کو آزاد کرنے کے لیے ضروری ہے اور تمہارا خون اس گلستان کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے۔



## بغداد میں علم و آگہی پر قیامت

(23 ربیع الاول 1425ھ بمطابق 14 مئی 2004ء)

ہلا کہ جب بغداد میں داخل ہوا تو یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا بھر میں پھیلی چاروں جانب جہالت کی تاریکی میں صرف مسلمانوں کی لائبریریاں اور سائنسی تحقیق کی لیبارٹریاں علم و آگہی کے خزانوں سے مالا مال تھیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک یا خطہ ایسا تھا جس میں سائنس، فلسفہ، طب، فلکیات، ریاضی اور دیگر تمام علوم کے ماہریں جمع ہوں جیسے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے۔

آج بھی کسی بھی علم کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اگر کہیں اس کے آغاز سے پھوٹی تحقیق پر کسی مسلمان کا نام ہوگا تو کہیں اس علم کی نئی راہیں متعین کرنے والا کوئی صاحب علم مسلمانوں کی علمی میراث کا امین ہوگا۔ بوعلی سینا کی طب سے لے کر ابن الہیثم کی ریاضی تک کوئی ایسا علمی میدان نہیں جہاں اس دور کے مسلمانوں نے اپنے نشان نہ ثبت کیے ہوں۔ لیکن چراگا ہوں، خانہ بدوش بستیوں اور جنگوں میں پلنے والے منگول جب بغداد پر چڑھ دوڑے تو جہاں انہوں نے عام شہریوں کا قتل عام کیا، دنوں تک مسلمان کے خون سے ہولی کھیلی، وہاں اس بغداد کے سب سے بڑے کتب خانے کو آگ لگا دی جس کی راکھ سے دریائے دجلہ کا پانی کئی دن تک کالا رہا۔ ہلا کہ شاید یہی سمجھتا تھا کہ علم صرف کتب خانوں میں موجود کاغذوں تک محدود ہوتا ہے اس لیے اس نے قتل و غارت کرتے ہوئے ان پڑھ اور پڑھے لکھے، جاہل اور عالم کسی میں کوئی تمیز نہ کی۔

مگر اکیسویں صدی کا ہلا کہ جب اسی شہر میں داخل ہوا تو جہاں اس نے ظلم و ستم کی روایت کو قائم رکھا وہاں اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ وہ قوم ہے کہ اس میں واپس پلٹنے اور کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرنے کی تڑپ ضرور باقی رہتی ہے۔ یہاں برطانیہ کی فوج جنگ عظیم میں صرف چند ماہ قابض رہ سکی تھی اس لیے امریکی فوج عام شہریوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عیار منصوبہ سازی کی اور آج کے سال گزرنے تک وہ اس منصوبے پر خاموشی سے عمل کر رہا ہے۔

اس منصوبے کے تحت ایک اندازے کے مطابق عراق کی یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں اور سائنسی تحقیق کے مراکز سے قابل، ذہین اور نابغہ روزگار سائنسدانوں، عالموں اور محققوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ پروفیسروں اور سائنس دانوں کے قتل کا آغاز مئی 2003ء میں کیا گیا جس کا نشانہ سب سے پہلے پروفیسر فلاح حسین تھا جو مستنصریہ کالج آف سائنس کا انچارج تھا اور اس کے بعد روز کسی نہ کسی سائنس دان، انجینئر اور صاحب علم کو مارنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دوسرا قتل بغداد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد البرادی تھا، البرادی کے قتل کے بعد پورے بغداد کے پروفیسروں میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی، مستنصریہ کالج کے پروفیسر اسماعیل محمود محمد عیسیٰ نے سائنس مانیٹر میگزین کو لکھا

ہوسام شلغاذٹ جو مصر میں پیدا ہوا اور امریکا کی شہریت اختیار کر گیا، گزشتہ سال جب امریکا کے بہت سے سرمایہ دار عراق میں روپیہ کمانے کی لالچ میں وہاں پہنچے تو ان میں ہوسام بھی تھا لیکن اس کا عصری تعلق اسے متنبہ کرنے کے لیے کافی تھا، اس کو فوراً پکڑ کر فوج کے اذیت کمپ (Detention Centre) بکھ میں لے جایا گیا۔

رہا ہونے کے بعد اس نے امریکا کی ایک دور دراز ریاست SeaTle کے اخبار Seattle Times کو 8 مئی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ”ابو غریب کے جیل خانہ کی تصاویر اور ظلم کی داستان تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو اس نے بکھ کے اذیتی کمپ میں دیکھا ہے۔ کتوں کی طرح بوکھلائے ہوئے امریکی سپاہی جب عراق کے شہروں سے اپنی لاشوں کے ساتھ عام شہریوں کو بھی اٹھا کر لاتے ہیں تو تشدد کا عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کے چہروں پر اور ماتھوں پر سگریٹ یا چاقو سے شترسوار (Camel Johey) یا پھر میں نے ایک امریکی کو قتل کرنے کی کوشش کی (I Tried to Kill an Amrican) کھود دیا جاتا ہے۔“

شلغاذٹ نے کہا میرے سامنے ایک 14 سالہ عراقی بچے کو لایا گیا اور اندر پھینکتے ہی دو سپاہیوں نے اس کے بازو ایسے مروڑے کہ وہ جڑ سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اس ”بکھ“ کمپ میں ایک خاتون سپاہی کچھ عراقی قیدیوں کو ایک جگہ جمع کرتی ہے اور پھر اس کے پاس ایک غلیل نما ہتھیار ہوتا ہے جس میں وہ پکڑے کو اسپرٹ میں بھگو کر اسے آگ لگا کر ان پر پھینکتی ہے جس سے ان کے جسم کے حصے آگ سے جھلس جاتے ہیں۔

اس نے ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے شرمندگی اور ندامت سے سر جھکا لیا جو امریکی سپاہی ان عراقی قیدیوں کے ساتھ بھیانک طور پر جنسی تشدد کی صورت میں کرتے ہیں۔ یہ بیان ابھی چھپا ہی تھا کہ امریکا کے سینٹروں نے وہ فلمیں اور وہ تصاویر امریکی فوج کے ہیڈ کوارٹر میں دیکھیں جو عراقی خواتین پر تشدد، تذلیل اور بے رحمی سے متعلق تھیں۔

میں وہ تفصیل شاید نہ لکھ سکوں کہ نہ قلم میں اتنا حوصلہ ہے اور نہ دل میں اتنی طاقت، آنسو ہیں جو اس عالم بے بسی میں آنکھ سے رواں ہیں لیکن پتا نہیں کیوں ان آنسوؤں کے درمیان شدت سے غصہ اور نفرت عود کر آئی ہے جب میں انہی مجرموں کو انسانیت کے ان لیٹروں کو مسلمانوں کی سر زمین پر جہازوں سے اترتے، استقبال کھانے کھاتے، اکٹھی پریس کانفرنسیں کرتے اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ملاتے دیکھتا ہوں اور پھر اس خاموش اُمت کی طرف دیکھتا ہوں جس کے رو برو یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔

ظلم پر خاموش رہنے کے جرم پر تو تاریخ شاہد ہے اللہ نے کسی قوم کو معاف نہیں کیا خواہ روم میں رہنے والے ہوں یا فارس کے باسی یوں غرق ہوئے کہ ان کا نشان تاریخ میں ملنا مشکل ہو گیا۔



## کتا یونٹ کے سپاہی

(30 ربیع الاول 1425ھ بمطابق 21 مئی 2004ء)

آپ کو علم ہے اس کی تربیت، اسے مختلف ہنر سکھانے اور اسے جاسوسی میں طاق کرنے پر پورے 50 ہزار امریکی ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ 50 ہزار امریکی ڈالر یعنی تقریباً 30 لاکھ پاکستانی اور عراق میں ایسے 50 کے قریب کتوں کی جان خطرے میں ہے۔

ان کتوں کی ایک پوری یونٹ ہے جس کے انچارج اسٹاف سارجنٹ زیلیکی نے اپنی ہائی کمان کے سامنے چیخ بچ کر کہا: ”یہ کتے چیک پوسٹوں پر ڈیوٹیاں دیتے ہیں، گھروں، دکانوں، قید خانوں اور سڑکوں کے کنارے اپنی تیز ناک سے چھپے ہوئے بارود کے ذخیرے اور اسلحہ کے ڈھیر دریافت کرتے ہیں، دشمنوں کا تعاقب کرتے ہیں لیکن ظالم عراقی انہیں پتھروں سے اینٹوں سے زخمی کر دیتے ہیں، ان پر گولیوں سے نشانے لیے جاتے ہیں اور آج میری اس کتا یونٹ نے کئی ”سپاہی“ زخمی ہو کر اسپتال میں پڑے ہیں۔“

دنیا بھر میں انسانی جانوں سے کھیلنے والی امریکی فوج کی ہائی کمان میں فوری طور پر جانوروں کی ہمدردی جاگ اٹھی اور کہا کہ ان کی حفاظت کے لیے فوری اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ اسی میٹنگ میں ان کتوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے افغانستان میں تعینات 189th ایک پیٹائلین کے انچارج برسن ہینز نے کہا: ”یہ کتے اتنے اہم ہیں کہ افغانستان کے مجاہدین نے ایک کتے کو مارنے کے لیے 10 ہزار امریکی ڈالر انعام رکھا ہوا ہے۔“

فوراً امریکی فوجی کمان حرکت میں آئی اور امریکی کمپنیوں کو ایک خاص قسم کی بلٹ پروف جیکٹ ترتیب دینے کے لیے کہا گیا جس کی لاگت تقریباً 1500 امریکی ڈالر تھی اور یہ 25 کلو گرام وزنی جیکٹ پہلی دفعہ چند دن قبل 95th ملٹری پولیس کی پٹائلین کو دی گئی جس نے اپنے کتوں سمیت اور کیسز کو پہنائی لیکن اب بھی یہ کتے عراقی غیض و غضب سے نہ بچ سکے۔ کوئی تاک کر ان کے منہ کا نشانہ لیتا اور کوئی انہیں دیکھ کر ان کے پاؤں تلے کانچ کے ٹکڑے بکھیر دیتا۔ اب ان کے لیے خاص قسم کے بوٹ بنائے گئے ہیں اور سر پر ایک مخصوص ہیلمٹ ہے جس سے ان کتوں کی صرف ناک باہر رہتی ہے تاکہ بارود کی بوسگھتی پھرے اور دشمنوں کو تلاش کرتی رہے۔

یہ سب کچھ ان دنوں میں ہو رہا تھا جب پوری دنیا ”ابو غریب جیل“ میں ہونے والے انسانوں پر تشدد، بے رحمی اور ظلم کی تصویریں چھپ رہی تھیں، انسانی تہذیب سے عاری امریکی فوج کی خواتین افسران ان برہمنہ عراقی افراد کو تشدد، تمسخر اور تحقیر کا نشانہ بنا رہی تھیں۔ ”ابو غریب جیل“ تو دنیا کے سامنے آگئی لیکن میرے سامنے اس وقت ایک ایسے شخص کا بیان ہے جو امریکی مشنری ہے اور عراق میں اپنے ہی ہم وطن امریکی فوجیوں کی قید میں رہ کر واپس آیا ہے۔

نہ ملے دینا تو معمول کی بات ہے۔ سب سے اذیت ناک بات یہ ہے کہ ان زخموں سے چور اسپتالوں میں آنے والی لواتین میں دس فیصد ایسی تھیں جو حاملہ تھیں، ان کے خاوندوں نے اس بات کی بھی پروا نہ کی وہ ان کی نسل کو پروان پڑھا رہی ہیں۔

## میڈیا کی عدالت

(08 ربیع الثانی 1425ھ بمطابق 28 مئی 2004ء)

مارپیٹ کی یہ واردات ایسی نہیں کہ زندگی میں ایک دفعہ ہوگئی اور پھر چین آگیا۔ امریکا کی ہر تین میں سے ایک خاتون اپنے خاوند کے تشدد کا شکار ہوتی ہیں جبکہ ان میں آدھی کے قریب ایک ہی سال میں تین دفعہ اس بری طرح ماری جاتی ہیں کہ انہیں کئی کئی دن ہسپتالوں میں گزارنا پڑتے ہیں۔ ان مارپیٹ کا شکار خواتین میں سے 30 فیصد کے زخم اتنے گہرے اور شدید ہوتے ہیں کہ علاج کے باوجود بھی ان کے جسم کا کوئی نہ کوئی اہم حصہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔

خونخوار امریکی مردوں کا یہ تشدد صرف اپنی بیویوں تک نہیں رکتا بلکہ اس میں ساتھ فیصد ایسے ہیں جو اپنی بیوی کو مار مار کر ادھ موکا کر دیتے ہیں تو پھر ننھے ننھے سبے ہوئے معصوم بچوں پر ان کا ہاتھ اٹھنے لگتا ہے۔ میں یہاں اگر ایسے بچوں کی تعداد ان کے زخموں کی نوعیت اور ان کی زندگیوں میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنوں کا ذکر چھیڑ دوں تو لوگ حیرت میں گم اور انگشت بدنداں رہ جائیں۔ معصوم بچے ٹوٹی ہوئی سرکی ہڈیوں، مجروح کمر، زخمی چہروں کے ساتھ اسپتال آتے ہیں اور پھر ہاتھ جوڑتے اور روتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم واپس اس گھر میں نہیں جائیں گے۔ ان کو ایک طویل مدت کے لیے Care Centeres میں رکھا جاتا ہے جہاں ان کا خوف دور کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو واپسی سے سراسر انکار کر دیتے ہیں۔

میں نے یہاں صرف عورتوں پر ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو گھروں کی چار دیواری کے اندر ہوتے ہیں۔ میں نے جنسی تشدد کی ماری ان خواتین کا ذکر نہیں کیا جن کی تعداد یہ ہے کہ امریکا میں ہر دو منٹ میں ایک عورت جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہے اور رانیہ الباز جس ملک میں رہتی ہے وہاں شاید کئی سالوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آجائے۔

میڈیا کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ایک عدالت لگا لیتا ہے جسے چاہے مجرم ٹھہرا دے اور جس کے مجرموں کو چاہے پردے میں رکھے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ یہ عدالت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ ہمارا چھوٹا سا گناہ بھی معاف نہیں کرتے اور اپنے ہر سال ہونے والے پندرہ ہزار عورتوں کے قتل پی جاتے ہیں لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے جب میرے ملک کی فیشن پرست، مغرب کی دلدادہ اور این جی او کی پروردہ خاتون مغربی زندگی کا خواب دیکھنے لگتی ہے، اس طرح کے معاشرے کی توصیف میں نعرے بلند کرنے لگتی ہے، انہیں شاید علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے آج بھی ہم اس معاشرے میں زندہ ہیں جہاں آخرت کا خوف ہماری اقدار کا محافظ ہے، جہاں آج بھی بہن، بیٹی اور ماں کے لفظ سن کر بڑے بڑے بد معاش اور غنڈوں کے سر جھک جاتے ہیں، جہاں آج بھی عزت و تکریم اور غیرت و حمیت صرف عورت کے نام سے وابستہ ہے لیکن میں اس دکھ کا کیا کروں۔

غیر اگر ہمیں برا کہیں تو بجا لیکن اگر اپنے ہی وہ عدالت لگا کر بیٹھ جائیں تو پھر وہ سادہ دل مسلمان کہاں جائے۔ مجبور تو مومن کے شرمندہ رہنما ایسے ہی قوموں سے ان کا وقار چھینا کرتے ہیں۔ اپنی اقدار سے محبت لوٹا کرتے ہیں اور انہیں شرمندہ اور ندامت زدہ بنایا کرتے ہیں۔

مسلمان مرد ہوتے ہی ظالم ہیں، یہ بدترین خاوند اور بے مروت باپ ہیں۔ یہ ان بڑے بڑے تبصروں کا خلاصہ ہے جو گزشتہ ہفتے پوری دنیا کے میڈیا پر ایک واقعہ کے بعد کیے گئے۔ یہ واقعہ سعودی عرب کے ٹیلی ویژن کی انٹرنیشنل الباز کا ہے جسے اتوار کی رات کوریاض کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا۔

خاتون کے بقول وہ اور اس کا خاوند دونوں رات کو عام سی گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک دونوں کے درمیان اختلاف برپا ہوا، بات میں تلخی آئی، ہاتھ پائی شروع ہوئی اور پھر غصے سے بھر پور خاوند نے کہا کلمہ پڑھو اس لیے کہ میں تمہیں اب مار دوں گا، اس نے اسے دھکا دیا جس سے وہ گر پڑی، سر زمین سے ٹکرایا اور آنکھ اور داہنا گال زخمی ہو گیا۔ اسے اسپتال کس نے پہنچایا، خاتون نے اس کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ پورا واقعہ خاتون کی تصویروں کے ساتھ عالمی میگزین ”نیوز ویک“ میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا اور پھر دنیا بھر کے یہودی روپے سے چلنے والے ٹی وی چینل اس ایک زخم کو بنیاد بنا کر مسلمان خاوندوں پر برس پڑے۔ انہیں غیر مہذب، وحشی، ظالم اور بے مروت قرار دیا گیا۔

یہ سب کچھ اس معاشرے اور اس قوم کے لوگ کہہ رہے تھے جن کے گھر گھر میں تشدد اور ظلم کی کہانی روز دہرائی جاتی ہے۔ میں یہاں ایف بی آئی کی کرائم رپورٹ سے اعداد و شمار آپ کے سامنے رکھوں گا اور پھر صرف ایک دعوت فکر دوں گا کہ صرف چند لمحوں کے لیے فیصلہ کیجیے کہ مہذب ترین کہلانے والوں کا اصل چہرہ اپنے گھر والوں کے ساتھ کتنا بھیانک ہوتا ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق ہر سال پندرہ ہزار امریکی خواتین اپنے خاوندوں، سابقہ خاوندوں یا پھر بوائے فرینڈز کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہیں، یہ تعداد دنیا کی کسی بھی مسلمان ملک کے مقابلے میں کئی سو گنا زیادہ ہے بلکہ شاید سارے اسلامی ممالک میں خاوندوں کے ہاتھوں قتل ہونے والی عورتوں کی تعداد جمع کی جائے تو بھی امریکا کی اس جرم میں برتری پھر بھی قائم رہتی ہے۔

امریکا میں آج تک جتنی خواتین قتل ہوئی ہیں جن میں ڈیکیتی، بٹرکوں کے حادثے، اغواء اور قتل ان سب کی کل تعداد میں سے 34 فیصد ایسی تھیں جنہیں ان کے خاوندوں نے قتل کیا تھا۔ قتل کے علاوہ تشدد اور مار پیٹ امریکی گھرانوں کا معمول ہے۔ ہسپتالوں میں زخمی حالت میں آنے والی عورت میں سے 30 فیصد ایسی ہوتی ہیں جو کسی حادثے میں زخمی نہیں ہوتیں بلکہ انہیں ان کے خاوندوں نے ٹھڈوں سے مارا ہوتا ہے۔ دانتوں سے کاٹا ہوتا ہے، دیواروں کے ساتھ پٹخا ہوتا ہے یا پھر چاقو یا تیز دھار آلات سے زخمی کیا ہوتا ہے۔ گلہ گھونٹا یا پھر ہاتھ روم میں ہاتھ ٹب کے پانی میں

زائرین کی رہائش کے لیے پلازہ تعمیر ہوگا۔ صرف چند گھنٹوں میں بلڈوزر آئے، صدیوں سے مسلمانوں کی عبادتوں کی آواز سننے والے گھر زمین بوس ہونے لگے۔ چیختے، چلاتے، شور مچاتے، اپنے بچوں کو سنبھالتے فلسطینی مرد اور عورتیں اپنی جمع پونجی ہاتھ میں اٹھائے بے خانمی کا داغ لیے اس محلہ سے کوچ کر گئے۔

یہ 37 سال پرانی ہجرت تھی، یہ لوگ غزہ کی پٹی اور دیگر علاقوں کے مہاجر کیمپوں میں آباد ہو گئے۔ شکست خوردہ اور بے گھری کے دکھوں سے چور۔ یہ لوگ وہاں ابھی آباد ہی ہوئے تھے کہ ان کے خالی کردہ علاقوں میں دنیا بھر سے یہودی اپنی بستیاں بسانے آ گئے۔ ان بستیوں میں ایک شخص ابی میر کاہن اپنے ساتھ نفرت کی آگ لے کر پہنچا۔ یہ کلک کا پیر دکار بنالیکن اس نے اپنی تنظیم Kach (اس طرح) بنائی۔

یہ ایک اور تنظیم گیش (Gash) کے ساتھ مل کر فلسطینیوں کے علاقے میں بندتوں سمیت گشت کرتے ہیں۔ ہیبرون ہو یا کریت اگر کوئی ننھا سا بچہ ان کی گاڑی پر پتھر پھینکتا تو اسے گولیوں سے بھون دیا جاتا۔ مشہور واقعہ اس گروہ کے قائد لیونگر کا ہے جس کی گاڑی پر پتھر پڑا تو وہ دیوانہ وار کودتا ہوا، ایڑیاں اچھالتا، گالیاں دیتا فائر کرنے لگا جس سے جوتوں کی دکان پر بیٹھا ایک نوجوان خالد صالح شہید ہو گیا۔ ان سب گروہوں کا ایک ہی نعرہ تھا: ”ہمیں خدا نے اس جگہ آباد ہونے اور ایک یہودی ریاست تشکیل دینے کا حکم دیا ہے۔ ہم یہاں سے ہر عرب کو ضرور نکال دیں گے۔“ یہ تنظیم تھی جس کے ایک پیر دکار باروک گولڈ اسٹائن نے سب سے پہلے 25 فلسطینیوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ اس آغاز سے آج تک گولیوں سے اسی طرح مسلمان شہید ہوتے ہیں۔ اسی طرح بلڈوزر آتے ہیں، گھروں کو مسمار کرتے ہیں اور مسلمان سروں پر سامان اٹھائے، بازوؤں سے بچوں کو پکڑے یا گودوں میں اٹھائے ہجرت کر رہے ہیں۔

37 سال ہو گئے نہ یہودیوں کا ظلم بدلا نہ فلسطینیوں کی حکومت، دونوں اسی طرح برسرِ پیکار ہیں۔ ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور میزائلوں کے مقابلے میں ہاتھوں میں پتھر اور اینٹیں لیے آج بھی اسی طرح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ البتہ ایک علاقہ ایک قوم اور ایک جذبہ ضرور بدل گیا ہے۔ میں 37 سال پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب ایک فلسطینی شہید ہوتا تھا تو شہروں، گلیوں، چوکوں، چوراہوں میں میرے ملک کے مسلمان احتجاج کرنے باہر آ جاتے تھے۔ مسجد اقصیٰ میں آگ لگتی تھی تو میری قوم کے مسلمانوں کے دل جل اٹھتے تھے۔ آج گولیاں برساتے ٹینک اور ہیلی کاپٹر انسانی جسموں کے پر نچے اڑا رہے ہوتے ہیں اور ہم کتنے آرام سے یہ منظر دیکھ کر میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان جسد واحد کی مانند ہیں، جس کے ایک عضو کو تکلیف ہو تو پورا بدن اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔“

شاید ہم جسد واحد نہیں یا پھر شاید ہم مسلمان ہی نہیں..... ورنہ کسی آنکھ سے آنسو نہ پکیتا، کسی چہرے پر تو درد کی پرچھائیاں ہوتی، کوئی تو سر بازار پکار اٹھتا، حکمران بے حس ہوں تو کیا ہوا؟ ہم ابھی تک زندہ ہیں..... لیکن ایسی باتیں زندہ قوموں سے کی جاتی ہیں۔

## کیا ہم زندہ ہیں؟

(10 ربیع الثانی 1425ھ بمطابق 04 جون 2004ء)

یہ 10 جون 1967ء ہے۔ فاتح اسرائیل گزشتہ رات عربوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر چکا ہے۔ 638ء سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے ایک مسلمان شہر (بیت المقدس) یروشلم بند و قید لہراتے یہودیوں کے قبضے میں آ چکا ہے۔ وہ شہر جسے مسلمان 1400 سال سے القدس کہتے آ رہے تھے، جو صرف مختصر عرصہ کے لیے عیسائیوں کے زیرِ نگین رہا لیکن بارہویں صدی کے عظیم فاتح صلاح الدین ایوبی کے زور بازو سے پھر امن و سلامتی کا شہر بن گیا۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس مختصر دورانیے کی عیسائی حکومت نے کس طرح اس شہر کے مسلمانوں کے خون کو اڑا لیا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں مسلمانوں کی رواداری کی مثال اس صورت میں ملتی ہے کہ عثمانی خلیفہ سلیمان عالیشان نے اپنے درباری معمار سنسان پاشا کو یہودیوں کے لیے عبادت گاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور صرف ایک سال میں اس نے یہ عبادت گاہ تعمیر کر کے یہودیوں کے حوالے کر دی..... لیکن آج منظر کچھ بدلا ہوا ہے۔ صبح ہی سے اسرائیلی جوان مغربی دیوار تک جوق در جوق پہنچ رہے ہیں، بند و قید اٹھائے، جوتوں سمیت وہ نہ محرابوں پر نظر ڈالتے ہیں اور نہ فرش پر بچھے قالین پر..... تنگ اور بل دار سیڑھیاں عبور کرتے وہ حرم کے چبوترے تک جا پہنچتے اور وہ مقام جہاں سے رحمتہ للعالمین نے معراج کے سفر کا آغاز کیا تھا وہاں کھڑے ہو کر سکھ بجانے لگے۔

دوسری جانب 11 بجے دن وہ اس عبادت گاہ میں داخل ہوئے جو دیوارِ براق کے قریب تھی۔ وہاں پہنچ کر یہودیوں کے سب سے بڑی مذہبی رہنما ربی زوی یہودا کوک کی جیب روانہ کی گئی، اسے بند مقام پر کھڑا کیا گیا، اس نے وہاں حرم کے چبوترے پر کھڑے ہو کر کہا: ”آج یہودی قوم اپنے گھر میں واپس آ گئی ہے۔“ اس کے نائنوں میں ایک شخص جو جنگ میں حصہ لے رہا تھا جس نے ہلٹ پہنا تھا جوتے اور خون آلود یونیفارم کے ساتھ اسی چبوترے پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: ”دیکھو یہودیو! یہ مقام اب تم سے صرف پانچ قدم کی دوری پر ہے۔“

پورے شہر میں عرب نوجوانوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں جو عرب شہری نظر آتا قتل کر دیا جاتا۔ اسرائیلی فوج ہر گھر میں گھس گئی تاکہ اسلحہ برآمد کرے اور نوجوانوں کو گرفتار کرے۔ مسجدوں سے فانوس اور قالین لوٹ لیے گئے، آرکیا لوجیکل میوزیم سے صحیفہ بحرِ مردار کو اٹھالیا گیا، نوادرتوڑ دیئے گئے اور ہزاروں فلسطینی سپاہی اپنے ساتھ لے جائے گئے۔

یہ سب توفیق کے نشے میں چور یہودی فوج نے کیا..... لیکن ایک فیصلہ اور بھی ہوا۔ اسی 10 جون کو جنرل موٹے دایان نے یروشلم (بیت المقدس) شہر میں اعلان کیا کہ ”اس شہر کے مغربی محلہ سے مسلمانوں کے 619 مکان فوراً خالی کر دیئے جائیں۔ اس لیے کہ دیوارِ گریہ (دیوارِ براق) کے ساتھ اور یہاں پوری دنیا سے آنے والے یہودی



اور آج ٹھیک بیس سال بعد اسی بھارت کے تخت پر ایک ایسا شخص متمکن ہوا ہے جس کا چہرہ، چال ڈھال، پہچان اور شناخت ان لوگوں سے مختلف نہیں ہے جو کل تک اس ملک میں دہشت گرد تھے۔ اس کی ڈاڑھی، اس کے کپس، اس کی پگڑی اور اس کا کڑا سب ویسا ہی ہے۔

قوموں کی تاریخ میں افتاد آتی ہے، مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، لوگ خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں مگر اس سارے معرکے میں پہچان اور شناخت سے محبت کرنے والی قومیں ہی زندہ رہا کرتی ہیں۔ مجھے اس سارے مرحلے میں جو خیال رہ رہ کر شرمندہ کرتا ہے وہ یہ کہ جب یہ سب افتاد ہو رہی تھی تو کسی سکھ نے مصلحت کے نام پر، ترقی کے نام پر Moderation کے نام پر کبھی یہ نعرہ بلند نہیں کیا کہ سب لوگ ڈاڑھیاں منڈوا دیں، کپس کاٹ لیں، پگڑی پہننا چھوڑ دیں، چن چن کر مارے جاتے، پچپانے جاتے، گھروں میں جلانے جاتے لیکن اپنی شناخت نہ چھوڑتے۔ نہ کسی نے فوج کی نوکری میں، پولیس کی نوکری میں، ورلڈ بینک اور اقوام متحدہ کی میٹنگ میں یہ شناخت چھوڑی اور نہ ہی ہندو بلوایوں کے خوف سے اس کو ترک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرانس اور یورپ میں ان کی پگڑی پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی تو وہ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے۔

یہی وہ شناخت سے محبت تھی کہ سرفرازی ان کے حصے میں آئی اور یہی شناخت سے دوری تھی کہ ہم بے آبرو ہو گئے۔ اگر ہم نے بحیثیت قوم اپنی شناخت سے محبت کی ہوتی تو پھر کوئی چوک پر کسی ڈاڑھی والے کو روک کر تلاشی نہ لے رہا ہوتا، کسی عمامے والے شخص کو دیکھ کر دہشت گرد نہ کہتا..... مگر کیا کروں ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو یہ سمجھتی ہے کہ شراب کی بوتل اور اس کے لیبل میں روح افزا چھپا کر رکھا جائے تو بہتر ہوتا ہے۔ انہیں علم نہیں جب ایسی بوتلیں توڑنے والے انقلاب لاتے ہیں تو کوئی کھول کر نہیں دیکھتا کہ اس کے اندر کیا چھپا ہے..... کفر ہے یا ایمان؟ ظاہر کی شناخت ہی کافی ہوتی ہے۔



## شناخت

(29 ربیع الثانی 1425ھ بمطابق 18 جون 2004ء)

یہ وہی لوگ تھے کہ جب اپنے سب سے مقدس مذہبی مقام کی توہین کی وجہ سے انتقام پر اترے تو ان کی قوم سے دو افراد نے اپنے ملک کی سب سے طاقتور وزیراعظم کو اس کے اپنے ہی گھر کے لان میں ہزار ہا سیکورٹی کے انتظامات کے باوجود ہلاک کر دیا۔ طاقت اور اقتدار کے نشے میں چور نہرو خاندان کی یہ چشم و چراغ جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد قوم سے مخاطب ہوئی تو سکبر سے اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ اس نے کہا: ”آج ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔“ لیکن یہ اکڑی ہوئی گردن اس کے اپنے سیکورٹی گارڈز کے ہاتھوں زمین پر آ رہی۔ جس دن اس کی چتا کو آگ لگائی جا رہی تھی اس دن پورے ہندوستان کے شہروں اور گلیوں میں قیامت برپا تھی۔ ان لوگوں کو پہچانا اتنا مشکل نہ تھا، اپنے گرد کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے تھے کہ بچے سے لے کر بڑا اور جوان سے لے کر بوڑھا سہر پر پگڑی پہنتا اور ممکن ہوتا تو ڈاڑھی اور کیسیں بڑھاتا (یہ ”ممکن“ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ اگر ڈاڑھی آئی ہوتی)۔ گھر جلا دیئے گئے، دکانیں لوٹ لی گئیں، محلے کے محلے اجاڑ دیئے گئے، جو بھی تھوڑے سے کیس بڑھائے پگڑی کے ساتھ نظر آ جاتا جھوم اس پر پل پڑتا۔

یہ 1984ء تھا، سکھوں کا اتنا خون بہا کہ پورا بھارت کانپ اٹھا لیکن غصے اور انتقام میں پھرے ہوئے ہندو صرف ایک عورت کے قتل کا انتقام پوری قوم سے لینا چاہتے تھے۔ وہ قوم جس نے چند سال پہلے اپنی شناخت اور اپنی مذہبی، سیاسی اور قومی جدوجہد کی جنگ لڑی تھی۔ امرتسر کے پتوں بیچ 1919ء کے جلیانوالہ باغ کے قریب اپنے مقدس ترین مقام پر گولڈن ٹمپل جس کا تالاب سکھوں کے خون سے رنگین کر دیا تھا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈاروالہ کی وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی گئی تھی جس کی تقریریں لندن کے ساؤتھ پاؤل سے لے کر نیویارک کے جیکسن ہائٹس تک سکھوں کی دکانوں پر کیسٹوں کی صورت میں گونجتی تھیں۔

پورے مشرقی پنجاب میں صرف اسی شخص کا نعرہ بلند ہوتا تھا اور اسے ہی سکھوں کے گرو جی کا روپ کہا جاتا تھا لیکن جب بھارت کی فوج جو توں سمیت ان کے مقدس ترین مقام کو روندتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو سوائے سکھوں کے کوئی آنکھ اشک بار نہ ہوئی۔ پورے ملک میں اس فتح پر جشن منایا گیا، سپاہ نے نعرے بلند کیے ہم نے دہشت گردوں کا نیٹ ورک رہتی دنیا تک نیست و نابود کر دیا ہے۔ سکھوں پر پورے ملک میں بد اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جب ایک سکھ پولیس کے سربراہ کو جوں کشمیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی دبانے پر لگایا گیا تو پارلیمنٹ سے لے کر حکومتی حلقوں تک سب نے اس پر الزامات لگائے۔

آبزور خبر رساں ایجنسی نے ان میں دو ایسے واقعات کا سراغ لگایا جن میں لوگوں کو امریکا کے حوالے کیا گیا حالانکہ ان کے ملک کی عدالتیں انہیں بے گناہ قرار دے چکی تھیں۔ ایک برطانوی تاجر وہاب الراہی اپنے ہمراہ ایک عراقی اور ایک فلسطینی کو لیے لندن سے ایک فلائٹ پر نومبر 2002ء میں گمبیا کے ایئر پورٹ پر اترے اور اترتے ہی گرفتار کر لیے گئے اور پھر صرف چند گھنٹوں کے اندر وہ تینوں گوانتانامو بے کے قید خانے پہنچ گئے اور آج تک ان کی کوئی خبر نہیں۔

جون 2003ء کو ملا دی میں دو ترک، ایک سعودی اور ایک کینیا کا باشندہ اس بنیاد پر پکڑے گئے کہ یہ امیر ہیں، مسلمان ہیں اور دہشت گردوں کو فنڈ دیتے ہیں۔ ان کو کینیا کی عدالت نے رہا کر دیا لیکن عدالت سے باہر نکلے ہی انہیں سی آئی اے کے حوالے کر دیا گیا اور آج تک ان کی کوئی اطلاع نہ مل سکی اور ان لاتعداد قید خانوں کے نیٹ ورک ہی سے کسی ایک میں ہوں گے۔ ان قید خانوں میں چند ایک ایسے ہیں جو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن امریکی کتوں کی طرح ان کی بوسو گتھتے پھر رہے ہیں۔ شاید وہ کسی دن اس فرار اور وہاں ہونے والے تشدد کی کہانی بیان کر سکیں۔

ایک تکلیف دہ کہانی اس شامی نژاد شخص ماہر آرار کی ہے جو کینیڈا کا شہری تھا، نیویارک کے ہوائی اڈے پر چند گھنٹوں کے لیے پرواز بدلنے کے لیے رکا، دہشت گردی کے جرم میں دھریا گیا۔ پہلے امریکیوں کے تشدد کا نشانہ بنا، پھر کچھ حاصل نہ ہو سکا تو اردن والوں کو سوئپ دیا گیا۔ وہاں سے شام میں ایک 3x6 فٹ کے سیل میں قید کر دیا گیا۔ روز نکالا جاتا، زنجیروں سے پینا جاتا، جب کچھ برآمد نہ ہو سکا تو چھوڑ دیا۔ خفیہ قید خانوں کا یہ نیٹ ورک پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے جسے امریکی سی آئی اے خود اپنی نگرانی میں رکھتی ہے۔ سب سے بڑا خفیہ قید خانہ بگرام ایئر پورٹ کا بل کا ہے جہاں 1200 سے زیادہ لوگ مختلف ملکوں سے لا کر رکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد گوانتانامو بے ہے۔ یوں تو ابوغریب کا قید خانہ بہت مشہور ہوا ہے لیکن ایک خفیہ قید خانہ بغداد ایئر پورٹ کے قریب ہے۔ مراکش جو امریکا کا وفادار حلیف ہے اس کا ایک تفتیشی مرکز تمارا ہے جس میں کئی سوافراد کو رکھا گیا ہے۔ یہ مرکزی سی آئی اے کی نگرانی میں چلتا ہے اور رباط سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔

ان قید خانوں میں ایک عجیب سا ربط ہے۔ قیدی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔ ایک جگہ سے تشدد سہتے دوسرے جگہ جا پہنچتے ہیں۔ پاکستان سے گرفتار ہونے والا عبداللہ تبارک جسے 2001ء میں گرفتار کیا گیا، پہلے بگرام کے قید خانے لے جایا گیا پھر گوانتانامو بے اور اب مراکش کے تمارا تفتیشی مرکز میں منتقل ہو چکا ہے اور تفتیش کی اذیت سے گزر رہا ہے۔ مصر کے ملحق المز رہ سے آذربائیجان کے باکو، قطر کے ایئر بیس اور عمان، تھائی لینڈ اور سنگاپور تک ان خفیہ قید خانوں کا ایک جال ہے جس میں ہزاروں حریت پسند مسلمان قید ہیں۔ نہ ان کی کوئی فہرست ہے نہ تفصیل، نہ کسی عدالت کے روبرو پیش ہوتے ہیں نہ ان کی کوئی خبر باہر آتی ہے۔

شاید تاریخ کے ظالم رومن بادشاہ، منگول، ہلا کو اور ظلم و ستم کے علمبردار فرعون بھی اپنے دشمنوں پر وار کرتے ہوئے بتا دیا کرتے تھے لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ شاید وقت بدلے کسی زلزلے کے بعد، طوفان کے بعد، اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی آفت کے بعد، کھدائی ہو اور آثار قدیمہ کے لوگ یادداشت مرتب کریں اور آنے والی نسلیں اپنی کتابوں میں پڑھیں:

بجو! اگلے وقتوں میں ایک ظالم ملک تھا جس کے پوری دنیا میں قید خانے تھے جہاں انسانوں کو پوری زندگی کے لیے مقید کر دیا جاتا تھا۔ ایک دن اللہ کی لٹھی حرکت میں آئی اور.....!!!

## امریکا کے خفیہ قید خانے

(04 جمادی الاول 1424ھ بمطابق 25 جون 2004ء)

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتے آج بھی آپ کو ایسے عقوبت خانے، زیر زمین قید خانے اور بے آب و گیاہ جزائر پر موجود ملک بدر بلکہ جہاں بدر سزا خانے ملتے ہیں۔ آج ان قید خانوں اور عقوبت گاہوں پر لوگ جا کر تصویریں بناتے ہیں اور ان کی ہولناکی دیکھ کر انسانی تہذیب کے اس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں جب ظلم و ستم اور جبر راج کر رہا تھا۔ دنیا کے ہر خطے میں آپ کو ایسے عقوبت خانوں کے آثار ملیں گے، خواہ وہ طورخم کی پہاڑی پر تیمور کا وہ سرنگ نما عقوبت خانہ ہو جس میں تیز دھار بڑے بڑے چہرے نصب ہوتے تھے۔ ادھر ایک ڈھلوان سے قیدی کو اس میں پھینکا جاتا اور نیچے اس کا قیمہ ہو کر باہر آتا۔ فلپائن میں سمندر کے کنارے وہ زیر زمین قید خانہ جس کی اندھیری کوٹھڑیوں میں ان کے آزادی کے ہیرو زوال سمیت کئی لوگوں نے جان دی۔

لندن شہر کا ناوڑ جس کے سامنے آگ کے الاؤ جلتے رہے اور ان میں لوگوں کو پھینکا جاتا رہا۔ پیرس کا وہ بڑا سا چھرا جسے گیلون کہا جاتا تھا جس کی تیز دھار کے نیچے کتنی گردنیں کاٹی جاتی رہیں۔ یہ سب آج کے دور میں ایک میوزیم اور ایک یادگار کا حصہ بن چکا ہے، ہم سمجھتے ہیں اب ہم پہلے کی طرح ظالم، جابر اور خونخوار نہیں رہے، ہم مہذب ہو چکے ہیں۔ لیکن آئیے میں آپ کو اس مہذب معاشرے اور ترقی یافتہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکا کے ان صرف تین سال کے اندر دنیا بھر سے اٹھائے جانے والے انسانوں کی روداد بتاؤں۔ حیرت کی بات ہے کہ جس طرح چھوٹے چھوٹے گاؤں میں زمینداروں، سرداروں اور وڈیروں نے یہ طریقہ کار اختیار کر رکھا ہوتا ہے کہ لوگوں کو غائب کروادیا اور پھر انہیں کسی خفیہ قید خانے میں بند کر دیا، مروادیا، پھٹکوا دیا اسی طرح آج سے صدیوں بعد جب ماہرین آثار قدیمہ سراغ لگائیں گے تو انہیں جہاں ہم برستی اور تباہ ہوتی بستیاں ملیں گی وہاں ایسے خفیہ قید خانوں کا سراغ بھی ملے گا جو نہ کسی میڈیا میں تھے نہ کسی ریکارڈ پر لیکن ان میں تین ہزار کے قریب مسلمان موت و حیات کی کشش میں قید ہیں۔

گزشتہ تین سال میں امریکا نے پوری دنیا میں اپنے اتحادیوں کی مدد سے اور ان کی ہوئی حکومتوں کی سیکورٹی سروسز کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو ان کے گھروں، دکانوں اور ٹھکانوں سے اٹھایا اور پھر ان کو ایسے مقام پر لے جایا گیا جس کا شاید ہی کسی کو علم ہوتا کہ ان پر تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کی جائیں گی۔ یہ لوگ کسی بھی قانون کی پروا کے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتے ہیں۔ ایک جگہ اگر تشدد کرنے والے ذرا نرم ہیں تو دوسرے ملک بھیج دیا جاتا ہے۔

ملائیشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، پاکستان افغانستان سے ان کی کھپ امریکا کے حوالے ہوتی رہی ہے۔ افریقہ، عرب ریاستیں اور یورپ بھی ان میں حصہ ڈالتا رہا ہے۔ اس وقت ان ”مجرموں“ کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ان میں 70 کے قریب ایسے ہیں جنہیں عدالت بے گناہ قرار دے چکی ہے لیکن انہیں آج تک رہائی نصیب نہیں ہو سکی۔

کھڑی تھی نیچے ٹینک گزرے، اس نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر گولیوں کی آواز آئی۔ جب میں وہاں پہنچی تو میری چھوٹی بہن سارہ کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ فوت ہو چکی تھی۔

میرے باپ نے اس کی قمیض کا ایک حصہ پھاڑا اور سارہ کے خون سے ایک نظم تحریر کی اور پھر اس کپڑے کو بالکونی پر لٹکا دیا اور جس دن تم لوگ میرے باپ کو پکڑ کر لے گئے اس نے کہا: ”دیکھو فاطمہ! اس نظم کو یہیں لٹکے رہنے دینا۔ اس کی حفاظت کرنا، میں واپس ضرور آؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ زندہ ہے۔ وہ واپس ضرور آئے گا لیکن جب میں تم لوگوں کو دیکھتی ہوں تو یقین ٹوٹنے لگتا ہے۔“

تم لوگوں نے کہا تھا کہ ہم آزادی لے کر آئے ہیں، جمہوریت لے کر آئے ہیں لیکن تم لوگ تو کلکٹر بم لے کر آئے۔ میں نے ان بموں کو برستے خود دیکھا ہے۔ یہ میرا آخری دن تھا جب میں اسکول گئی اس دن جہازوں سے بم ہمارے اسکول کے کھیل کے میدان پر گرے، میں جب اسکول کے برآمدے میں آئی تو چاروں طرف بچوں کے اعضاء اس گراؤنڈ میں بکھرے ہوئے تھے۔

یہ بچے آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے اعضاء اسکول کی مٹی کا رزق ہو چکے ہیں۔ اس دن میرے باپ نے بچوں پر کوئی نظم نہیں لکھی۔ اس نے کہا تھا آج بچوں نے اپنے خون سے بہت سی نظمیں تحریر کر دی ہیں۔ یہ پہلا دن تھا جب میں نے اپنے باپ کو زندگی میں روتے ہوئے دیکھا۔

آپ لوگ رست کی تانہ کی میں میرے باپ کو اٹھا کر لے گئے اور کہا: کہ ہم اس سے چند سوال پوچھیں گے پھر چھوڑ جائیں گے..... لیکن آج ایک سال ہو گیا میرا باپ واپس نہیں آیا، میں بتا نہیں سکتی اس کے بغیر ہم پر کیا گزرتی ہے۔ میں صرف 13 سالہ بچی ہوں لیکن لگتا ہے میں ایک عورت ہوں..... دکھی، غمزدہ..... آپ لوگوں نے میرا بچپن مجھ سے چھین لیا ہے..... ماں سارا دن گھر میں چلتی رہتی ہے بالکل خاموش۔ وہ دیواروں کو گھورتی ہے، چھتوں کو دیکھتی رہتی ہے۔ تم کہتے ہو عراق میں جمہوریت آئے گی! جمہوریت کے ساتھ میرا باپ بھی واپس آئے گا؟ میں زیادہ نہیں لکھ سکتی بس اتنا بتا دیں آپ نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟

فاطمہ کا یہ سوال اس امت مسلمہ سے جس کے سامنے گھروں کے گھر برباد ہو رہے ہیں، اُڑ رہے ہیں، زمین کا رزق ہو رہے اور وہ مصلحت کی چادر اوڑھے سو رہی ہے۔ میں کبھی سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ کیا فاطمہ کے خط پر خاموش رہنے والے 50 سے زیادہ اسلامی ملکوں کے شہروں پر وہ دن نہیں آ سکتا جب ان کے گھروں سے بھی کوئی فاطمہ ایسا ہی خط لکھ رہی ہوگی۔

شاید! اس وقت وہ کہیں کاش! ہم مصلحت پر غیرت کو اور بزدلی پر بہادری کو ترجیح دے دیتے۔



## فاطمہ بنام امت مسلمہ

(13 جمادی الاول 1425ھ بمطابق 02 جولائی 2004ء)

اس کی عمر صرف 13 سال ہے، ماں باپ نے اس کا نام فاطمہ رکھا، وہ اور اس کی چھوٹی بہن سارہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بغداد میں ایک گھر میں لمبی خوشی رہتی تھیں۔ اس کا باپ عربی زبان میں شعر لکھتا اور بقول فاطمہ خواب دیکھا کرتا تھا اور پھر ایک رات جب یہ خوش و خرم خاندان گہری نیند سویا ہوا تھا تو دروازہ توڑتے، دیواریں پھلانگتے اور ٹھڈے مارتے بندو قوں کی نالیاں سیدھے کیے امریکی سپاہی ان کے گھر میں گھس آئے اور اس کے باپ کو اٹھا کر لے گئے اور آج ایک سال تک ان کے باپ کا کچھ علم نہیں ہو سکا۔ زخمی دل اور آنسوؤں سے ڈوبی فاطمہ نے ایک خط تحریر کیا ہے۔

یوں تو یہ خط امریکی صدر جارج بش کے نام ہے لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ خط پوری مسلم اُمہ کی بے حسی کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے۔ وہ امت جسے ان کا اللہ واضح حکم دیتا ہے کہ تم ان لوگوں کی مدد کو کیوں نہیں جاتے جو ظلم و جبر سے تنگ آ کر بار بار پکارتے ہیں۔ اے اللہ! ہمارے لیے کوئی مددگار بھیج۔

فاطمہ نے لکھا: ”جس دن تمہارے سپاہی بغداد شہر میں داخل ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں لیکن پھر چند دن کے بعد وہ آئے اور میرے باپ کو اٹھا کر لے گئے اور کہا کہ یہ جلد واپس آ جائے گا لیکن وہ آج تک نہیں لوٹا۔ میں نے سنا وہ ابو غریب جیل میں ہے اور بیمار ہے لیکن وہ کبھی بیمار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو خوابوں میں زندہ رہنے والا شخص ہے اور کوئی اس سے اس کے خواب نہیں چھین سکتا..... لیکن جب سے میں نے ابو غریب جیل کی تصویریں دیکھی ہیں میں ڈرتی ہوں کہ کہیں کسی امریکی عورت نے اس کے گلے میں بھی رسی نہ باندھی ہو اور اسے گھسیٹ رہی ہو۔ اگر وہاں بھی ہے تو اس کے خواب زندہ ہیں کیونکہ وہ کہا کرتا تھا میں اپنے خواب دل میں ایک خفیہ جگہ چھپا کر رکھتا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ لوگ ابو غریب جیل کو گرانا چاہتے ہو ایسا تم کرنا، یہ ہماری تاریخ ہے۔ یہ ہمارے ظلم سننے کی گواہی ہے، آپ پہلے بہت کچھ گرا چکے ہو، ہمیں آزادی دینے کے نام پر۔ آپ نے کہا تھا آزادی آئے گی لیکن ہمارے گھروں پر میزائل آئے۔ میں اور میری چھوٹی بہن دونوں رات کو لپٹ کر روتی رہتیں جب ہم اپنے شہر پر جہازوں کی آوازیں سنتی، ہم برستے تو ہم خوفزدہ ہو جاتیں، ہمیں کوئی بھی خوفزدہ ہونے سے نہ بچاتا، ہمارے والد کے خواب بھی ہمارے ساتھ نہ دیتے۔ جب تم لوگوں کے ٹینک اور مشین گنوں والی گاڑیاں ہماری سڑک سے گزرتیں تو میں اور میری بہن اپنے مکان کی بالکونی سے انہیں دیکھتی رہتیں اور پھر ایک دن انہوں نے ہر اس شخص کو ہلاک کرنا شروع کر دیا جو بالکونی پر کھڑا ہوتا تھا۔

میری چھوٹی بہن سارہ بہت چھوٹی تھی، اسے علم ہی نہیں تھا کہ تم لوگ کتنے ظالم ہو۔ ایک دن وہ بالکونی میں

ان بہوں کی کھپ عراق پہنچی فوراً ان کی میاوی ہتھیاروں کا استعمال کر کے ایران کی پیش قدمی روک دی گئی۔  
اسے 1983ء کا وہ ادھیر عمر ڈونلڈ رسفیلڈ بھی یاد آیا ہوگا جو صدر ریگن کے خصوصی ایچٹی کی حیثیت سے اس سے ملنے آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکا عراق کی خفیہ مدد کر رہا تھا اور پھر اس ملاقات کے بعد جو صرف ڈیڑھ گھنٹہ رہی..... عراق اور امریکا کے سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔

یہی ملاقات تھی جس کے بعد امریکی کمپنیوں نے عراق کو ایٹمی، کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیار فراہم کیے اس نے تو ان ہتھیاروں کی فہرست میں جو 12 ہزار صفحات پر مشتمل تھی ان 50 امریکی کمپنیوں کے نام بھی لکھوا دیئے تھے مگر امریکیوں نے جب اسے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا تو یہ صفحات ضائع کر دیئے گئے۔

اس کو گروہوں کے خلاف کیمیاوی گیس استعمال کرنے کا الزام سن کر کیسا لگا ہوگا جب کہ یہ الزام وہی لوگ لگا رہے تھے جو کل تک اس کی حمایت کرتے تھے۔ اسے یاد ہوگا کہ 1983ء کے نومبر میں جب امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے رکن جونا تھن ہاؤ نے وزیر خارجہ جارج شلٹن کو بتایا کہ عراق ایرانیوں پر گیس استعمال کر رہا ہے تو امریکی کانگریس میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

ممبران نے کہا کہ عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں..... لیکن کانگریس میں نائب وزیر خارجہ رچرڈ مرفی نے کہا: ”عراق پر پابندی لگانا ہمارے سیاسی اور اقتصادی مفاد میں بہتر نہیں ہے۔“ اور پھر اسے 1990ء کی وہ امریکی محکمہ دفاع کی رپورٹ بھی یاد آگئی ہوگی جس میں کہا گیا تھا: ”گردو ایرانی بمباری سے ہلاک ہوئے ہیں۔“

اسے اپریل 1990ء میں سینٹر ایلن سہسن اور اس کے ساتھیوں کی بغداد میں ملاقات بھی یاد آگئی ہوگی جس ملاقات کے بعد انہوں نے مغربی ذرائع ابلاغ پر تنبیہ کی تھی کہ وہ بلاوجہ اور بے بنیاد طور پر صدام حسین کی کردار کشی کر رہے ہیں۔

اسے جون 1981ء کا وہ دن بھی یاد آیا ہوگا جب اسرائیل نے اس کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کیا تھا تو امریکا اور برطانیہ دونوں نے سلامتی کونسل میں اسرائیل کے خلاف قرارداد کے حق میں ووٹ دیا تھا اور اسرائیل سے کہا تھا کہ اس کا ہر جانہ ادا کرے۔ وہ امریکا کو محبوب تھا، منظور نظر تھا۔

بے وفائی کا یہ منظر نیا نہیں، چلے ہوئے کارتوسوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کا عمل بہت پرانا ہے۔ امریکا کا ہر منظور نظر ایسے ہی دردناک انجام سے دو چار ہوا۔ کوئی دیار غیر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا، کسی کو بڑھاپے میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تو کسی کو اسی کے وفادار سپاہیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ سب انجام دیکھتے ہوئے عبرتناک مستقبل اور بحرمانہ اختتام سامنے ہونے کے باوجود آج بھی کتنے ایسے حکمران ہیں جو سمجھتے ہیں کہ امریکا ہمارے ساتھ وفا کرے گا، آخری وقت میں ساتھ دے گا، شاید انہیں علم ہی نہیں کہ ہو سکتا ہے کہ چند سال بعد کسی کٹہرے کے سامنے یہ چارج شیٹ پڑھی جا رہی ہو: ”تم نے عراق پر حملے میں ہمارا ساتھ کیوں دیا.....؟ تم نے افغانستان پر بم گرانے کے لیے زمین کیوں استعمال کرنے دی.....؟ تم عرب مجاہدوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہو.....!!!“

## انجام سے بے خبر حکمران

(20 جمادی الاول 1425ھ بمطابق 09 جولائی 2004ء)

تم عراقی ہو کر مجھ سے سوال کر رہے ہو کہ میں نے کویت پر کیوں حملہ کیا جب کہ تم جانتے ہو کہ کویت عراق کا حصہ تھا اور اسے اتحادی طاقتوں نے تیل پر قبضہ کرنے کے لیے ہم سے الگ کیا۔ تم عراقی ہونے کی کرسی پر بیٹھے ہو تو تمہیں پتا ہے کہ کویتی کہتے تھے ہم دس دینار میں ایک عراقی عورت خرید سکتے ہیں۔

عراق کے سپاہی عراق کی ناموس کے لیے لڑے تھے، ان کو تو کو کیا حق حاصل ہے کہ مجھ پر مقدمہ کریں؟ جج کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے یہ الفاظ صدام حسین کے تھے جسے ایک ہیلی کاپٹر میں ایک امریکی اڈے پر لایا گیا اور پھر ایک بکتر بند گاڑی میں بغداد کے ہوائی اڈے کے قریب صدام ہی کی پرانے محل میں بنائی گئی ایک عدالت میں ہتھکڑیوں سمیت لے جایا گیا۔

عدالت میں اس کی ہتھکڑیاں کھولی گئیں اور اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کو سات الزامات پر مشتمل چارج شیٹ پڑھ کر سنا دی گئی: ”تم نے 1988ء میں گروہوں کو زہریلی گیس سے ہلاک کیا، تم نے 1991ء میں بذور طاقت شیعہوں کی تحریک کو کچلا، تم نے 1991ء کی جنگ کے بعد گروہوں اور شیعہوں کو مار کر اجتماعی قبروں میں دفن کیا، تم نے بلا جواز 1981ء سے 1988ء تک ایران پر جنگ مسلط کی، تم نے 1990ء میں کویت پر حملہ کیا، تم نے 1980ء سے 1999ء تک کئی شیعہ رہنماؤں کو قتل کر دیا۔“

اس نے اطمینان سے چارج شیٹ سنی اور کہا یہ ایک تھیز ہے اور اس میں یہ سب ڈراما رچایا جا رہا ہے۔ اصل مجرم تو جارج بش ہے۔

67 سالہ صدام حسین جب یہ الزامات سن رہا ہوگا اور اپنے ارد گرد امریکی سپاہیوں کو دیکھ رہا ہوگا تو یقیناً اسے کئی دہائیوں پر پھیلی اپنی امریکا دوستی یاد آ رہی ہوگی۔ وہ کیسے ان کے اشاروں پر ناچتا رہا، ان کے مقاصد پورے کرتا رہا، اسے وہ شاہ ایران سے لے کر مارکوس تک کتنے ایسے حکمران یاد آئے ہوں گے جو امریکا سے وفا کرتے رہے اور پھر اسی امریکا کے ہاتھوں ذلیل و سوا ہوئے۔

اسے یاد آیا ہوگا کہ یہ تو وہی امریکا تھا جب ایرانی فوجوں کی زد میں عراق کا شہر بصرہ آ گیا تو فوراً امریکی سی آئی اے اس کی مدد کے لیے آگئی۔ تمام سیلاب کا رخ ایرانی فوجوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا دیا گیا اور عراق کو وہ تمام تصاویر فراہم کر دی گئیں۔

ادھر امریکی کمپنی CARDON کو کہا کہ عراق کو فوراً کلکسٹر بہوں کی ترسیل شروع کر دی جائے، جیسے ہی



اور پھر یوں ہوا کہ ایک احساس نے جنم لیا، ایک غیرت نے انگڑائی لی۔ گزشتہ مہینے کی پہلی اتوار کو ٹورنٹو کے نارتھ یارک سٹی کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، سڑکوں پر زیادہ چہل پہل نہ تھی لیکن اس کے سٹی سینٹر کی لائبریری کے نچلے حصے میں وقتی ایک بڑے ہال میں 300 سے زیادہ جذباتی مسلمان جمع تھے، ہر کسی کی زبان سے جذبات اُٹھ رہے تھے اور گرم جوشی نمایاں تھی۔ انہوں نے مل کر ایک قرارداد منظور کی۔ ہمیں اپنی زندگی اور طرز معاشرت کو برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں اسلامی اقدار حفاظت کرنی ہے اور اسی کے مطابق اس معاشرے میں زندگی گزارنی ہے اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے لیے ایک علیحدہ شریعت کورٹ بنائی جائے جو ہمارے درمیان فیصلے کرے۔ ہم کینیڈا کی عدالتوں میں اپنے مقدمے لے کر نہیں جائیں گے۔

امریکی نمک خوار اور منافقت کے پیرو کار نام نہاد مسلمان جنہیں انسانی حقوق کی انجمنیں پناہ دے کر Activist (عملی اقدام کا قائل) کا لبادہ پہناتی ہیں، فوراً چیخ اٹھیں۔ ایران میں پیدا ہونے والی آذری جمیدی بولی: کینیڈا جیسے لبرل ماحول میں شریعت کورٹ کا قیام مسلمانوں کا مضحکہ اڑانے کے مترادف ہے۔ میں تو ڈر جاتی ہوں کہ آپ کیسا سچ یہاں بول رہے ہیں؟

اس عورت کی حمایت میں بہت سے ”انسانی حقوق“ کے ایجنڈا کے علمبردار اور ڈورنرز کے پیسوں پر پلنے والی این جی اوز کے نمائندے بولے: کیا یہ تو کینیڈا جیسے ملک میں سنگسار کرنے، ہاتھ کاٹنے اور کوڑے مارنے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مہم غازی نے خواتین پر حجاب کی پابندی کو ظلم قرار دیا اور آخر میں اپنے گلے میں لٹکے چھوٹے سے کپڑے کو ہاتھ سے پکڑ کر لہراتے ہوئے کہا: بس، بہت ہو گیا۔

لیکن جہاں غیرت مندوں کا ہجوم جمع ہوا اور جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو جو یہ جانتے ہوں کہ یہ چند مغرب زدہ لوگ کس کی زبان بول رہے ہیں اور کس کے پیسے پر پل رہے ہیں؟ وہاں ایسی باتیں صدائے صحراء ہو جاتی ہیں اور قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ تالیوں کی گونج میں اس قرارداد کے پیش کرنے میں مبینہ شیخ نے کہا: ”یہ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام کا قانون انسان کے بنائے ہوئے قانون سے افضل ہے۔ ٹھیک ہے ہم کینیڈا کے لبرل اور سیکولر ماحول میں رہ رہے ہیں لیکن ہمیں ہماری اقدار اور ہماری روایات اور ہمارے قانون کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے نہ کہ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ لوگوں کے قانون کے مطابق۔“

یہ آواز ایک ماہ پہلے صرف تین سو مسلمانوں کے گروہ سے اٹھی تھی اور آج کینیڈا کی مسلمان آبادی کا مطالبہ بنتی جا رہی ہے جس ملک میں انیسویں صدی میں صرف 5 مسلمان رہتے تھے وہاں آج 12 لاکھ مسلمان ہیں اور اتنی بڑی تعداد کے لیے قانون کی منظوری کینیڈا کی حکومت اور آئین کی مجبوری ہے لیکن میں سوچتا ہوں اور حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ صرف چند مسلمانوں کی ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت مسلمانوں میں عظمت رفتہ کے خواب زندہ کر سکتی ہے، یہ ہجرت تو صرف مسلمان کہلانے پر ستائے جانے والوں کی ہجرت تھی۔ اگر کبھی دین کے غلبے اور اسلام کی سرشاری میں ہجرت کا آغاز ہو گیا تو دنیا کا نقشہ کیسا ہوگا؟

## تیسرا راستہ

(27 جمادی الاول 1425ھ بمطابق 16 جولائی 2004ء)

جب آج سے تین سال قبل امریکا میں دنیا بھر سے مزدوری کے لیے آنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تو ان کے سامنے تین راستے تھے: چپ چاپ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور جیسے بھی ہوان کی بوسو گھٹتے امریکی ایف بی آئی کے ایجنٹوں کے ہاتھ نہ آئیں۔ دوسرا راستہ مجبوری کا تھا یعنی اگر آپ رجسٹریشن والوں کے سامنے لوکل پولیس کے رو برو یا پھر ایف بی آئی کے چھاپوں میں گرفتار ہوں تو امریکی جیل میں اپنے مستقبل کے فیصلوں کا انتظار کریں لیکن اکثر مسلمانوں نے ایک تیسرا راستہ بھی اپنایا۔

نیویارک کے مشہور جزیرے مین ہٹن کے تینوں سچ ایک بڑی سی سڑک پر ایک بسوں کا اڈہ ہے، یہاں سے امریکا کے ہر کونے کی طرف بسیں چلتی ہیں۔ ان لمبی لمبی بسوں پر موٹے موٹے حروف میں UREY HOUND لکھا ہوتا ہے۔ ان دنوں مین ان بسوں پر سوار ہونے کے لیے غریب الدیار مسلمانوں کا ہجوم ہوتا۔ یہ اکثر آدھی رات کے وقت سخت سردی میں بڑے بڑے کوٹ پہنے، اپنے بچوں کو سینے سے لپٹائے اور اپنی کل متاع چند سوٹ کیسوں میں سمیٹے آئے اور وہاں سے پلاسٹک برگ کی بس پر سوار ہوئے۔ منزل پر پہنچ کر انہیں تین فلائنگ پیدل چلنا پڑتا۔ پورا راستہ برف سے ڈھکا ہوتا اور درجہ حرارت 15 سے 20 درجے منفی کی سطح پر ہوتا۔ سامان کندھوں پر اٹھائے ننھے ننھے بچوں کی انگلیاں تھامے یہ کینیڈا کی چیک پوسٹ پر پہنچتے، اپنا پاسپورٹ جمع کرواتے اور ایک درخواست بھی جس میں لکھا ہوتا کہ ہم اپنے گھریا اور ماحول سے خوفزدہ آپ کے ملک میں رہنا چاہتے ہیں۔

یوں تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ان کے پاس گیارہ مہینے کے بعد کی جانے والی نفرت اور تعصب کی کہانیاں بہت تھیں۔ کیسے برسوں ان کے ساتھ رہنے والے ان سے اجنبی ہو گئے تھے ان کی بچیاں اگر حجاب کے ساتھ گھروں سے باہر نکلتیں تو کیسے ستائی جاتیں، ان کی دکانوں کا کس طرح بائیکاٹ کیا گیا؟ کیسے انہیں چند لمحوں میں باعزت شہری سے ذلت و رسوائی کی پستیوں میں گرا دیا گیا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب پورے مغربی میڈیا پر مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ عام تھا اور دہشت گرد کا دوسرا نام مسلمان رکھ دیا گیا تھا۔ ایسے میں کینیڈا کے مسلمان بھی دم سادھے، چپ اور دیار غیر میں مصلحت کوش ہو کر بیٹھے ہوئے تھے کہ لٹے پٹے مسلمانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے قافلے وہاں پہنچنے شروع ہوئے اور میڈیا کے مقابلے میں سچ سے لبریز ظلم کی کہانیاں وہاں پر عام ہونے لگیں۔ وہ جو اپنی مصلحت، خاموشی اور امریکی نظام سے مفاہمت کی سزا بھگت کر رہے تھے انہوں نے مہذب دنیا کا چہرہ الٹ دیا۔

جلال بابا رصدر اور عدنان مندریس وزیراعظم منتخب ہو کر آئے تو انہوں نے ایوانوں میں، مساجد میں عربی زبان میں اذان کا آغاز کیا۔ وہ لوگ جو اس ملک میں اپنے طور پر ان اقدار کو دفن کر چکے تھے پریشان ہو گئے، مقدمہ چلا، عدالتوں نے فیصلہ دیا، جلال بابا کو عمر قید اور عدنان مندریس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ لوگوں کے خوف سے عدنان مندریس کو پھانسی دینے کے بعد جیل میں ہی دفن کر دیا گیا۔ غیظ و غضب سے بھر پور ہجوم باہر نکل آیا اور اپنے محبوب رہنما کے جسد خاکی کو قبر سے نکالا اور ایک مسجد کے محن میں دفن کر دیا۔

یوں احساس ہو گیا تھا کہ اگر ایسے ہی چلتا رہا تو ایک دن ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ فوج آگئی، نیا آئین مرتب ہوا، مکمل طور پر سیکولر اور اس سیکولر آئین کے تحفظ کے لیے نیشنل سیکورٹی کونسل بنادی گئی اور کہہ دیا گیا کہ خردار اگر اسلام کی پہچان کی طرف بھی لوٹنے کی کوشش کی تو دیکھنا ہم مسلح افراد بیٹھے ہیں امریکا کے پروردہ یورپ کے نمک خوار۔

یہ وہی آئین ہے جس کا سہارا لیتے ہوئے 24 جون کو ایک آئینی عدالت نے 99 فیصد مسلمانوں کے ملک میں ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز فیصلہ کر دیا۔ ترکی کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 440 کے تحت عورت کو زنا کے جرم میں تین سال سزا دی جاتی تھی۔ عدالت نے کہا کہ قانون ہمارے آئین کے منافی ہے اس لیے کہ ایسے تعلقات رکھنا آئینی طور پر کسی انسان کا حق ہے۔ اس عدالت کے 9 ممبران تھے جن میں سے 7 نے اس فیصلے کا ساتھ دیا اور 2 نے اختلاف کیا۔ ایسی ہی ایک عدالت 1996ء میں اسی فوجداری قانون کی دفعہ 441 کو منسوخ قرار دے چکی ہے جس کے تحت مرد زنا کاروں کو اس بات کی سزا دی جاتی تھی اگر وہ معاوضہ کے عوض ایسی حرکت کا ارتکاب کریں۔

یوں تو انقرہ کے بازاروں میں اسی دن لاکھوں لوگ غیظ و غضب میں سڑکوں پر نکل آئے، ہزاروں عورتیں اپنے سروں پر حجاب لیے اس مجبور عدالت کے حکم کے خلاف نعرے لگا رہی تھیں۔ فوج کے زیر اثر عدلیہ پر گالیاں اور امریکی زیر اثر فوج پر غصے کا یہ عالم تھا کہ پورا شہر آگ کی طرح ابل رہا تھا۔

دنیا بھر کے میڈیا سے میں یہ خبر پڑھ رہا تھا اور شرم سے جھکے ہوئے سر کے ساتھ سوچ رہا تھا: ”کیا بڑی طاقتوں کے سرخ رو ہونے کی اتنی بڑی قیمت بھی ادا کی جاسکتی ہے؟ انسانوں کی تاریخ میں شاید ہی کسی چیز پر اتنا خون نہ بہا ہو، اتنی قربانی نہ دی گئی جتنی غیرت و حمیت پر دی گئی..... مگر کیا کریں غیرت و حمیت کا درس تو پیغمبروں کی تعلیمات سے ملتا ہے۔ ان تعلیمات کا سایہ سر پر نہ ہو تو مولانا روم کے دلیں میں.....“ اس سے زیادہ دکھانہیں جاتا۔ آنسو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور قلم رک رک جاتا ہے۔

مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ کہانی ہمارے ہاں تو نہیں دہرائی جا رہی؟ کہیں ہم بھی تو اسی راستے پر نہیں چل پڑے جہاں نادان ترک بھائی قبائے خلافت کو چاک کر کے نکل گئے تھے اور پھر آج تک انہیں واپسی کا راستہ نہیں ملا.....



## حمیت نام تھا جس کا

(04 جمادی الثانی 1425ھ بمطابق 23 جولائی 2004ء)

یہ وہی ملک ہے جہاں آج سے تقریباً 90 سال قبل مسلمانوں سے وہ ساری علامتیں، ساری نشانیاں اور سارے مظاہر چھین لیے گئے تھے جو کسی راہ چلتے کو یہ احساس دلا سکیں کہ اس کے ارد گرد چلتی پھرتی مخلوق مسلمان ہے۔ یورپ کے قرب و جوار میں سانس لینے والی اس قوم کو بد بختی سے ایک ایسا لیڈر میسر آ گیا جس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اور سوچنا سب یورپ کی سیکولر ”اخلاقیات“ سے مرعوب تھا۔ وہ اپنے آپ کو ”روشن خیال“ کہتا اور اسلام کو روشن خیال بنانے اور اپنی قوم کو سیکولر روپ میں ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جہازوں کے جہاز بھر کر مغربی ملبوسات منگوائے گئے، صاحب حیثیت لوگوں کے لیے نئے اور غریبوں کے لیے پرانے، جہاں کہیں مسلمانوں کی علامت کے طور پر عبا، جبہ، دستار یا پھندے والی ٹوپی نظر آ جاتی اتروادی جاتی۔

سب سے بڑا ظلم تو عورتوں پر تھا کہ صدیوں اپنے گھروں سے نکلنے ہوئے اپنے مذہب کی پیروی میں سروں پر اوڑھنیاں اوڑھ کر یا برقع پہن کر نکلتی تھیں، انہیں مجبور کر دیا گیا کہ اگر وہ باہر آئیں تو ننگے سر..... یا پھر گھروں میں چھپی بیٹھی رہیں۔ اقتدار کے ایوانوں، سرکاری دفاتر، بڑی بڑی پارٹیوں اور محافل میں عورتوں کو اسکرٹ پہن کر آنے کے لیے کہا گیا۔

اسی ملک کے مسلمانوں سے ان کی اسلامی شناخت چھیننے کے لیے ایک اور کام کیا گیا۔ ان کی زبان کا رسم الخط جو عربی حروف تہجی سے مل کر بنا تھا فی الفور ختم کر دیا گیا اور پوری زبان کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا حکم دیا گیا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے یہ حکمران اس قدر خوفزدہ تھا کہ قرآن تو قرآن وہ مسلمانوں کے منہ سے ایک لفظ بھی عربی کا سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔

جمعہ کے خطبہ کو ترکی زبان میں دینے کا حکم دیا گیا اور اذان بھی ترکی میں دینے کے احکام صادر کیے گئے۔ جس اسمبلی میں قرارداد پاس ہو رہی تھی وہاں ایک غیرت مند مسلمان ممبر نے مائیک پر ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند کی تو اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ دوسرا اٹھا اور اس نے اذان کو آگے بڑھایا۔ اسے بھی گولی کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں سات راسخ العقیدہ مسلمان ممبران اسمبلی نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر اسمبلی کے فلوور پر اذان مکمل کی۔

اس ملک کی 90 سالہ تاریخ ایسی قربانیوں اور ایسے ہی ظلم و ستم اور تشدد سے بھری ہوئی ہے۔ جو لوگ عوام کے ووٹوں سے اقتدار میں آئے اور انہوں نے اسلام کی اصلی روح کو بحال کرنے کی کوشش کی، انہیں دو قوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سیکولرزم سے رچی بسی فوج اور دوسری اس فوج کے اشاروں پر چلنے والی عدلیہ۔ جیسا چاہا جس طرح کا چاہا

ایف بی آئی نے اسے کہا کہ یہ معلومات اسے دو۔ اس نے انکار کر دیا تو اسے 1990ء میں ایک فراڈ کے مقدمہ میں سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد وہ ٹی وی کے پروگراموں میں سیکورٹی کا ماہر بن گیا۔ مشورے دیتا رہا، دو سال پہلے اس نے روبن لور کے ساتھ مل کر ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا ”اسامہ بن لادن کی تلاش“ اور پھر اس کتاب کے ہیرو کی طرح 25 ملین ڈالر کا انعام افغانستان روانہ ہو گیا۔

اس نے کابل کے نواح میں سبز رنگ کے ایک بڑے مکان میں ایک ٹارچر سیل قائم کیا وہ اس کے ساتھی امریکی فوج کی یونیفارم پہنتے۔ نہتے عام شہروں کو گھروں سے نکالتے، تشدد کرتے اور 25 ملین ڈالر کا انعام کے لیے رات دن لگے رہتے۔ یہاں تک کہ ان کی زد میں افغان سپریم کورٹ کے رکن مولوی صدیق اللہ بھی آ گئے۔ جب وہ پکڑے گئے تو اس گھر میں آٹھ افغان شہری تشدد کا نشانہ بن رہے تھے، غلام نجی کو چھت سے الٹا لٹکایا ہوا تھا۔ اس نے کہا مجھے 18 دن سے اس حالت میں رکھا گیا ہے شیر خان نے کہا مجھے گھر سے اٹھایا، راستے میں بندوقیں مار کر میری پسلیاں توڑی گئیں اور پھر کبھی مجھ پر گرم پانی اور کبھی شدید ٹھنڈا پانی انڈیا گیا۔

گرفتاری کے بعد جج عبدالباسط بختاری کے سامنے جو ناتھن نے اکہرائے ہوئے لہجہ میں کہا، یہاں رسفیلڈ کے کہنے پر آیا ہوں اور میں اس کے ساتھ فیکس اور ای میل کے ذریعے رابطے میں رہتا ہوں۔ اس کے وکیل جان ٹینفنی نے کہا میرے پاس دستاویزی ثبوت ہیں کہ یہ پرائیویٹ جیل رسفیلڈ اور پیٹنا گون کی ہدایت پر بنی ہے اور ایسی بہت سی جیلیں یہاں موجود ہیں۔

ایسا کیوں؟ اس جیل پر چھاپہ کیوں مارا گیا؟ ایڈیما کے ساتھ ایک شخص ایڈ کاربلو بھی گرفتار ہوا جو اس سب تشدد کی فلم بنی کر رہا تھا اور امریکیوں کو خوف محسوس ہوا کہ ڈالروں کی ہوس میں وہ یہ فلم بھی کہیں فروخت نہ کر دے اور پھر صدر بش کے ایکشن بری طرح متاثر ہو جائیں۔

دوسرا یہ کہ امریکی فوج نے جس طرح کابل کو عیاشی اور فاشی کا اڈہ بنایا ہوا ہے وہ افغان قوم کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی مذہبی اور اخلاقی روایات ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ وہ اس غصے میں اپنی کٹھ پتلی حکومت پر گر جتے ہیں اور ان کٹھ پتلی حکمرانوں میں بھی کبھی غیرت و حمیت جاگ اٹھتی ہے۔ یہی سب کچھ تھا جب برطانوی فوج کابل کے بازاروں میں یوں کچلی گئی تھی کہ صرف ایک ڈاکٹر زندہ چھوڑا گیا تھا کہ دوسروں کو افغان غیرت و حمیت اور انتقام کی کہانی سناسکے۔

ایسی کہانی کے دوبارہ سنانے کے دن قریب آتے جا رہے ہیں اور خوفزدہ امریکی حکمران ایڈیما کے بارے میں بیان دے رہے ہیں کہ اس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں لیکن جب غیرت و حمیت میں چمکتی ہوئی تلواریں نکلتی ہیں تو پھر نہ قابض فوجیں بچا کرتی ہیں اور نہ ڈالروں کی تلاش میں پرائیویٹ جیل خانے چلانے والے غنڈوں کے غول۔



## غنڈوں کے غول

(11 جمادی الثانی 1425ھ بمطابق 23 جولائی 2004ء)

یہ تو غنڈوں کے غول تھے جب وہ امریکا کی سرزمین پر آباد ہونا شروع ہوئے، چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں دندناتے پھرتے، بندوقیں لہراتے، بینک لوٹتے، مقابل آنے والوں کو قتل کرتے اور راستے میں ملنے والی جھونپڑیوں کو آگ لگا دیتے۔ جس شخص کا گینگ (گروہ) ذرا بڑا ہوتا، اس کے سینے پر ایک بچ لگا دیا جاتا جس پر شریف (SHERIFF) لکھا ہوتا اور یوں وہ قانون نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوتا۔ یوں لگتا پورا امریکا ایسے گروہوں سے بھرا پڑا ہے جو ڈالروں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور دولت کی ہوس میں سب کچھ کر گزرتا ہے جس کی قانون، اخلاق اور اقدار اجازت نہیں دیتے۔

یہ ہوس زر آج بھی امریکی معاشرے کا طرہ امتیاز ہے، آج بھی ایسے مسلح گروہوں کی کوئی کمی نہیں، بینکوں کو لوٹنا، کلبوں کو تاراج کرنا، بے وجہ قتل کرنا اور سر راہ اکیلے افراد کو چھرا گھونپ کر ان کی جیب سے تھوڑی بہت رقم اڑانا ایسے لوگوں کا مشغلہ ہے، عام امریکی خوفزدہ اور سہارا رہتا ہے، گھر سے نکلے تو چند ڈالر جیب میں ڈال لیتا ہے کہ اگر جیب خالی ہوئی تو لوٹنے والا ناراض ہو کر اسے قتل نہ کر دے۔ شام چھ بجے کے بعد کام کرنے والے اپنے دفاتر کو تالا لگا لیتے ہیں۔ خواتین ملازم کے ہاتھ روم پر نمبروں والے تالے ہیں اور ان کے نمبر صرف خواتین کو معلوم ہوتے ہیں کہ کہیں کوئی ان میں گھس کر زیادتی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے۔

دولت کی اس ہوس میں ڈرے ہوئے اس معاشرے میں جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ فلاں ”دہشت گرد“ کے سر کی قیمت 25 لاکھ ملین ڈالر ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو آج افغانستان کی سرزمین پر ہو رہا ہے۔ غنڈوں کے غول کے غول اس وقت مختلف سفارتخانوں کی سیکورٹی کے لیے گارڈز کے روپ میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ یہ سب کالے رنگ کی عینک پہنے ہوتے ہیں، کمانڈو کی طرح کے لباس، کندھے پر مشین گن لٹکائے اور پنڈلیوں سے پستول باندھے ہوتے ہیں۔ یہ سب مصطفیٰ ہوٹل کابل میں گھومتے ہیں۔ یہ کابل کے بازاروں میں کھلی شراب کی دکانوں اور عورتوں کے کاروبار کے مراکز میں بھی نظر آتے ہیں۔

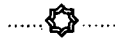
ڈالروں کی ہوس میں ایک شخص جو ناتھن کینتھ ایڈیما اپنے دوستیوں کے ساتھ کابل پہنچا۔ یہ شخص 1975ء سے 1992ء تک امریکی فوج کی اسٹیشنل سروسز کا رکن رہا ہے۔ وہ لیٹیویا میں تعینات رہا جہاں اسے ایسی معلومات ملیں کہ روس کے ایٹمی اثاثے کیسے دہشت گردوں کو فروخت ہوتے تھے۔ اس نے یہ سب کہانی ایک فلم پروڈیوسر سرجار کلوئی کو بتائیں جس نے اس پر Peace Rober کے نام پر ایک فلم بنا ڈالی۔

سکیں، مگر دل کو حوصلہ ملتا ہوگا نہیں فلپائن تو 110 سال سے امریکا کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں تو ہماری جان ضرور بچ جائے گی۔

کبھی کبھی خیال آتا ہوگا۔ ہمارے قبائلی علاقوں میں موجود جنگ چل رہی ہے اس میں ہمارا امریکا پر بڑا بھروسہ ہے۔ اس کی امداد کے بغیر، اس کی ٹیکنالوجی کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ایسا سوچتے ہوئے وہ مایوس ہو جاتے ہوں گے۔ مگر پھر خیال آتا ہوگا۔ نہیں فلپائن کے مندانو کے علاقے میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کئی سال سے چل رہی ہے اور امریکی فوج کی چھاونیاں وہاں موجود ہیں جو انہیں کچلنے کے لیے حکومت کا ساتھ دیتی ہیں۔ اس کے باوجود بھی فلپائن کی حکومت نے فوج واپس بلالی اور ان کا ڈرائیور بچ گیا۔ ہمارا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس ابھی حکومت کی طرف سے اعلان آتا ہی ہوگا۔

تنہائی میں، قید میں، موت کے بڑھتے ہوئے سائے میں وہ طرح طرح کے سوالوں سے الجھتے ہوں گے۔ طرح طرح کے جواب طرح طرح کی تسلیاں دیتے ہوں گے، انہوں نے یہ بھی سوچا ہوگا دیکھو فلپائن پر تو ایک کمزوری نازک سی منحنی سی عورت حکمران ہے۔ عورت کتنی کمزور ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے شہری کے لیے امریکا سے ٹکر لے گئی۔ ہمارے ہاں تو مرد اور شیر آزاد حکمران ہے وہ تو یوں آنکھیں پھاڑ کر میدان میں آئے گا اور کہے گا کہ..... اور پھر ہم دونوں اپنے گھر آزاد بیٹھے ہوں گے..... مگر میں کیا کروں؟

وہ آنکھیں مرنے کے بعد بھی کھلی ہیں اور محو انتظار ہیں اس اعلان کی جو سب نشریات روک کر ٹیلی میڈیا پر کیا جانا تھا۔ وہ کان آج بھی زمین سے لگے اس ارتعاش کو محسوس کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں جس میں یہ صدا گونجتی تھی جو فلپائن کی صدر نے صرف ایک فقرہ میں کہہ دی تھی: ”خارجہ پالیسی سے زیادہ انسان ہمارے نزدیک اہم ہے۔“ پتا نہیں کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو مزید اس فقرے کی گونج کا انتظار کرنا ہے۔



## اس آواز کا انتظار

(18 جمادی الثانی 1425ھ بمطابق 106 اگست 2004ء)

میں کبھی چشم تصور میں ان دنوں کے آخری لمحات لے کر آتا ہوں تو سوچتے سوچتے میرا ذہن بند ہو جاتا ہے، آنکھیں آنسوؤں سے تر اور جسم ایک آن جانے وسو سے میں ڈوب جاتا ہے، راجہ آزاد اور سجاد نعیم دونوں ایک ایسی مملکت میں پیدا ہوئے جسے آج عالمی طاقتوں کے ساتھ دہشت گردی کی خلاف جنگ میں ساتھ دینے پر فخر ہے جس کے حکمران اس طرہ امتیاز اور تمغے کو اپنے سینے پر آویزاں کیے جگہ جگہ اس کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ یہ دونوں ایک ایسے ملک کے باشندے تھے جن کی حکومت اپنے ہاں پیدا ہونے والے ہر شخص کے لیے روزگار فراہم نہیں کر پاتی۔ یہاں 45 فیصد سے زیادہ لوگ غریبی کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں اسی لیے ان دونوں کو تلاش رزق کے لیے ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں خاک چھانا پڑتی۔

یہ ایسے ملک کے شہری تھے جو اپنی پیدائش سے تھوڑی دیر بعد ہی امریکا جیسی طاقت کا دست نگر ہو گیا تھا۔ اسی کی امداد پر پلتا، اسی کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتا اور اسی کی گود میں بیٹھ کر اپنی پالیسیاں مرتب کرتا۔ یہ دونوں بے چارے اس دھرتی پر پیدا ہوئے جہاں حکمران لوگ تبدیل نہیں کیا کرتے بلکہ بیرونی اشارے کے تحت تاج و تخت الٹا کرتے ہیں۔ ان کا ملک کتنا مجبور تھا اس کی سرحدوں پر ”القاعدہ“ کے دہشت گرد پناہ لیے ہوئے تھے اور ان سے جنگ کے لیے انہیں امریکی فوج، امریکی طاقت، ایف بی آئی اور سی آئی اے کی مدد چاہیے تھی ورنہ شاید وہ اس آپریشن میں کامیاب نہ ہو سکتے۔

ایسا سب کچھ تھا مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں میں جب بھی چشم تصور میں ان دونوں پاکستانیوں کے آخری لمحات لے کر آتا ہوں تو مجھے منظر آنکھیں جو انتظار کر رہی تھیں کہ ان کے ملک کے سربراہ کا چہرہ اچانک ٹیلی ویژن پر ابھرنے لگا، وہ صرف ایک بات کہے گا میں ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا: ”سب سے پہلے پاکستان“ سو آج یہ دونوں پاکستانی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں، محترم ہیں، ہم ان کی زندگیوں کے لیے عراق فوج نہیں بھیجیں گے۔ وہ آنکھیں پتھرا گئیں، وہ کان قوت سماعت سے محروم ہو گئے..... لیکن یہ آواز نہ گونج سکی۔

وہ سوچتے ہوں گے کہ ہمارا ملک دہشت گردی میں عالمی طاقتوں کا شریک ہے، ایسا کیسے کر سکتا ہے..... لیکن پھر خیال آتا ہوگا فلپائن بھی امریکا کا سو سال سے اتحادی ہی، القاعدہ کے خلاف جنگ میں شریک اس نے اپنے ایک ڈرائیور کے لیے اپنی بھیجی ہوئی فوج واپس بلالی۔ ہم نے تو صرف نہ بھیجنے کا اعلان کرنا ہے۔ وہ پھر سوچتے ہوں گے ہم تو 50 سال سے امریکی امداد کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں، شاید ایسا اعلان نہ کر



دے سکتے ہیں لیکن ہماری مکاری کو نہیں۔

اور پھر اس نے اپنی فوج کو درختوں کی اوٹ میں ایک دیوہیکل لکڑی کے گھوڑے کو بنانے کا حکم دیا جو اندر سے خالی ہو اور پھر کچھ عرصے بعد ایک آسمان سے باتیں کرتا دیوہیکل گھوڑا بن گیا جس کے نیچے پیسے لگے ہوئے۔ سپہ سالار نے اپنی فوج کو اس کے اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ آدھی کے قریب فوج اس میں آگئی۔ پھر رات کی تاریکی میں گھوڑے کو شہر کے بند دروازے پر چھوڑ دیا اور باقی فوج کو وہاں سے دور چھپ جانے کا حکم دے دیا جیسے سب لوگ یونان واپس چلے گئے ہیں۔

صبح جب ٹرائے کے لوگ بیدار ہوئے تو دیکھا یونان کے سپاہی تو چلے گئے لیکن دروازے پر ایک خوبصورت گھوڑا کھڑا ہے وہ سمجھے یہ یقیناً ان کے خدا کی طرف سے مدد اور اشارہ ہے۔ وہ اسے دروازہ کھول کر اندر لے آئے اور فتح کا جشن منا کر ناپچے لگے اور پھر ناپچے ناپچے گھروں کو لوٹ گئے۔ رات جب سب اس گھوڑے کی کرامت پر خوش فتح کے نشے میں چورسور ہے تھے تو یونانی فوج گھوڑے سے باہر نکلی اور سوئے ہوئے ٹرائے کے سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ دروازہ کھول دیا، باقی فوج بھی اندر داخل ہو گئی اور یونانی بہادری نہیں بلکہ یونانی مکاری نے ٹرائے کا شہر فتح کر لیا۔ اس روز سے آج تک ٹرائے کا گھوڑا مکاری و عیاری کی علامت سمجھا جاتا جس سے ہاری ہوئی جنگ جیتی جاسکے۔ آج بھی حال امریکا کا عراق میں ہے۔ مہینوں کی جنگ معاشی ناکہ بندی، قوت کا استعمال، اسلحہ کی برتری، ان سب کے باوجود وہ روز اپنے سپاہیوں کے تابوت واپس امریکا بھیج رہا ہے اس کے اپنے اتحادی واپس جا رہے ہیں جیسے یونان والوں کے ساتھی لمبے محاصرے اور نقصان سے تنگ آ کر واپس گئے تھے۔ اور اب بہادری کی جگہ مکاری اور عیاری کا تاریک راستہ اختیار کیا جا رہا ہے اور میرے لیے شرم کی بات یہ ہے کہ ”ٹرائے کا گھوڑا“ (یہ لفظ تشبیہ نہیں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوا ہے) جس کی اوٹ میں مسلمان فوج بھیجنے کی بات ہو رہی ہے وہ میرے ہی ملک کا ایک فرد (جہانگیر اشرف قاضی) ہے۔ یہ مسلمان بھی ہے، عربی بھی جانتا ہے اور یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ یہ امن کا راستہ لے کر آئے گا اور پھر اس کی اوٹ میں مسلمان فوج اترے گی اور جب یہ فوج عراق کے مجاہدین کی بنائی ہمت کی فسیل عبور کر جائے گی تو چھپی ہوئی امریکن فوج شب خون مار دے گی۔ لیکن ٹرائے کے اس گھوڑے کو علم نہیں کہ جب تو میں اپنے غداروں کے سر اڑانے کی ہمت کر لیتی ہیں تو باہر کے نفلی ہمدردوں کی گردنیں اس سے پہلے ان کی زد میں ہوتی ہیں۔



## ٹرائے کا گھوڑا

(25 جمادی الثانی 1425ھ بمطابق 13 اگست 2004ء)

یونان کی رزمیہ تاریخ میں ایک شہر کے باشندوں سے لڑائی کا بہت تذکرہ ملتا ہے۔ یہ شہر تھا ٹرائے۔ ترکی کے ساحلوں پر آباد ایک چھوٹا سا شہر جس کے رہنے والے نڈر، بے خوف اور بہادر تھے۔ نہ کسی کو غلام بنانے کی تمنا رکھتے اور نہ کسی کا غلام ہونا پسند کرتے۔ اپنی زندگی میں خوش اور اپنی دھن میں مگن، لیکن اسی شہر کے پڑوس میں یونان کا شہر آفاق شہر ایتھنز آباد تھا۔

دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں کہنے، فلسفے پر گفتگو کرنے اور اپنے آپ کو دنیا بھر سے بہتر مخلوق تصور کرنے والا شہر، جب خود پر غرور اور تکبر کا یہ عالم ہو تو پھر قومیں اپنی حدود و قیود میں بند نہیں رہا کرتیں۔ دوسروں کو زیر نگین کرنے کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں۔ یہی ایتھنز تھا جس سے سکندر ایک دن بلاوجہ دنیا فتح کرنے کا جنوں لے کر نکلا اور علاقوں کو روندنا ہوا ہندوستان آ پہنچا..... لیکن ایتھنز کے رہنے والے ہمیشہ ٹرائے کے خوبصورت شہر کو فتح کرنے کا خواب دیکھتے رہتے۔ بار بار بہانے بنا کر اپنی کشتیوں، جہازوں اور بحری بیڑوں پر سوار اس کے ساحل پر اترتے۔ گھسان کارن پڑتا اور پھر بھاگ کر واپس یونان آ جاتے۔ آئے دن کی لڑائیوں سے تنگ آ کر ٹرائے کے رہنے والوں نے اپنے شہر کے گرد ایک مضبوط فسیل بنالی تھی تاکہ ویرہی سے یونان کے سپاہیوں کو روک سکیں۔

ایک دفعہ ایتھنز کے لوگوں نے کئی سال لگا کر مضبوط تیاری کی اور مکمل منصوبہ بنایا کہ اب ہم شکست سے دو چار ہو کر واپس نہیں آئیں۔ ہزاروں کشتیوں پر سوار یونانی فوج ٹرائے کے ساحل پر اتری۔ سامان رسد کے لیے کشتیوں کا ایک علیحدہ دستہ مقرر کیا گیا۔ پڑاؤ ڈالنے کے بعد جب جنگ کا طبل بجا تو ٹرائے کے سپاہی انتہائی بے جگری سے لڑے لیکن یونان کے سپاہی اس دفعہ اپنے ساتھ ارد گرد کی ریاستوں کی سپاہیوں کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ لڑائی نے طول پکڑا تو ٹرائے کے لوگوں نے شہر کی فسیل میں قلعہ بند ہو کر مقابلے کا سوچا۔ چاروں طرف فسیلوں پر تیرکمان سے مسلح لوگ کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے بھی کوئی دیوار پر چڑھ کر اسے عبور کرنے کی کوشش کرتا، منہ کی کھاتا۔ محاصرہ طویل ہوتا گیا، بالکل ایسے ہی تھا جیسے کسی ملک پر معاشی پابندیاں لگا کر اس پر حملہ کیا جائے۔

ادھر مہینوں کے محاصرے کے بعد بھی یونان کے سپاہیوں کے مرنے کی تعداد کم ہونے کی بجائے دن بدن بڑھتی گئی۔ ٹرائے کے رہنے والے غیرت مند انتہائی مشکل میں تھے مگر کسی نے زبان نہ کھولی اور جنگ لڑتے رہے۔ ایک رات کو یونان کے سپہ سالار نے اپنے ساتھیوں کو تقریر کے لیے بلایا اور پھر اپنی جذباتی تقریر کے بعد کہا کہ ہم ٹرائے کے بہادر لوگوں کو شکست نہیں دے سکتے البتہ ایک دن وہ ہمیں ایک بار پھر شکست دے دیں گے۔ وہ ہماری فوج کو تو شکست

فروخت کے ریکارڈ توڑ رہی ہے۔

خوفزدہ فلاچی نے اس کتاب میں یورپ کے حکمرانوں کو نا اہل اور نیند میں ڈوبے ہوئے کہا ہے کیونکہ ان کو اندازہ نہیں کہ پورا یورپ آہستہ آہستہ اور خاموشی کے ساتھ ”اسلام کی کالونی“ بنتا جا رہا ہے اور ایک دن یہ یورپ نہیں یوروبیا (Eurobia) ہو جائے گا۔ اس نے اپنے ہزاروں پڑھنے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے علاقوں، شہروں اور محلوں میں مسلمانوں کا پیچھا کریں اور انہیں یورپ سے نکال دیں ورنہ وہ ایک دن اپنے ہی ملک میں اجنبی ہو جائیں گے۔ اس کتاب کو اس وقت کی اٹلی کی موجودہ حکومت کے گروپ ناردرن لیگ کے کارکن اپنے تقریروں، مباحثوں اور گفتگو میں موضوع بنائے ہوئے ہیں۔

یہ خوف کیوں ہے؟ اور یہ صرف اٹلی میں ہی نہیں پورے یورپ میں نظر آتا ہے۔ وہ ممالک جنہوں نے لبرل ازم کا لبادہ اوڑھ کر اپنے معاشرے سے مذہب کو دلیس نکالا دے دیا تھا۔ اس لیے ان کا ظالم چرچ ان کی زندگیوں کو جہنم بنائے ہوئے تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ جب حقانیت سے پر کسی مذہب کی خوشبو دروازے پر دستک دیتی ہے تو انسان جو دین فطرت پر پیدا ہوا ہے اس خوشبو کو اپنے دل میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا۔

پاپائے روم کے اٹلی میں آج اس وقت مسلمانوں کی تعداد 8 لاکھ سے زیادہ ہے۔ وہ اٹلی کا دوسرا بڑا مذہب ہے لیکن آج تک کسی بھی حکومت نے انہیں اتنی بڑی اقلیت کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ وہ حکومت کے اعداد و شمار میں یہودی، بدھ اور مخالف پروٹسٹنٹ تو موجود ہیں لیکن مسلمان کہیں نظر نہیں آتے۔ انہیں کبھی عرب تارکین وطن یا دیگر تارکین وطن کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ سب کیوں خوفزدہ نہ ہوں؟ ان کے سامنے دنیا کے بدلتے ہوئے پس منظر کا نقشہ ہے۔ وہ تمام اعداد و شمار ہیں جو انہوں نے خود مرتب کیے ہیں۔ انہی اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ 50 سال میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی میں 235 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ عیسائیوں کی آبادی میں صرف 47 فیصد جب کہ یہودیوں کی آبادی میں 4 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ یورپ اس لیے بھی زیادہ خوفزدہ ہے کیونکہ امریکا میں مسلمانوں میں اضافے کی شرح صرف 25 فیصد ہے جب یورپ میں مسلمان 143 فیصد کی شرح سے بڑھ رہے ہیں اور آسٹریلیا میں 157 فیصد کی حیرت انگیز رفتار ہے۔

اس وقت فرانس، برطانیہ، اٹلی اور اسپین جیسے بڑے ممالک میں اسلام دوسرے بڑے مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ دنیا میں صرف آٹھ سال پہلے یعنی 1996ء میں مسلمان ایک ارب 48 کروڑ تھے اور آج ایک ارب 95 کروڑ ہو چکے ہیں اور یہ سب اضافہ یورپ کے ممالک میں ہے کیونکہ ایشیا میں مسلمانوں کی آبادی صرف 19 فیصد بڑھی ہے۔

اس عالم خوف میں فلاچی جیسے دانشور بوکھلاہٹ میں کتابوں پر کتابیں لکھ رہے ہیں، نفرت کی آگ سلگا رہے ہیں لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے وہ قوم اور مذہب جس کی خوشبو سے پورا مغرب خوفزدہ ہے، ڈرتا ہے اسی مذہب کے نام لیوا حکمران مصلحت اور خوف کے عالم میں ڈرے ڈرے، سہمے سہمے اپنوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں کی آنکھوں میں منظور نظر ہونے کے لیے جو خود خوف سے تھر تھرا کانپ رہے ہیں۔ ان کی رات کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔

## خوفزدہ یورپ

(02 رجب 1425ھ بمطابق 20 اگست 2004ء)

یہ وہی خاتون ہے جو گزشتہ چار دہائیوں سے دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں، حکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں کے انٹرویو لے رہی ہے۔ اس کی قلم کی کاٹ اور اس کے چھپنے والے انٹرویوز کی اہمیت اس قدر ہے کہ بڑے بڑے حکمران کبھی اس کو انٹرویوز کی درخواستیں بھیجاتے ہیں اور کبھی مختلف راستوں اور طریقوں سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کس طرح ان کا ایک بار انٹرویو لے اور اسے اخبار کی زینت بنائے۔ خود درخواست کر کے انٹرویوز کے لیے بلانے کی کہانی اس نے ذوالفقار علی بھٹو کے انٹرویو میں بڑے کھل کر بتائی ہے۔

اس کی کتاب An Interview with History پوری دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل ہے۔ اس کتاب میں اندرا گاندھی سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو تک اور آیت اللہ خمینی سے لے کر مائزے تنگ کئی شخصیات کے انٹرویوز ہیں۔ بال کی کھال نکالنے اور رہنماؤں کی خامیوں اور خوبیوں کو نمایاں کرنے میں اسے کمال حاصل ہے۔

یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر رہنما کی شخصیت کے خول آپ کے سامنے ترخ کر کے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اٹلی کی رہنے والی یہ خاتون اور یانا فاچی اپنا ملک چھوڑ کر امریکا کے شہر نیویارک میں آباد ہے کہ وہیں سے اسے عالمی پریس تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن گزشتہ تین سال سے اسے اپنے آبائی وطن اٹلی جو قدیم دنیا کا روم تھا، کا دکھ کھائے جا رہا ہے۔ وہ روم جو عیسائیت کی ترویج کا مرکز و محور رہا اور آج بھی پاپائے روم کی نشست گاہ ہے۔ جہاں سے صدیوں پوری دنیا کے گرجا گھروں اور عام عیسائی انسانوں پر راج کیا جاتا رہا ہے۔ لوگوں کو زندہ جلانے اور بڑے بڑے چھروں سے ذبح کرنے کے احکام دیئے جاتے رہے ہیں، مسلمانوں کے خلاف تین صلیبی جنگوں کی حکمت عملیاں طے ہوتی رہی ہیں اور پورے یورپ سے 12 سال کے بچوں سے لے کر 70 سال کے بوڑھوں تک کو مذہبی منافرت کے نام پر بھرتی کر کے بیت المقدس کو فتح کرنے کے لیے بھیجا جاتا رہا ہے۔

اور یانا فلاچی کو آج اسی روم اور موجودہ اٹلی کے لٹنے کا دکھ ہے، جب سے 11 ستمبر کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ ہوا ہے فلاچی نے تین کتابیں مسلمان کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کے خلاف لکھی ہیں۔ اس کی تیسری کتاب گزشتہ دنوں اٹلی کے سب سے زیادہ بکنے والے اخبار Corrier Della Sera نے چھاپی ہے اور اسے اپنے اخبار نے ساتھ اخبار بیچنے والے اسٹالوں پر رکھ دیا ہے۔ اس کی پہلی دونوں کتابیں بھی بہت زیادہ تعداد میں بکیں اور یہ بھی

ساتھیوں کے روپ میں نظر آتے ہیں کہ دریائے کنہار ان کے خون سے رنگین ہو جاتا ہے۔ آئیے میں آپ کو 1864ء میں دلی میں لگی ایک عدالت میں لے چلوں۔ یہاں انبالہ کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کیپٹن ٹائی سن، پولیس کپتان پارسن اور ڈی آئی جی میجر بفیلڈ کریسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری اور مولانا بیگی علی صادق پوری اور ان کے سات ساتھی جھکڑیوں میں جکڑے، پاؤں میں بیڑیاں اور طوق پہنے لائے جاتے ہیں۔ کپتان پارسن مولانا جعفر سے منصوبے کی تفصیل پوچھتا ہے۔ انکار پر شدت کے ساتھ ان کے ہاتھوں، پشت، بازوؤں اور سر پر بید مارنا شروع کرتا ہے اور بے ہوش کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اگلے دن چار پانچ بٹے کئے گئے جو ان کو لایا جاتا ہے اور صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک بیدوں، لالوں اور ہنروں سے مارا جاتا ہے۔ مارنے والے وقفے میں سانس لے کر تازہ دم ہو کر پھر مارتے ہیں اور مولانا اور ان کے ساتھیوں کو نڈھال کر کے چھوڑا جاتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں درختوں کے پتے کھا کر یہ لوگ افطار کرتے ہیں۔

کیا عجیب منظر ہے؟ 11 اپریل کو یہ لوگ عدالت میں آئے، بیڑیوں اور طوق کے ساتھ ظہر کا وقت آیا سب نے وہیں تیمم کر کے نماز ادا کی۔ 2 مئی 1864ء جج نے مولانا جعفر، مولانا بیگی اور محمد شفیع کو پھانسی کی سزا سنائی اور لاشوں کو جیل میں دفنانے کا حکم جاری کرایا۔ تینوں مردان خُرنے وہیں عدالت میں سجدہ شکر ادا کیا۔

انگریز حیران رہ گئے اور پھر ڈپٹی کمشنر پارسن جیل میں ان کے پاس آیا۔ کہا: ”دیکھو! ہم تم کو تمہاری مرغوب سزا شہادت نہیں دیں گے، تم سب کا لاپانی جاؤ گے، عمر بھر کے لیے۔“

تینوں کے سر کے بال اور ڈاڑھیاں صاف کر دی جاتی ہیں، مولانا بیگی اپنی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال اٹھا کر فخر سے کہتے ہیں: ”افسوس کس بات کا! تو تو خدا کی راہ میں کائی گئی۔“

یہ صرف ایک مقدمہ نہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہے اور آج بھی جل رہا ہے۔ پٹنہ کیس 1865ء راج محل کیس 1870ء، انبالہ کیس 1871ء سے لے کر آج تک نہ ان لوگوں کی حق اور سچائی کے ساتھ دینے کی ریت بدلی اور نہ حلیے اور لباس..... لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو لال قلعہ کا دروازہ ٹوٹا ہے نہ بہادر شاہ ظفر معزول ہوا ہی، نہ فرنگی فوج دندناتی ہوئی ملک میں داخل ہوئی ہے مگر پھر کیوں منظر وہی نظر آتا ہے جو سرہنری کارٹن نے رکھا تھا؟ بس جس کے منہ پر ڈاڑھی اور ٹخنوں سے اوپر پاجامہ دیکھا اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ یہی وہ پہچان ہے جو حق اور باطل کے درمیان تمیز کرتی ہے، منافق اور صادق کا فرق واضح کرتی ہے۔ 1857ء میں بھی انگریز فوج کو انہی سے خوف تھا اور آج بھی باطل قوتیں انہی کے نام سے لرزہ برانداز ہیں۔



## ایک ہی منظر

(10 رجب 1425ھ بمطابق 27 اگست 2004ء)

کیا منظر ہے! برطانوی فاتح فوج دلی کے لال قلعے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکی ہے، مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کی حکومت ختم ہو چکی، صرف بہادر شاہ ظفر کی حکومت ہی کا نہیں برصغیر پر مسلمانوں کی حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ برطانوی فوج جب دلی کے بازاروں میں نکلی تو چوکوں اور چوراہوں پر ایسے پھانسیاں دی جانے لگیں جیسے درختوں پر بیا کے گھونسلے لگے ہوں، یہ کون لوگ تھے جن کے سردنوں تک پھانسیوں پر جھولتے رہے؟

سرہنری کارٹن دلی کی فتح کی یادداشتوں میں لکھتا ہے: ”اور پھر جب دلی فتح ہوئی تو جس کے منہ پر ڈاڑھی ہوتی یا جس کا پانچامہ ٹخنوں سے اونچا ہوتا اسے پکڑ کر تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا۔“

کیا اس جیتی جاگتی، ہنستی بولتی اور زندگی سے بھرپور دلی میں صرف یہی لوگ مسلمان تھے؟ نہیں ہرگز نہیں! ایسے ہزاروں آباد تھے جن کا نام و نسب مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو پھر یہ عتاب ان مخصوص افراد پر ہی کیوں ٹوٹا؟ ان کی گردنیں کیوں تختے اور پھندے کے لیے چنیں گئیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں پر پھیلے مسلمان معاشرے کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ حق کا بلا خوف و تردد ساتھ دینے والے اور باطل کے سامنے سرنگوں ہونے والے۔

یہی دلی جہاں مسلمانوں کا آخری حکمران علامت کے طور پر زندہ تھا، اس پر قبضے کے لیے جو فوج ترتیب دی گئی ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے نام و نسب مسلمانوں جیسے تھے، مگر انگریز فوج کی غلامانہ زندگی کسی مسلمان کو اس قدر مجبور کر سکتی ہے، یہ شاید گمان میں نہ آ سکے۔ اسی ”وفادار“ دیسی فوج کی ایک رجمنٹ فرنٹیئر فورس نے جب لال قلعے پر حملہ کیا تو دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی ایک سپاہی نے اس کے بیچ میں اپنا سر دے دیا۔ مغل سپاہیوں نے دروازہ بند کرنا چاہا، سپاہی کی گردن نیلی ہو گئی مگر دروازہ اندر سے بند نہ ہو سکا۔ اسے کٹور یہ کر اس ملا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ رجمنٹ آج بھی تہوار کے دن اپنی گردن پر ایک نیلی پٹی باندھتی ہے تاکہ اپنے اس وفادار کی یاد مناسکے۔

باطل کا ساتھ دینے کی روایت کا ساتھ دینے والے اور حق کا ساتھ دینے والے دونوں کی روایت بڑی طویل ہے، دونوں کی جنگ بڑی قدیم ہے لیکن میں جب بھی برصغیر کی جنگ میں حق کی لڑائی لڑنے والوں کے حلیے اور لباس تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے سرہنری کارٹن یاد آ جاتا ہے کہ بس جس کی ڈاڑھی اور ٹخنوں سے اوپر شلوار دیکھو اسے ذبح کر دو۔

یہ چہرے اور یہ حلیے مجھے 6 جولائی 1931ء میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ اور ان کے

کسی مسلمان کو ڈھونڈ رہا تھا جس کو یہ امانت لوٹا دوں، پتا نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا ایک مسلمان عورت اتنی بہادری سے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کس طرح جان دے سکتی ہے؟

ایسی داستانیں اور خون سے لکھی گئی ہزاروں نہیں لاکھوں حقیقتیں ہیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی قربانیوں سے تحریر کی ہیں۔ لٹے پٹے قافلوں، جلتے ہوئے گھروں، کٹے پھٹے لاشوں، مٹی میں ملتی آبروؤں کی کہانیاں۔ مدتوں ان کہانیوں کو سنانے والے ان کے چشم دید گواہ ہم میں موجود ہے۔ وہ بھرائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے لہجے میں جب کوئی واقعہ بیان کرتے تو میری آنکھ میں بھی آنسو تیر جاتے اور میں ان سے صرف ایک سوال کرتا: ”آپ سب نے یہ قربانیاں کس لیے دیں؟“

فوری جواب ہوتا: ”پاکستان کے لیے۔“

میں یہی کہتا کہ ایک خطہ زمین کے لیے تو انسانی تاریخ میں اتنی قربانی نہیں دی گئی۔ دس لاکھ لوگ مارے گئے۔ کیا صرف زمین اتنی اہم ہوتی ہے؟ میرے اس فقرے پر کوئی غصے سے اُچھل پڑتا تو کوئی آنسوؤں سے رونے لگتا اور کوئی جذبات سے مغلوب ہو جاتا اور پھر ایک ہی جواب ملتا: ”تمہیں پتا ہے ہم سب کے لیے یہ محض خطہ زمین نہیں تھا، اسلام کی جائے امان تھا۔ زمین تو ہمارے پاس پہلے بھی تھی، کھیتی باڑی کے لیے بھی اور سر چھپانے کے لیے بھی۔“

یہ نسل جب تک ہمارے درمیان رہی ان یادوں کے چراغ جلاتی رہی۔ یہی نسل تھی جس کے روبرو جب کشمیر کا جہاد شروع ہوا تو اگرچہ یہ لٹے پٹے تھے مگر جذباتوں سے سرشار اس قوم نے پشاور سے کراچی تک ایک رنگ و یک زبان ہو کر آج کے آزاد کشمیر کو ہندوؤں کی غلامی سے آزاد کرالیا۔ یہی کہانیاں سناتے لوگ اور جذباتوں سے پرداستانیں بیان کرتی مائیں 1965ء میں موجود تھیں کہ ہم جب تک ایک ہی تو تھے۔ اس وقت کسی کو نہ خطہ زمین یاد آیا نہ معاشی ترقی، نہ روشن خیالی یا درہی اور نہ امریکا سے دوستی۔ اس وقت کے صدر نے قوم کو پکارا تو اس کی زبان پر صرف ایک ہی کلمہ تھا اور وہ کلمہ طیبہ تھا۔ اس نے اسے پڑھا اور قوم نے یک روح اور ایک بدن ساتھ دیا اس لیے کہ ان کی گھٹی میں اس کلمہ سے محبت اور ان کے ضمیر میں اس سے قربانی کی یادیں رچی ہوئی تھیں۔

لیکن میرا دکھ اور میرا المیہ عجیب ہے۔ اس مختصر عمر میں میں نے اسی سرحد پر جس کے چپے چپے پر شہیدوں کے خون کی خوشبو مٹی میں گندھی ہوئی ہے، محبتوں، دوستیوں اور چاہتوں کے ہار پکڑے لوگوں کو دیکھا۔ وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد اس بات پر اپنے نسلوں پرانے مسکن چھوڑ آئے تھے، جو اپنے ساتھ رہنے والوں سے علیحدہ ہو گئے تھے کہ ان کو ایک کلمہ طیبہ کی لڑی اپنی جانب کھینچ رہی تھی، آج ان کی نسل فنکاروں، موسیقاروں، ناچنے والوں اور اداکاروں کو اپنا ورثہ قرار دے رہی تھی۔ ہم نے عیش پرستی کو اس قدر خود پر سوار کر لیا ہے کہ نہ ہمیں فتح کی خواہش رہی، نہ آبرو مندی سے جینے کی تڑپ۔ مگر اس سب کچھ بدلنے کی کوشش کے باوجود تاریخ ایک کشت و خون کا باب رقم کر رہی تھی۔ ویسے ہی جلتے ہوئے مکان، ویسے ہی کٹے پھٹے لاشے، ویسے ہی آبروریزی کے مناظر۔ یہ بھی مسلمانوں کے محلے تھے، انہی کے مسکن تھے، گجرات کے ہندو اکثریت کے صوبے میں۔ ان کے رنگ، ان کی شکلیں، ان کا کھانا پینا، ان کا لباس سب وہی تھا جیسے سب کا، مگر ان کی زبان سے صرف ایک کلمہ نکلتا تھا اور وہی کلمہ طیبہ تھا جس کی پکار قربانیاں دینے پر مجبور کرتی ہے۔ قوم کو جنگ میں متحد کرتی ہے، فتح سے ہمکنار کرتی ہے۔

## کلمہ کی لڑی

(17 رجب 1425ھ بمطابق 03 ستمبر 2004ء)

”یہ میرے پاس تمہارے لیے ایک امانت ہے، تم اس کشت و خون کے عالم میں مجھے مل گئے، میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔“ پھر اس نے اپنی جیب میں سلے کپڑے کا رومال نکالا جس پر کئی گرہیں لگی ہوئی تھیں، انہیں کھولا اور اس کے اندر ایک چھوٹا سا تعویذ تھا۔

اس نے یہ تعویذ اس مسلمان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ”لو آج موہن سنگھ سرخرو ہو گیا۔“ امرتسر کے جلتے ہوئے مسلمان محلے کی ایک تاریک گلی میں جب وہ یہ تعویذ اس کے حوالے کر رہا تھا تو وہ خوف سے چاروں طرف دیکھتا جاتا کہ کہیں کوئی ہندوؤں یا سکھوں کا غول اسے اس مسلمان کے ساتھ دیکھ نہ لے۔ یہ مسلمان امرتسر کا رہائشی مشہور ادیب اے حمید تھا۔ اے حمید نے پوچھا لیکن یہ تعویذ ہے کس کا؟ موہن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے کہا۔ چند دن پہلے جب مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ہندوؤں اور سکھوں کے جھٹے مسلمان محلوں پر ٹوٹے، مردوں کو قتل کرتے، مکان کو آگ لگاتے اور عورتوں کی بے حرمتی کرتے۔ میں ایک رات ایک چوک سے گزر رہا تھا کہ وہاں چند ہندو غنڈے نشے میں بدست بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے روکا۔ میں نے کہا کہ میں گھر جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا آؤ تمہیں سورگ کی سیر کراتے ہیں۔ میں ان کا اشارہ سمجھ گیا۔ شاید کوئی مظلوم مسلمان لڑکی ان کے ہاتھ چڑھ گئی ہے۔ میں نے پوچھا تو بولے ہاں! آج ہم دیکھیں گے کب تک جیسے ہند نہیں کہتی۔

میں نے ان سے کہا: ”چلو میں اس کو راضی کرتا ہوں۔“

انہوں نے کہا: ”جاتو، موج، کر لے۔“

میں ساتھ والی چھوٹی سی کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دیے کی روشنی میں چارپائی پر ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بیٹھی تھی جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے زبردستی نوے چھ سوٹے گئے ہوں لیکن اس کی آنکھوں میں شیرینی کی سی چمک تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا: ”خبردار میرے قریب مت آنا۔“ میں نے کہا: ”بھن میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔“ بہن کا لفظ سن کر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے کہا میرا نام رقیہ ہے۔ ان غنڈوں نے میرے باپ اور بھائیوں کو قتل کر دیا اور مجھے اٹھا کر لے آئے لیکن انہیں علم نہیں ایک مسلمان عورت اپنی عزت کی حفاظت کیسے کرتی ہے؟ پھر اس نے اپنے گلے سے ایک تعویذ اتارا اور میرے قریب آ کر مجھے دیتے ہوئے کہا: ”یہ میری امانت ہے اسے کسی مسلمان کو دے دینا اور جھپٹ کر میرے گلے میں لٹکی کر پان کو زور سے اپنے سینے میں اتار لیا۔“ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور تھوڑی دیر تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ دھیمی روشنی میں اس کے چہرے پر ایک ایسا سکوت اور نور سا تھا کہ میں خوف زدہ ہو گیا اور تعویذ جیب میں ڈال کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس دن سے میں



تشدد کرتا ہے وہیں اس کی زبان ہماری تعریف میں بھی رطب اللسان ہوتی ہے، وہ ہماری دوستی کے گن گاتا ہے، وہ ہمیں مسلم امہ کے خلاف چھیڑی جانے والی اس جنگ میں اپنا ساتھی کہتا ہے لیکن اس ساتھی کا حشر نیپال کے شہر کھٹمنڈو میں یہ ہوا کہ جیسے ہی ہجوم مسجد کی بے حرمتی سے فارغ ہوا تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نمائندہ اور اس کا جھنڈا فضاؤں میں لے کر اڑنے والی پی آئی اے کے دفتر پر حملہ آور ہو گیا۔ اس وقت کسی کو یاد نہ آیا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو کفر و اسلام کی جنگ اور خیر و شر کے معرکہ میں خیر کے ساتھ نہیں ہیں۔

اس وقت کسی کو یاد نہ آیا ہماری دوستی امریکا سے محبت کی گواہی تو امریکی کانگریس کی رپورٹ LB-94041 اور RL-316234 دے رہی ہیں، جو چیچ چیچ کر کہتی ہیں کہ پاکستان تو وہ ملک تھا جس کے جیکب آباد اور دہلی دہلی کے ہوائی اڈوں سے امریکا نے افغانستان پر 57000 ہوائی حملے کیے۔ ڈیزلی کٹر بم پھینکے اور ایک اللہ کا نام لینے والے مسلمانوں کے جسموں کے پر نچے اڑا دیئے۔ جس نے اپنے ایک لاکھ 15 ہزار فوجی افغانستان کی سرحد پر لگا دیئے کہ اگر کوئی مظلوم بھاگ کر نکلے تو پکڑ کر امریکا کے حوالے کر دیا جائے۔

رپورٹ کہتی ہے کہ ہم نے بہت سے سابق آرمی افسران کو امریکی ایف بی آئی کے حوالے کیا جنہوں نے ایک Spider گردپ بنایا جن کا کام ایک غیر رسمی انٹیلی جنس گردپ کے طور پر کام کرنا اور پاکستان کے اسلامی گردپوں پر نظر رکھنا اور ان کو کنٹرول کرنا تھا۔ ہم دنیا بھر میں اس واحد اسلامی ملک کے باسی ہیں جس نے 400 سے زیادہ مسلمانوں کو گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کیا اور وہاں وہ گوانتانامو بے جیسے قید خانے میں اذیتوں، تشدد اور بے حرمتوں کا شکار ہوئے۔ ہم تو اس دوستی اور اس ساتھ کا تمغہ سینے پر سجائے ہوئے پھرتے ہیں..... لیکن پتہ نہیں کیوں نیپال کے لوگوں کو ہماری مسلمانوں سے بے وفائیاں یا دشمنیاں آئیں اور انہوں نے ہمیں بھی عام مسلمانوں کی صف میں کھڑا کر کے ہماری ہی اڑ لائن کے دفتر پر حملہ کر دیا۔

ہمارے ساتھ یہ المیہ ہے اور ہمیشہ رہے گا، ہمارے حکمران اپنی غیرت و حمیت گروی رکھ دیں، اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اپنے مسلمانوں کو اغیار کے ہاتھ بیچ دیں، اپنے سینے پر غیروں کی وفاداریوں کے تمغے سجالیں..... لیکن پوری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ وہ جس نے مسلمان کے گھر میں جنم لیا، جس کا نام مسلمانوں جیسا ہے، جو ان کے درمیان رہتا ہے وہی ہمارا دشمن ہے۔ اسی سے ان کو خوف آتا ہے، اسی پر ان کا غصہ نکلتا ہے۔ اب چاہے گھر کو آگ لگا کر وفاداری ثابت کریں یا بیٹوں بیٹیوں کی جان لے کر..... کوئی یقین نہیں کرے گا۔ یہی وہ لوگ اور اقوام ہیں جن پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں: ”دنیا میں گھائے کا سودا اور آخرت میں بھی خسارہ۔“



## گھائے کا سودا

(24 رجب 1425ھ بمطابق 10 ستمبر 2004ء)

بالکل ویسا ہی منظر تھا، مشتعل ہجوم ہاتھوں میں لٹھیاں، بھالے، پھاڑے، مٹی کے تیل کے ڈبے اور آگ لگانے کا سامان لیے جمع تھے۔ آنکھوں میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں اور نیپالی زبان میں اسلام اور مسلمانوں کی خلاف نعرے اور پھر وہ ایک آوازوں کی آوازوں سے گونجتی اور مسلمانوں کے سجدوں سے ہر لمحہ روشن مسجد پر حملہ آور ہو گئے۔ کوئی صحن میں کودا تو کوئی میناروں پر چڑھ گیا۔ کسی نے منبر کو پکڑا اور ٹھوکروں میں لے لیا اور کوئی بچھی ہوئی صفوں کو اکٹھا کر کے تیل چھڑک کر آگ لگانے لگا..... لیکن سب سے ناقابل بیان یہ بات تھی جس کو لکھتے دل زخمی، آنکھ نم اور بدن کانپتا ہے وہ یہ کہ اس آباد مسجد میں قرآن پاک کے ہزاروں نسخے موجود تھے جنہیں روز مسلمان کھولتے اور تلاوت کرتے تھے، بچے اپنے ہاتھوں میں لے کر درس قرآن حاصل کر کے زندگی کے سفر کا آغاز کرتے، ہجوم نے ان نسخوں کو اٹھا اٹھا کر سڑک پر پھینکنا شروع کیا اور پھر جب وہ سب نسخے وہاں پھینک چکے تو انہیں اکٹھا کر کے آگ لگا دی۔

منظر تو ویسا ہی تھا، جیسا دسمبر 1992ء میں بابرہ مسجد کے سامنے نظر آیا تھا لیکن وہ مسجد تو کئی سال سے اذان کی آواز اور قرآن پاک کی تلاوت کو ترس چکی تھی۔ اس کی زمین مسلمانوں کے سجدوں سے نا آشنا ہی ہو گئی تھی، وہاں کسی کے ہاتھ ہمارے دلوں کی دھڑکن قرآن پاک کا کوئی نسخہ نہیں آیا تھا کہ بے حرمتی کرتا لیکن اس کے باوجود صبح ہوتے ہی پاکستان کا کوچہ کوچہ اور قریہ قریہ سراپا احتجاج بن چکا تھا۔ غیرت اور حمیت میں ڈوبے ہوئے مسلمان سڑکوں پر نکل چکے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہر کسی کا ذاتی گھر لوٹ لیا گیا ہو۔ کسی کی اپنی عزت کو سر بازار نیلام کر دیا گیا ہو۔ کون سا ایسا دل تھا جو خون کے آنسو نہ رو دیا ہو اور کون سی ایسی محفل تھی جس میں مسلم امہ پر آنے والی اس ذلت و مسکنت کی دہائی نہ دی گئی ہو؟

کیا تو میں اتنی جلد بے حس ہو جایا کرتی ہیں؟ کیا تبدیلی اس قدر لوگوں میں سرایت کرتی ہے کہ حکمرانوں کی بے حسی اور دین سے لاپرواہی عوام کی رگوں میں بھی سرایت کر جاتی ہے؟ لیکن میرا المیہ ایک اور بھی ہے اور اس المیے کا تعلق شاید اس پاکستان میں بسنے والے ہر شخص سے ہو، خواہ وہ اسلامی شعار کو اپنی منزل سمجھے یا نہ سمجھے، ڈاڑھی نہ رکھے، نماز نہ پڑھے، روزے کی پابندی نہ کرے، مکمل طور پر مغربی تہذیب میں ڈوبا ہو، لیکن اس کے آباء و اجداد نے اس کا نام مسلمانوں جیسا رکھ دیا ہو اس کے شناخت کے خانوں میں اس کا مذہب اسلام ہو؟ یہ المیہ اس شخص کے لیے بھی اتنا ہی شدید اور سوچنے والوں کے لیے اتنا ہی کر بناک ہے۔

المیہ یہ ہے: ”ہم جو 11 ستمبر کے ہولناک دن کے بعد ایک دم ایک ایسے گروہ کے ساتھ ہو چکے ہیں جو مسلم امہ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور افغانستان سے لے کر عراق اور روس سے لے کر اسرائیل تک جہاں جہاں وہ مسلمانوں پر ظلم و

پر برسنے چاہیے تھے؟ گھر کہاں ویران ہونے چاہیے تھے اور پابندیاں کس پر لگنا زیب دیتیں ہیں؟  
شاہ ایران کا جنرل منصور مہرادی جو اس کے دور میں جیل خانہ جات کا انچارج تھا جس نے ہزاروں ایرانیوں کو جیل میں تشدد سے قتل کیا، امریکا کی ریاست کیلی فورنیا میں مزے کی زندگی گزار رہا ہے۔ انڈیشیا کا جنرل سنتا نک جس نے 1991ء میں امریکا کے ایماء پر مشرقی تیمور میں معرکہ سانتا کروڑ میں ہزاروں لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا، اب مزے سے امریکا کا مہمان بنا ہوا ہے۔ ہوٹل راس کی امریکی سرپرستی میں چلنے والی فوج کی ہٹیلین نمبر 316 جس نے 1980ء میں ہزاروں شہریوں کو بجلی کے جھکے دے کر، چھوٹے چھوٹے کمروں میں ٹھونس کر، دم گھونٹ کر اور تشدد کے نئے طریقے آزما کر ہلاک کیا، آج یہ پوری ہٹیلین امریکا میں مزے اڑا رہی ہے۔

ارجنٹائن کا ایڈمرل جو گے ایز کو جو نایاک کی جنگ میں سات سال ایک بدنام ترین تشدد کا مرکز الیسکو لامیکا چلاتا رہا ہے۔ اس نے اس مرکز میں ہزاروں لوگوں کو قتل، معذور اور تشدد سے پاگل بنایا۔ آج کل امریکا کی ریاست ہوائی میں رہ رہا ہے اور حکومت کی مکمل سرپرستی اسے حاصل ہے۔

چلی کے ملٹری اسکواڈ کارکن دفینڈز پرلوس جس نے سینکڑوں سیاسی قیدیوں کو تشدد سے قتل کیا اور خود سرعام 72 قیدیوں کی موت کا اعتراف بھی کیا اسے امریکا میں ایف بی آئی میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

جنرل کارڈس جو ایل سیلو اور میں دہشت کی علامت تھا، جس کے ظلم کی داستانیں دل دہلا دیا کرتی تھیں، جس نے جہاں اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو ہلاک کیا وہاں اس نے تین امریکی عورتوں کی بے حرمتی کرنے کے بعد انہیں تشدد سے ہلاک بھی کیا، آج کل سن شائن اسٹیٹ میں رنگ رلیاں منارہا ہے۔

افسانوں کی خوفناکی سے زیادہ خوفناک جو زنگھیر مورگار شیا جس نے ڈیٹھ اسکواڈ بنایا اور لاکھوں بے گناہ لوگوں کو صرف شیعہ کی بنیاد پر ہلاک کیا، ان دنوں امریکا کی ریاست فلوریڈا میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔

گوئے مالا کا وزیر دفاع جس نے نعرہ دیا کہ وہ 70 فیصد آبادی کی خاطر تین فیصد لوگوں کو قتل کرے گا تاکہ یہ خوش حال ہو سکیں اور پھر یہ سب کر دکھایا۔ غلطی سے آٹھ امریکی شہری بھی اس سے ہلاک ہو گئے۔ امریکی عدالت نے سزا سنائی تو سی آئی اے عین موقع پر اسے بچا کر لے گئی۔

یہ وہ چند دہشت گرد ہیں جن کے میں نے نام لیے ورنہ دیت نام میں قتل کرنے والے، کیوبا کے طیارے اغوا کرنے والے، اپنے اپنے ملکوں میں امریکی پشت پناہی پر قتل عام کرنے والے، انسانوں کا خون بہانے والے ہزاروں دہشت گرد امریکا میں رہ رہے ہیں۔ کسی غار میں چھپے ہوئے نہیں بلکہ سرعام..... لوگوں کے درمیان۔ ایسے میں جب چند نہتوں کے لیے افغانستان کے پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں اور عراق میں انسانوں کی لاشوں کے انبار لگا دیئے جارہے ہیں تو کیا وہ وقت دور ہے جب مظلوموں کا جم غفیر اس ملک پر ٹوٹ پڑے جس میں اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ دہشت گرد پناہ لیے ہوئے ہیں۔

بس ایک ذرا مظلوموں، زخم خوردوں، تشدد زدہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کی دیر ہے..... انہیں تو کنسی B-52 کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بس انتقام سے ابلتی خوفناک آنکھیں ہی بزدل ظالموں کو خوف زدہ کر دیتی ہیں اور وہ بازاروں میں چیخیں مارتے دوڑتے پھر رہے ہوتے ہیں۔

## دہشت گردوں کی جائے پناہ

(یکم شعبان 1425ھ بمطابق 17 ستمبر 2004ء)

ایک جانب دریائے ہڈن، دوسری جانب بحر اوقیانوس کا ساحل جس کے کنارے ایک پارک ہے، جسے بیسٹری پارک کہا جاتا ہے، جہاں امریکا میں رہنے والے صدیوں سے آباد ریڈ انڈینز کو شکست دے کر دور بھگانے والی فوجیں اترتی تھیں۔ جنگوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں آباد جب ان ریڈ انڈینز نے پورے یورپ سے بھاگے ہوئے جرائم پیشہ افراد کے تیور دیکھے تو سنبھل کر مقابلہ کرنے کی ٹر نہیں کھینچیں۔ نہتے اور تیر و تلوار جیسی سادہ چیزوں سے وہ توپ اور بندوق کا کہاں مقابلہ کر سکتے تھے؟ مارے گئے، قتل ہوئے لیکن لڑتے رہے۔

آخر جرائم پیشہ لوگوں کا حربہ آزما گیا، دھوکہ دے کر جال میں پھنسا اور پھر مارنا۔ معاہدے کے تحت ایک تھوڑا سا علاقہ حملہ آوروں کو دے دیا گیا اور باقی ماندہ علاقے میں ریڈ انڈینز کو آزاد رہنے کا موقع دیا گیا اور پھر معاہدہ توڑ دیا گیا، طاقت جمع کی گئی، حملہ کیا مزید علاقہ پر قبضہ کر لیا، ایسے ہی پانچ ہزار سے زیادہ معاہدے کیے گئے اور توڑے گئے اور یوں پورے امریکا کی سرزمین پر یورپ کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا۔

عہد توڑنے، کمزور پر حملہ کرنے اور دھوکہ دہی سے علاقہ ہتھیانے کے خمیر سے یہ ملک امریکا اس دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ یہی دریائے ہڈن کے ساتھ آباد جزیرہ مین ہٹن اس کا اولین دار الحکومت بنا جسے آج نیویارک کہتے ہیں۔ اسی بیسٹری پارک اور دریائے ہڈن کے پل یا بحر اوقیانوس کے ساحل سے نظر آنے والے دو بلند بالا 120 منزل بلند ٹاور آج سے تین سال قبل جب آگ میں جل رہے تھے تو پوری دنیا کے سامنے مظلومیت کے ثبوت کے طور پر بھاگتے ہوئے لوگ، روتی ہوئی عورتیں اور آنسو بہاتے ہوئے مرد ٹیلی ویژن پر دکھائے جارہے تھے۔

دہشت گردی کا نعرہ بلند ہوا، اس سے جنگ کے اعلانات ہوئے اور پھر نہتے افغانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔ انسانوں کے جسموں کے پر خچے اڑائے گئے۔ گھروں میں بیٹھے بچوں اور نہتے عورتوں پر بم برسا کر شہید کیا گیا۔ کنٹینروں میں بند کر کے دھوپ کے صحراؤں میں پیاس کے عالم میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ افغانستان کو تباہ کر کے انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی تو عراق پر حملہ کیا گیا اور آج تین سال گزرنے کے باوجود یہ کشت و خون کا بازار جاری ہے اور پوری دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم دہشت گردوں کو تلاش کر رہے ہیں، انہیں ختم کر رہے ہیں۔

لیکن آئیے میں آپ کو گیارہ ستمبر 2001ء سے پہلے کے امریکا میں لے جاتا ہوں جس کے چپے چپے میں دنیا بھر پر ظلم و ستم، قتل و غارت اور دہشت کا بازار گرم کرنے والے آسودہ اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے اور آج بھی گزار رہے ہیں۔ آئیے میں آپ کو درندہ، بھیڑیوں اور قاتلوں کی جنت میں لیے چلتا ہوں اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ہم کس سرزمین

صدر ہے چیخ اٹھا، کہنے لگا: ”یاد رکھو وہ دن قریب آ رہا ہے جب ہندو اس برصغیر میں اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔“  
 راسٹر یہ سیوک سنگھ کے لیڈر رام مدھو نے چلاتے ہوئے لہجے میں کہا: ”اے ہندو قوم! کیا یہ تمہارا وہی اکھنڈ بھارت ہے جو 1947ء میں ایک تھا اور اس میں ہندو اکثریت میں تھے“..... لیکن جس تیز رفتاری سے مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے ماہرین یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ 2050ء میں اس ہندو تو اور بھارت دیش میں ہندو اقلیت میں تبدیلی ہو جائیں گے اور دوسری جانب اسی بھارت کے ٹکڑوں پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی مسلمان برابر اپنی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں۔

مردم شماری کے محکمے کے انچارج نے ان سب کو مزید پریشان کر دیا، جب اس نے کہا کہ یہ اعداد و شمار 2001ء میں کی گئی مردم شماری کے ہیں جس میں کشمیر کی مسلمان آبادی شامل نہیں ہے کیونکہ اس وقت وہاں شدید جدوجہد آزادی جاری تھی اور ہم وہاں مردم شماری نہیں کر سکے تھے اور ہم 67 لاکھ کشمیری مسلمانوں کو اس میں شامل نہیں کر سکے اور مزید یہ پریشان کن بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے 34 فیصد اضافے کے مقابلے میں ہندوؤں کی آبادی میں 19 فیصد اضافہ ہوا تھا۔

اب وہاں سر جوڑے جا رہے ہیں انسانی حقوق کے ماہرین اور ماہرین آبادی اس کی وجہ تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا یہ اس لیے کہ مسلمانوں کی آبادی میں شرح خواندگی کم ہے۔ کوئی کہتا ہے مسلمانوں کا مذہب انہیں کنبہ بندی کی تلقین نہیں کرتا۔ کوئی اپنے ہندوؤں پر چیختا ہے کہ یہ صرف مرد بچوں کی خواہش میں وقت سے پہلے ڈاکٹروں سے الٹرا سائونڈ کروا کر معلوم کرتے ہیں اور اگر ڈاکٹر کہے کہ لڑکی پیدا ہوگی تو حمل گرا دیتے ہیں۔

یہ سرتو آج سے 50 سال پہلے امریکا میں جوڑے گئے تھے جب سی آئی اے کی رپورٹوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں مسلمانوں کی آبادی کو بڑھنے سے کیسے کنٹرول کرنا ہے؟ اگر یہ ایسے ہی بڑھتے رہے تو ایک دن افریقہ میں کوئی اور مہدی سوڈانی پیدا ہو جائے گا اور برصغیر اور عرب دنیا میں تو ویسے ہی اسلام کے سرفروشوں کی کمی نہیں۔ یوں نیویارک میں جان پاپنجر انسٹی ٹیوٹ کو آبادی کے کنٹرول کرنے کے لیے پروگرام بنانے کے لیے کہا گیا اور پھر پوری مسلم دنیا میں مانع حمل ادویہ کی مفت بوجھاڑ کر دی گئی لیکن ہوا یہ کہ یہ سب ادویہ عیاشی میں ڈوبے ہوئے امریکا اور یورپ میں زیادہ استعمال ہوئیں اور مسلمان بحیثیت مجموعی اس سے دور رہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جب بھی کسی ملک پر امریکی امداد بند ہوتی مانع حمل ادویہ کی امداد پر پابندی نہ لگتی۔ پھر بھی مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی اور کسبخت کو چیلنج کر لینا پڑا: ”ہمیں مسلمانوں کی آبادی کو روکنا ہے منصوبہ بندی اگر ممکن ہو، اور اگر نہیں تو جنگ ہے۔“

آج اس جنگ کا آغاز ہے۔ عراق میں، افغانستان میں، چین میں..... لیکن انہیں علم نہیں کہ ہر وہ قوم جس کے رہبر اور ہادی برحق نے کہا تھا: ”مجھے قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر ہوگا۔“

حیرت ہے جس امت کی کثرت پر پورا عالم خوفزدہ ہو جاتا ہے ہمارے ارباب اقتدار اور بڑے زعماء پر یہ خرچ کر کے ادویہ سے، اشتہاروں سے اور شفا خانوں سے اسے کم کرنے پر لگے ہیں۔ جب ذہن غلام ہو جائیں تو اپنے نقصان کو بھی فائدہ اور فائدے کو نقصان سمجھتے ہیں۔

## امت مسلمہ کی کثرت سے خائف

(08 شعبان 1425ھ بمطابق 24 ستمبر 2004ء)

اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی، ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزری لیکن آج اس باپ کو ایک ایسا مرحلہ درپیش تھا کہ اس کی ریاضت نیم شب بھی کام نہ آرہی تھی۔ اس بچے کے لیے وہ اپنے اللہ کے حضور کتنی دفعہ سجدہ ریز ہوا تھا، اس نے اپنے آباء و اجداد کے نقش قدم پر چلنے کے لیے کہا تھا لیکن وہ تھا کلنڈر نہ مزاج رکھنے والا، لہو و لعب کا جگری دوست، بس اسی بات پر خوش کہ وہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کا نام مسلمانوں جیسا ہے..... اس کے لیے بس یہی کافی تھا، نہ اس کو دین کا علم سمجھنے کی کوئی رغبت اور نہ عبادت سے کوئی شغف۔ باپ تھک ہار کر امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھے اپنے وقت کے خطیب العصر اور عالم دین سید عطا اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بات کرتے ہوئے باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ صاحب عرفان سید نے پوری بات سنی اور کہا بیٹے کو خالصہ کالج میں داخل کروادو۔ باپ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا، لیکن مشورہ صاحب الرائے اور صاحب نظر شخص سے تھا تو اس نے ایسا ہی کر دکھایا۔

چند دن جب اس نام کے مسلمان بیٹے نے اپنے ہم کلاس سکھوں اور ہندوؤں سے مسلمانوں ہونے کے طعنے سنے تو باپ سے سوال کرنے لگا کہ میرا دین کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کیا طلب کرتا ہے؟ کیسے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے؟ جب اپنے ساتھیوں کی بوجھاڑ اور طعنوں کے یلغار کے سامنے جب لا جواب ہو جاتا تو باپ کے حضور حاضر ہو جاتا اور یونہی سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس وقت اس باپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نوجوان نے عبادت کی طرف رجوع کر لیا۔

یہ واقعہ مجھے اس لیے یاد آ رہا ہے کہ آج سے چند دن قبل وہ خطہ جسے ہم بھارت سمجھ کر اس سے جدا ہو گئے تھے، جہاں گذشتہ 51 سال سے ہندوؤں کی حکمرانی رہی، جس ملک پر کئی سال متعصب اور اسلام سے نفرت کی بنیاد پر ایکشن جیتنے والی جماعت برسر اقتدار رہی ہے، وہاں کے مردم شماری کے مکران نے تازہ مردم شماری کے اعداد و شمار بتاتے ہوئے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

اس نے کہا گذشتہ دس سالوں میں بھارت میں مسلمانوں کی آبادی میں 33 فیصد اضافہ ہوا ہے اور اب مسلمان بھارت میں چودہ فیصد کے قریب ہو چکے ہیں، یہ رفتار اور اضافہ صرف ان دس سالوں میں ہی ایسا نہیں بلکہ جب سے بی جے پی کی متعصب حکومت برسر اقتدار آئی ہے یا جب سے مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت کا آغاز ہوا ہے اس وقت سے شروع ہوا ہے۔ گذشتہ مردم شماری میں مسلمان 45 فیصد کی رفتار سے آگے بڑھے ہیں۔

جس دن یہ اعلان ہوا پورے بھارت میں ہندوؤں کے متعصب لیڈروں کے پریشان کن بیان آنے لگے۔ وینکیا لیڈو جسے گجرات میں دو ہزار مسلمانوں کے قتل کے بعد مئی 2002ء میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ آج بی جے پی کا

کہ اس پیغام میں کسی کالے کی گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں تھی۔

جیسے ہی اس پیغام کا اثر نمایاں ہونا شروع ہوا تو یورپی طاقتیں جو افریقہ پر حکمران تھیں انہوں نے ایک فیصلہ کیا..... ایک بڑی سی میز پر افریقہ کا نقشہ بچھا دیا گیا اور پھر جیسے ایک چھری سے کیک کاٹا جاتا ہے ویسے پورے افریقہ کے حصے بخرے کر دیئے گئے اس لیے کہ اگر وہ ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے رہتے تو اس پیغام کا اثر ان پر تیزی سے پھیل سکتا تھا۔ اب تو وہ گروہوں میں بانٹ دیئے گئے۔ جس کے ملک میں کوئی دوسری اقلیت کا علاقہ حصے میں آ گیا اس نے اپنی توسیع پسندی اور قومی تفاخر میں ان کے گلے کاٹنے شروع کر دیے۔ ایک قبیلہ دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا اور افریقہ امن کی آواز سننے کو ترس گیا۔

لیکن کے خبر تھی اللہ نے اس سرزمین کے نیچے اپنی نعمتوں اور دولتوں کے خزانے بچھا رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار پھر جھوٹ بولنے کے ماہر کولن پاول کو پھر اسی طرح کی تقریر کرنے کے لیے کہا گیا جیسا عراق پر حملے سے پہلے کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی اور صدام حسین کے مظالم کی کہانی سنا کر کیا گیا۔ کانگریس کے سامنے اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ”ہم ڈارفار (دارفر) کے انسانی المیے پر خاموش نہیں رہ سکتے۔“

دارفر جس میں اب تک قحط اور آپس کی لڑائی میں پچاس ہزار کے قریب لوگ موت کی آغوش میں گئے ہیں، کیا یہ روانڈا کے انسانی قتل عام سے ذرا سی بھی مشابہت رکھتا ہے جہاں دس لاکھ انسان مارے گئے، قتل کیے گئے، زندہ جلادینے گئے، ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے دفن کیے گئے؟ کیا یہ کوسوو، یا بوسنیا کے قتل عام سے زیادہ ہے لیکن کہیں بھی امریکی ضمیر نہ جاگا، مدتوں انسانوں کے قتل کا تماشا دیکھا جاتا رہا۔

لیکن اب امریکا یورپ کے ممالک کو ساتھ ملا کر ایک فوج African union intervesion foalo ترتیب دے رہا ہے جس کے تیس سو کی قریب فوجی وہاں پہنچ چکے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سب امریکا کی کمان میں اس کے اشاروں پر وہاں کارروائی کریں گے۔ کوشش ہے کہ یہ سب شکل و صورت سے افریقی لگیں مگر ان کی کمان گورے امریکیوں کے ہاتھ میں رہے۔

موت اور قحط کے سائے میں تڑپتے ہوئے دارفر کے عوام کے لیے نہ اقوام متحدہ کی خوراک پہنچ رہی ہے نہ مدد بلکہ ان کے لیے گولیوں اور بموں کی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ پابندیاں لگیں گی تاکہ پاکستان اور چین کا تیل بند ہو اور ساتھ ہی سوڈان پر غربت چھا جائے امریکی فوج وہاں موت کا پیغام لے کر اتر رہی ہے تاکہ مسلمانوں کے قتل عام کا شوق بھی پورا کرے اور تیل کی دولت پر قبضہ بھی جمالے۔



## ایک تیر و شکار

(10 شعبان 1425ھ بمطابق یکم اکتوبر 2004ء)

اُن کا تصور یہ ہے کہ ان کا ملک روزانہ تین لاکھ تیس ہزار بیرل تیل برآمد کرتا ہے اور یہ تیل زیادہ تر پاکستان اور چین کو فروخت کیا جاتا ہے۔ امریکا یا یورپ کا کوئی ملک ان کے خریداروں میں سے نہیں ہے۔ وہ لوگ اس لیے برے لگتے ہیں کہ ان کی حکومت تھوڑا بہت سہی اسلام کے قانون عدل پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ ان کے حکمران اس لیے بھی قابل ملامت ہیں کہ جب اسامہ بن لادن پر اس کے اپنے ملک کی سرزمین تنگ ہو گئی تو وہ یہاں قیام پذیر ہو گیا اور اس نے وہاں ترقیاتی کام شروع کیے۔ ایئر پورٹ تعمیر کر دیا، خوبصورت سڑکوں کا جال بچھانا شروع کیا اور اس پس ماندہ، مفلوک الحال اور دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے گانہ ملک میں ایک دواؤں کی فیکٹری لگا دی۔ ملک کی عام آبادی ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنیوں کی مہنگی دوائیوں کی بجائے اپنے ملک میں تیار سستی دوائیاں خریدنے لگی۔

ایسے میں انسانی حقوق کا پرچار کرنے والا امریکا کیسے خاموش رہ سکتا تھا؟ ایک طویل پروپیگنڈے کی مہم شروع کی گئی، یہودی میڈیا کے زیر اثر اخبارات نے کہنا شروع کیا کہ اس فیکٹری میں کیمیائی ہتھیار بنائے جاتے ہیں۔ پھر ایک دن دندانے ہوئے طیارے آئے بڑے بڑے وزنی بم برسائے گئے اور فیکٹری مکمل طور پر تباہ کر دی گئی۔ سوڈان کے شہری دواؤں کی ترسیل سے محروم کر دیئے گئے۔

آج پھر امریکا کے انسانی حقوق کے مصنوعی چہرے پر ایک بار پھر غصے کی لہریں نظر آ رہی ہیں۔ ایک درد ہے جو چیخ بن کر امریکا کے وزیر دفاع کولن پاول کی زبان سے نکلا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دارفر میں انسانوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور سوڈان حکومت اس کی براہ راست ذمہ دار ہے۔ اس درد کی لہریں کہاں سے اٹھتی ہیں اور اس محبت کے پیچھے کون سی نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں اور تنبیہ کے ساتھ کون سے ارادے ترتیب پا رہے ہیں۔

افریقہ کے سیاہ فام عوام وہ لوگ ہیں جن سے یورپ اور امریکا کے لوگوں نے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ صدیوں انہیں جانوروں کی طرح ہانک کر، بڑے بڑے پنجروں میں بند کر کے اور بحری جہازوں میں لاد کر غلاموں کی طرح ان کی تجارت کی گئی۔ امریکا کے جنوب میں واقع ریاستوں کی ساری زراعت کا دار و مدار ان غلاموں کی محنت کا شمر تھا۔ ان کو جانوروں کی طرح کی کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا، کوڑوں سے پیٹا جاتا، اگر وہ کبھی گوروں کی بس یا ٹرین کے ڈبے میں بیٹھ جاتے تو گولی سے اڑا دیا جاتا، مدتوں ان پر اسکولوں، کالجوں، ہونٹوں اور گوروں کی مخصوص دکانوں پر ان کا داخلہ ممنوع رہا۔ اس نفرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ افریقی سیاہ فام اس پیغام کے نزدیک ہوتے گئے جو ان کے آباء و اجداد میں سے سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے قبول کیا تھا۔ اُس پیغام کی کرنیں اس لیے بھی ان کے دلوں پر اتریں اور پیوست ہو گئیں



## ہے اگر کوئی خطرہ مجھ کو اس امت سے ہے

ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر میں ایسی بحث اور مطالبات عام سی بات ہے لیکن آج جو تیور اس شخص کی بات میں تھا، جو یقین اور جو مطالبے میں شدت تھی وہ پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ میں اچانک گزرتے ہوئے اس دفتر میں رکا، میرا بلوچ دوست کوئٹہ کا ڈپٹی کمشنر تھا، اس کے سامنے کالی پگڑی اور سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ایک پٹھان اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں اپنا مطالبہ پیش کر رہا تھا۔

میرے بلوچ ساتھی ڈپٹی کمشنر نے کہا: ”یار! نہ اس کی اردو میری سمجھ میں آتی ہے اور نہ اسے میری، اس سے پشتو میں سمجھ کر مجھے بتاؤ۔“ اور پھر اس شخص نے تاریخ کا ایک ایسا مطالبہ دہرایا جو ہمیشہ ایسی قوموں میں دہرایا جاتا ہے جہاں عدل و انصاف بازار کی زینت بن جائے، جان، مال اور آبرو سرعام نلام ہونے لگے اور لوگوں کا حاکموں پر سے اعتماد بھاپ بن کر اڑ جائے۔

اس نے کہا: ”میں کوئٹہ کے علاقے پشتون آباد میں ایک طویل عرصے سے رہ رہا ہوں، چھوٹا سا کاروبار بھی ہے، اطمینان سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک شخص کی شراکت سے کاروبار کو وسعت دی۔ چند سال کاروبار بہتر طور پر چلا اور پھر دھوکہ دہی اور فراڈ سے وہ شخص اور اس کے تین ساتھی کئی لاکھ روپے اور ایک موٹر سائیکل لے اڑے۔ میں نے چاروں کے خلاف مقدمہ درج کرایا۔ چاروں گرفتار ہوئے، دو کو پولیس نے پیسے لے کر چھوڑ دیا اور دو کی جج نے ضمانت کر دی اور میں بے یار و مددگار اور مفلوک الحال ہو گیا۔ ان چار میں سے دو نقل مکانی کر کے افغانستان کے شہر قندہار چلے گئے اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ مل گئے، میں اپنا روپیہ طلب نہیں کر سکتا تھا، عدالت کا پروانہ وہاں نہیں جاتا تھا۔

پھر مجھے پتہ چلا کہ وہاں طالبان کی حکومت آگئی ہے۔ میں کوئٹہ سے پک اپ میں بیٹھا اور قندہار پہنچ گیا۔ وہاں کی عدالت میں جا کر درخواست دی، دونوں ملزمان کو طالبان کی سپاہ پکڑ کر لے آئی، صرف ایک دن مقدمہ چلا، ان لوگوں نے اقرار کر لیا کہ آدھے پیسے موٹر سائیکل ہمارے پاس ہے اور آدھے پیسے باقی دونوں کے پاس۔ اگلے دن میں موٹر سائیکل اور پیسے لے کر آ گیا۔ اب میں ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے پاس درخواست لے کر آیا ہوں کہ ان باقی دو افراد کو پکڑ کر میرے حوالے کرو، میں انہیں طالبان کے پاس لے جاؤں گا تا کہ مجھے انصاف مل سکے۔ مجھے آپ پر، آپ کی عدالت پر اور آپ کی پولیس پر کوئی بھروسہ نہیں۔“

وہ جب کہانی سناتے ہوئے اپنے مطالبے کی طرف آیا تو جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے آنسو تیرنے لگے اور کہا: ”تم اپنے یہ بڑے بڑے عالیشان دفاتر بند کرو اور وہاں چٹائی پر بیٹھنے والوں سے انصاف کرنا سیکھو..... ورنہ ایک دن تمہاری عدالتوں میں کوئی اپنا مقدمہ لے کر نہیں آئے گا۔“

ایسا ہی ایک منظر خود میرے دفتر میں برپا ہو گیا۔ میں ڈپٹی کمشنر چاغی تھا، افغانستان سے ایک برساتی دریا جسے

لوگ بورنالہ کہتے ہیں۔ چاغی میں داخل ہوتا ہے۔ اس پر چاغی کے تین بڑے قبیلوں کی زراعت کا دار و مدار ہے۔ ایک دن تینوں قبیلوں کے سردار میرے دفتر میں آئے اور کہا: ”افغانستان کے برونج قبیلے کے سردار نے اس پر بند باندھ کر پانی روک لیا ہے، آپ کچھ کریں۔“

اسی دوران طالبان کی طرف سے شورا کا ولسوال یعنی ڈپٹی کمشنر مولانا عبدالحی مرے دفتر میں ملاقات کے لیے آ گئے، لوگ ٹوٹ پڑے، ظلم ہے، زیادتی ہے، ایسا روایات کے خلاف ہے۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور مجھے کہا: ”کل صبح ہم دونوں موقع پر جانیں گے، دو مولوی آپ کی جانب سے اور دو مولوی ہماری جانب سے، شریعت کے مطابق فیصلہ ہوگا۔“ سردار جنہوں نے زندگی میں پنواری اور قانونیوں کو دیکھا تھا ہنسنے لگے۔ کیا ہم ریونیوریکارڈ لے کر آئیں گے؟ مولوی صاحب نے کہا: ”فیصلہ شریعت پر ہوگا۔“

غصے میں بھرا ہجوم میرے ساتھ افغانستان میں اس موقع پر پہنچا جہاں بند باندھا ہوا تھا۔ لوگ جمع تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انگریز کے بنائے حکم مال کے قانون اور ضابطے کے سامنے شریعت کیا کر سکتی ہے؟ مولوی صاحب نے مجھے ساتھ لیا اور دونوں طرف سے علماء سے کہا: ”بتائیے! پانی کی استعمال کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے۔“ ایک حیرت انگیز بات سامنے آئی، دونوں ملکوں کے علماء کی زبان سے ایک ہی جواب نکلا: ”اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرو اور باقی نیچے والوں کے لیے چھوڑ دو، پانی روکنا غیر شرعی ہے۔“

مولوی عبدالحی کا صرف ایک اشارہ ہوا اور سردار جسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بند کیسے توڑے، وہ اتنے بڑے بند کو کدال سے توڑنے لگ گیا، صبح تک بند ختم ہو چکا تھا۔ میں جب واپس ان لوگوں کے ساتھ آ رہا تھا تو وہ سب صرف ایک بات کہہ رہے تھے: ”ایسا اگر ہمارے قانون میں مسئلہ پیش آتا تو اب تک کئی قتل ہو چکے ہوتے، مقدمے چلتے، سالہا سال عدالتوں کی پیشیاں بھگتی جاتیں، کیا ہم اپنے فیصلے طالبان سے نہیں کروا سکتے؟“

یہ سوال تاریخ میں ہمیشہ کیا گیا اور لوگ ایسے منصف مزاج کی تلاش میں رہے جس کے ہاں سے انصاف کی خوشبو آتی ہو۔ فارس کبھی ایک بڑی سلطنت نہیں تھی، چھوٹے چھوٹے حکمران تھے، ایک چھوٹے سے علاقے میں نوشیروان عادل انصاف سے فیصلے کرتا تھا، اس کی دھوم مچی ہوئی تو اردگرد کے لوگ اس کے پاس اپنے فیصلے لے جانا شروع ہوئے پھر انہوں نے اسے اپنا حکمران تسلیم کر لیا اور ایک دن پورے فارس کے لوگ اس کے زیر نگیں آ گئے کہ وہ فیصلے انصاف پر کرتا ہے۔

عدل اور انصاف کی خوشبو سردوں سے ماورا ہوتی ہے، پھیلتی ہے تو پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ طالبان کے زمانے کا عدل و انصاف اور امن و سلامتی ایک خوشبو تھی، لوگ جانتے تھے کہ کابل سے چمن تک اور ہلمند سے چاغی تک سفر کرتے ہوئے مسافر کبھی خوفزدہ نہیں ہوتے، چوری ڈاکے کا ڈر نہیں جب وہ اپنے ملک میں داخل ہوتے ہیں تو طرح طرح کے خوف ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ انہیں علم تھا کہ اسپین بولدک کی مارکیٹ میں ہزاروں دکانوں میں کروڑوں روپے کا مال پڑا ہوتا ہے اور وہاں کوئی سپاہی بھی نہیں ہوتا، مگر لوگ دکان کھلی چھوڑ کر نماز کے لیے چلے جاتے ہیں۔

میں نے صرف دو مقدمات کا ذکر کیا ہے جب اس محکمے کے لوگ یہ خواہش کرنے لگ گئے تھے کہ ہمیں انصاف ملے گا تو کہاں سے..... لیکن اس خوشبو کو پھیلنے سے روکنے والی طاقتوں کو فکر دامن گیر ہوگئی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ نیویارک کا خوفزدہ شہر، بیس کی ہوس زدہ لوگوں سے ڈری عورت اور پاکستان کا انصاف سے محروم باشندہ پکارنے

## بے گناہ

(29 شعبان 1425ھ بمطابق 15 اکتوبر 2004ء)

ان تینوں کو تین مہینے تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں زنجیریں تھیں۔ وہ ایسی حالت میں گھنٹوں گزارتے، گر پڑتے تو تھوڑی دیر کے لیے ہاتھ پاؤں کھول کر اسٹریچر پر لٹا دیا جاتا۔ ذرا ہوش آتا تو واپس اسی حالت میں قید کر دیئے جاتے۔ روزانہ بارہ گھنٹے اس عذاب میں گزرتے اور پھر باقی بارہ گھنٹوں کے لیے انہیں تفتیش کے لیے مختلف ٹیموں کے روبرو پیش کر دیا جاتا۔

یہ تفتیش بھی عجیب تھی۔ کبھی مختلف طریقوں سے خوف دلایا جاتا جب اللہ خوف کی حالت میں مدد کرتا تو تشدد پر اتر آتے۔ بے رحمانہ تشدد سے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ہوش میں لاتے اور طرح طرح کے لالچ، ترغیبات اور انعام و اکرام کی پیشکشیں کی جاتیں۔ ان تین صبر آزمایہ مہینوں کے بعد ایف بی آئی اور امریکی حکام ان سے یہ بیان حاصل کر سکی کہ انہوں نے 2000ء میں اسامہ بن لادن اور گیارہ ستمبر کے حملے کے سب سے بڑے مجرم محمد عطا سے ملاقات کی تھی، پورے امریکا میں پریس اور الیکٹرانک میڈیا پر شور مچا دیا گیا۔ ہر اہلکارٹی وی پر آ کر فتح و مسرت سے بیان کرنے لگا کہ لوگ یوں ہی گوانٹا مو بے کے قیدیوں کے لیے شور مچاتے ہیں، ہم نے بہت ثبوت حاصل کیے ہیں اور یہ سب کے سب ایک بہت بڑے دہشت گردی کے نیٹ ورک کا حصہ تھے۔

یہ تینوں کسی غریب، پسماندہ، مفلوک الحال ملک کے شہری نہ تھے، کسی کاسہ لیس مسلمان حکومت کے زیر سایہ زندگی نہیں گزار رہے تھے بلکہ یہ اپنے زمانے کی دنیا پر حکومت کرنے والی اور آج کی دوسری سپر پاور برطانیہ کے شہری تھے۔ آصف اقبال، شفیق رسول اور روح اللہ۔ ان کو اس ملک کے شہریوں کے احتجاج اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے دوا لیلے کے بعد برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا، اس لیے کہ برطانیہ نے کہا کہ یہ اتحادی ہے لیکن کسے خبر تھی کہ اتحادی اور مفلوک، مجبور، کاسہ لیس حکمران کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ امریکا اس سے وہی توقع کر رہا تھا جو وہ پاکستان جیسے جھکے ہوئے ملک سے کرتا ہے۔

برطانیہ نے شروع میں انہیں بیانات پر بھروسہ کرتے ہوئے مقدمے کا آغاز کیا۔ برطانیہ کی خفیہ ایجنسی نے تحقیقات کیں۔ مشہور زمانہ MIS ایجنسی جب اس بیان کی صداقت ڈھونڈنے لگی، وہ اس بات پر حیران رہ گئی کہ یہ تینوں برطانوی مسلمان شہری تو ان سارے سالوں میں برطانیہ میں موجود تھے۔

شفیق رسول مستقل طور پر ایک ہوٹل میں کام کرتا رہا اور باقی دونوں اپنے کالج آتے جاتے اور امتحانات میں شریک ہوتے رہے۔ وہ تو گیارہ ستمبر کے بعد افغان مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے اور اس جہاد کی ذمہ داری ادا

لگ جائے گا: ”مجھے تم سے امن نہیں چاہیے، انصاف نہیں چاہیے، میرا مقدمہ چٹائی پر بیٹھنے، روکھی سوکھی کھانے اور کپے مکانوں میں رہنے والے طالبان کے پاس لے جاؤ۔“

اگر ایسا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہی خوف تھا کہ وہ سب مل گئے اور پورے افغانستان میں انصاف کی خوشبو کو روکنے کے لیے وہاں بارود کی بو پھیلا دی گئی، ڈیزی کٹر بموں سے، میزائلوں سے، جدید ترین اسلحہ سے۔

لیکن یہ خوف آج بھی ختم نہیں ہوا، اس لیے کہ جب تک یہ امت مسلمہ موجود ہے یہ خوف موجود رہے گا۔ ڈاکٹر اقبال یاد آ رہے ہیں انہوں نے اپنی ایک نظم ”ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس کا اپنے مشیروں سے خطاب“ کے عنوان سے کہی ہے۔ اس میں ابلیس یہ کہتا ہے کہ مجھے کسی نظام، کسی گروہ سے خوف نہیں..... بس ایک ہی گروہ سے ہے۔ ابلیس کو امریکا تصور کیجیے اور اس کے مشیروں کو وہ ملک جو اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور پھر دیکھیے کیسے یہ اشعار ان کے خوف کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے  
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو  
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ  
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو  
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف  
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں  
الحدذر آئین پیغمبر سے سو بار الحدذر  
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں  
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے  
نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیر رہ نشیں  
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف  
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں  
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں  
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات



## ان سے ہیر و چھین لو

(07 رمضان 1425ھ بمطابق 13 ستمبر 2004ء)

اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر برسلز میں ہے، برسلز جو یورپی یونین کا بھی صدر مقام ہے، دنیا بھر کے ممالک اس تنظیم کو دولت اور وسائل سے نوازتے ہیں تاکہ وہ انہیں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے لیے رہنمائی فراہم کرے۔ ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے وہ راستے بتائے کہ کس طرح دنیا کے غریب ملکوں کو اپنی جاگیر کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ (International Crisis Group)۔ اس گروپ کی شاخیں پوری دنیا کے ممالک میں ہیں۔ جہاں کہیں بے چینی، اضطراب، عوامی رد عمل یا سول وار ہو اس کے نمائندے وہاں جاتے ہیں اور اپنے امیر آقاؤں کے پیسے سے رپورٹیں مرتب کرتے ہیں۔ یہ رپورٹیں ان کے چار مختلف بڑے دفاتر واشنگٹن، نیویارک، لندن اور ماسکو کے ذریعے ان حکمرانوں کو پہنچائی جاتی ہیں جو اس عالمی منظر نامے میں امریکا اور یورپ کے حوالے سے کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اس تنظیم کا موجودہ صدر فرن لینڈ کا سابق صدر مارتی آہستاری ہے اور اس کا چیف ایگزیکٹو آفسریلیا کا سابق وزیر خارجہ گیرتھ ایوانز ہے۔ یہ تنظیم اپنی رپورٹیں ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ایشین بینک، دنیا بھر کے ڈونرز اور امداد دینے والے ممالک کے سربراہوں کو ارسال کرتے ہیں اور پھر وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کو امداد سے مالا مال کرنا ہے اور کس پر معاشی پابندیاں لگا کر اس کا گلہ گھونٹنا ہے۔ کون سا راستہ اختیار کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اور کس طرح قوموں کو محکوم، مجبور اور تابع فرمان بنایا جاسکتا ہے۔

پاکستان ان رپورٹوں کا خصوصی موضوع ہے اور ہر سال لاکھوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں کہ کس طرح اس ملک کو جس کے عام آدمی کے دل اسلام کی محبت میں دھڑکتے ہیں، جن کے لوگ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہونے والے مسلمانوں پر ہوتے ظلم و ستم پر تڑپ اٹھتے ہیں، ان کی مدد کو دوڑتے ہیں، جن کے روزمرہ میں آج بھی عدل و انصاف، رحم و حمیت، حکمرانی و جہانباہی، سخاوت، دریا دلی اور اعلیٰ ترین قدروں کے معیار صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی نہیں۔

یہ لوگ بے عمل سہی، گناہ گار سہی، مجبور و مقہور سہی..... مگر ان کے ہاں ابھی تک عظمت کے معیار کے پیمانے نہیں بدلے۔ یہی وہ فکر ہے جو پوری مغرب کو ہے یعنی وہ خوف ہے جس کی وجہ سے اس گروپ کو یہ کام دیا گیا کہ کہاں پروار کیا جائے کہ پاکستان کے عام آدمی کے خیالات تبدیل ہو کر ہمارے جیسے ہو جائیں۔ دو سال کی محنت کے بعد گزشتہ ہفتے اس گروپ نے اپنی رپورٹ دنیا کی ان حکومتوں کو ارسال کر دی ہے جو ہمارے ملک کا کلچر تبدیل کرنے کی

کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے جو ان کا دین ان پر لازم قرار دیتا ہے۔ ایسے میں ان کی ملاقات نہ اسامہ بن لادن سے ہو سکتی تھی اور محمد عطا تو اس وقت دوسرے جہاں کو جا چکا تھا۔

ادھر یہ سب برطانیہ کی پارلیمنٹ میں پیش ہو رہا تھا اور دوسری جانب بینا گون کا ایک امریکی کرنل انتھونی کرٹینو نوکری سے ریٹائر ہوا۔ اس نے بیس سال خفیہ ایجنسیوں میں گزارے تھے، اس نے ریٹائر ہوتے ہی ایک برطانوی اخبار نویس ڈیوڈ روز کو ایک انٹرویو دے دیا۔

اس نے کہا کہ گوانتانامو بے میں چھ سو کے قریب افراد قید تھے جنہیں دہشت گرد سمجھ کر لایا گیا تھا اور کئی سال کی امریکی ایجنسیوں کی تحقیق، تشدد اور جسمانی اذیت کے باوجود بھی کسی شخص کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے ایک ثبوت تک نہ مل سکا۔

اس نے کہا کہ یہ سب افراد اس تجربے اور ان وسائل سے ہی عاری ہیں جو دہشت گردی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے یہ وہ سادہ سے لوگ تھے جو طالبان پر امریکی حملے کا سن کر ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ اس نے کہا کہ امریکا کی اس دہشت گردی کی جنگ میں اس کے اہم ترین افراد میں شامل تھا اور وٹو ق سے کہہ سکتا ہوں ان چھ سو میں سے اکثر افراد نے اسامہ بن لادن کو شاید دیکھا بھی نہ ہو، ملاقات تو بہت دور کی بات ہے۔ اپنی ریٹائرمنٹ سے چھ ماہ پہلے وہ اس جوائنٹ ٹاسک فورس میں رہا جو امریکا نے دہشت گردی کے خلاف بنائی اور اس نے وہ تمام رپورٹیں اور تفیشی فائلیں دیکھیں جو گوانتانامو بے کے قیدیوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ اس سے پہلے جرمنی میں ان رابطوں کی تحقیق کے لیے مامور تھا جو گوانتانامو بے کے قیدیوں اور وہاں کے دہشت گردوں کے ساتھ تھے۔

اس نے کہا کہ میں وہ شخص ہوں جو اس سارے معاملے کا خاص مہرہ تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب قیدی بس امریکا کی نظروں میں کامیابی دکھانے کے لیے شمالی اتحاد نے پکڑ کر دیے۔ یہ لوگ تو سوائے چھوٹی موٹی بدوق چلانے کے اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، ان سے دہشت گردی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔

میں یہ سب کچھ پڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہمارے حکمران جن کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے جب دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے ساڑھے چار سو دہشت گردوں کو پکڑ کر امریکا کے حوالے کیا، ہم دہشت گردی کی جنگ میں بہت بڑے حلیف ہیں لیکن کوئی ہے ان صاحبان اقتدار میں سے جو اس رپورٹ کے بعد خود سے سوال کرے کہ سب کے سب تو بے گناہ تھے، سادہ سے مسلمان تھے، ہاں! لیکن ہم سے بہتر تھے کہ اپنی جان اللہ کی راہ میں لے کر نکل کھڑے ہوئے لیکن کون کرے گا؟

شاید کوئی نہیں کہ ایسا خوف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ جزا اور سزا کا مالک تو ایک واحد و تبار ہے اور وہ ان بے گناہوں پر گزری اذیتوں کا ضرور حساب لے گا..... مگر یہاں تو جزا اور سزا کا مالک صرف امریکا ہے۔ کبے ہوئے لوگوں اور مجروح و محکوم غیرتوں سے یہ سوال اچھے نہیں لگتے۔



رپورٹ نے حیرت انگیز انکشافات کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہم جو پہلے کیا کرتے تھے پاکستان میں مدرسوں کے نظام تعلیم کو تبدیل کرو اور اسے ماڈرن تعلیم کے ساتھ یکجا کرو۔ اب ایک سال ہم نے پاکستان میں گزار کر دیکھ لیا، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے اس کے نصاب کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دو جہاں پاکستان کے بچے بچپن سے ایسے ہیرو اپنے ذہن میں بنا لیتے ہیں جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت، عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت اور علی رضی اللہ عنہ کی عدالت۔ جب تک یہ ہیرو اس نصاب سے کھرچ نہیں دیے جاتے مدرسوں پر دباؤ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ نصاب پوری قوم کے بچوں کو متعصب بنارہا ہے۔ ہم مذہبی طالب علموں سے نمٹ سکتے ہیں لیکن یہ نصاب پورے معاشرے کو ان کا ہمدرد بنارہا ہے۔

رپورٹ کہتی ہے کہ ہماری کئی سال کی محنت اور روپے پیسے کی امداد کے باوجود پرویز حکومت نصاب تعلیم کو ہماری مرضی کے مطابق بدلنے میں بری طرح ناکام ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بھی سرکاری اسکولوں، اس کے نصاب کی کتابیں لکھنے والوں اور افسروں میں ہزاروں ایسے ہیں جو اسلامی اقدار اور معیارات پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ دانستہ ان کتابوں میں سب کچھ ڈال دیتے ہیں۔

اس رپورٹ کے ماہرین نے کہا ہے کہ پرویز حکومت فوراً مرکزی اور صوبائی سطح پر بنے ہوئے بورڈ، ٹیکسٹ بک بورڈ اور ماہرین کے ادارے توڑ دے اور پورے ملک میں یکساں نصاب کو ختم کر دے کیونکہ ان اداروں میں مذہبی رجحان والے لوگ قبضہ کر کے بیٹھے ہیں جو ماڈرن پالیسیوں کو چلنے نہیں دے رہے۔ حکومت نے دسمبر میں اعلان کیا تھا کہ پورے ملک میں پہلی جماعت سے انگریزی شروع کروائی جائے گی جو آج تک نہیں ہو سکی، اس لیے ہر ضلعی حکومت کو اپنا نصاب خود بنانے دیا جائے اور دنیا بھر سے ماہرین پاکستان بھیجے جائیں جو ان ضلعوں میں ناظمین کے ساتھ بیٹھ کر نصاب بنائیں، علاقائی ہیرو نصاب میں ڈالے جائیں۔

دنیا بھر کے ممالک اپنی مدد اور روپے کا رخ ضلعی حکومتوں کی طرف کریں۔ ان کو پیسے دے کر اسکول بنا کر، ماہرین بھیج کر اپنی مرضی کا نصاب بنائیں۔ کوئی ضرورت نہیں پورے ملک کا ایک نصاب ہو اور مدرسوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو جب لوگ ان کی امداد سے دور ہو جائیں گے تو ہمارا راستہ آسان ہوگا۔

میں اس رپورٹ کو پڑھتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس ملک کے ایک سو سے زائد اضلاع میں جب انگریز ماہرین کی سرکردگی میں نصاب ترتیب دیا جائے گا، این جی اوز کی امداد پر کتابیں لکھی جائیں گی تو پھر جہلم میں راجہ پورس ہیرو ہوگا تو گوجرانوالہ میں رنجیت سنگھ بٹھہ میں راجہ داہر تو سبی میں سیوا..... ایسے میں اسکول کے بچے اگر اپنے کسی بزرگ کے منہ سے وہ نام سنیں گے جو ان کے آباء و اجداد محبت سے لیا کرتے تھے تو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کریں: ”کیا عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ ہمارے ضلع سے تھے یا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کون سے ضلع سے تعلق رکھتے تھے۔“

اور اس نسل کی کمائی اس کی آنکھوں کے سامنے لٹ جائے گی جس کے دامن میں اپنے اسلاف سے عشق کے سوا اور کوئی دولت باقی ہی نہیں ہے۔ مفتی جمیل خان جیسے لوگوں کی شہادت ایسے لوگوں کو راستے سے ہٹانے کی کوشش ہے جو ابھی تک نئی نسل کو اس کے اسلاف سے جوڑنے کا کام کیے جا رہے ہیں۔

## تاریخ دُہرائی جاتی ہے

(14 رمضان 1425ھ بمطابق 29 اکتوبر 2004ء)

یہ وہی العمارہ ہے جہاں اپریل 1916ء میں برطانیہ کی حملہ آور اور غاصب فوج جس میں اکثریت ہندوستان کے ضمیر فروش سپاہیوں کی تھی، برطانوی جرنیل ٹاؤن شینڈ کی سربراہی میں جب خلافت عثمانیہ سے لڑی تو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئی۔ صرف ایک تہائی زندہ بچے اور دو تہائی مار دیے گئے اور تاریخ نے وہ لمحہ بھی دیکھا جب برطانوی جرنیل ٹاؤن شینڈ نے ترک فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ساری ذمہ داری ہندوستان کے بھرتی کے شوقین فوجیوں پر ڈال دی گئی جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اور ان علاقوں سے تھی جہاں سے آج بھی نسل در نسل لوگ فوج میں بھرتی ہونا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔

پورے ہندوستان کے عوام خلافت عثمانیہ کے ساتھ تھے، ان کے دل اس کے لیے دھڑکتے تھے اور فوج کے سپاہی برطانوی افسران کی قیادت میں تازہ دم ہو کر لڑنے کے لیے اور اپنے ماتھے سے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں ذلت کا داغ مٹانے کے لیے عراق جا رہے تھے۔ عراق جو برطانوی افواج کا ترکوں کے خلاف ایک بیس کیمپ تھا۔ عربوں کو قومیت کے نعرے کا فریب دیا گیا تھا۔

اتحادی فوجیں ایک بار پھر ان ہندوستانی سپاہیوں کی طاقت کو ساتھ لے کر عراق کے میدان کارزار میں اتریں۔ غداروں کی غداری رنگ لائی اور بالآخر ان سپاہیوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور پھر موصل ان کے ہاتھ آ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو 1920ء تک پورا عراق ان کے قبضے میں تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب 1920ء کے شروع کے مہینوں میں ترکی، مصر، شام اور عراق بلکہ فلسطین میں لوگ اتحادی افواج سے نبرد آزما تھے اور ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی، ہندوستان کے سپاہی عراق میں اپنے مسلمان بھائیوں کا گلہ کاٹ رہے تھے۔

ان سپاہیوں کے ساتھ وہ تمام ظلم و ستم اور بربریت تھی جو برطانوی سامراج کو وہاں مستحکم کر سکتی تھی۔ بہر حال یہ ایمان فروش سپاہی کامیاب ہوئے تو وہی نعرہ بلند کیا گیا جو آج عراق میں کیا جا رہا ہے۔ لیگ آف نیشنز جو اس وقت کی اقوام متحدہ تھی اس نے عراق کا مینڈیٹ برطانیہ کو دیتے ہوئے کہا: ”یہ ”مقدس امانت“ اس وقت تک ان کے پاس رہے گی جب تک عراق کے عوام اپنی آزادانہ رائے سے منتخب حکومت نہیں بنا لیتے۔“

برطانیہ برسرِ اقتدار آیا تو وہی ہوا جو آج ہو رہا ہے۔ غدار اور بکاؤ عراقی عربوں کی ایک حکومت بنا دی گئی۔ ہر وزیر کے سر پر ایک برطانوی میسر کی تلوار لٹک رہی ہوتی۔ وزیر کو مکمل فرمانبرداری کا حکم تھا جو بھی ذرا چوں چرا کرتا اس کا انجام عبرتناک ہوتا۔



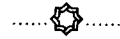
۱ اپریل 1921ء میں ایک وزیر طالب شاہ نے ایسا کرنے کی جرأت کی تو اسے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور پھر ان کو ان عراقیوں پر بھی بھروسہ نہ رہا تو حجاز میں ترکوں کے خلاف برطانوی حکومت کا ساتھ دینے والے عدار شریف مکہ کے بیٹے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنادیا گیا۔

۱ دھرم عراقی عوام کا غیظ و غضب عروج پر تھا۔ ہنگامہ آرائی تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ عراقی صرف یہ کہتے تھے کہ اس سرزمین میں برطانوی افواج کے ناپاک وجود کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اب وہ مرحلہ آیا جب تاج برطانیہ نے عراقی عوام کو مستحق سکھانے کے لیے اپنے ٹوڈی، عدار امت فیصل کے تمام اختیارات سلب کر لیے۔ برطانوی ہائی کمشنر کو ڈکنیٹر کے تمام اختیارات دیے گئے۔ اخبارات بند کر دیے گئے۔ جو ذرا قوم کی رہنمائی کرنے کے لیے آگے بڑھتا اسے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا جاتا اور پھر وہی کیا گیا جو آج فلوچہ میں ہو رہا ہے۔ ہوائی اڈوں سے بم لدے طیارے اڑتے اور نہتے شہریوں پر بمباری کرتے۔ نہ کوئی میڈیا لوگوں تک ان کی آہ و زاری پہنچانے والا تھا اور نہ ہی ان کی داد رسی کو کوئی عالمی طاقت موجود تھی۔ وقتی طور خاموشی رہی مگر آگ سلگتی رہی اور پھر ایک دن اسی طاقتور برطانیہ کو عراق سے نکلنا پڑا۔

آج اسی العمارہ میں جہاں کبھی برطانوی فوج نے ہتھیار ڈالے تھے وہیں برطانوی فوج عراقی عوام کے حملوں کی زد میں ہے۔ ہر روز ان کی چھاؤنی پر راکٹوں، گرنیڈوں اور ہندوتوں سے حملہ ہوتا ہے۔ اڈری گلین جو ایک صحافی ہے اس نے گزشتہ بارہ دن وہاں گزارے۔ اس نے کہا: ”ایک عجیب خوف ہے جو ان برطانوی سپاہیوں پر طاری ہے۔ صرف اس مہینے میں کئی سپاہی مارے جا چکے ہیں۔ وہ بار بار محاصرے میں آتے ہیں۔ عراقیوں پر اپنی طاقتور توپوں سے حملے کرتے ہیں لیکن ان کے کمانڈو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ابھی تک عراقیوں کے حملے ذرا کچے ہیں۔ وہ جنگ کی حکمت عملی اور طریق کار سے واقف نہیں اس لیے ہم یہاں زندہ ہیں لیکن یہ روز روز کی جنگ اور حملے ان کو طاق بنارہے ہیں ان کے نشانے کچے ہوتے جارہے ہیں۔ ان کا حملہ کرنے کا انداز اور حکمت عملی بہتر ہوتی جا رہی ہے اور پھر ایک دن آئے گا کہ جب ہمیں اپنی زندگیاں بچانے کے لیے بھاگنا پڑے گا۔“

اسی لیے انہیں اپنے وفادار ہندوستانی سپاہی بہت یاد آتے ہیں۔ وہ ہر چند ہفتوں بعد پاکستان پر دباؤ بڑھاتے ہیں، کبھی لالچ سے کبھی دھونس سے، کبھی حکمرانوں کے اقتدار کا سہارا دینے کی ترغیب سے..... لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ کرائے کے فوجی نہ 1920ء میں انہیں بچا سکے اور نہ آج بچا سکیں گے۔ جن لوگوں کے ضمیر میں شہادت کا جذبہ اور اسلاف کی قربانیوں کی مہک موجود ہو ان کو نہ ڈکنیٹر زیر کر سکتے ہیں نہ قابض فوج، وہ تو بھڑکتے ہوئے شعلے ہوتے ہیں جو بھی آئے اس جانب بھسم ہو جاتا ہے۔

البتہ بڑی طاقتیں اپنے ملکوں میں واپس لوٹ جاتی ہیں اور کرائے کے فوجیوں کے ہاتھ بس چند تمغے آ جاتے ہیں جو نسل در نسل ذلت کی علامت بن کر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔



## پاکستان سے رشتہ کیا؟

(21 رمضان 1425ھ بمطابق 05 نومبر 2004ء)

چہروں پر غیرت و حمیت اور جوش و جذبے کی داستانیں لیے اور آنکھوں میں آزادی کی چمک اور بے تابی سجائے آپ نے نوجوانوں کے گروہوں کو ضرور دیکھا ہوگا جو ایک نعرہ اتنے زور اور جذبے کے ساتھ بلند کرتے کہ چاروں جانب وادی کے پہاڑ بھی گونج اٹھتے۔ یہ نعرہ تھا: ”پاکستان سے رشتہ کیا..... لا الہ الا اللہ“۔ کلمہ طیبہ کے اس رشتے کو نبھانے کی کہانی بہت خون آشام ہے۔

یہ کہانی وادی کشمیر میں پھیلے اسی ہزار شہداء کے قبرستانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان قبرستانوں میں آپ کو ہر عمر، ہر قوم، ہر نسب اور قبیلے کا آدمی ملے گا۔ یہ لوگ تو اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے اور اپنے اللہ سے انعام و اکرام کے مستحق بھی..... لیکن وہ جو زمخوں کے ساتھ زندہ ہیں، ان کے زخم بھی اتنے شدید اور المناک ہیں کہ قلم لکھتے لکھتے خونچکاں ہو جاتا ہے۔ راتوں کو بھارتی سیکورٹی فورسز کے غنڈے گھروں میں گھستے ہیں۔ بچوں، نوجوانوں اور کسی حد تک ادھیڑ عمر کے لوگوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر چند دن کے بعد تشدد سے کچلی ہوئی لاش کسی سڑک کے کنارے یا کسی گھاٹی میں پڑی ہوئی ملتی ہے۔

عورتوں پر تشدد اور ظلم و ستم کا انداز ویسا ہی بھیمانہ ہے جیسا دنیا بھر کی قابض افواج کسی علاقے میں گھستے ہوئے روارکھتی ہیں۔ عصمتیں پامال کرتے ہوئے اس بات کا بھی دھیان نہیں رکھا جاتا کہ مظلوم عورت اسی سالہ بوڑھی خاتون ہے یا نوجوان لڑکی۔ یہ سب کہانیاں نہیں حقیقتیں ہیں، سچائی سے لبریز داستانیں ہیں جو کئی سالوں سے دنیا بھر کے میڈیا پر پیش ہوتی رہی ہیں، عالمی ضمیر کے دروازے پر دستک دیتی رہی ہیں۔

لیکن اس سارے ظلم، تشدد اور خون آشامی کے باوجود ایک امید کا رشتہ اور ایک آس کی لکیر تھی جو ان لوگوں اور ہمارے درمیان قائم تھی۔ یہی امید کا رشتہ تھا، یہی کلمہ طیبہ کی لڑی میں پرویا ہوا تعلق تھا کہ یہ لوگ جب بھی سری نگر کی گلیوں یا سوپور کے بازاروں میں نکلے، انہوں نے پاکستان سے تعلق اور کلمہ طیبہ کے اتحاد پر اپنے ایمان کا اعلان کیا۔

یہی وہ تعلق اور جذبہ تھا جس سے پاکستان کے عام شہری کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ جذبہ جہاد سے سرشار ہوتا تھا اور اپنے مذہب کی اساس اور اللہ کے فرمان کے مطابق ان مظلوموں کی مدد کے لیے بے چین ہو جاتا تھا جسے قرآن ”قریہ ظالمہ“ قرار دیتا ہے اور اس کے ان بانیوں کی مدد کا حکم دیتا ہے جو اللہ سے پکار پکار کر فریاد کرتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی مددگار بھیج دے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے گلگت سے گوادریک تک مسلمانوں کے دلوں کو کشمیر کے مظلوموں کے ساتھ دھڑکنا سکھا دیا تھا۔

## تاریکی کا شہزادہ

(28 رمضان 1425ھ بمطابق 12 نومبر 2004ء)

بہت سے لوگ جن کے مفادات اور جن کی نوکریوں اور اقتدار کا تحفظ اس شخص سے وابستہ ہے وہ اس کے جیتنے پر یقیناً خوش ہوں گے۔ ان کو شاید یہ یقین ہو گیا ہوگا کہ اب وہ اپنے ان داتا کے سائے میں مزید اپنے مستقبل کو تحفظ دے سکیں گے۔ ایسے لوگ ہر اس دور میں جنم لیا کرتے ہیں جب ایک جانب چنگیز خان، ہلاکو، ہٹلر یا کسی بھی توسیع پسند آمر کی فوجیں دندنارہی ہوں..... دوسری جانب سکتی اور دم توڑتی انسانیت زخموں سے چور چور ہو۔ یہ افراد حاکم ان جابروں اور قابروں کی کامیابیوں کی تمنا کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کے اقتدار کی طوالت بڑھتی رہے۔

جارج بش جیت گیا ہے۔ ایک دفعہ پھر چار سال کے لیے امریکی عوام نے پوری دنیا پر جبر و ظلم اور تشدد و بربریت کی توثیق کر دی ہے، لیکن اس توثیق کے بعد کیا ہو گیا کیا ہونے والا ہے؟ یہ سب تو پردہ غیب میں ہے لیکن جن لوگوں نے اس شخص کی پالیسیاں مرتب کی ہیں اور جو گزشتہ چار سالوں میں اسے مسلم امہ سے برسرِ پیکار رکھے ہوئے ہیں کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ سب کچھ دیکھا جائے تو خوف سے پر ایک نئی دنیا نظر آتی ہے اور ظلم و ستم کا ایک نیا عہد شروع دکھائی دیتا ہے۔

یہ لوگ کون ہیں؟ ان کا پس منظر کیا ہے اور یہ جارج بش پر کس طرح حاوی ہیں؟ یہ تقریباً 50 کے قریب افراد کا ایک ٹولہ ہے جسے NEO CONS کہا جاتا ہے۔ یہ سب کے سب یا تو یہودی ہیں یا پھر ان کے ہی خواہ۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اسرائیل کا تحفظ اور اس کی سیکورٹی امریکا کی پالیسی کا محور اول ہونا چاہیے۔ ان میں سے چند اہم لوگوں میں سے ایک رچرڈ پل ہے جو امریکا کی ڈیفنس پالیسی بورڈ کا چیئر مین رہ چکا ہے۔ دوسرا ڈیوڈ فروم ہے جو صدر بش کی تقریریں تحریر کرتا ہے اور اپنے مشہور زمانہ نعرے Axis of Evil (بدی کے محور) کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس نے بدی کے تین محور بتائے تھے۔ ایران، عراق اور کوریا۔ یہ شخص امریکا کی خارجہ پالیسیوں کا معمار سمجھا جاتا ہے۔

رچرڈ پل امریکی حکومت میں گزشتہ تیس سال سے خارجہ پالیسی بنانے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ امریکا میں اسے دوست اور مخالف اسے ”تاریکی کا شہزادہ“ کہتے ہیں لیکن یہ لقب درحقیقت صدر بش کو ملنا چاہیے۔ یہ شخص 1964ء سے پال دلف ووترز کا دوست ہے اور پوری دنیا میں صہیونی امریکی ترجمان ڈگلس انڈر فرتھ کا گرو ہے۔ یہ شخص امریکی نائب صدر ڈک چینی اور وزیر دفاع ڈونلڈ رامسفیلڈ کا یار، ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے۔ امریکا کے تمام ادارے، محکمے، پالیسی ساز جانتے ہیں کہ صدر بش ان لوگوں کے مشورے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتا۔

طاقت کے نشے میں چور ان لوگوں نے صدر بش کے آئندہ چار سالوں کے لیے ایک پلان مرتب کیا ہے۔ یہ نشہ اس قدر بد مست ہے کہ انہوں نے اس پلان کو خفیہ رکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم

لیکن آج جذبہ کے اظہار پر، اس کی اساس پر حملے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ لوگوں کو یوں تو سامنے نظر آنے والے چہرے نظر آرہے ہوں گے جو دونوں ملکوں کے نمائندوں کی صورت میں میزوں پر بات کرتے نظر آتے ہیں، ہر روز نئی تجاویز پیش کرتے حکمران دکھائی دیتے ہیں لیکن شاید ہی کسی کو اس کا احساس ہو کہ یہ سب تو محض کٹھ پتلیاں ہیں، اس جذبے کو سرد کرنے کی ڈوریں کسی اور کہاں سے ہلائی جارہی ہیں؟

2001ء کی گرمیوں میں امریکا کے دفتر خارجہ نے جنوبی ایشیا پر اپنی دو کمیشنوں کو ضم کر کے ایک ٹاسک فورس بنائی کہ بھارت سے تعلقات کیسے بہتر بنائے جاسکتے ہیں؟ پھر گیارہ مئی 2001ء کو اس ٹاسک فورس کو تین اہداف دیے گئے۔

(1) بھارت سے تعلقات مزید بہتر بنانا۔

(2) پاکستان کو ایک ماڈریٹ اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا۔

(3) افغانستان پر ایسا کنٹرول کہ وہاں دہشت گرد پناہ نہ لے سکیں۔ جون 2003ء میں اس ٹاسک فورس نے

اپنی رپورٹ ”جنوبی ایشیا میں امریکا کی نئی ترجیحات“ کے نام سے پیش کر دی۔

رپورٹ میں پاکستان کے بارے میں امریکی اہداف ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ جو سب کچھ ہو رہا ہے اس کے پس پردہ کون ہے؟ پاکستان میں ظاہری طور پر بھی اور اندرون خانہ آرمی کا دخل کم کیا جائے۔ عام انتخابات میں آئی ایس آئی کی دخل اندازی کو روکا جائے۔ پرویز مشرف کو مجبور کیا جائے کہ لائن آف کنٹرول سے دخل اندازی ختم ہو اور دراصل لائن آف کنٹرول ہی اصل باڈر ہے۔ بھارت کو مجبور کیا جائے کہ کشمیر میں معاشی ترقی تیز کرے، سیکورٹی فورسز کی تعداد کم کرے، ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے دونوں ملکوں کو خفت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس ضمن میں کشمیریوں کو مکمل آزادی اور خصوصی عالمی مقام بھی دلایا جاسکتا ہے۔

رپورٹ کا ایک تجزیہ سب سے اہم ہے اور وہ یہ کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ زندہ ہے اور بھارت سے دشمنی قائم ہے پاکستان سے کٹر اسلامی سوچ کو ختم نہیں کیا جاسکتا..... یہ مسئلہ قائم ہے تو جہاد کے نعرے زندہ رہیں گے اور پاکستان ماڈریٹ اسلامی ریاست نہیں بن سکتا۔

وہ جو تجزیہ ہے جس کی بنیاد پر آج ہر کوئی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ بے چینی اس لیے نہیں کہ ہمیں کشمیر کی قربانیاں یاد آرہی ہیں بلکہ ہمیں تو ہمارے آقا مجبور کر رہے ہیں کہ جب تک یہ نعرہ زندہ ہے۔ ”پاکستان سے رشتہ کیا..... لا الہ الا اللہ“ اس وقت تک اس قوم کی رگوں سے جہاد کی روح کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

انہیں شاید علم ہی نہیں کہ یہ روح کسی کی قربانیوں سے تازہ تو ہوتی ہے لیکن جنم اسی وقت سے لیتی ہے جب آدمی ہر طاقت اور آلہ کا انکار کر کے ایک اللہ کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے پھر ان کے سامنے کٹھ پتلیوں کی طرح تجویزیں دیتے حکمرانوں اور پھول نچھاور کرتے رہنما کوئی حیثیت نہیں رکھا کرتے۔



## تنہا اور منقسم امریکا

(05 شوال 1425ھ بمطابق 19 نومبر 2004ء)

یہ سب سے اہم الزام تھا جو جان کیری اپنے ایکشن کے جلسوں میں جارج بش پر لگاتا رہا۔ کیلی فورنیا سے لے کر بوسٹن تک اور سیٹل سے لے کر آسٹن تک اس نے لوگوں کو چیخ چیخ کر بتایا کہ بش حکومت نے امریکا کو پوری دنیا میں تنہا کر دیا ہے۔ پوری دنیا کے عوام ایک طرف ہیں اور جارج بش کی حکومت دوسری طرف۔ دنیا بھر کے لوگ عراق پر حملے اور انسانیت سوز مظالم کے خلاف ہیں جب کہ بش اپنے غرور، طاقت کے نشے اور فوجی ساز و سامان کے زعم میں اندھا ہو چکا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ 52 فیصد امریکی عوام نے اس اندھے پن کا ساتھ دیا اور 48 فیصد نے اس جارحیت کو مسترد کر دیا۔ کبھی کسی نے سوچا ہے کہ یہ 48 فیصد کون ہیں اور وہ 52 فیصد کون ہیں۔ امریکی تاریخ کے کئی سو سال سے ان دو طبقوں کو بڑی دور سے پہچانتے ہیں..... ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم اور جاہل مقہور۔

جس سرزمین پر آج سے کئی سو سال پہلے ایک بہت بے ضرری قوم آباد تھی، اپنے اپنے قبیلوں میں سکھ اور چین کی زندگی گزارنے والی، گھوڑوں پر سفر کرنا، گائے بھینس اور بکریاں پالنا اور تھوڑا بہت اناج اگانا جن کی روزمرہ زندگی کا حصہ تھا۔ نہ مشرق نے ان کا رخ کیا تھا اور نہ ہی اس سے وابستہ خرافات ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھیں۔ یہ لوگ قتل و غارت، چوری، ڈاکے، عصمت دری، اغوا اور جنسی جرائم سے نا آشنا تھے۔ ان کے ہاں نہ آج کی طرح ہر سال دس لاکھ کنواری مائیں بچے جنم دیتی تھیں۔

ایسے میں جب کولمبس نے اس پر سکون سرزمین پر قدم رکھا تو اس کے پیچھے پیچھے یورپ کے مختلف ملکوں سے جرائم پیشہ، قاتل، ڈاکو، چور اور لٹیروں جن پر اپنے ملکوں کی زمین تنگ ہو چکی تھی چلے آئے۔ پہلے تو یہ لوگ وہاں خاموشی سے آباد ہونے لگے۔ یہ سب سفید فام یورپ کے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے جتنے ترتیب دیے، چھوٹی چھوٹی فوجیں مائیں اور ان آبادیوں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ ایک جگہ سے ان لوگوں کو دھکیلا جاتا تو ایک معاہدہ کیا جاتا، پھر وہ معاہدہ توڑا جاتا اور دوسری جگہ حملہ کر کے قبضہ کر لیا جاتا اور یوں آہستہ آہستہ سارا امریکا ان کے قبضے میں آ گیا اور بے چارے ریڈ انڈین محکوم بن کر رہ گئے۔ آج ان سفید فاموں کی امریکا میں تعداد 70 فیصد کے قریب ہے۔

اب جب زمینیں قبضے میں آئیں تو انہیں آباد کرنے کا مرحلہ آیا۔ غلام ڈھونڈے گئے، افریقا کے ساحلوں پر جہاز لنگر انداز کیے گئے اور جال پھینک کر انسانوں کو جانوروں کی طرح پکڑا گیا اور صدیوں تک ان سے ظلم اور مشقت کی جگہ میں پس کر کام لیا گیا۔ ساری زمینیں آباد کروائی گئی اور پھر بعد میں انہیں امریکا کی شہریت دے دی گئی۔ آج ان کالے افریقی نژاد افراد کی تعداد 17 فیصد کے قریب ہے۔

اس پلان کو طشت از باہم کرنے سے پوری دنیا کو وقت سے پہلے خوف زدہ اور مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پلان جسے صدر بش نے قبولیت کا درجہ دیا اسے ایک کتاب An End of Evil: How to Win War on Terror میں شائع کر دیا گیا ہے تاکہ دنیا کو مزید خوف اور اضطراب کا شکار کیا جائے۔ آپ پلان کو غور سے دیکھیے اور پھر سوچیں کہ یہ لوگ آئندہ چار سالوں میں خطہ ارض اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے اس کے چند اہم نکات رکھے دیتا ہوں۔

(1) دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری کی ضرورت ہے ورنہ ہم یہ جنگ نہیں جیت سکیں گے۔

(2) امریکا کو شدت اور طاقت کے ساتھ پوری کوشش کر کے سعودی عرب کے تیل سے مالا مال مشرقی حصے کو علیحدہ کرنا چاہیے تاکہ سعودی حکومت مفلس اور قلاش ہو جائے اور ان کے پاس مقدس مقامات کے سوا کچھ نہ رہے۔

(3) عراق سے دہشت گردوں کے خلاف تعاقب شام کی حدود کے اندر تک جا کر کیا جائے اور یہ اس وقت تک کیا جائے جب تک شام ماڈریٹ اسلام اور مغربی سیاسی نظام کے سامنے جھک نہیں جاتا۔

(4) ایرانی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اس کے جلاوطن رہنماؤں کی مدد کی جائے۔ جب تک ملائیت ایران میں موجود ہے کبھی بھی دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

(5) اقوام متحدہ کے کردار کو بالکل قبول نہ کیا جائے جب تک وہ امریکا کے اس نقطہ نظر کو اپنے چارٹر کا حصہ نہیں بناتی کہ Pre-Enptive یعنی حملے سے پہلے تدارک کے لیے کسی ملک پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔

(6) فرانس کو یورپ سے دور کیا جائے اور برطانیہ پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ یورپ کا حصہ نہ بنے اور ہمیشہ امریکا برطانیہ مشرق کے دفاع کو مقدم رکھا جائے۔

(7) چین کو متنبہ کیا جائے کہ وہ صرف اپنے آپ کو تجارت اور کاروباری سرگرمیوں تک محدود رکھے۔

(8) اسرائیل کے حماس اور فلسطینیوں پر حملوں کے خلاف بیان بازی بند کی جائے اور واضح کیا جائے کہ اسلام کی دہشت گردی امریکا اور یورپ کی خلاف ہے اور اسرائیل کے حملے ہمارے دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے ہیں۔

(9) مسلمان ملکوں میں ہماری مرضی کے ڈکٹیٹر ہی اچھے ہیں اور انہیں جمہوریت کی طرف لے جانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔

کتاب میں پلان کے اختتام میں کہا گیا ہے کہ دہشت گرد اسلام کی کوئی سرحد نہیں۔ یہ ہماری تہذیب اور اقدار کا دشمن ہے اگر اسے نہ روکا گیا تو پھر ایک دن ہم سب اس کے ہاتھوں میں کھلونا ہوں گے۔ دہشت گردی کی وجہ فلسطین یا کشمیر نہیں خود مذہب اسلام میں موجود ہیں اور جب تک یہ مذہب زندہ ہے ہم محفوظ نہیں۔ یہ وہ پلان ہے جو اگلے چار سالوں میں پورا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ ایسے میں کون کس کا ساتھی ہے یہ بھی سامنے آ جائے گا۔

شاید تاریخ مسلم امہ پر ایک ایسی عید کا آغاز کرنے والی ہے جب امہ ایک طرف اور حکمران دوسری جانب..... لیکن شاید حکمرانوں کو اندازہ نہیں کہ قومیں قربانیوں سے جنم لیا کرتی ہیں، جبر کے عالم میں متحد ہوا کرتی ہیں اور تشدد سے بکھرا کرتی ہے۔

## بش کے نئے دور کی بدلتی ہوا

(12 شوال 1425ھ بمطابق 26 نومبر 2004ء)

ابھی ان چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی چمکی مدہم بھی نہیں ہوئی تھی جو صدر بش کے الیکشن جیتنے کے بعد اپنے مستقبل کو محفوظ تصور کر رہے تھے کہ امریکی نینک اپنے جدید اسلحے سے مزین فوجیوں کو لیے آسمانوں پر برم برساتے جہازوں کی چھتری تلے تین ہزار مساجد اور تین لاکھ معصوم شہریوں کے شہر فلوجہ میں داخل ہوئے۔ صرف ایک رات یعنی 8 اور 9 نومبر کی درمیانی شب فلوجہ شہر پر چالیس ہزار کلسٹر بم گرائے گئے۔ ٹینکوں کے گولوں سے مکانات کو زمین بوس کیا گیا مسجدوں کو دہشت گردوں کی پناہ گاہ سمجھ کر شہید کر دیا گیا۔ نہتے شہریوں کو باغی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

پوری دنیا کا میڈیا خاموش تھا۔ پہلے دن فلوجہ کے شہریوں نے چالیس امریکی فوجیوں کو پرغال بنایا اور اس کی ویڈیو الجزیرہ اور العربیہ ٹیلی ویژن کو بھجوائی لیکن انہوں نے اسے چلانے سے انکار کر دیا اور یہ وجہ بتائی کہ جب ہم نے عراق جنگ کے آغاز میں امریکی گرفتار صرف پانچ فوجیوں کو دکھایا تھا تو ہمارا جینا دو بھر کر دیا گیا تھا۔ پورے فلوجہ میں صرف ایک اخباری ایجنسی المفکرات الاسلام خبریں دیتی رہیں لیکن اس کی خبریں کسی اخبار کی زینت نہ بن سکیں۔ صرف وہی خبریں اور وہی فلمیں اخبارات اور ٹیلی ویژن پر چلیں جو ان صحافیوں نے بھیجی تھیں جو امریکی بکتر بند گاڑیوں میں سوار ہو کر فلوجہ میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی اگر کسی نے ذرا سا آزادانہ تبصرہ کیا تو اسے کاٹ چھانٹ کر پھینک دیا گیا۔ فلوجہ قبرستان بن گیا۔ ایسا تو تاریخ میں کسی شہر کے ساتھ بھی نہیں ہوا تھا۔ شہر فتح ہوتے تھے، لوٹے جاتے تھے، زیر نگین ہوتے تھے لیکن دنیا میں ظالموں کو ظالم کہنے والے لوگ موجود ہوتے تھے۔ نیرو نے روم کو آگ لگائی تو اسے مارنے والے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان سے بچنے کے لیے اپنی قبر کھودے، خنجر سے اپنا گلا کاٹے اور وہیں دفن ہو جائے۔ نادر شاہ کو دلی اجاڑنے پر ظالم کہنے والے موجود تھے۔ ویت نام، چلی اور انگولا پر مظالم کی داستانیں بیان کرنے والے شاعر نظمیں لکھتے تھے اور نوبل انعام تک پاتے تھے، لیکن فلوجہ تاریخ کا وہ بد نصیب شہر ہے جس کی تباہی پر آنسو بہانے والا اس ہنستی ہستی، کھیلتی مسکراتی دنیا میں کوئی میسر نہ آسکا۔

حکمران تو بے حس ہوا ہی کرتے ہیں، ان کو اپنے روز و شب اور اقتدار کی لذتوں کی طوالت عزیز ہوتی ہیں۔ ایسا ہمارے ہاں بھی تھا، بس فلوجہ کی تباہی پر یوں چپ تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کوئی سوال کرتا تو دبے لفظوں میں یہی جواب ملتا ہمیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اپنا مفاد عزیز رکھنا چاہیے۔ ہم اس عالمی طاقت کو ناراض کر لیں گے تو ہمیں کہیں جگہ نہیں ملے گی۔ ہم بے آسرا اور بے سروسامان ہو جائیں گے۔ ہماری حمایت کرنے والے ہم

جب ترقی اپنی منزلوں کو چھونے لگی تو مزید لوگوں کی ضرورت آپڑی۔ اب جنوبی امریکا، میکسیکو، برازیل، برصغیر اور مشرق وسطیٰ سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ یہ لوگ وہاں ان کی فیکٹریوں، دکانوں، پلازوں میں کام کرتے، ٹیکسیاں چلاتے، ہوٹل اور دکانیں آباد کرتے اور پھر یہ امریکی معاشرے کا حصہ بن گئے۔ یہ سب لوگ بھی 25 فیصد کے قریب ہیں لیکن پورے امریکا میں آپ ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھومیں کسی بھی سفید فام سے ملیں آپ کو اس کی گفتگو میں ایک تعصب ملے گا..... وہ کالوں سے، ایشیا والوں سے اور میکسیکو والوں سے نفرت کرتا نظر آئے گا جب اگر آپ کسی سیاہ فام سے ملیں تو وہ آپ کو اپنے آباء و اجداد پر ظلم کی داستان ضرور سنائے گا۔

امریکا نے گزشتہ کئی سالوں سے کوشش کی کہ سب کو ایک امریکی قوم ثابت کر سکے لیکن موجودہ الیکشن نے نفرت کی اس خلیج کو پوری دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ سفید فام متعصب عیسائیوں اور یہودیوں نے بش کو ووٹ دیے اور وہاں آباد مسلمانوں، عربوں، سیاہ فام افریقیوں اور جنوبی امریکا کے رہنے والوں نے جان کیری کو ووٹ دیے۔

یہ وہ لوگ تھے جو پوری دنیا کے عوام کے ساتھ تھے اور سفید فام جارج بش کے ساتھ۔ وہ دنیا جس کے عوام آج چیخ چیخ کر اپنی حکومتوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ اپنی افواج عراق سے واپس بلاؤ، ہنگری اس دسمبر میں فوجیں واپس بلا رہا ہے جب کہ سلواکیہ، پولینڈ، بلغاریہ، ہالینڈ اور یوکرین نے بھی اس سال کے آخر تک امریکا کا ساتھ دینے کا اعلان کیا ہے اور جیسے ہی جارج بش چار جنوری 2005ء کو دوسری مدت صدارت شروع کریں گے وہ پوری دنیا میں تنہا ہو چکے ہوں گے..... لیکن سب سے بڑا المیہ یہ ہو گا کہ ایک منقسم امریکا کے صدر ہوں گے جہاں بش کا حامی اپنی گوری چمڑی سے پہنچانا جائے گا اور مخالف اپنی رنگت اور چہرے کے نقوش سے..... قومیں جب یوں تنہا اور منقسم ہو جاتی ہیں تو زوال کے دن قریب آ جاتے ہیں۔





## ریت کی بوریاں

(19 شوال 1425ھ بمطابق 04 دسمبر 2004ء)

اس سے بڑا مذاق نہیں ہو سکتا کہ آپ کا پیٹ جس دوائی سے ٹھیک ہو جائے آپ اُسے آنکھ کی سوزش ٹھیک کرنے کے لیے بھی استعمال کرنا شروع کر دیں۔ یہ الفاظ ایک ایسی رپورٹ کے ہیں جو امریکی حکام ابھی تک عوام کے سامنے لانے سے گھبرارے ہیں۔ ڈیفنس سائنس بورڈ ایک ایسا ادارہ ہے جو امریکا کی جنگی حکمت عملی مرتب کرنے، اس کی جیتی ہوئی جنگ ظاہر کرنے اور اس کا پورے عالم میں وقار بحال کرنے کے لیے سفارشات مرتب کرتا ہے۔ اس ادارے نے آج سے کئی سال پہلے یہ کام شروع کیا تھا اور ہر سردیا گرم جنگ کے بارے میں اس کی رپورٹیں رہنمائی کا کام دیتی رہی ہیں۔

1917ء میں جب روس میں کیونسٹ انقلاب آیا تو جہاں مسلمان ممالک جارحیت کا شکار ہوئے، ان سے ان کے مذہب کا نام لینا، اس کی عبادات کرنا اور اس حوالے سے اپنی شناخت بنانا سب کچھ چھین لیا گیا۔ وہاں مغرب کے سب سرمایہ دار ممالک میں ایک خوف اور بے چینی ہو گئی۔ یہ خوف کسی ظلم کے نتیجے میں نہ تھا۔ مظلوم تو مسلمان تھے لیکن خوفزدہ یورپ اور امریکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پورا معاشرہ سرمایہ داری کی بنیادوں پر استوار ہے جس میں کسی مذہبی اخلاقیات کی پاسداری کا تصور تک نہیں۔ پیسہ بنانے کے لیے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کسی بھی قسم کا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ مزدور کو مجبور اور مفلس رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس معاشرے میں ایک مادر پدر آزاد جمہوریت کو سب سے مقدس حیثیت دی گئی۔ یہ نہ ہوتی تو ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے کی آزادی کیسی ہوتی؟ پھر آپ نائٹ کلب کھولیں، شراب خانے چلائیں، مخرب اخلاق فلمیں بنائیں، عورتوں کو مزین کر کے ہر کاروبار میں استعمال کریں، آپ کو آزادی، اظہار رائے اور انسانی حقوق کی چھتری تلے ہر چیز کی آزادی ہے۔ اس لیے وہ لوگ دنوں میں اربوں ڈالر کے مالک بن گئے تھے، انہیں کیونز سے خطرہ ہونے لگا کیونکہ وہاں یہ سب کام حکومت خود کرتی تھی اور وہ بھی کسی اخلاقی پابندی کے بغیر۔ انہوں نے کیونسٹ ممالک کے عوام پر سرمایہ، منافع اور مفادات کے خواب دکھائے اور انہیں آزادی اور جمہوریت کا لالچ دیا۔ جو ممالک اس لالچ میں آ کر دل کے کسی گوشے میں امریکا کو اچھا سمجھتے تھے۔ وہ آج اسے اپنا بدترین دشمن خیال کرتے ہیں وہ بھی اپنے مفاد کے لیے اور جس دن مفاد ختم ان کی ہمدردیاں بھی ختم۔

امریکا نے مسلمان ملکوں کو اسی طرح جمہوریت اور آزادی کا خواب دکھانے کی کوشش کی جس طرح روس کے مجبور عوام کو دکھایا جاتا تھا۔ حکمرانوں کو ظالم بتانے کی کوشش ہوتی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مسلمان ملکوں میں ظلم کی داستانیں تو موجود ہی رہتی ہیں جو روس کی مسلمان ریاستوں میں بیٹیں۔ یہاں تو ہر فرقے ہر مذہب کو اپنے تصورے

سے روٹھ جائیں گے۔

لیکن وقت اپنے اور ہی فیصلے کرنے کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ پوری بش انتظامیہ میں واحد شخص جس سے بھارت ناراض تھا جس کو یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ وہ پاکستان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتا ہے، جسے مغرور اور فرعون صفت بش انتظامیہ کے سامنے کبھی کبھی زبان کھولنے کی جرات ہوتی تھی اسے نکال دیا گیا۔ امریکا کا وزیر خارجہ کولن پاؤل۔ یہ وہی شخص تھا جسے بھارت ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنا بہت مشکل ہے۔ جب بھارت پوری دنیا کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم پاکستان سے مذاکرات اپنی مرضی سے کر رہے ہیں اس نے سرعام بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ تو ہماری کتنے ماہ کی محنت اور دردِ دوسری کا نتیجہ ہے۔

وہی وزیر خارجہ جو بھارت سے مذاکرات کر کے پاکستان پہنچا تو اس نے فوراً پاکستان کو نان نیو اتحادی کا درجہ دینے کا اعلان کر دیا۔ بھارت اس پر سخت ہوا کہ ہمیں اس اعلان کی ہوا تک لگنے نہ دی اور دوسری جانب امریکہ کے یہودی نواز طبقے برہم ہوئے کہ یہ تم نے کیا کر دیا۔ بش انتظامیہ اس پورے خطے میں بھارت اور جاپان کو سپر طاقت کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے لیکن کولن پاؤل چین کو اس کا مقام دینے پر راضی تھا اور یوں چین کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی اس خطے میں کردار مل جاتا۔

لیکن اب صدر بش کے دوسرے دور کے آغاز سے پہلے ہی ایک ایسی خاتون کو وزیر خارجہ بنایا گیا ہے جو صاف الفاظ میں کہتی ہے کہ امریکا کو اس خطے کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ جو صرف جنگ، تباہی اور مسلمانوں کے کردار کو دنیا سے ختم کرنے کی تمنا رکھتی ہے۔ جس کی جھوٹی رپورٹوں کی بنیاد پر عراق پر حملہ کیا گیا جو ان پچاس یہودی افراد کی منظور نظر ہے جو امریکا کو مسلمانوں کے ہر ملک پر باری باری حملہ کر کے انہیں مفلوج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم آج بھی مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ بش کے جیتنے کے بعد ہمارا مستقبل محفوظ ہے تو صرف اس کی ایک تبدیلی سے ہوا کارخ بدلنے کا اشارہ لینا چاہیے۔

طوفان کا رخ ان بادبانی کشتیوں کی طرف آنے والا ہے جن کے بادبان بھی غیروں کے ہیں اور چپو بھی دوسروں کے ہاتھ میں۔ ایسے میں نہ کشتی ڈوبنے کی صدائیں دیتی ہے اور نہ مرنے والوں کی چیخیں۔

فلوجہ کو قبرستان بنانے والے بھیڑیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں بس ایک بھیڑوں کا گلہ چاہیے ہوتا ہے اور ہم نے تو شیر بننا سیکھا ہی نہیں۔



ساتھ عبادت کرنے، شناخت بنانے اور بلا خوف تبلیغ کرنے کی اجازت ہے۔

اور آج عالم یہ ہے پورا عالم اسلام امریکا کی ترقی کی تعریف کر سکتا ہے لیکن امریکا کی کسی پالیسی کی تعریف نہیں کرتا۔ وہ جن کے دل کبھی امریکا کے لیے دھڑکتے تھے آج اس کے ہاتھوں مظلوم شہریوں کے دکھ دیکھ کر روتے ہیں۔ اس وقت مسلمان دنیا میں امریکا کے تمام دعوؤں کا نام منافقت پڑ چکا ہے اور رپورٹ کہتی ہے کہ منافقت اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک سب سے غلیظ اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ وہ اب امریکا جیسی آزادی چاہتے ہیں اور نہ اس جیسی جمہوریت۔ اب اگر امریکا اپنا رویہ بدل بھی لے تو زخم اتنے گہرے ہو چکے ہیں کہ مسلم دنیا میں موجود اس کے خلاف نفرت کم نہیں ہو سکتی۔

یہ رپورٹ امریکی حکام کے سامنے ہے اور رپورٹ والوں کے نزدیک اس کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ اب اتنا دور نکل گئے ہیں کہ واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ یہ وہ طوفان ہے جسے اب امریکا نے اندازہ کر لیا ہے لیکن شاید ہمارے ہاں کے مفاد زدہ لوگوں کو اندازہ نہیں لیکن طوفان جو مسلم امہ میں جنم لے رہا ہے وہ جب اپنی طاقت سے نکلے گا اس کی زد میں اس کی ٹھوکریں سب سے پہلے وہی لوگ ہوں گے جو اپنے تھے لیکن ان کے لیے ریت کی جنگ شروع ہو گئی۔

یہ جنگ یورپ اور امریکا نے دو محاذوں پر جیتی۔ ایک خاموش اور واقعی جنگ اور دوسرا پروپیگنڈہ۔ جنگ تو جہاں ممکن تھا وہ ہوتی رہی کبھی ویتنام میں تو کبھی انگولا میں، لیکن پروپیگنڈہ ہر ملک میں ہوا۔ جیمز بانڈ کا کردار تخلیق کر کے فلمیں بنائی گئیں۔ ریمبو کی فلموں کی سیریز چلائی گئی۔ سی آئی اے میں ایک پورا سیل بنایا گیا جو صرف ایسے لطیفہ تراش کر پوری دنیا میں پھیلاتا جس سے کمیونزم کا مذاق اڑے، تضحیک ہو۔ مسلمان ملکوں پر مظالم کی داستانیں ہر زبان میں ترجمہ کر کے لوگوں کو بھیجی گئیں۔ اخباروں اور رسالوں میں چھاپی گئیں۔ کمیونزم کو ایک بے راہ رو اور انسانیت سے محروم معاشرہ ثابت کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب روس افغانستان میں داخل ہوا تو پوری امت مسلمہ اس کے خلاف نبرد آزما ہو گئی۔ یوں امریکا اور یورپ کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی اور روس عبرتناک شکست سے دوچار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور آج اس کا شمار ایک مقروض، امداد کے خواہاں اور پریشان حال ملکوں میں ہوتا ہے۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہی کامیاب تجربہ 11 ستمبر میں نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد امریکا نے مسلمانوں پر آزمایا اور اس رپورٹ کے مطابق جو اس وقت 102 صفحات پر مشتمل ہے آج امریکا ان دونوں محاذوں پر شدید قسم کی شکست سے دوچار ہے۔

کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس کی تحریک چلانے والے، اس نام سے سیاسی پارٹی بنانے والے دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں جب کہ جس دن سے امریکا نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا ہے، ایک جانب تو امریکا میں لوگوں میں اسلام کے مطالعے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور دوسری جانب اسلام قبول کرنے والوں میں اضافہ ہوا ہے۔

ادھر مسلمانوں کا عالم یہ ہے کہ ان کے جذبات کا ریلا آہستہ آہستہ طوفان کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ تاریخ کا اولین سبق ہے کہ پانی کا ریلا ریت کی بور یوں سے آہستہ آہستہ ٹکراتا رہے تو اسے احساس تک نہیں ہوتا وہ کتنا سرک چکی ہیں اور پھر آخری ریلا آتا ہے تو یہ بوریاں میلوں لڑکھڑاتی ریلوں کی زد میں ہوتی ہیں۔ طوفان اپنی منزل تک پہنچنے نہ پہنچے، ریت کی بور یوں کو انجام تک ضرور پہنچا دیتا ہے۔



## محمود غزنوی کے منتظر استھان

(26 شوال 1425ھ بمطابق 11 دسمبر 2004ء)

یہ وہی شخص ہے جو اپنے لیے مخصوص طیارے بک کروا کر بھارت کے سفر پر نکلتا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر آتا تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کی مشتاق مخلوق اس کے پاؤں پر گر پڑتی، اس کے ہاتھ چومتی، پاؤں پر ماتھے ٹیکتی، اس کے جوتوں کی دھول اٹھا کر چانتی یا پھر اپنے سروں کی مانگوں میں سجالتی۔ مرد، عورتیں، بچے سبھی اس کے دیدار کو ترستے اور اپنی جیبوں میں پڑی دولت، ہاتھوں اور کانوں میں پڑے زیور سب اس کے قدموں میں نچھاور کر دیتے۔ سب اس ایک آشیر باد اور ایک نگاہ کی طلب میں میلوں سفر کر کے وہاں آتے۔ یہ شخص حیدر سرسواتھی گیا رہ نومبر کو بھارت کی ایک جنوبی ریاست تامل ناڈو کی پولیس کے ہاتھوں قتل کے ایک جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

یہ شخص بھارت میں ہندو مذہب کی پانچ بڑی استھانوں میں سے ایک استھان کا نجی کا شکر اچار یہ یعنی سب سے بڑا پروہت ہے۔ اس کے مندر تک لوگ ہزاروں میل کا سفر کر کے آتے ہیں اور اپنے بھگوان کے چروں میں اپنی دولت نچھاور کر کے من کی مرادیں مانگتے ہیں۔ ان چڑھاؤں، نذرانوں اور بھینٹوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ایک شخص مقرر تھا۔ اس شخص کا اچانک اس شکر اچار یہ سے کسی بات پر اختلاف ہوا۔ بھارت کے اخبارات اس اختلاف کو بھی کسی ہوس ناک سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لڑائی چل رہی تھی کہ اس نے چند لوگوں کے رو برو یہ دھمکی دی کہ معاملات سیدھے کر لو ورنہ وہ پوری دنیا کو بتا دے گا کہ شکر اچار یہ نے کا نجی مندر کی منتوں کے خزانے سے پانچ بلین ڈالر ہڑپ کر لیے ہیں۔ شکر اچار یہ نے اپنے وفاداروں کو حکم دیا کہ اس کو عبرتناک انجام سے دوچار کر دیا جائے اور پھر اکتوبر کے مہینے میں اسے قتل کر دیا گیا۔

لیکن اس قتل کے ساتھ وہ کہانیاں کئی سو سال بعد منظر عام پر آ گئیں جو سلطان محمود غزنوی کے سومات پر حملے کے وقت اس بھارت کی مظلوم و مقہور، پنڈتوں، پروہتوں اور نام نہاد بھگوان کے اوتاروں کے ظلم کی چکی میں پے پے ہوئے انسانوں نے سنائی تھیں۔ دیوداسیوں کی ہولناک کہانیوں سے لے کر غریبوں کی آرزوؤں سے کھیل کر دولت سیٹھنے کی داستانوں تک سب آج اخباروں میں سامنے آ رہا ہے۔ وہ الزامات جو کبھی مندروں کا تقدس پامال کرنے، بتوں کے نذرانوں کو لوٹنے کا الزام محمود غزنوی پر لگایا جاتا تھا اور میرے ملک کے دانشور بھی اس میں شامل ہو جاتے تھے، آج ہندوستان کے برہمن اور پجاری تامل ناڈو کی وزیر اعلیٰ جے للیجا پر لگا رہے ہیں۔

یہ الزام اس وقت لگانا شروع کیا گیا جب اس نے کام کوئی پتھم مندر کے خزانوں پر سرکاری تالے لگوا دیے۔ پورے بھارت میں اسے بددیانتی اور کرپشن کے الزامات لگا کر بدنام کرنے کی کوشش کی گئی مگر کچلے ہوئے عوام

## پسماندہ لوگ

(03 ذیقعدہ 1425ھ بمطابق 07 دسمبر 2004ء)

پتا نہیں آج کیوں مجھے یہ دونوں لفظ اتنے پیارے لگ رہے ہیں، ان سے محبت ہو رہی ہے، جی چاہتا ہے کہ یہ لفظ جو ہمارے بارے میں دیار غیر میں کہے گئے ہیں بار بار دہرائے جائیں۔ ان کا بار بار اعلان کیا جائے۔ مجھے ان پسماندہ عورتوں کی عزت و تکریم کرنے کو جی چاہ رہا ہے جنہیں اس لیے جاہل اور گنوار کے لقب دیے گئے کہ وہ حجاب پہن کر گھروں سے باہر نکلتی ہیں لیکن آئیں میں آپ کو اس تہذیب کا منظر دکھاتا چلوں جس کی دلدادہ ان سے مرعوب، ان سے اپنے اقتدار کی طوالت کی بھیک طلب کرنے والے حکمران حجاب کو پسماندگی کی علامت کہہ کر فخر سے گردن اونچی کرتے ہیں۔

کیا ایک مسلمان عورت کے حجاب پہننے سے اس ہاتھ میں کوئی کلاشن کوف آ جاتی ہے، وہ دتی ہم لیے آنے لگتی ہے یا پھر اس کے کندھے پر کوئی راکٹ لا چرٹ ہو جاتا ہے کہ مغرب کے دلدادہ حکمران اور ”مہذب“ دانشور اس سے خوف کھانے لگتے ہیں۔ ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ وہ مسلمان معاشرے کی عورت کو بدل کر اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ صرف ایک حجاب سے کیا قیامت ٹوٹتی ہے اور کس پر قیامت ٹوٹتی ہے؟ پوری دنیا میں زیب و زینت، آرائش حسن اور فیشن کے حوالے سے بہت بڑی انڈسٹری ہے جس کے کاریگر اور ماہرین کروڑوں کی تعداد میں اپنی مصنوعات بازار میں لے آتے ہیں۔ میں یہاں صرف بالوں کے حوالے سے مصنوعات کا ذکر کروں گا۔ دنیا میں اس وقت لاکھوں کی تعداد میں بیوٹی پارلر اور سیلون کھلے ہوئے ہیں جہاں خواتین کے آرائش گیسو کا کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں یہ بیوٹی پارلر موجود نہ ہوں ان پارلوں کے پشت پر ان مصنوعات پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہاں کون کون شخص مالا مال ہو رہا ہے۔ بالوں کو ریشمی، چمکدار اور خوشنما بنانے کے لیے ہزاروں طرح کے شیمپو ہیں جو مختلف فرمیں لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتی ہیں۔ بالوں کو مختلف قسم کے حسب خواہش رنگنے کے لیے بے شمار ہیز کلر ہیں۔ یہ مستقل رنگنے کے لیے بھی ہیں عارضی طور پر رنگنے کے لیے بھی۔

آپ کسی پارٹی میں کپڑوں سے ملتا جلتا بالوں کا رنگ بنانا چاہیں تو آپ کو ایسے ہیز اسپرے میسر آ جائیں گے جو قیمتی بھی ہوں گے اور دھونے سے صاف بھی ہو جائیں گے۔ بال گھنگھریا لے ہوں تو ان کو سیدھا کرنے کی مشینیں مختلف فیکٹریاں تیار کرتی ہیں اور سیدھے بالوں کو گھنگھریالا بنانے کے لیے الگ مشینیں ہیں۔ بالوں کو خشک کر کے ایک طرف پر اور ایک انداز میں موڑنے کے لیے مختلف ساز و سامان ملتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے جیل (Gel)، طرح طرح

نے اسے پھر منتخب کر لیا۔ بے لیلیا کا کہنا تھا کہ اس مندر کے بتوں کے چرنوں میں ہر سال کروڑوں روپے کا سونا بچھا دیا گیا جاتا ہے۔ لوگ غلہ اور اناج یہاں دان دیتے ہی، اپنی جائیدادیں وقف کرتے ہیں اور اس سے صرف چند پروہتوں کے پیٹ موٹے ہو رہے ہیں اور پورا بھارت غربت و افلاس کی چکی میں مسلسل پتا جا رہا ہے۔

پورے بھارت میں ایسے مندروں، استھانوں اور بھگوان کی اوتار گاہوں کا جال بچھا ہوا ہے جن کی آمدن کا نہ تو کوئی حساب دیتا ہے اور نہ کوئی ان سے پوچھنے والا۔ صرف ایک مندر ایسا ہے جو اپنے پاس جمع ہونے والے نذرانوں کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ان مندروں کے پروہتوں کے پاس کتنی دولت ہے؟ یہ آندھرا پردیش کے علاقے تری پوتی پر ایک پہاڑی پر واقع مندر ہے۔ اسے ترو ملاتری پوتی ٹرسٹ چلاتا ہے۔ اس کے حسابات کے مطابق ہر سال 150 ملین ڈالر کے نذرانے اور بھینٹیں وصول کرتا ہے۔ روزانہ اس بت کے چرنوں پر دس کلوگرام سونا بھینٹ دیا جاتا ہے۔

اسے مندر کے پروہت کے حکم پر ڈھلویا جاتا ہے اور اس سے مندر کی مقدس مہریں بنوا کر بازار میں مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں۔ اس وقت اس مندر کے خزانے میں آٹھ ہزار کلوگرام سونا موجود ہے، لیکن اس ساری آمدنی کے باوجود اس مندر سے صرف بیس فیصد آمدنی کو چند نام نہاد آشرم چلانے پر خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ اس ایک مندر کا حال ہے جو پورے بھارت میں اپنے حسابات رکھتا ہے اور اسے لوگوں کو بتاتا ہے۔

ان نذرانوں اور بھینٹوں کا ایک خوفناک پہلو جو شاید دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والوں کو نظر نہ آئے وہ اس گرفتار ہونے والے لشکر اچاریہ کے کیس سے ظاہر ہوا ہے۔ یہ شخص اپنی دولت سے راشنریہ سیوک اور دیگر تشدد تنظیموں کو مدد فراہم کیا کرتا تھا جو مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کے گھر بار جلانے اور انہیں بے دخل کرنے کے لیے فسادات کرتی تھیں۔ اس نے گجرات کے مسلم کش فسادات میں خاص طور پر بی جی پی کے غنڈوں کی مالی امداد کی۔ اس لیے اس نے گرفتاری کے بعد سب سے پہلے اٹل بھاری واجپائی سے رابطہ قائم کیا اور وہ تمام مسلم دشمن تنظیمیں متحد ہو گئیں تاکہ اس کیس کو دبا دیا جائے اور مزید راز طشت ازبام نہ ہوں اسی لیے بی جی پی نے لشکر اچاریہ کی رہائی کے لیے اتوار 5 دسمبر سے پورے بھارت میں احتجاج کا اعلان کیا ہے۔

جن مندروں اور استھانوں کی دولت اپنی بھولی، بیمار، مجبور اور مظلوم قوم کو لوٹ کر بنائی گئی ہو جو یا تو برہمنوں کے پیٹ بھرنے کے کام آئے یا مسلمانوں کے خون سے ہوئی کھیلنے کا مقصد پورا کرے..... وہاں صرف محمود غزنوی کی تلوار ہی فیصلہ کیا کرتی ہے۔ ظلم اور جبر سے نجات دلایا کرتی ہے۔

لیکن میرا دکھ یہ ہے کہ محمود غزنوی کے جانشین تلوار چھوڑ کر ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کے ہار لے کر سرحد پر کھڑے ہیں اور ان گلوں میں ڈال رہے ہیں جو اپنی جتنا کولوٹنے کے بھی مجرم ہیں اور ہمارے بھائیوں کو شہید کرنے کے بھی۔



## غدار کی کے باوجود

(10 ذیقعدہ 1425ھ بمطابق 24 دسمبر 2004ء)

اس نے تو اپنی قوم سے غدار کی کر کے، ان پر ہر روز ہونے والے ظلم و تشدد سے نظریں پھیر کر، اپنے ہم وطنوں کی پروا کیے بغیر امریکی فوج کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اس فوج میں کرنل کی حیثیت سے ملازم ہو گیا تھا جسے ہر روز امریکی اور برطانوی افواج کے ہمراہ نیپتہ عراقیوں پر تشدد کرنے کے لیے نکلنا پڑتا۔ یہ سپاہی اپنے ہم وطنوں کے گھروں کا راستہ دکھاتے، ان کا گھیرا کرتے، چھتوں سے کودتے، مردوں کو رانگلوں سے مارتے ہوئے باہر نکالتے، عورتوں کی بے حرمتی اور بچوں کو خوفزدہ کرتے۔

ایسے میں اگر کوئی ان میں سے برطانوی یا امریکی فوج پر حملہ آور ہوتا تو یہ اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے، اپنی جان قربان کرتے..... لیکن اس کے ساتھ یہ سب کیسے ہو گیا؟ اسے کرنل کی وردی پہنے اور سینے پر غدار کی کا تمغہ سجائے اپنے جوان سال بیٹے بابا موسیٰ کا تشدد سے کچلا ہوا لاشہ اٹھانا پڑ گیا۔

یہ گزشتہ دنوں کی بات ہے، برطانوی افواج کو امریکیوں نے شہروں کے اندر لوگوں سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا، اس لیے کہ امریکی سمجھتے تھے کہ آئر لینڈ میں آزادی کی تحریک دبانے کی وجہ سے انہیں حریت پسندوں سے لڑنے کا بہت تجربہ ہے۔ ایسے ہی عالم میں ملکہ برطانیہ کی لنکا شائر رجمنٹ نے بصرہ میں ایک ہوٹل کا گھیراؤ کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے اس ہوٹل کے کمروں میں اسلحہ چھپا ہوا ہے۔

یہ عراقی کرنل داؤد موسیٰ ان کے ساتھ باہر کی طرف ڈیوٹی دے رہا تھا۔ جب اسلحہ نہ ملا تو برطانوی سپاہیوں نے ہوٹل کا سیف توڑا اور اس میں سے روپے پیسے، زیور جو ملاوٹنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی ایسی قیمتی چیز جو جیبوں میں سما سکتی تھی اسے اٹھا لیا اور ہوٹل کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا۔ داؤد موسیٰ جب اس لوٹ مار کے بعد اندر داخل ہوا تو پورے کا پورا ہوٹل خالی تھا کیونکہ اسے گھیراؤ کرنے کے بعد لوگوں کو نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ اچانک ایک کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بابا موسیٰ زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھے ہوئے ہیں۔

وہ اس کے ہاتھ پاؤں کھولنے کو دوڑا تو برطانوی سپاہیوں نے کہا: ”اس حرامی نے ہم کو یہ سب کچھ کرتے دیکھ لیا ہے اس کا انجام ابھی ہو جائے۔“ داؤد کے بتانے پر کہ وہ اس کا بیٹا ہے، سب ایک دم حیران رہ گئے اور اسے چھوڑ دیا گیا اور پھر یہ سب کہانی برطانیہ کے اخبار انڈی پینڈنٹ تک جا پہنچی۔ وہ برطانیہ جہاں عوام کے جم غفیر نے ٹوٹی بلیئر اور بش کی عراق جنگ کے خلاف شدید مظاہرے کیے۔

بات چھپانے کے لیے خاموشی سے پیسے اور لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا گیا..... لیکن کسی شہری نے اس اخباری

کے کنڈیشنر اور بے شمار قسم کی کرمیں جو اربوں ڈالر کا مغرب میں لگی ہوئی فرموں کے مالکان کی جیبیں بھرتی ہیں۔

میں نے یہاں صرف حجاب پہننے سے اس کے اندر آنے والے صرف بالوں کا ذکر کیا ہے ورنہ اس کا روبرو مغرب نے عورت کے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک کوئی ایسا مقام نہیں جس کو بازار میں لاکر نہ کھڑا کیا ہو جس کی خوبصورتی اور زیبائش کے لیے اشیانہ بنائی ہوں اور اپنی مارکیٹ میں فروخت نہ کیا ہو۔

یہ سوداگر نما لوگ اور عورت کو کاروبار کے لیے استعمال کرنے والے ”مہذب“ تاجر جن کے ہاں کسی قسم کا کوئی اخلاقی معیار اور ضابطہ موجود نہیں عورت کو اسے اس درجہ نمائش بنا کر پیش کرتے ہیں کہ آنکھیں شرم سے پانی پانی اور دل خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ حسن و نمائش کی یہ انتہا عریانیت پر ختم ہو جاتی ہے اور اس وقت فحاشی کے کاروبار سے 37 ارب ڈالر ہر سال کمائے جا رہے ہیں۔ رسالوں، فلموں، انٹرنیٹ اور فیش شوز ان کے چند ایک مظاہر ہیں۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد جو اس معاشرے پر بیتی ہے اور وہ جس معیار کی مہذب دنیا بنا سکے ہیں۔ اس کا صرف ایک ملک امریکا سے اندازہ کیجیے جہاں اس وقت ہر دو منٹ میں ایک عورت جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ یہ تعداد کیسوں کی ہے جو پولیس میں رپورٹ ہوتے ہیں۔ صرف ایک سال یعنی 1996ء میں تین لاکھ دس ہزار عورتیں پولیس رپورٹ کے مطابق جنسی زیادتی کا شکار ہوئیں ورنہ اصل تعداد 9 لاکھ بنتی ہیں۔ صرف ایک سال میں بارہ لاکھ کے قریب بچے زیادتی کا نشانہ بنتے ہیں اور ان میں 75 فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔ امریکا میں اگر دن میں 100 بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں 34 ایسے ہوتے ہیں جو بغیر باپ کے اس دنیا میں آتے ہیں یعنی جن کے خانہ ولدیت میں باپ کا نام درج کرنے کے لیے کوئی شخص میسر نہیں ہوتا۔

یہی مہذب معاشرہ اپنے بچوں کے ساتھ گھروں میں کیا سلوک کرتا ہے؟ 1998ء میں 28 لاکھ بچوں کو والدین نے شدید مارا اور ان میں سے 14 لاکھ کو اتنا مارا کہ ان کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا جن میں 20 فیصد ایسے جو والدین کی اس ”عظیم“ محبت کے ہاتھوں اپنی معصومیت ساتھ لیے اس دنیا سے چلے گئے۔

مجھے یہ پسماندگی عزیز ہے، یہ میرے لیے افتخار کا باعث ہے اور مغرب کو حجاب اس لیے ایک ایٹم بم کی طرح لگتا ہے کہ یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اب عورت نمائش نہیں بنے گی۔ اگر وہ نمائش نہ بنے گی تو ہزاروں بلکہ لاکھوں سرمایہ داروں کے ذریعہ آمدنی پر لات ماری جائے گی۔

پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب مل کر اس حجاب پہننے والی کو پسماندہ، دہشت گرد، بدتہذیب نہ کہیں۔ ان کی روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ وہ تو ایسا کریں گے۔ اور ہمارا اقتدار کی طوالت کا، کرسی کی برقراری کا معاملہ..... ہماری بھی تو جان بڑی مشکل میں ہے۔





خبر پر برطانیہ کی ہائی کورٹ میں درخواست دے دی۔

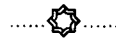
اب کیا تھا؟ اس ساری لوٹ مار اور بہترین تنخواہوں پر پلنے والی برطانوی فوج کی بددیانتی اور لوٹ مار کا ایک ہی گواہ تھا بابا موسیٰ۔ ایک غدار وطن کا بیٹا لیکن غداری کا سرٹیفکیٹ بھی کسی کو اطمینان نہ دلا سکا۔ پھر ایک دن بابا موسیٰ کو اس کے باپ کے سامنے گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں موجود ایک سینڈ لیفٹیننٹ نے کہا تمہارے بیٹے کا تحفظ کیا جائے گا اور پھر وودن کے بعد بابا موسیٰ کی لاش اس کے غمزہ باپ کے حوالے کر دی گئی۔

اس کی پوری لاش پر تشدد کے نشان تھے۔ اس کے ناک کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی، اس کی پسلیوں اور جسم کے مختلف حصوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ ہتھکڑیوں کی جگہ سے کھال ادھر چکی تھی۔ جب داؤد موسیٰ اپنے دوسرے بیٹے علامہ موسیٰ کے ساتھ برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر گیا تو اسے علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے..... لیکن اس نے وہاں سات ایسے اور قیدی دیکھے جو بالکل نیم مردہ حالت میں زخموں سے چور چور پڑے ہوئے تھے، ان میں سے ایک کو وہ پہچانتا تھا۔ ان میں بچ جانے والے ایک شخص نے کہا ہم لوگوں کو ایک اندھیرے کمرے میں لے جایا گیا اور پھر ہلکی سی روشنی کی گئی اور ہمارے منہ پر بوریاں ڈال کر گردن پر سی کس دی گئی پھر برطانوی سپاہی اندر آئے اور ہماری چھاتیوں، پیٹوں اور ٹانگوں کے درمیان گھونسنے اور لاتیں مارنے لگے۔ ہم میں سے سب سے زیادہ بابا موسیٰ درد کی شدت سے چیخا تھا۔ اس نے کہا میرا دم گھٹ رہا ہے بوری کھولو، تو سپاہیوں نے کہا چیخنا بند کرو سانس آرام سے آئے گی اور پھر اس پر لاتوں، گھونسوں کی بارش کر دی گئی۔

بابا موسیٰ کا باپ جو امریکی فوج کے ساتھ عراق کا کرٹل ہے اور اب بھی ہے، اپنے چھبیس سالہ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ لیے ہوئے دو پوتوں 5 سالہ حسن اور تین سالہ حسین کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ ان کی ماں صرف 6 ماہ پہلے فوت ہوئی۔ یہ اس گھر کا حال ہے جس کے دروازے پر غداری کا تمغہ سجا ہے۔

میں ان لوگوں کا حال سوچتا ہوں جو ظلم و جبر کے طوفان میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتے ہیں۔ کمزور ہاتھوں اور بوسیدہ ہتھیاروں سے لڑتے ہیں۔ جب یہ دشمن کے جبر کا شکار ہوتے ہوں گے تو کیسی کیسی آزمائشیں ان کا مقدر ہوتی ہوں گی وہ آزمائشوں کے موسم سے گزر کر اپنے رب کے حضور سرخرو ہو جائیں گے..... لیکن پتا نہیں کیوں پھر میرا ذہن ان سب کی طرف لوٹ جاتا ہے جو امریکا کا ساتھ دینے میں اپنوں سے غداری کر جاتے ہیں۔

اپنوں کے گھروں کو لوٹنے اور ہمسار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اگر ان کے بیٹے کبھی ایسی ہی حالت میں گرفتار ہو گئے تو ان کے غداری کے سرٹیفکیٹ ان کی وفاداریاں شاید کام نہ آسکیں۔ ایسے میں تو دعائیں بھی بے اثر ہو جائیں کہ وہ رب کائنات سے تو اپنا رشتہ کب کا توڑ چکے ہیں۔



## تباہی کا سفر

(17 ذیقعدہ 1425ھ بمطابق یکم جنوری 2005ء)

افریقہ کے شمال مغربی ساحلوں کی خوبصورتی اور اس سے سرنگراتے بحر قزح کے شفاف پانی پر مغربی دنیا ہمیشہ ایک لپٹائی ہوئی نظر رکھتی رہی ہے۔ یہی تو وہ ساحل ہیں جہاں سے مسلمانوں کے اللہ کے وحدانیت سے سرشار قافلے کشتیاں جلا کر یورپ کی سرزمین پر داخل ہوئے تھے۔ اسپین کے ساحل اور جبل الطارق کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان ہی ساحلوں کی ریت کے آس پاس..... لیکن ان ساحلوں کے ساتھ آباد سرزمینوں پر بسنے والے تو سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی جراتوں اور صداقتوں کے امین تھے۔

وہی لوگ جو طارق بن زیاد کی فوج کا ہر اول دستہ بنے اور اسپین میں عمارتوں، باغات، سائنس اور ادب کے ایسے چراغ روشن کر آئے کہ آج بھی ان کے کچھ ہوئے طاقتوں سے روشنی پھونکتی رہتی ہے۔

مغرب کا مورخ انہیں مسلمان نہیں مور (Moor) کہتا ہے اور اسپین کی اسلامی حکومت یا اسلامی تہذیب نہیں بلکہ Moorish تہذیب کا ذکر کرتا ہے۔ یہ متعصب یورپ جب اسپین پر دوبارہ برسر اقتدار آیا تو پھر ان ساحلوں کا خواب بھی دیکھنے لگا جن کی ریت سے مسلمانوں کے قافلے انہیں فتح کرنے کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے لگے۔ کبھی نپولین کی سرکردگی میں فرانسیسی فوجیں اتریں، پھر کبھی ولندیزی، اور کسی ساحلی علاقے پر پرتگیزی۔ مسلمانوں کے علاقے در علاقے اور مملکتیں در مملکتیں محکوم ہوتی گئیں۔ صلیبی جنگوں کا دور بھی گزرا۔ کبھی فتح کبھی شکست..... لیکن ان علاقوں میں ایک دوسری جنگ کا آغاز تھا۔ غریب و نادار بھوک سے بد حال افریقی مسلمانوں کو لالچ اور ترغیب سے عیسائی بنانے کا عمل جاری تھا۔ ہر ملک کے عیسائی اپنی زبان، رنگ اور نسل کو بھول کر، اپنے درمیان جنگوں کو فراموش کر کے صرف ان سیاہ فاموں کو عیسائی بنانے میں لگے ہوئے تھے..... مگر تین سو سال کی محنت، بیش بہا سرمایہ، یتیم خانے اور ہسپتال، اسکول اور معذوروں کے ادارے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس پورے علاقے میں صرف دوسو کے قریب مسلمانوں کو عیسائی بنایا جاسکا اور پھر پورے یورپ نے دیکھا کہ یہ سب لوگ کیسے اس کے خلاف ایک شخص مہدی سوڈانی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اکٹھے ہو گئے۔

اب فکر دامن گیر ہو گئی۔ سوچا گیا کہ اگر ہم برسر اقتدار رہے تو یہ ہمارے مقابلے میں ایک طوفان بن کر اٹھیں گے۔ فوراً افریقہ سے کوچ کا فیصلہ ہوا اور اقتدار ایسے مسلمانوں کے حوالے کیا گیا جو ان کی طرح ماڈریٹ، روشن خیال اور صرف نام و نسب کے مسلمان ہوں۔ پورا علاقہ ایسے تقسیم کیا گیا جیسے میز پر یک رکھ کر کاٹا جاتا ہے..... یہ مصر ہے تو وہ مراکش، یہ سوڈان ہے تو وہ تیونس، یہ الجزائر ہے تو وہ ماریطانیہ..... مسلمانوں کو علاقائی قوموں میں بانٹ کر اور روشن

بہت کچھ کہنے کو ہے لیکن شاید ہم وہ بے حس قوم ہیں جو اپنی بربادی کا منظر نامہ خود تحریر کر رہے ہیں۔ شاید انہیں علم نہیں اس نصاب کی تعلیم کے بعد خود ان کے گھروں میں جنسل پروان چڑھے گی اسے آپ لاکھ سمجھاؤ کہ یہ سب فاشی عریانی اور بے حیائی تمہارے لیے آخرت میں عذاب کا باعث بنے گی تو وہ صرف اتنا جواب دے گی، ہم نے دس سال اسلامیات پڑھی ہے، کتابوں میں تو ایسا کچھ بھی نہیں لکھا ہوا۔



خیال حکمران دے کر یہ لوگ جاتے جاتے ایک اور درس بھی دے گئے۔ دیکھو یہ سیاہ فام مسلمان بڑے ہٹ دھرم ہیں، یہ لوہے کے پنے ہیں، یہ کبھی دین نہیں چھوڑیں گے، بس ان کو آہستہ آہستہ آزادی، بے راہ روی اور روشن خیالی کا درس کتابوں کے ذریعے دیتے جاؤ اور پھر اس خاموش زہر سے بننے والی قوم کے اثرات دیکھو..... ان میں ایک ملک تھا تیونس اور وہاں ایک ایسا ہی روشن خیال حکمران تھا جس کے ملک میں 98 فیصد آبادی مسلمان تھی۔ وہاں اس نے آج سے 25 سال قبل حجاب اور اسکارف کو جبراً ممنوع قرار دیا۔

یہ سب کام ایک حکم یا آمریت کے خالی تقارے سے نہیں ہوا۔ زیتونہ یونیورسٹی تیونس میں اسلامیات کے شعبے کو ایک ذمہ داری سونپ دی گئی ایک ایسی اسلامیات کا نصاب تیار کرنے کی جو روشن خیال ہو، ماڈریٹ ہو جس میں ہر طرح کے تعیش کی اجازت ہو، یہ نصاب تیونس کے اسکولوں اور کالجوں میں نافذ کیا گیا اور پھر یہ خاموش زہری نسل میں یوں سرایت کر گیا کہ انہیں اپنے ساحلوں پر عریانیت بری لگی نہ رقص انہیں شراب سے نفرت محسوس ہوئی نہ جوئے کے بڑے بڑے اڈوں سے..... اور جو کام تین سو سال تک یورپ کے عیسائی پادری نہ کر سکے اس یونیورسٹی کے مسلمان روشن خیال اسلامی مفکرین کر گزرے۔

آج یونیورسٹی کے منصوبہ ساز مفکرین اس لیے یاد آ رہے ہیں کہ میرے ملک میں اس روشن خیالی کی ترغیب کا آغاز اس خاموشی سے ہوا کہ شاید ہی کسی کو اس کا علم ہوا ہو۔ عجیب و غریب عقائد اور روشن خیال مذہبی رسوم رکھنے والے فرقے اسماعیلیہ کے افراد کو 1985ء میں محض ایک میڈیکل یونیورسٹی کھولنے کی اجازت دی گئی۔

دنیا بھر کے ڈونرز کے فنڈ وہاں پہنچے۔ یونیورسٹی کو کامیاب بنایا گیا۔ پھر جہاں جہاں اسماعیلی بستے تھے وہاں بے تحاشا روپے پیسے دے کر اسکول اور کالج کھولے گئے۔ ہنزہ کی وادیوں میں یورپ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے پیسوں کی بارش کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آغا خان فاؤنڈیشن سے بہتر کوئی تعلیم نہیں دے سکتا۔

اب لوہا گرم تھا، لوگوں کو آغا خان فاؤنڈیشن کے روپ میں ماڈل مل چکا تھا، روشن خیال، ماڈریٹ، ادھر امریکا اور اس کے اتحادی تیونس کا تجربہ دہرانا چاہتے تھے۔ 8 نومبر 2002ء میں آغا خان یونیورسٹی ایگزامینیشن بورڈ کا آرڈی نینس جاری کر دیا گیا۔ جس کے ساتھ ہر سرکاری بورڈ کو منسلک ہونے کی اجازت دی گئی۔

ملک کے قومی مفاد میں اس فاؤنڈیشن کو اس ملک کا نصاب مرتب کرنے کا کام سونپا گیا۔ اب روپیہ کہاں سے آئے؟ اگست 2001ء کو کراچی میں آغا خان یونیورسٹی کے شمس لاکھانی اور امریکی سفیر کے درمیان معاہدہ ہوا اور 50 لاکھ ڈالر کی امداد آغا خان فاؤنڈیشن کو دے دی گئی۔

میں اس لمبی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ یہ سب کیا کرنے والے ہیں اور میرے ملک میں کیا ہونے والا ہے؟ صرف ایک بات کا تذکرہ کرتا ہوں، اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ ہمیں کس طرف لے جایا جا رہا ہے اور ہم کس ذلت و پستی میں گرنے والے ہیں۔ آغا خان بورڈ نے میٹرک میں اسلامیات کے جس نصابی خاکے کی تجویز دی ہے اس کی شق نمبر 5 میں کہا ہے کہ پاکستان میں اسلامیات کے نصاب کے لیے زیتونہ یونیورسٹی تیونس کے نصاب سی مدد لی جائے گی۔ صرف یہی ایک ٹک اس سارے خوفناک خطرے کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے جو میرے ملک میں پیش آنے والا ہے۔ میں یہاں اس سوال نامے کا تفصیلی ذکر بھی نہیں کروں گا جو آغا خان فاؤنڈیشن نے طالب علموں کو دیا ہے اور جس میں پہلی دفعہ شرم و حیا کا دامن چھوڑ کر سوال کیے گئے ہیں۔

## وارننگ

(24 ذیقعدہ 1425ھ بمطابق 08 جنوری 2005ء)

یہ ہنگام سے سوکھو میٹر دور ایک لمبا ساحل ہے۔ نیلے پانیوں اور گرم ریت پر یورپ کے فیشن پرست اور امریکا کے دولت مند اپنی زندگی کے کچھ دن گزارنے آتے ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جہاں آج سے تیس سال قبل ان امریکی سپاہیوں نے ڈیرے جمائے اور پھر جب وہاں سے نکلے تو اسے قہر خانہ بنا کر گئے۔ پوری قوم کو قہر گری کی ایسی لت پڑی کہ ہر شکر اور ہر چوراہے پر اس کے نوجوان لڑکیوں کی تصویروں کے البم لیے گھومتے پھرتے نظر آنے لگے۔ اس جزیرے کو اس ذلت و رسوائی اور نمائشی و عریانی میں نمایاں مقام حاصل تھا اور پھر چند دن پہلے جب یہ سب لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے، خوش گپیاں چل رہی تھیں، بے پروا ساحل کی ریت پر لوٹ رہے تھے کہ صرف ایک لہر آئی اور ان کے جسم سمندر کا رزق ہو گئے۔ سمندر کے پانیوں نے اسے قبول کرنا پسند نہ کیا اور لاشوں کو واپس ریت پر الٹ دیا۔ کوئی بم گرا نہ خود کش حملہ ہوا، بس چشم زدن میں پورے کا پورا ”پھوٹ“ جزیرہ عبرت کا نشان بن کر رہ گیا۔

یہ انڈیمان اور نکوبار کے جزیرے ہیں، یہ وہی جزیرے ہیں جہاں کبھی انگریز اپنے خلاف بغاوت کو کالے پانی سزا دے کر بھیجا کرتے تھے۔ اس پورے علاقے میں امریکا کی اشیر باد سے بھارت سپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور سپر پاور بننے کے لیے اس نے اپنی فوجیں، بحری جہاز، میزائل اور ہوائی جہازوں کو وہاں رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ان کی مسلح افواج بھی تھیں تاکہ اگر گرد کے ممالک کو خوفزدہ کیا جاسکے۔ طاقت کے نمرود کو خاک میں ملانے کے لیے یہاں بھی وہی لہر کافی تھی۔ تیز لہر آئی اور دونوں جزیرے مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گئے۔ پانی یوں انسانوں اور سب ساز و سامان کو بہا کر لے گیا کہ لگتا تھا یہاں کوئی رہتا ہی نہ تھا۔ نہ کوئی ریڈار کام آ سکتا ہے اور نہ ہوائی وارننگ سینٹر..... یہاں بھی کوئی حملہ نہیں ہوا، کوئی خود کش کار دھماکہ نہیں ہوا لیکن طاقت کا غرور خاک میں مل کر رہا۔

یہ انڈونیشیا کے جزائر کا وہ علاقہ ہے جہاں آج سے دو سال قبل کار بم دھماکہ ہوا تھا۔ اس جگہ جہاں مغربی سیاح داد عیش دینے آیا کرتے تھے۔ اس دھماکہ کے بعد پوری مغربی دنیا مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کی علامت بن گئی تھی۔

آسٹریلیا کی حکومت نے اس وقت تک سکھ کا سانس نہ لیا جب تک وہ وہاں موجود مسلمانوں کے چوٹی کے رہنماؤں اور مساجد کے اماموں کو پابند سلاسل نہ کر دیا گیا، مجرم کو پھانسی کی سزا نہ دلا دی گئی..... لیکن آج انہی جزائر میں تادم تحریر دولاکھ سے زائد لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں اور کوئی الزام دینے والا موجود نہ تھا۔ سب کے سب بس ایک سمندر کی لہر میں یوں دب کر رہ گئے کہ پھر اٹھ نہ پائے۔

یہ میرے اللہ کی ایک چھوٹی سی وارننگ تھی۔ ایک چھوٹی سی تنبیہ تھی۔ آئیے اس چھوٹی سی وارننگ کی حیثیت اور حجم کو ناپنے کی کوشش کریں۔ جس جگہ زمین سے سمندر کی لہروں نے طوفان برپا کیا وہاں ایک ہزار کلومیٹر لمبا ایک گہرا دھکاف پڑ گیا ہے جو کئی سو گز چوڑا ہے۔ اس وقت دنیا کی تمام طاقتوں کے پاس ملا کر ایٹم بموں کی تعداد دس ہزار سے پندرہ ہزار تک ہے لیکن اندازہ ہے اس زلزلے کی قوت اور طاقت دس لاکھ ایٹم بموں سے بھی زیادہ تھی۔ یعنی اگر یہ لاوا کسی بستی پر دوڑ پڑتا تو شہر کے شہر اس کھولتے ہوئے لاوے کی زد میں آ کر بھسم ہو جاتے۔ ایسے میں نہ کسی کو اپنے ایٹم بم یاد آتے نہ جہاز اور نہ ہی ڈیزل کٹر بم، بس ایک بھگم دوڑ مچ جاتی..... لیکن لاوے کی گرمی دور سے انسانوں کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے لیکن چونکہ یہ ایک وارننگ تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس لاوے کو سمندر کی تہ سے اٹلنے کا حکم دیا کہ صرف سمندر کی لہروں میں جوش آئے اور وہ انسانوں کو اپنے غصے کا مزا چکھائے۔ یہ اس کے غضب کا ایک چھوٹا سا اشارہ تھا۔ یہ اس سال کی کارکردگی پر ایک تازیانہ تھا۔

یہ سال کہ جس میں ہم نے انسانوں پر ظلم ہوتے دیکھا اور خاموش رہے۔ ہم نے افغانستان تباہ ہوتے دیکھا اور ہم نے کچھ نہ سوچا۔ ہم نے فوجہ کی پوری آبادی کھنڈر بننے دیکھی..... لیکن چپ رہے۔ پوری دنیا امریکا کی غنڈہ گردی کے مقابلے میں یوں دم سادھے بیٹھی رہی جیسے مرغیوں کے ڈربے سے کوئی کچی ہوئی مرغی نکالتا ہے تو بقیہ مرغیاں چپ بیٹھتی ہیں کہ ہماری باری نہیں آئی۔ ہم خاموش تماشا کی تھے، سمجھتے تھے کہ بچ گئے۔

یہ جرم صرف ایک قوم کا نہیں تھا اس پوری دنیا پر بسے چھ ارب انسانوں کا تھا اور پھر میرے اللہ نے بلا تخصیص ان چھ ارب انسانوں کو وارننگ دے دی..... لیکن انسان بھی عجیب ہے۔ ہر چیز کی سانسنی تو جیہہ کر لیتا ہے یہ زلزلہ اس لیے آیا؟ اس کے لیے وارننگ سسٹم بنانا چاہیے، فلڈ کنٹرول ہونا چاہیے..... لیکن اس رب کائنات کی طرف رجوع نہیں کرتا اور پھر ایک دن اس عذاب میں پھنس جاتا ہے جہاں سے اسے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ جو قومیں یا انسان وارننگ دینے والے کو نہ پہچانیں اور لا پرواہی سے اپنے رستے پر چلتے رہیں..... ان کے مدفن اسی رستے پر ہی بنا کرتے ہیں۔





میں امریکی مارے گئے، زخمی ہوئے، کوئی عراقی عہدیدار قتل ہوا، عراقی سپاہیوں کے پرچے اڑے تو ہر کمپ میں ایک خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ڈرے ڈرے، سب سب سپاہی اپنے کیمپوں میں اپنی بیویوں اور گرل فرینڈز کی تصویریں نکال کر دیکھنے لگتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی بچوں کی تصویر چوم کر آنسو بہانے لگتا ہے اور کوئی اپنی قسمت کو گالیاں دیتا ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو مارچ 2003ء سے اب تک خالص امریکی فوجیوں میں سے 12 ہزار ایسے تھے جو زخمی ہو گئے، امریکا کے اعلیٰ ترین ہسپتالوں میں ان کا علاج ہوا لیکن ان میں سے 5 ہزار ایسے ہیں جو ساری زندگی کے لیے معذور ہو گئے اور باقی سات ہزار طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں اور خوف، بے چینی، اضطراب انہیں نارمل زندگی گزارنے نہیں دیتا۔ یہ چلتے پھرتے نقشے ہیں جو امریکا کے شہری لوگوں کو نظر آتے ہیں اور پھر اگر کسی ”ریزرو“ فوجی کو عراق جانے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ خوف سے کانپنے لگتا ہے، بیمار پڑ جاتا ہے یا پھر کوئی اور بہانہ بنا کر غائب ہو جاتا ہے۔

یہ وہ عالم ہے جس سے مجبور ہو کر اس فوج کے جرنیل نے لکھ بھیجا ہے کہ اب یہ فوج یا طاقت نہیں رہی بلکہ ایک ”ٹوٹی ہوئی طاقت“ (Broken Force) بن چکی ہے۔

گیارہ ستمبر کے بعد ایک اسرائیلی یونیورسٹی کے پروفیسر نے کہا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ یہودیوں کے حق میں میڈیا کی سب سے بڑی کارروائی ہے۔ اب اس کے نتیجے سے مسلم دنیا نہیں بچ سکتی۔ یہی خیالات امریکا میں موجود یہودی لابی کے تھے لیکن کسے خبر تھی کہ نسبتاً جلد بہ شہادت سے سرشار عراقی مسلمان ان ساری تدبیروں کا رخ بدل دیں گے، ظالم پر خوف طاری کر دیں گے..... لیکن یہ صرف ایک خوف نہیں جو ان پر طاری ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد پیدا ہونے والا ایک دوسرا خوف بھی ہے جس کا انہیں یقین تک نہ تھا۔ 2004ء میں برطانوی بچوں میں جو نام رکھے گئے ان میں پہلی دفعہ کئی سو سال تاریخ کو اُلٹتے ہوئے ”محمد“ مقبول ترین ناموں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔

ادھر امریکا کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے ایک حرفی رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ یہودیوں کے خلاف نفرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مومن جب اپنے اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور پھر اپنا جینا اپنا مرنا اس کے لیے وقف کر دیتا ہے تو قادر مطلق دشمنوں کی تدبیروں کو ایسے ہی ان کے منہ پر اُلٹ دیتا ہے۔



## تدبیریں اُلٹ دی گئیں

(02 ذی الحجہ 1425ھ بمطابق 15 جنوری 2004ء)

بالٹی مور امریکا کے دارالحکومت سے تھوڑی دور ایک چھوٹا سا شہر ہے جس سے لوگ روزانہ واشنگٹن کے بڑے بڑے دفاتر میں کام کرنے آتے ہیں اور شام کو واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ واپس اپنے شہر آنے پر ان کے پاس دارالحکومت کے دفاتر کی چھوٹی بڑی ہزار طرح کی خبریں ہوتی ہیں، خفیہ بھی اور سرعام بیان کی جانے والی بھی۔ ایسی خبریں زبانوں سے نکلتی، جھوموں میں پھیلتی، صحافیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اسی لیے اکثر اوقات امریکی انتظامیہ کے کئی راز اسی شہر کے اخباروں میں جا کھلتے ہیں اور پھر پورے ملک پر طشت از بام ہو جاتے ہیں اور پھر چاروں جانب صفائیوں، بیانات اور تردیدوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

چند دن پہلے اسی شہر بالٹی مور کے اخبار سن (Sun) نے ایک خبر لگا دی، شاید اسے پینا گون میں کام کرنے والے کسی شخص نے بتایا ہو یا پھر اس نے اڑتے اڑتے یہ خبر حاصل کر لی..... مگر خبر ایسی تھی کہ نہ تردید کرتے بنتی تھی اور نہ سچ مانتے ہوئے عزت برقرار رہتی تھی۔ اخبار نے کہا کہ امریکی فوج جس میں اکثریت ان ریزرو فوجیوں کی ہوتی ہے جنہیں حالت جنگ میں بلایا جاتا ہے۔

ان ریزرو فوجیوں کا ایک کمانڈر ہوتا ہے جو عراق سے لے کر افغانستان تک اور فلپائن سے لے کر ہٹی تک ان فوجیوں کے اکٹھا کرنے اور بھیجنے کا بندوبست کرتا ہے۔ خبر کے مطابق اس نے امریکی محکمہ دفاع کو ایک طویل یادداشت میں یہ لکھ کر دے دیا ہے کہ امریکا کی یہ سب سے اہم ”ریزرو“ فوج اب ایک ٹوٹی ہوئی طاقت ”Broken force“ بن چکی ہے اور اب آئندہ یہ کسی قسم کی جنگی صورت حال اور اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں۔

لیفٹیننٹ جنرل جیمز پلے نے کہا کہ پورے عراق میں ہم نے ”ریزرو“ بھیجے جو وہاں موجود تمام افواج کا 40 فیصد ہیں۔ بیس دسمبر کو دیے گئے اس یادداشتی خط میں اس جنرل نے کہا ہے کہ اس کے زیر کمان فوجی اب اس بات کو قطعاً ماننے کو تیار نہیں کہ وہ یہ تمام کام عراقیوں کو آزاد کرنے، ان کی آزادی کا تحفظ کرنے یا انہیں جمہوریت دلانے کے لیے کر رہے ہیں۔ جنرل نے کہا کہ ان کو شاید اب مزید ڈالروں اور تنخواہوں میں اضافے کا لالچ بھی عراق نہ بھیج سکے۔

یہ حال صرف ”ریزرو“ امریکی افواج کا ہی نہیں، ان سب کا ہے جنہوں نے اپنے چاروں جانب موت کو بڑھتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ وہ خواہ امریکی افواج ہوں یا ان کا ساتھ دینے اور انہیں تحفظ فراہم کرنے والے عراقی رگروٹ، سب کا حشر نمایاں ہے۔ روز ایک نیا منظر نامہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

جیمز ڈرن جو امریکا کا خصوصی مندوب ہے، اس نے کہا کہ جیسے ہی کوئی ایسی خبر آتی ہے کہ خود کش بم دھماکے



اقتدار اور طاقت حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ یہ جہاں جہاں اکثریت میں ہیں ان علاقوں کی آزادی کی تحریکیں چلوائی جائیں تاکہ وہاں ایک شدید قسم کی جنگ چل پڑے اور پھر ان کی مدد کر کے مسلم امہ کے حصے بخرے کیے جائیں۔ دوسرا بڑا کمزور مقام جہاں سے حملہ کیا جاسکتا ہے اور کامیابی بھی حاصل ہو سکتی ہے وہ عرب اور غیر عرب کی تقسیم ہے۔ عرب پوری مسلم امہ میں صرف 20 فیصد ہیں لیکن یہ عرب دنیا اسلامی تہذیب کے مراکز کی وجہ سے پوری مسلم امہ کا مرکز و مرجع بنی ہوئی ہے۔ امریکا کو چاہیے کہ مسلم امہ کے غیر عرب علاقوں مثلاً پاکستان، ملائیشیا اور انڈونیشیا پر اس طرح توجہ دے کہ وہ عرب مرکز سے دور ہو جائیں اور پھر عربوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس ضمن میں مغربی ممالک میں آباد مسلمانوں کو خصوصی طور پر استعمال کیا جائے اور ان آبادیوں میں لبرل اسلام کو اس طرح متعارف کروایا جائے کہ ان کی جذباتی وابستگی عرب دنیا سے ختم ہو کر رہ جائے۔

مسلم امہ کا تیسرا کمزور مقام قبائلی، نسلی اور علاقائی تقسیم ہے۔ ان سب لوگوں کو اگر کوئی رشتہ آپس میں متحد اور متفق رکھ سکتا ہے وہ ان کا مسلمان ہونا ہے۔ قبائلی، نسلوں اور زبانوں کا اختلاف ایسا ہتھیار ہے جس کو استعمال کر کے پہلے بھی مسلم امہ کے حصہ بخرے کیے گئے ہیں، یہی وہ ہتھیار تھا جو ایک زمانے میں روس استعمال کرتا تھا لیکن اب امریکا کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہیے۔

اس کے بعد آخر میں وہ خصوصی اقدامات بتائے گئے جو کہ امریکی حکومت کو کرنے چاہیے اور اب ان اقدامات کی منظوری دے دی گئی ہے۔

☆ لبرل اور ماڈریٹ مسلمانوں کا کوئی نیٹ ورک یا تنظیم نہیں جو فوری طور پر ایسے دین سے بیزار اور ماڈرن تہذیب کے دلدادہ افراد کا ایک نیٹ ورک بنایا جائے جو عالمی سطح پر ہو۔

☆ جہاں جہاں قدیم سوچ رکھنے والے ادارے موجود ہیں ان کو یا تو طاقت سے ختم کیا جائے یا صلح سے اور پھر ان اداروں، تنظیموں کا اختیار لبرل مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔

☆ جو بھی ملک مدارس اور مساجد کو جدید بنیادوں پر منظم کر رہے ہوں انہیں اسلام کی ماڈریٹ سوچ دے رہے ہوں ان کی بھرپور مدد کی جائے اور اس دائرہ میں آنے والے مدرسوں اور مساجد پر ڈالروں کے دروازے کھول دیے جائیں۔

☆ نوجوانوں کو اپنے اسلاف سے برگشتہ کرنے کے لیے اسکالرشپ، امداد اور امریکا میں تعلیم و تربیت کے مواقع دیے جائیں۔

☆ سعودی عرب اور پاکستان کے ایسے اداروں اور خیر حضرات کا ناطقہ بند کر دیا جائے جو کسی بھی قدیم طرز اسلام کی تنظیموں کو سپورٹ کرتے ہیں۔

ان سب میں اہم اور خطرناک حکمت عملی یہ ہے کہ مسلم ممالک کی افواج کے 80 فیصد سے زیادہ افسران کو فوری طور پر امریکا کی فوجی اکیڈمیوں میں تربیت دی جائے اور انہیں مکمل طور پر تیار کیا جائے کہ اگر کہیں مسلم امہ میں امریکا کے خلاف جذبات پیدا ہوں وہ اسے فوراً کچل دیں۔

یہ وہ یکسین ہے جو امریکا کے Ummanitis کی بیماری کے لیے تیار کی ہے اور کتنے بدنصیب ہیں ہم کہ ہم اس دیکسین کو جو ہماری موت ہے لگوانے کے لیے خود بے تاب ہوئے جاتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کا، اہل جاہ کا بس

## آخری پناہ

(10 ذی الحجہ 1425ھ بمطابق 21 جنوری 2005ء)

Meningitis ایک ایسا مرض ہے جس سے انسانی جسم کے اہم اعضا خصوصاً دماغ اور دل میں کچھ ایسے زخم ہوتے ہیں کہ پھر وہاں مستقل طور پر معذوری پیدا ہو جاتی ہے یا پھر اس کے نتیجے میں موت واقع ہوتی ہے۔ یہ مرض دماغ کے لیے خصوصی طور پر مختص ہے اور اس کا کام دماغ کی جھلیوں میں ورم پیدا کر کے اسے ناکارہ بنانا ہوتا ہے۔ یہ ان چند ایک خطرناک امراض میں سے ہے جن سے بچاؤ کے لیے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔

احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ سب اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ گزشتہ دنوں امریکی پالیسیاں بنانے والے ادارے رینڈ کارپوریشن (Rand Corponation) کے سربراہ سائنس نے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مسلم امہ کے بارے میں ایک لفظ استعمال کیا ہے Ummnanitis یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ملیریا کے وزن پر کلیریا اور بوریہ وغیرہ کے قافیے جوڑے جاتے ہیں تاکہ ان کو کسی مرض کی قسم کے طور پر ظاہر کیا جاسکے۔

اگر یہ لفظ کسی عام آدمی نے یا کسی امریکی ادیب یا اسکالر نے محض تفسیر طبع کے لیے استعمال کیا ہوتا تو مجھے کوئی عجب نہ لگتا، نہ میری حیرت کا عالم یہ ہوتا..... لیکن یہ تو ایک ایسے شخص نے کہا ہے ایسے ادارے کا سربراہ ہے جسے امریکی حکومت کئی سو ملین ڈالر دیتی ہے تاکہ وہ حکومت کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے پالیسیاں بنائے اور پھر ان پالیسیوں پر امریکی حکومت آنکھ بند کر کے عمل کرنے لگتی ہے۔ اس ادارے کا نام رینڈ کارپوریشن ہے۔ یہ ادارہ پچاس سال سے کام کر رہا ہے، اس کی پہلی پالیسی رپورٹ 1946ء میں آئی تھی اور آج تک اس کی تمام رپورٹیں امریکی خارجہ پالیسیاں مرتب کرتی رہی ہیں۔ Rand اصل میں Research and Development کا مخفف ہے۔

اس دفعہ اس ادارے کو امریکی حکومت نے اپنی انیفرس کے ذریعہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی امریکی حکومت کے لیے حکمت عملی مرتب کی اور پھر اس حکمت عملی کو امریکی حکومت نے اپنے لیے نافذ العمل قرار دے دیا۔ اسی حکمت عملی کے نفاذ کے بعد سائنس نے سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مسلم امہ کو ایک بیماری سے تشبیہ دی۔

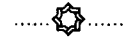
یہ پالیسی دستاویز ایک ضخیم تحقیق ہے جس میں مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے جذبات، خیالات اور اختلافات کا جائزہ لے کر امریکی حکومت کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا گیا ہے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ پوری مسلم امہ کو توڑنے کے لیے تین بنیادی نشانے ہونے چاہئیں اور یہی تین کمزور مقام ہیں جہاں سے مسلم امہ پر حملہ کر کے اس بیماری سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

سب سے اہم شیعہ سنی اختلافات ہیں۔ شیعہ جو پوری امہ میں صرف 15 فیصد ہیں لیکن بعض مقامات پر

نہیں چلتا کہ وہ یہ ساری کی ساری حکمت عملی اپنے ہاتھ میں لے لیں اور بتائیں کہ لاؤ ہم اس امہ کے گلے پر خود چھری پھیرتے ہیں اور وہ امہ جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کا شجر

ہم اس کا اتحاد پارہ پارہ کر کے خود دکھاتے ہیں۔ شاید انہیں علم نہیں، شاید یہی امت ان کی آخری پناہ ہے۔ یہی ان کی آخری امان ہے..... ورنہ اگر یہ پارہ پارہ ہو گئی تو موت ان کے دروازوں پر بھی رقص کرے گی اور پھر وہ کسے پکاریں گے، کون ان کو امان دے گا۔



## بسنت

(24 ذی الحجہ 1425ھ بمطابق 04 فروری 2005ء)

دونوں میاں بیوی مکھن پورہ کے ایک متوسط رہائشی علاقے میں مقیم تھے۔ مبین شاہد کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی جس پر وہ اپنے تین سالہ جگر گوشے فہیم اور اپنی بیوی کو لے کر بازار جاتا یا کسی دوست، رشتے دار سے ملنے کے لیے۔ اس دن بھی شام کے وقت وہ اپنے نور نظر کو موٹر سائیکل کی ٹینگی پر بٹھائے اپنی بیوی کے ہمراہ جا رہا تھا۔ ننھا فہیم اس سوچ میں خوش تھا کہ وہ اپنے نانا اور نانی سے ملے گا۔

محبتوں کے جلو میں جب یہ چھوٹا سا قافلہ مزنگ کے قریب پہنچا تو اچانک ننھے فہیم کی گردن سے خون کا فوارہ سا نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا پورا لباس لہو سے تر ہو گیا۔ حواس باختہ باپ نے موٹر سائیکل روکی، ماں نے چیختے ہوئے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے اس کی گردن کی طرف ہاتھ کیا تو کئی ہوئی گردن میں تیز دھار آرے کی طرح پروٹی ہوئی کئی پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ ہنستا ہنستا گھر تو ویران ہو گیا..... لیکن اس معصوم کا خون کتنی مدھر ادا کاراؤں، نازنیوں، تھرکتی ناچتی بچلیوں کے چہروں کو لالی دے گیا جو اسی کتنی پتنگ کے معرکے میں کیسٹوں پر بچتے ہوئے گانوں کی تھاپ پر جھومتی رہیں۔

اس کی عمر 14 سال تھی۔ بہنوں کا لاڈلا بھائی ندیم شاید میٹرک کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ شام کو ٹیوشن پڑھنے جاتا تو ماں اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی۔ اس کی واپسی کے لیے دعائیں مانگتی۔ کیسی کیسی امیدیں اور کیسے کیسے خواب اس سے وابستہ ہوں گے جو اس کی بہنوں اور ماں نے دیکھے ہوں گے اور پھر ایک دن یہ کئی بہنوں کا اکلوتا بھائی ہاتھوں میں کتابیں پکڑے کلمہ چوک کے نزدیک پہنچا تو کئی پتنگ کی ایک ڈور اس کی گردن پر یوں پھری کہ ساری امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کے چراغ گل کر گئی۔ لاش کے سر ہانے اس کی ماں صرف خون آلود کتابیں لیے کھڑی تھی اور روتے ہوئے لاہور کے اس آسمان کو دیکھ رہی تھی جہاں عیش و عشرت کی پتنگیں اُڑ رہی تھیں۔ کلمہ چوک پر بہت بڑا خون کا دھبہ تھوڑی دیر تک رہا پھر تیز رفتاری گاڑیوں کے خوفناک ناز اس نشان کو اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ صرف دو واقعات ہیں کہ ان کے لکھنے کے بعد یہ قلم مزید لکھنے کی تاب رکھتا ہے نہ آنسو ساتھ دیتے ہیں کہ دم بھر کورک جائیں اور میں اس ”خوبصورت“ ثقافت کے ہاتھوں لٹنے والے ایک ایک شخص کا مرثیہ لکھ سکوں۔ وہ جو اس رنگ و نور اور عیش و عشرت کے جشن کی نذر ہو گئے۔ یہ جشن میرے بچپن میں لاہور کے بدنام ترین علاقے ہیرامنڈی میں واقع میاں صلاح الدین کی ایک حویلی میں منایا جاتا تھا اور پورا لاہور اسی جگہ جا کر کٹھنوں پر بیٹھنے والی حسیناؤں کو چھتوں پر دیکھا کرتا تھا۔

## بلوچستان کا مسئلہ کیا؟

(یکم محرم 1426ھ بمطابق 11 فروری 2005ء)

ہم اگر ان کو سیلاب میں چاول نہ بھیجیں، کبیل اور رضائیاں اکٹھی کر کے انہیں نہ دیں تو یہ لوگ تباہ ہو جائیں۔ یہ غریب لوگ ہیں ان کے کپڑے دیکھ۔ ان کے لیڈر بھی دھوٹی اور قمیچی چپل پہن کر پھر رہے ہوتے ہیں۔ بس جی کیا کریں ان کو ساتھ رکھنا ہے اس لیے ہم یہ قربانی دے رہے ہیں، صرف پاکستان کے لیے۔ یہ اور ایسے فقرے یاد کے درپچوں سے ہتھوڑوں کی طرح لگتے ہیں۔ ایسے کئی فقرے میں نے اپنے بچپن میں پنجاب کے ہر شہر کی گلیوں میں سنے۔ میں نے ہر شخص کو رعونت سے پر اور بنگالیوں کے بارے میں تحقیر سے بولتا ہوا دیکھا۔

جو ذرا تیزی کے ساتھ نوالے لینے لگتا اسے بھوکا بنگالی کہا جاتا۔ جب وہاں کے لوگ اپنے حقوق کی جدوجہد کر رہے تھے تو یہاں پر عام شہری سے لے کر دانشور تک یہی بات دہراتے تھے۔ جانے دیں ان کو، یہ ہماری امداد کے بغیر ایک دن نہیں نکال سکتے۔ ان کو سمجھا آجائے گی دال کسی بھاد بکتی ہے۔ یہ سارے فقرے ہماری زبانوں، ہمارے ذہنوں، ہماری گفتگوؤں میں کون ڈالتا ہے اور ایسا صرف پنجاب ہی میں کیوں ہوتا ہے؟ پھر ایسا کرنے کے بعد پنجاب ہی نفرت کا استعارہ کیوں بن جاتا ہے؟ یہ سوال مجھے اپنے بچپن سے 22 سال کی عمر تک جو میں نے اس خطے میں گزاری ہمیشہ پریشان کرتا رہا لیکن 24 سال بلوچستان میں گزارنے کے بعد اس سوال کا جواب دینا اتنا آسان تھا کہ جیسے فلسفے کی گتھیاں سلجھ گئی ہوں۔

6 مارچ 1980ء کو جب میں کونسل میں داخل ہوا تو 77ء کا آرمی ایکشن ختم ہوا کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ ضیاء الحق کا مارشل لاء تھا اور بلوچستان کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی جس پر پنجابی استعمار کے خلاف نعرے درج نہ ہوں۔ جس یونیورسٹی میں مجھے پڑھانا تھا وہ بھی ایسے ہی نعروں سے سرخ ہو رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں بھی لوگ سرکار سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے جتنی آرمی ایکشن کے دوران..... لیکن پھر 1983ء کے بلدیاتی ایکشن آگئے۔ کونسلر منتخب ہو گئے۔ ابھی تک لوگوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ ہمارے وسائل پنجابی لوٹ کر کھا رہے ہیں۔ ہم انہی کی لوٹ مار کی وجہ سے ہمسامہ ہیں لیکن جب انہوں نے اپنے کونسلروں، اپنے چیئرمینوں کو دھڑا دھڑا سکولوں، ڈسپنسریوں اور کمیونٹی سینٹروں کی عمارتیں بناتے، کمیشن کھاتے اور انہیں بغیر اسٹاف کے چھوڑتے، ان میں اپنے ذریعے بناتے دیکھا تو اب زبان پر لوٹ مار کرنے والوں کا نام بدلنے لگا۔ پنجابی کا کھوکھلا نعرہ اب یقین کے قابل نہ رہا۔

پھر 1985ء کے ایکشن آئے۔ اب عوامی نمائندوں کے حوالے سے بات ہونے لگی۔ کوئی کسی کو کرپٹ کہتا اور کوئی کسی اور کو۔ دیواروں سے پنجابی استعمار کے لفظ غائب ہو گئے اور پھر جب 1988ء کے ایکشن میں پارٹیاں میدان میں آئیں تو لوگ ایک دوسرے میں ایسے الجھے اور ان کی کارکردگی پر عوام کی نظر پڑی تو اب یہ قوم پرستوں کو مناتے تو قوم پرست ان کو۔ بس اب سارا نذر لہ مرکز کے خلاف تھا۔ لفظ پنجاب اب نفرت کی لعنت سے نکلنے لگا تھا۔ اگلے انتخابات تو حیرت سے پر تھے۔ وہ لوگ جو بلوچ قوم پرستی اور آزادی و حریت کے علمبردار تھے جب

آج یہ پرے لاہور کو اپنے آسیب میں لے چکا ہے۔ پہلے صرف ان گھرانوں کی چھتیں اس سے آباد ہوتی تھیں اب چھتیں بکتی ہیں۔ پچاس ہزار سے لے کر دس لاکھ روپے تک..... لیکن یہ چھتیں نہیں بکتیں اپنے ساتھ غیرت و حمیت اور شرم و حجاب کا بھی سودا کر دیتی ہیں۔

لیکن اس سودے میں گھانے کا ایک سودا بھی ہے جانوں کے گھانے کا سودا۔ 1995ء میں بسنت کے دن 6 افراد جان سے گئے اور دوسو شدید زخمی ہوئے۔ 1996ء میں 7 ہلاک ہوئے اور 250 زخمی، 1997ء میں 30 ہلاک اور 675 زخمی اور اب این۔ جی اوز اور ملی نیشنل کا دور آیا۔

آزادی اور لبرل ازم کا زمانہ آیا۔ بسنت کی دھوم خرابی اور منانے والوں کی سرپرستی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا آغاز 2000ء کی بسنت میں 8 جانوں کے ضیاع اور 718 لوگوں کے زخمی ہونے اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے ہوا۔ گزشتہ تین سالوں میں 42 لوگ ہلاک ہو چکے ہیں اور ہزاروں شدید زخمی۔

ان ہلاک ہونے والوں کی کہانیاں فہیم اور مبینہ شہادے سے مختلف نہیں تھیں۔ ایسے ہی جوانوں کی لاشیں بوڑھے والدین نے اٹھائیں اور ننھے بچوں کو چھوٹی چھوٹی قبریں کھود کر زمین کی آغوش میں دفن کیا کہ اب ماؤں کی آغوش کی گرمی ان تک پہنچ نہیں سکتی تھی..... لیکن یہ ساری لاشیں اور سارے دکھ ان لوگوں کو کہاں نظر آئیں گے جو بڑے بڑے ہوٹلوں کے برآمدوں میں بسنت کے دن نشے میں دھت نظر آتے ہیں۔

ہوٹل کا کرہ کئی گنا کرایہ دے کر لیتے اور اس دن داد عیش دینے کے لیے چاروں جانب سے لاہور پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ خون ان حسیناؤں کو کیسے نظر آ سکتا ہے جن کے پہناؤں، اداؤں اور رنگینیوں کو قید کرنے کے لیے کمرہ مین ان کے طواف کرتے نظر آتے ہیں اور اخباروں کے ایڈیشن ان کی تصویروں سے بھرے لوگوں کی ذہنی عیاشی کا باعث بنتے ہیں؟ ان معصوموں کی آہ و پکار سے ان ملی نیشنل کمپنیوں کو کیا سروکار جو صرف اپنا کاروبار چکانے کے لیے اسپانسر بنتی ہیں۔

صرف دوشروہ کی کمپنیاں ہر سال ایک کروڑ روپیہ اس تہوار پر خرچ کرتی ہیں۔ کوٹھیوں، حویلیوں، دالانوں، چھتوں، ہوٹلوں اور پارکوں میں رقص میں جھومتے ہجوم کو بلند آواز میں کسی بہن کا ماتم، کسی ماں کا نوحہ یا کسی باپ کی چیخ کیسے سنائی دے سکتی ہے۔

میں یہاں اس بحث میں کیا جاؤں۔ اس دکھ کے آغاز کی کہانی کیا بیان کروں کہ بسنت اصل میں گستاخ رسول حقیقت رائے دھری کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور منافرت پھیلانے کے جرم میں پھانسی کی سزا کے روز یعنی بسنت پنجمی کے دن پھانسی دی گئی تھی اور پھر اسی روز ہندوؤں اور سکھوں کے جتنے شہر میں پھیل گئے اور مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پھر اسی دن کی یاد میں حقیقت رائے دھری کے میلے پر اس کی سادھی جو آج بھی لاہور میں ہے اس پر ہندو اور سکھ بسنت پنجمی پر پتنگیں اڑا کرتے تھے۔

آج یہ سادھی تو دیران ہو چکی ہے اور لاہور میں شاید ہی کوئی اس طرف رخ کرتا ہو..... لیکن پورا لاہور حقیقت رائے دھری کی سادھی بن چکا ہے۔ وہ لاہور جو غازی علم دین جیسے عاشق رسول کی آخری آرام گاہ ہے وہاں گستاخ رسول کے شیدائیوں کے طریقے پر عمل ہوتا ہے کس اُمت کی امین یہ قوم اب کس بسنت سے محبت کرتی ہے۔

## سلگتی آگ کی زد میں کون؟

(08 محرم 1426ھ بمطابق 18 فروری 2005ء)

اونچے اونچے پہاڑوں، بلند بالائیوں اور دور تک پھیلے ریگستانوں کے درمیان آپ کو ایک لکیر نظر آئے گی جو اس علاقے کو تقسیم کرتی ہے۔ اس لکیر کی مشرقی جانب جہاں کہیں کوئی بلند مقام میسر تھا وہاں ایک پختہ مورچہ یا پھر مٹی اور گارے سے بنی ہوئی کوئی چوکی ضرور ہوگی۔ یہ لکیر بلوچستان کے بے آب و گیاہ خطے کو افغانستان سے جدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسے کونے سے شروع ہوتی ہے جہاں ایران، افغانستان اور پاکستان تینوں ایک ٹکون کی شکل میں ملتے ہیں۔ اس علاقے کو رباط کہتے ہیں جہاں آج بھی فتح کے نشان کے طور پر کیپٹن کا قلعہ موجود ہے۔ چاغی کے ریگستانوں اور پہاڑوں سے گزرتی یہ لکیر کونڈ، پشین، چمن اور ژوب سے ہوتی ہوئی پاکستان کے قبائلی علاقہ جات تک جا پہنچتی ہے۔ اس لکیر کے دونوں جانب ایک ہی طرح کی زبان بولنے والے اور ایک طرح کا لباس پہننے والے اس لکیر سے پہلے بھی اور بعد میں بھی یہ لوگ ایک دوسرے کی سہولتیں استعمال کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ہاں مزدوری کرنے جاتے ہیں۔ کنویں لکیر کے جس طرف بھی ہو لیکن دونوں جانب کے لوگ اسی سے پانی بھریں گے جہاں ہریالی اور کھیت ہیں وہاں دوسری جانب والے مزارع بن کر آئیں گے۔ خانہ بدوش تو کبھی بھی اس لکیر کی حیثیت سے آشنا نہیں رہے۔ قافلے ہرات سے چلتے اور بلوچستان، سندھ اور پنجاب سے ہوتے واپس کابل کے راستے کہیں اور جا آباد ہوتے۔ یہ لکیر جسے عرف عام میں سرحد کہا جاتا ہے برصغیر اور افغانستان کی حکومت کے درمیان انگریزوں کی پہلی افغان جنگ کے بعد قائم ہوئی اور پھر دوسری افغان جنگ کے نتیجے میں معاہدے کے بعد اس میں چند اور علاقے برصغیر میں شامل ہو گئے۔

انگریز نے کابل کے فرمانرواؤں کو ہمیشہ اپنے زیر اثر رکھنے کے لیے ان پر جنگیں مسلط کیں اور پھر ان پر شرائط عائد کیں کہ وہ اس زمانے کی روسی حکومت سے تعلقات نہیں رکھیں گے لیکن افغان حریت اور آزادی کے متوالے یہ پابندیاں توڑتے رہے اور بار بار جنگ کا سامنا کرتے رہے۔

یہ سرحد ہمیشہ بلوچستان کے ناراض لوگوں کے لیے پناہ اور کوچ کرنے کا راستہ رہی ہے۔ جب سے یہ سرحد وجود میں آئی جو کوئی اپنے گھر، قبیلے، شہر یا حکومت سے ناراض ہوتا دوسری طرف چلا جاتا۔ وہاں اسے رہنے کے لیے جگہ اور ذریعہ معاش میسر آ جاتا جس میں طاقت اور ہمت ہوتی اپنی جنگ وہاں بیٹھ کر جاری رکھتا اور جو کمزور ہوتا اسے حکومت کے گماشتے مجبور کرتے کہ وہ واپس آ جائے۔ کبھی افغانستان سرکار کے ذریعے کبھی اس کے عزیز واقارب کو یہاں تنگ کر کے۔

افغانستان سے لوٹے تو لوگوں نے ایک فرض ادا کرتے ہوئے ووٹ دیے۔ واضح اکثریت سے جیتے لیکن صرف دو سالوں میں یہ تماشا میں نے دیکھا۔ میں اسی ضلع میں ڈپٹی کمشنر تھا جہاں لوگ پاؤں کو ہاتھ لگا کر انہیں ووٹ دیتے تھے اور صرف دو سال بعد وہ ایسے شخص کے ہاتھوں ہار گئے جس کا بلوچ سیاست میں تذکرہ ہی چند سال پرانا تھا۔ ایک ریٹائرڈ ڈی آئی جی پولیس افسر۔ یہ سردار، نہ قوم پرست لیڈر، نہ قربانیوں کی داستان۔ بڑے بڑے زعماء جن کی زندگیاں اس شخص میں رچی ہوئی تھیں اس سارے سفر میں یوں محبتوں کی زبان بولتے تھے کہ آپ حیران ہو جائیں۔ جب ایک قوم پرست رہنما نے ایک پنجابی وزیراعظم کی گاڑی چلائی تو لوگ باتیں بنانے لگے لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتے۔ یہ تھا اس جمہوری عمل کا فیض، وہ بلوچستان جس کے درو دیوار پر پنجابی استعمار مردہ باد لکھا ہوتا تھا وہاں اب نعرے ہی بدل گئے تھے۔

ان بیس سالوں میں جو سفر رواں تھا اس میں اگرچہ شکوے شکایات اور رنجشیں تھیں لیکن نفرت نہیں تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ عام آدمی جب اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کو تبدیل کروانے جاتا تو عموماً ایک بات کہتا ہمیں کوئی نان لوکل یا پنجابی آفیسر دے دو۔ اپنے قبائلی آدمی سے ہم نہیں لڑ سکتے۔ 114 سال تک میرے علاقے میں ایک سڑک تھی جو مکمل طور پر بند پڑی تھی۔ یہ ایک استعارہ تھا انگریزوں سے لے کر پاکستانی فوج کے خلاف مزاحمت کا۔ اسے کھولنے اور دوبارہ تعمیر کرنے کا سوچنا ایسے ہی تھا جیسے آج گوادر پورٹ تعمیر کرنا.....

لیکن اس دور میں جب میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے یہ سڑک کھولنے گیا تو خود وہی مری میرے ساتھ تھی۔ یہ لوگ صرف ایک یا ڈیڑھ ارب کے ترقیاتی بجٹ پر قناعت کیے ہوئے تھے کہ اپنے اس بجٹ کی پلاننگ، اس کی سوچ، اس کے اختیار پر اپنے لوگ بیٹھے نظر آتے تھے۔ یہ ترقیاتی بجٹ پنجاب کے کسی بھی بڑے ضلع کے بجٹ سے کم تھا۔ میں اس خوشی میں تھا کہ اب شاید یہ پنجابی استعمار کے نعرے لوٹ کر نہ آئیں..... لیکن صرف ایک 12 اکتوبر نے ان دیواروں پر یہ سب نعرے واپس لکھوا دیے۔ حیرت کی بات ہے کہ جب تک پنجابی وزیراعظم رہا یہ نعرے نہیں لکھے گئے اور جب وہ چلا گیا تو ان نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ ٹھیک 24 سال بعد میں جب کونڈ سے لاہور واپس آ رہا تھا تو سڑکیں واپس اسی طرح نعروں سے سرخ تھیں۔ جیسے 1980 میں تھیں اور جب میں پنجاب کے شہروں میں لوگوں سے گفتگو کر رہا تھا تو زبان پر ویسے ہی جملے تھے جو 1971ء سے پہلے ہوتے تھے۔

یہ سب سرداروں کا گند ہے۔ وہ ترقی نہیں چاہتے ان کے باپ کی گیس ہے؟ یہ سب ایجنٹ ہیں۔ ابھی دیکھیں ان کو کیسے ٹھیک کیا جاتا ہے۔ شہر کے درو دیوار پر پراپرٹی مافیا کے گوادر کے اشتہارات ہیں اور ان سے پوچھو تو شاید انہیں علم تک نہ ہو کہ گوادر کے شہری کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ مکران میں صرف 3 کلومیٹر روڈ ہے۔ وہاں 25 کلومیٹر تک جا کر پانی لانا پڑتا ہے۔ بس وہ اس بات پر خوش ہیں۔ ہم وہاں جا کر ترقی لائیں گے۔ پلاٹ اور کالونیاں بنائیں گے۔ میں جو خود ایک پنجابی گھر، شہر اور صوبے میں پیدا ہوا، یہ باتیں سنتا ہوں تو ڈبڈباتی آنکھوں سے صرف ایک بات سوچتا ہوں۔ ہماری زبان پر یہ گفتگو کون دیتا ہے؟ کیا بلوچستان کے لوگوں سے نمائندگی کا حق ہم چھیٹتے ہیں؟ کیا ہم بھی راجن پور سے انک تک غریبوں کی بستیوں میں بھوک اور افلاس کا رقص نہیں دیکھتے، تو پھر ہم سے یہ نفرت کیوں؟ اور صرف ایک جواب ہے جب 1971ء میں ڈھا کہ کے گلے چڑھنے سے رنگین ہو رہے تھے ہم کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہم وہی حشرات سے پر فقرے بول رہے تھے۔ اگر ہم نے کبھی دکھ درد میں آنے والا زمانہ دیکھا ہوتا تو دوسروں کی گالی ہمارے مقدر میں نہ آتی۔



اور بارودی سرنگیں پھینا شروع ہوئیں۔ حکومت تو امریکا کا ساتھ دینے میں مصروف تھی اسے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ یہ سلکتی ہوئی آگ تو امریکا کے زیر سایہ موجود حکومت کے علاقوں سے سلگائی جا رہی ہے۔

گزشتہ دنوں جب ان معاملات کی شدت اور دھماکوں کی دھما چوڑی مچی تو عجیب و غریب اطلاعات سامنے آئیں جن سے اب بلوچستان کا ہر عقل و شعور رکھنے والا شخص آشنا ہو چکا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نوجوانوں کو لالچ دے کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ امریکا اب تیل سے مالا مال اس خطے کو آزاد کروانا چاہتا ہے۔ تو تم اس جنگ میں حصہ لو۔ سرحد پار کروا کر قندھار میں بھارت کے سفارت خانے میں لے جا کر ان کا افغان پاسپورٹ بنوایا جاتا ہے پھر کچھ عرصہ دوئی میں گزار کر تھائی لینڈ کے جزیروں پر تربیت دلوائی جاتی ہے۔ ایسے کئی نوجوان ہیں جن کے گھر والے ان کی کہانیاں آپ کو سنائیں گے اور یہ سب کچھ اس فوج کے زیر سایہ افغانستان میں ہو رہا ہے جس کے ہم نان نیو اتحادی ہیں اس بھارت کے تو فصل خانوں میں ہو رہا ہے جس کے رہنماؤں کو ہم سرحدوں پر پھول پہناتے نہیں تھکتے۔

یہ سب تو تصویر کا ایک رخ ہے دوسری جانب جو چند اور عناصر اس جلتی ہوئی آگ کو آگے بڑھانے کا پیش خیمہ ہیں وہ لگتا ہے اب اس آگ سے اپنا گھر بھی جلا بیٹھیں گے۔ گوادری کی بندرگاہ بننے کے بعد سب سے زیادہ معاشی دھچکا کا اندازہ ایران اور دبئی کے سرمایہ داروں کو تھا کیونکہ اس سے دبئی کی بندرگاہیں کمزور پڑ جائیں۔ شروع میں تو انہوں نے اس سارے معاملے میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے کوشش شروع کی اور اشارے بھی ملنے لگے۔ لیکن دوسری جانب مکار دشمن امریکا موجود تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلنا شروع کر دیے اور اب بلوچ علیحدگی پسندی کی تحریک صرف پاکستان ہی نہیں ایران کے بلوچستان کے علاقے سیتان میں آگے بڑھائی جا رہی ہے۔

یوں بیک وقت دو ملکوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن شروع میں ایران کے ارباب اختیار کو اس کا اندازہ ہی نہیں تھا مگر اب تو آگ نے ہوا پکڑ لی ہے لیکن شاید امت مسلمہ کے ان بانیوں کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں لگی ہوئی آگ تینوں ملکوں میں یوں پھیلے گی جیسے جنگ عظیم اول میں قوم پرستی کا زہر پھیلا آج تک تریاق میسر نہ آسکا۔



نوٹس میں میزنگلوں اور جمالیوں میں جھگڑا ہوا، بات حکومت اور عدالت جا پہنچی۔ فیصلہ پانی کی تقسیم پر تھا۔ مینگل سردار فیصلے سے ناراض ہوا اور وہیں جا بسا۔ پھر حالات ذرا بہتر ہوئے تو واپس آ گیا۔ نواب اکبر بگٹی کا بڑا بھائی عبدالرحمن بگٹی سرداری کے جھگڑے میں اپنے باپ سے لڑا۔ انگریز، باپ کی طرف داری پر تھا، کوئی راستہ یا جائے پناہ نہ تھی۔ افغانستان کوچ کر گیا۔

باپ کو خطرہ تھا کہ وہاں بیٹھ کر اس کے خلاف لوگوں کو منظم نہ کرے تو اس نے انگریز سرکار سے درخواست کی کہ اسے لالچ دے کر واپس لائے۔ کوشش کامیاب ہوئی اور وہ انگریز سرکار میں تحصیل دار بنا دیا گیا۔ نواب خیر بخش مری کا باپ انگریزوں سے ناراض ہوا۔ اچانک ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے لڑ کر نکلے اور افغانستان جا بسا۔ انگریز طاقتور تھے بس نہیں چلتا تھا کچھ دیر رہا اور واپس آ گیا۔

پاکستان بن گیا لیکن اس سرحد کا چال چلن ویسا ہی رہا بلکہ اب پناہ دینے والے اپنی طاقت اور قوت کے مطابق مدد بھی دینے لگے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سرحد مدتوں اس حد تک غیر مستحکم رہی کہ اس کو اپنے یا سپر برجیاں لگانے کا کام 125 سال تک نہ انگریز کر سکا اور نہ ہی پاکستانی حکومت۔ بس ایک دفعہ لگائی گئی لیکن برجیاں جوں کی توں رہیں۔ کبھی بلوچستان میں 1973ء کی فوجی کارروائی ہوئی اور یہ علاقہ بے امن ہو گیا اور پھر افغانستان میں روس کی جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے لیکن ان سارے عرصوں میں حکومت کے محافظوں، چوروں، ڈاکوؤں، قبیلوں میں لڑائی کرنے والوں سب کو بھاگ کر پناہ وہیں ملتی۔

130 سالہ تاریخ میں صرف 5 سال ایسے ہیں جب اس سرحد سے بھگڑوں، ڈاکوؤں، چوروں اور حکومت سے لڑنے والوں کو پناہ نہ مل سکی۔ یہ دور طالبان کی حکومت کا دور تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب 125 سال بعد سروے آف پاکستان کی ٹیم میں یہ جرات پیدا ہوئی کہ اس سرحد کی از سر نو پیمائش کر کے یہاں برجیاں لگائی جائیں اور نقشہ میں نئی آبادیوں کی نشان دہی کی جائے۔ یہی وہ دور تھا کہ وہ سارے لوگ جو اپنے اپنے مقاصد میں ناراض ہو کر گئے تھے، یہاں سے دشمنیوں کے خوف سے جا چھپنے سے واپس آ گئے۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خون کر کے، گاڑی چوری کر کے، اپنے قبیلے سے لڑ کے وہاں جا چھپے گا۔ پورے ماحول پر ایک مردنی طاری تھی، حقوق کی جنگ کیسے لڑیں گے؟ کوئی تو ساتھ دینے والا ہو۔ ایک خاموشی کا سماں تھا جو پورے بلوچستان پر محیط تھا۔ یہی وہ دور تھا جب قوم پرست رہنماؤں کے بیٹے اعلیٰ وزارتوں کے سنگھاسن پر بیٹھے تھے۔ سردار عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری اور نواب اکبر بگٹی اور میر غوث بخش کے بیٹے پاکستان کے وفاق کی ایک اکائی کی حفاظت میں سرگرداں تھے کہ اب ان کی صفوں میں نعرے لگا کر بھاگنے والے کے بیٹے کے لیے جائے پناہ نہیں تھی۔

پھر اس دنیا کے نقشے پر گیارہ ستمبر آیا۔ یوں تو اس کے نتیجے میں افغانستان میں طالبان کی حکومت گری۔۔۔۔۔ لیکن پاکستان کے مستقبل اور تحفظ کی وہ فیصل گر گئی اور یہ سرحد واپس اسی طرح کھل کر صحن بن گئی جس میں راستے ہی راستے تھے۔۔۔۔۔ لیکن اب دوسری جانب صرف افغانستان ہی نہیں تھا بلکہ بھارت کے سفارت خانے اور قونصل خانے ان ناراض لوگوں کو پناہ تربیت اور تھیاردینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ جب کئی سالوں کے بعد بلوچستان کے مخصوص علاقوں میں راکٹوں کے حملے بم دھماکے

پولیس کے سابق سربراہ کو ہاں کا گورنر مقرر کیا۔ 12 اکتوبر کو ہی بدعنوانی ختم کرنے کا آرڈی نینس جاری ہوا اور اس شام شیخ مجیب الرحمن، ابوالمنصور احمد، سیکرٹری صنعت حمید الحق چوہدری، امین الاسلام چوہدری اور عبدالجبار کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی سب تو ضمانتوں اور ضمانتوں پر رہا ہو گئے لیکن شیخ مجیب الرحمن پر مقدمات درمقدمات بننے گئے اور پھر طاقت کے بھاری پتھر کی زد میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ سہروردی گرفتار ہوئے، الزام لگا علیحدگی کی تحریک کو ہوا دیتے ہیں۔ جو بھی کہتا یہ طریق کار ٹھیک نہیں ہے، ایسے مسئلے حل نہیں ہوتے وہ اسی بہیمانہ طاقت کا نشانہ بن جاتا۔ لوگ کچھ چیخنے لیکن بات یہی کی جاتی یہ سب ملک کی معاشی ترقی کا پیہرہ روکنے والے ہیں، انہیں وطن سے محبت نہیں، یہ سب علیحدگی پسند ہیں۔ الیکشن ہارا گیا تو بے چارے بنگالی مزید غداری کی زد میں آ گئے کہ یہ لوگ فاطمہ جناح کو ووٹ دے کر پاکستان سے محبت نہ کرنے کی گواہی دے چکے ہیں۔

پھر جب طاقت سے غربت، افلاس اور احساس محرومی کی کھیاں اڑانے والا کمزور بڑ گیا تو ایک اور وطن کی محبت کا حلف بردار آ گیا اور جب میرے وطن کے چہرے پر بھاری پتھر پھینکا جا رہا تھا تو میں اس شخص کی تقریریں سن رہا تھا، ملک سے محبت اور اس کی قسمت بدلنے کے دعوؤں سے بھری ہوئی۔ وہ عین حالت جنگ میں جب طاقت کے پتھر کے زد میں آئی ہوئی بنگالی قوم اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کی کوشش میں مصروف تھی غیر ملکی نمائندوں کو انٹرویو دیتے ہوئے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بار بار یہی کہہ رہا تھا یہ سب طاقت کی زبان جانتے ہیں۔

یہ صرف چند لوگ ہیں، ہم نے ان کو مغربی پاکستان کے برابر لانے کی کوشش کی لیکن یہ اس ترقی کے پیسے کو ذاتی مفاد پر قربان کرنا چاہتے ہیں۔ میں ایک ہی سپاہی ہوں اور آخر وقت تک ان سے لڑوں گا اور پھر اس بھاری پتھر کی زد میں وہ حصہ اس طرح کچلا گیا کہ اس نے اپنے لیے علیحدہ ہو جانے ہی میں عافیت سمجھی کہ کہیں طاقت کا زہر اس کی مکمل موت نہ بن جائے۔

یہ صرف بدن کے ایک حصے کی روداد ہے جو آج ہمارے ساتھ نہیں..... لیکن ہم سے محبت کرنے والے ہماری وفاداری، ہم سے عہد پاسداری جتانے والے آج بھی ویسے ہی دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک پر بدعنوانی، کرپشن، استحصال، غربت، افلاس اور بے روزگاری کی کھیاں منڈلا رہی ہیں لیکن کوئی نہیں سمجھتا کہ کھیاں چہرے سے ہٹانا ہوں تو پہلے ایک بڑا مورچہ بنایا جاتا ہے، اس کو زور سے یا آہستہ سے منہ پر چلایا جاتا ہے تاکہ وہ دور ہو جائیں۔ پھر کھیاں کے منڈلانے کی وجہ کو چہرے سے صاف کیا جاتا ہے جب چہرہ صاف ہو جائے تو پھر کھیاں وہاں نہیں آتیں کوئی اور جگہ تلاش کر لیتی ہیں مگر کیا کیا جائے طاقت کی سرشت ہی اور ہے اس نے ہمیشہ پتھر ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہوتا ہے۔

ریچھہ کو مورچہ بنانا کون سکھائے؟ منہ سے شہد کو صاف کرنے کا طریقہ کون بتائے؟ وہ تو دوست ہے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اسے پریشان ہوتے دیکھ نہیں سکتا بس پتھر اٹھاتا ہے اور اس کے منہ پر پتھر دیتا ہے پھر بعد میں بیٹھا رو رہا ہوتا ہے۔

## پتھر نہیں مورچہ

(15 محرم 1426ھ بمطابق 25 فروری 2005ء)

کہانی بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ شہر میں رہنے والے ایک شخص کی جنگل کے ایک ریچھ کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ پرسکون دور تھا، نہ شہروں میں ایسی بالچل تھی اور نہ ہی انسان جنگلوں کو کاٹ کر جانوروں کو بے دخل کر رہے تھے۔ ریچھ کبھی کبھی شہر کی طرف آنکلتا تو مانوس ماحول پا کر اپنے دوست کے پاس بھی آ جاتا۔ دوست جی جان سے اس کی خدمت کرتا، انواع اقسام کی خوراک اسے مہیا کرتا اور ریچھ اچھلتا کودتا، خوشی و خرم جنگل کی طرف لوٹ جاتا..... لیکن جانے سے پہلے وہ اس شخص کو جنگل آنے کی دعوت ضرور دیتا۔

ایک دن اس شخص نے جنگل جا کر ریچھ کی دعوت کھانے کی راہ لی، ریچھ اسے جنگل میں دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے اس دوست کی کیا خدمت کرے، اس نے جنگل میں موجود طرح طرح کے پھل اس کے سامنے حاضر کیے، درختوں پر چڑھ کر شہد کی مکھیوں کے چھتے توڑ کر اکٹھے کیے اور شہد نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔ شہد لذیذ تھا اور میٹھا بھی۔

اس شخص نے بہت زیادہ شہد کھا لیا اور پھر کھاتے ہی اسے نیند آ گئی۔ شہد چونکہ اس شخص کے ہونٹوں، مونچھوں اور ہاتھوں پر لگا ہوا تھا اس لیے جلد ہی اس پر کھیاں آ کر بھنھناتے لگیں۔ آدمی کی نیند خراب ہو رہی تھی وہ ہاتھ سے کھیاں ہٹاتا لیکن وہ آ بیٹھتے۔ ریچھ بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے کھیاں دور کرتا لیکن کھیاں کو ہٹانا آسان کام نہ تھا۔ ریچھ کو تو ایسی الجھن کا کبھی سامنا ہی نہیں کرنا پڑا تھا۔ کچھ دیر وہ یہ سب کرتا رہا لیکن زندگی بھر اس نے ہر مسئلے کا حل صرف طاقت سے کیا تھا۔ یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

کھیاں تھیں کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں، وہ اٹھا، اوپر پہاڑ پر گیا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر لے آیا اور پھر چند لمحے انتظار کیا جب بہت ساری کھیاں چہرے پر اکٹھی ہوئیں تو زور سے پتھر ان پر دے مارا۔ کھیاں تو بہت ساری مر گئیں لیکن ساتھ ہی اس کا دوست بھی جس سے وہ محبت کرتا تھا اس کی نادانی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

بچپن میں سنی ہوئی یہ کہانی مجھے بار بار یاد آتی ہے جب بھی میں اپنے ملک اور اس سے وفاداری، محبت اور اس کی حب الوطنی کا دعویٰ کرنے والوں کی تاریخ کے صفحات التما ہوں۔ میں نے کبھی ان کی محبت، وفاداری اور قومی مفاد پر قربان ہونے کی آرزو پر شک نہیں کیا..... مگر یہ نہیں کیوں بچپن میں تیس سال میں ہم نے کھیاں تو شاید کم ماری ہیں لیکن وطن کے چہرے کو طاقت کے پتھر مار مار کر زخمی ضرور کیا ہے۔

17 اکتوبر 1958ء کو ہم سے محبت کا دعویٰ کرنے والا ایسا ہی شخص آیا۔ 12 اکتوبر کو اس نے مشرقی پاکستان کی

چھ ماہ کے اندر یہ لوگ اپنی جمع پونجی ختم کر کے واپس ہجرت کے سفر پر روانہ ہو گئے، کوئی ایک ماہ بعد اور کوئی دو ماہ بعد۔ ادھر افغانستان میں موجود ان لوگوں کی حالت عجیب ہے جو اس امید پر اپنے وطن لوٹے تھے کہ شاید وہاں خوشحالی اور عزت و آبرو سے زندگی گزار سکیں گے۔

جو لوگ وہاں جا کر آباد ہونے کی کوشش میں تھے ان کی حالت عجیب و غریب تھی۔ قندھار کے جنوب میں میلوں پھیلے مٹی سے بنے اور خیموں سے تھے گھر ہیں جس میں یہ مہاجرین آباد ہیں۔ ان کیمپوں میں غربت و افلاس کا راج ہے۔ ان مہاجرین کے ساتھ وہ ہزار خانہ بدوش اور کوچی بھی آ کر آباد ہو گئے ہیں کہ جن کا رزق امریکی بمباری، ان کی خانہ تلاشی اور روز روز کی پکڑ دھکڑنے ختم کر دیا ہے۔ یہ لوگ وہاں سے آہستہ آہستہ نکل کر پاکستان میں چین کے بارڈر کے قریب اسپین بولدک میں آباد ہوتے ہیں۔

کچھ دیر دوسری طرف جانے کی کوشش کرتے اور پھر ایک دن موقع پا کر اپنی ”جنت ارضی“ کو جواب ”جہنم“ بن چکی ہے چھوڑ آتے ہیں۔ قندھار کے اس بے آسرا کیمپ اور غربت و افلاس اور بیماری سے مجبور مخلوق کے درمیان قندھار شہر میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو وہاں کے گورنر کی کہانیاں سناتا ہے۔ ایئر پورٹ کے ارد گرد آباد نائٹ کلب جنسی حیوانیت کی آماجگاہ ہے۔ دنیا بھر کی عریاں اور فحش ویڈیو کیسٹیں وہاں اسمگل کر دی گئی ہیں۔

یہی حال ہرات کا ہے جہاں ایک مقام پر ایسے دو لاکھ افراد آباد ہیں جن کا نہ کوئی گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ انہیں لالچ سے یہاں لایا گیا۔ انہیں اقوام متحدہ جو روٹی مہیا کرتی ہے اس سے صرف ایک وقت کا گزارا ہو سکتا ہے اور پھر پورا دن بھوک کی اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

یہ سب بد حالی ان مہاجرین تک محدود نہیں جو پاکستان سے واپس لوٹے بلکہ اب تو ان کیمپوں میں ہر وہ افغان شامل ہوتا جا رہا ہے جس کا کھیت تباہ، کاروبار برباد اور روزگار ختم ہو چکا ہے۔ بس چند شہروں کی زندگی میں وہ ماحول بنا دیا گیا ہے جہاں افغان سپاہیوں اور امریکی فوجیوں کی سرکردگی میں فاشی کے اڈے بھی چلتے ہیں اور شراب خانے بھی، ڈانس کلب بھی ہیں اور مخلوط تعلیم بھی اور پھر دنیا بھر کے میڈیا کو بلا کر دکھایا جاتا ہے کہ ہم یہاں انقلاب لے آئے ہیں۔

دوسری جانب اگر غیر ملکی صحافیوں کا کوئی گروہ کسی جگہ پہنچ جائے اور اسے صحیح حالات معلوم ہو جائیں تو پورے کے پورے جہاز کو برفانی طوفان کا نام دے کر گرگرا دیا جاتا ہے۔ چار دن تک یہ اطلاعات گردش کرتی ہیں کہ وہاں لوگ پہنچ نہیں سکتے، لیکن دنیا وہاں امریکی سپاہیوں کی سیٹلائٹ تصویروں دکھا دیتی ہے کہ جو برف میں جہاز کا بلیک باکس اٹھوٹھ رہے ہیں تاکہ تمام ثبوت ضائع کر دے۔

مجھے یہاں افغانستان کی بربادی، وہاں دنیا کی سب سے زیادہ پوسٹ کی کاشت اور انسانوں پر ظلم کی داستان نہیں سنائی۔ مجھے تو آج سے آٹھ سال پہلے کا وہ شخص نور محمد یاد آ رہا ہے جو نوشکی میں موٹر سیکلنگ تھا، اس کا بہت بڑا گیراج تھا..... پھر ایک دن اچانک میرے دفتر آیا اور کہا کہ میں نے سامان باندھ لیا ہے مجھے واپس افغانستان جانے کی راہداری دے دو۔ میں نے کہا تم نے اتنا بڑا کاروبار یہاں بنایا ہے وہاں جا کر کیا کرو گے؟

کہا: ”وہاں میری زمینیں ہیں انہیں آباد کروں گا۔“

میں نے پوچھا: ”کیوں؟“

## دنوں کے پھیرنے والا

(22 محرم 1426ھ بمطابق 04 مارچ 2005ء)

”ہمارے لیے اب وہاں کچھ نہیں، نہ کھانے کو روٹی ہے نہ سر چھپانے کو مکان اور نہ ہی مزدوری کرنے کے لیے کوئی کاروبار، نہ ہم ان کے رنگ میں رنگ سکتے ہیں اور نہ ہی غیرت وحیثیت سے جی سکتے ہیں۔“

یہ عجیب اور حیرت میں ڈوبے ہوئے لفظ اس ایک افغان نوجوان محمد قاسم کے ہیں کہ جسے امریکی حکومت آنے کے بعد پاکستان کی حکومت کے ادارے SAFRON اور اقوام متحدہ کے مہاجرین کی آبادی کے ادارے UNHCR نے طرح طرح کے لالچ دے کر واپس اپنے وطن بھیجا تھا۔ محمد قاسم تو وہ ہجرت آ سنا نوجوان تھا جس نے 15 سال کی عمر میں افغانستان چھوڑا تھا، وہ اس وقت ایک سکول میں پڑھتا تھا کہ اچانک روسی فوج آ گئی اور انہوں نے اس کے اسکول کو بند کر دیا۔

روسی یہ سمجھتے تھے کہ اسکولوں میں وہ اسلامی روحانی تعلیم دی جاتی ہے جس سے یہ بچے بڑے ہو کر مجاہدین بن جاتے ہیں۔ وہ مجاہدین کو اپنی زبان میں ”اشرار“ کہتے تھے۔ اسکول بند ہوا تو اس کے والدین نے اسے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان روانہ کر دیا۔ وہ شہروں شہروں گھومتا کراچی آ گیا اور سر جانی ٹاؤن کی مہاجر بستی میں آباد ہو گیا۔ اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور بنوری ٹاؤن کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہوا اور ڈگری حاصل کی۔ اس دوران وہاں طالبان کی حکومت آئی لیکن وہ اپنی تعلیم میں مصروف تھا۔ وہ اپنے ملک کا یہ پر امن دور نہ دیکھ سکا..... اور وہاں امریکی آ گئے۔

حکومت پاکستان اور اقوام متحدہ کے لوگ آئے، اسے اور بہت سے دوسرے مہاجرین کو ٹرکوں پر سوار کیا اور سبز باغ دکھاتے ہوئے افغانستان بھیج دیا۔ محمد قاسم کو اس کی تعلیم کے مطابق ایک اسکول ٹیچر کی نوکری دی گئی..... لیکن جب وہ اسکول میں داخل ہوا تو اسے باہر روک دیا گیا بس ایک ہی مطالبہ تھا: ”جاؤ! سوٹ اور ٹائی لگا کر آؤ۔“ وہ وہیں سے لوٹ آیا۔

اس نے بہت سی نوکریاں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی ڈاڑھی اور اس کا حلیہ اس کے آڑے آیا اور اسے انکار ہو گیا۔ محمد قاسم نے کہا کہ میں نے سوال کیا: ”کیا جمہوریت میں آدمی اپنی ماضی کا لباس اور مرضی کی تراش خراش بھی نہیں رکھ سکتا۔“ اس کی جمع پونجی ختم ہو گئی اور وہ واپس پاکستان لوٹ آیا جہاں اس نے ایک چھوٹے سے کاروباری ادارے میں میجر کی نوکری حاصل کی اور عزت و آبرو سے جی رہا ہے۔

افغانستان سے واپس لوٹنے والوں کی یہ صرف ایک کہانی نہیں ہر شخص ایک نئی پیتا اور نیا دکھ لے کر لوٹا ہے۔ گزشتہ سالوں میں ہزاروں افغانوں کو ٹرکوں پر لا کر کٹی وی کے کیمروں کے سامنے افغانستان روانہ کیا گیا اور پھر صرف

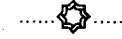
کہا: ”میرے ملک میں امن ہو گیا، طالبان آگئے ہیں، سب چین کی نیند سوتے ہیں۔ مجھے اپنا وطن اور امن چاہیے، دولت اور بے سکونی نہیں۔“

پھر وہ چلا گیا۔ کبھی کبھی آتا تو میں اس سے سوال کرتا: ”تمہارا ملک کیسا ہے؟“

اس کا ایک جواب ہوتا: ”الحمد للہ! پھر ہاتھ اٹھاتا اور کہتا: ”اللہ تعالیٰ تمہارے ملک کو بھی ایسا ہی امن نصیب کر دے۔ یہ ہماری پناہ گاہ رہا ہے، اللہ اسے بھی پر امن کرے۔“

میں جب محمد قاسم کی داستان پڑھ رہا تھا تو سوچ رہا تھا یہ نہیں آج نور محمد کس حال میں ہوگا؟ اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہوں گے تو شاید آنسوؤں کی جھری اس کی ڈاڑھی بھگودیتی ہو۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے؟ شاید یہیں کہیں یا پھر وہاں کسی مہاجریمپ میں۔

کاش! کوئی اس کو بتائے کہ دعا کرتے رہو۔ میرا رب دنوں کو پھیرنے والا ہے۔ شاید کسی کے بہتے آنسو سے پسند آجائیں۔



## اسرائیل سے نفرت قابل معافی نہیں

(29 محرم 1426ھ بمطابق 11 مارچ 2005ء)

یہ وہی ایران ہے جس پر آج سے 26 سال قبل تک ایک ایسے شخص کی حکومت تھی جو امریکا کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ وہ اس پورے خطے میں امریکا کا چوکیدار سمجھتا جاتا تھا۔ اس کی طاقتور فوج اور امریکی سی آئی اے کی تربیت یافتہ خفیہ ایجنسی ساوک اپنے ظلم اور دہشت گردی کی وجہ سے پورے خطے میں بدنام تھی۔ اس زمانے میں ایران دنیا بھر میں تیل برآمد کرنے والے ممالک کے دوسرے نمبر پر تھا۔

وہ تیل سے بجلی پیدا کرتا تھا لیکن شاہ ایران نے امریکا کے سامنے ایٹمی توانائی سے بجلی پیدا کرنے کے پروگرام کا اظہار کیا۔ شاہ منظور نظر تھا اس لیے امریکا نے ایران کے ساتھ ایک تکنیکی معاہدہ کیا اور پورے ایران میں ایٹمی توانائی سی چلنے والے 23 بجلی گھروں کے پلان کی منظوری دے دی گئی۔ یہ 23 بجلی گھر 1994ء میں مکمل ہونے تھے جس کے بعد ایران کی توانائی کی تمام ضروریات مکمل ہو جاتیں اور اسے اپنی معاشی ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی۔

پھر وقت نے پلٹا کھایا۔ امریکا کا چہیتا شاہ ایران مہر آباد انیر پورٹ سے آنسو بہاتا رخصت ہوا اور وہ لوگ برسر اقتدار آگئے جو امریکا اور اس کے سب سے اہم اتحادی اسرائیل پر دشنام و لعنت بھیجتے تھے۔

ان کی دیواروں پر، جلسوں میں، خطبوں میں دونوں طرف سے ضرور گونجتے: ”مرگ بر امریکا، مرگ بر اسرائیل۔“ حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکی حکومت میں بیٹھے ہوئے صاحبان اقتدار کو امریکہ کا جھنڈا جلانے سے، اسے گالی دینے سے، اس کے خلاف جلوس نکالنے سے کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں امریکی پرچم نہ جلایا گیا۔

اس کے صدور کے پتلے بنا کر نہ جلائے گئے ہوں اور اسے گالی نہ دی گئی ہو۔ برازیل سے لے کر کیوبا تک، لندن سے لے کر بلغراد تک اور فلپائن سے لے کر پاکستان تک دنیا کے ہر خطے میں امریکا لعنت، گالی اور نفرت کی علامت قرار پاتا رہا ہے مگر امریکی اس سب نفرت کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں لیکن اس قوم کو کبھی معاف نہیں کرتے جو اسرائیل کے خلاف نعرہ بلند کرتی ہے، اسے دنیا کا دہشت گرد ملک تصور کرتی ہے، اس کے خلاف اپنی جنگ کا اعلان کرتی ہے۔

امریکی ”Neocons“ جو کہ ایک ایسا گروہ ہے جس میں نوے فیصد یہودی ہیں اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح ہر دور میں امریکا کے اقتدار پر اثر انداز رہے ہیں اور گزشتہ چار سال سے ان کا غلبہ تاریخی ہے۔ ان کے مطابق صدام حسین کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ ان فلسطینی خاندانوں کی مالی امداد کرتا تھا جن کے جوان اسرائیل سے جنگ میں شہید ہو جاتے تھے۔ اسامہ بن لادن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک ایسے فرمان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عملدرآمد



## امریکا کا زوال

امریکی میڈیا کی نظر میں

(06 صفر 1426ھ بمطابق 18 مارچ 2005ء)

یہ ملک کچھ حکمرانوں کا آقا، کچھ افراد کے خوابوں کی جنت، کچھ آزاد خیال، روشن خیال اور بزم خود اعتدال پسندوں کی نظر میں ایک ایسا مثالی ملک ہے جس میں زندگی کی تمام رعنائیاں، خوبصورتیاں، مال و دولت کی کثرت، انسان کی زندگیوں کا تحفظ اور معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور حکومتی سطح پر امن و امان، سکون، اطمینان اور چین ہے۔ یہ وہ سراب ہے جس کی جھلک کے دیوانے پاسپورٹ لیے قطاروں میں کھڑے ویزوں کی بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔

ملکوں ملکوں غیر قانونی گھومتے ہیں اور اس ملک میں اترنے اور یہاں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکا میں رہنے، وہاں زندگی بسر کرنے، ویسی اقدار اپنانے کا خواب صرف ہم غریب ممالک کے افراد ہی نہیں دیکھتے بلکہ یورپ کے اکثر ممالک کے درمیانے طبقے کے لوگ بھی اس دلس میں جانسنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

کیا یہ سرزمین اتنی ہی دلکش اور خوبصورت ہے؟ کیا اس کے رہنے والے اتنے ہی پرسکون اور پریشانیوں سے آزاد ہیں؟ کیا ان کی حکومت ان کی دیکھ بھال اور ان کے دکھ سکھ کی پروا کرتی ہے؟ ان کا اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور خاندانی حال کیسا ہے؟ ترقی پذیر ہے یا زوال پذیر ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جو امریکا کو جنت ارضی سمجھنے والے شاید پوچھنا نہیں چاہتے یا پھر باہر کی دنیا میں، میڈیا میں، ٹیلی ویژن کی فلموں میں امریکا کو اتنا حسین اور دلربا بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ کوئی ان کے جوابات پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔ شاید انہیں علم نہیں کہ جس امریکا کو وہ آج دنیا کی سب سے بڑی عالمی طاقت سمجھتے ہیں وہ معاشی طور پر اس قدر نازک بنیادوں پر کھڑا ہے کہ اسے ہر روز اپنے معاملات چلانے کے لیے دو بلین ڈالر قرض لینا پڑتا ہے۔

شاید کوئی اس قسم کے اعداد و شمار پر یقین نہ کرے کہ یہ امریکا سے باہر کے کسی شخص نے تحریر کیے ہیں، لیکن آئیے! میں آپ کو ان اعداد و شمار کی دنیا میں لے جاتا ہوں جو روزانہ امریکی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں، ٹیلی ویژن پر دکھائے جاتے ہیں اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ایسے ملک کو آپ کیسا تصور کریں گے؟ یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو صرف امریکا میں اخبارات شائع کرتے ہیں، انہیں امریکا سے باہر نہیں جانے دیا جاتا آئیے! اخباروں اور رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہیں۔

12 دسمبر 2004ء کو نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ امریکا دنیا بھر میں شرح تعلیم کے لحاظ سے 49 ویں نمبر پر ہے، یعنی دنیا کے 48 ملک ایسے ہیں جہاں کے لوگ اس سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ وہ حیران کن انکشاف کرتا ہے امریکا

کرنے کا قصد اور ارادہ لے کر اٹھا ہے جس کے مطابق یہودیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکالنے کا حکم ہے۔ یوں مرگ بر اسرائیل کہنے والا ایران کیسے بچتا اور پھر ان لوگوں کے دور حکومت میں جن کا ایک نعرہ ہے کہ امریکا سیکورٹی امریکا کا بنیادی المیہ ہے۔ ایران کو وہ دھمکیاں ملنا شروع ہوئیں اور پھر دوسری بار اقتدار میں آنے سے تین دن قبل جارج بش نے کہا ہم ایران پر طاقت کا استعمال کر سکتے ہیں "Neocons" کے اصل سربراہ نائب صدر ڈک چینی نے تو بات کھول دی۔

دوسری بار انٹرویو لینے والے ڈون اسس بے کہا: "اسرائیل سب سے پہلے ایران پر طاقت کا استعمال کرے گا اور پھر باقی دنیا بے شک بین الاقوامی مذاکرات کا گندہ سمیٹتی پھرے۔" یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اسرائیل نے تین آبدوزیں خرید لیں جن سے ایران پر میزائل داغ کر اس کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کر دیا جائے گا۔

اگر ایران نے پوری دنیا کے سامنے اپنا معاملہ رکھ دیا ہے۔ جس ایران کو آج کہا جا رہا ہے کہ تم ایٹمی بجلی گھر نہ بناؤ اسے 25 سال پہلے 23 بجلی گھر بنانے کے لیے مدد فراہم کی گئی تھی۔ اس وقت وہ دوسرا براہ تیل پیدا کرنے والا ملک تھا اور آج پانچویں نمبر پر ہے۔ ایران چالیس لاکھ بیرل تیل روزانہ بیس سے چالیس فیصد اپنے ہاں خرچ کرتا ہے اس کے باوجود بھی اسے توانائی ضروریات پوری کرنے کے لیے کئی کروڑ ڈالر کی گیسولین باہر سے درآمد کرنا پڑتی ہے۔ یوں تیل سے حاصل کی گئی آمدن بھی بجلی بنانے پر خرچ ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ایران کی گیس کے ذخائر کا تعلق ہے وہ اس قدر قیمتی ہیں کہ جن سے کھاد اور دیگر کیمیائی مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ انہیں اگر بجلی پیدا کرنے پر لگایا جائے تو یہ نوٹ چلانے کے مترادف ہوگا۔ جس رفتار سے ایران میں صنعتی ترقی ہو رہی ہے اسے 2020ء تک 70 میگا واٹ بجلی کی ضرورت ہوگی جب کہ اب وہ 31 میگا واٹ پیدا کر رہا ہے اور اتنی بجلی نہ تیل نہ گیس اور نہ پانی سے ایران میں پیدا کی جاسکتی ہے۔

ایران نے اپنے دلائل میں یہ بھی کہا ہے کہ پوری دنیا ماحولیات کی رٹ لگائے پھرتی ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ایٹمی توانائی ماحول پر سب سے کم اثر ڈالتی ہے جب کہ تیل اور گیس ماحول پر برے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایران نے کہا کہ ہم اپنی قوم کے 12 بلین ڈالر خرچ کر کے ایٹمی بجلی گھر بنا ہی لیتے ہیں لیکن پھر بھی ہم اس کا ایندھن خریدنے کی طرف جائیں۔

مگر قصور تو اور ہے۔ یورپ کا ہر ملک ایٹمی بجلی گھر بنا کر سستی بجلی حاصل کر رہا ہے لیکن اسرائیل کو گالی نہیں دیتا۔ اس لیے وہاں سے کوئی خطرہ نہیں۔ بہانے بنائے جا رہے ہیں۔ تم بلیک مارکیٹ سے خرید لو گے۔ قدیر خان کا میٹ ورک آج بھی چل رہا ہے۔ تم لوگ اصل میں بہانے بنا رہے ہوں۔

تمہارا اصل مقصد ہم بنا کر اسرائیل کو تباہ کرنا ہے یہ سارے دلائل اگر دنیا کا کوئی بھی ملک امریکا اور یورپ کے سامنے لے کر جاتا تو اسے ایٹمی بجلی گھر حاصل کرنے میں مدد بھی ملتی مگر کیا کیا جائے یہودیت کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ امریکا کے سر میں ایران کو اسرائیل دشمنی کی سزا دینے کا سودا سما چکا ہے۔

وقت تجارتی خسارے میں ہے اور برازیل ہر سال 30 بلین ڈالر تجارتی نفع کماتا ہے۔ ایک زرعی پیداوار والا ملک امریکا گزشتہ سال اپنی لیے خوراک کی درآمد پر مجبور ہو گیا۔

اب ذرا اخلاقی حالت کو دیکھیے اسی این این کے دس نمبر 2004ء کے پروگرام کے مطابق امریکا میں 33 فیصد بچے ہر سال ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور 50 فیصد بچے طلاق یافتہ ماؤں کے پاس پلتے ہیں۔ یورپین ڈریم کے صفحہ 25 کے مطابق امریکا اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ جوئے پر خرچ کرنے والا ملک بن چکا ہے۔ یو ایس ٹو ڈے۔ (US Today) کی اشاعت 21 دسمبر 2004ء کے مطابق 2004 میں نو لاکھ بچوں اور بچیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ بالکل تازہ اعداد و شمار ہیں۔ زوال کا یہ سفر ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ 1950ء میں 75 فیصد لوگ مذہب پر یقین رکھتے تھے۔ 1990ء میں پچاس فیصد رہ گئے۔۔۔۔۔ آج کا امریکا جہاں اخلاقی انحطاط، معاشرتی زوال اور خاندانی توڑ پھوڑ کی علامت ہے وہاں شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کی معاشی بنیادوں کو گھن لگ چکا ہے۔ بس چند آندھیاں اور جھکڑ چلنے کی دیر ہے کہ عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی۔ آج سے بیس سال پہلے کسی کو یہ گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ روس جیسی طاقت کا یہ انجام ہوگا۔۔۔۔۔ مگر طاقت، عزت، خوشی اور غنی کو عطا کرنے والا واحد، قہار و جبار اللہ ڈھیل تو دیتا ہے لیکن پھر فرماتا ہے: ”اور تیرے رب کی پکڑ بہت شدید ہے۔“

سوچتا ہوں جب اس پکڑ کی زد میں آج کے روشن خیالوں کا آقا آئے گا تو پھر وہ کہاں منہ چھپا کر روئیں گے اور کون سی چوکھٹ پر سر رکھیں گے؟ کس سے اُمید لگائیں گے اور کس کے در کی غلامی کریں گے؟



میں 20 فیصد ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ حساب کتاب جاننے والوں میں امریکا دنیا میں چالیس بہترین ممالک میں 28 ویں نمبر پر ہے۔

اخبار نے حوالہ دیا ہے کہ امریکا میں تعلیم بالغان کے اداروں میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت دنیا میں سب سے زیادہ ناقص ہے۔ اسی اخبار نے کہا ہے کہ امریکا کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اتنے کند ذہن ہیں کہ مالکان کو ہر سال 30 بلین ڈالر ان کی بار بار ٹریننگ پر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے امریکا کو صحت کی بنیادی سہولیات کے اعتبار سے دنیا میں 54 ویں نمبر پر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا میں ہر سال اٹھارہ ہزار لوگ اس لیے مر جاتے ہیں کہ وہ اپنی صحت اور علاج معالجہ کی قیمت نہیں ادا کر سکتے۔

نیویارک ٹائمز کی 12 جنوری 2005ء کی اشاعت کے مطابق امریکا تمام ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی غربت کے اعتبار سے دنیا میں 22 ویں نمبر ہے۔ یہی اخبار یورپ سے موازنہ کر کے بتاتا ہے کہ امریکا میں زچگی کی اموات یورپ سے 70 فیصد زیادہ ہیں اور بچوں کی شرح اموات میں یہ دنیا میں 42 ویں نمبر پر ہے۔ یہاں تک کہ کیوبا جیسا غریب، ملک بھی اس سے آگے ہے۔

22 نومبر 2004ء کے نیویارک ٹائمز ہی میں لکھا کہ امریکا میں ایک کروڑ بیس لاکھ خاندان ایسے ہیں جو محنت اور مشقت کے باوجود بھی پیٹ نہیں بھر پاتے اور تین کروڑ 90 لاکھ خاندان ایسے ہیں جن پر سال میں کئی دفعہ فاقہ ضرور آتا ہے۔

امریکا کی معاشی حالت بھی اس وقت عجیب ہے وہ لوگ جو اسے ایک سپر پاور واحد بڑی طاقت سمجھ رہے ہیں انہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ زوال کی طرف اس کا سفر کس تیزی سے جاری ہے؟ یورپین ڈریم (European Dream) کے صفحہ 64، 65 کے مطابق دنیا میں 140 بڑی کمپنیوں میں 61 یورپ میں ہیں جبکہ امریکا میں پچاس ہیں۔ جبکہ گلوبل فنانس کے سروے کے مطابق دنیا کی پچاس بہترین منافع کمانے والے کمپنیوں میں 49 یورپ میں اور صرف ایک امریکا میں ہے۔

دنیا کے بڑے 20 کمرشل بینکوں میں 14 یورپ میں اور 6 امریکا میں ہیں۔ دوا ساز کمپنیوں میں یورپ کی BASF سب سے آگے اور اس کے علاوہ چھ بڑی کمپنیاں بھی وہاں ہیں۔ امریکا کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ انجینئرنگ کے شعبے میں 5 بڑی کمپنیوں میں 3 یورپ میں اور دو جاپان میں ہیں۔ امریکا اس شعبے میں دسویں نمبر سے بھی کم پر ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء میں نیسلے اور یونی لیور دو سب سے بڑی ہیں اور دونوں یورپ میں ہیں۔ دوسرے نمبر کی دس کمپنیوں میں بھی صرف چار امریکا میں ہیں۔

دی ویک کی 14 جنوری 2005ء کی اشاعت کی مطابق امریکا میں 10 لاکھ نوکریاں ختم کی گئیں۔ اس کے مطابق اس وقت وہاں 33 لاکھ بے روزگار افراد ہیں اور حالت یہ ہے کہ امریکا میں مکان خریدنے والے لوگوں کی اتنی کمی ہوگئی ہے کہ زیادہ تر مکان اور جائیداد خریدنے والے چین کے باشندے ہیں۔

نیویارک ٹائمز نے 12 دسمبر 2000ء کو امریکا کا ایک ایسے ملک سے موازنہ کیا ہے جو کل تک مقروض اور پسماندہ تھا یعنی برازیل۔ اخبار کے مطابق اگلے دس سالوں میں برازیل امریکا سے زیادہ مضبوط ملک ہوگا۔ امریکا اس

چلا کہ وہ کوئی مذہبی آدمی نہیں تھا بلکہ ایک جنسی جنونی قاتل تھا۔

جیک دی ریپر سے جنسی جنون کی یہ ”انتہا پسند“ تاریخ آج بھی اسی طرح رنگین ہے۔ جن لوگوں نے ان قاتلوں کی تاریخ مرتب کی ہے ان کے انکشافات حیرت انگیز ہیں۔ ان سو سالوں میں ہزاروں کے حساب سے ایسے جنونی قاتل پیدا ہوئے اور اپنے اپنے طریقوں سے ان آزاد خیال عورتوں کے گلے کاٹنے رہے، جسم نوچتے اور میلے رہے۔ لیکن شاید یہ اعداد و شمار بہت سوں کے حلق سے کانٹے کی طرح اتریں کہ ان قاتلوں میں 76 فیصد کا تعلق امریکا سے تھا اور 17 فیصد کا تعلق یورپ سے۔

یورپ کے ممالک کے جنونی قاتلوں میں انگلینڈ، جرمنی اور فرانس سب سے آگے تھے۔ میں نے اعداد و شمار کی ورق گردانی کی، اخبارات کے ذخائر اور رکھی گئی کتابوں کو چھانا لیکن میں اس اداکارہ کے لیے ”مسلم دنیا“ سے ایک بھی جنونی قاتل نہ ڈھونڈ سکا۔

مجھے ان سارے قاتلوں میں کوئی مدر سے کا پڑھا ہوا، کوئی ٹخنوں سے اونچے پانچاے اور لمبی ڈاڑھی والا بھی نہ مل سکا۔ میری حیرت اور بھی بڑھ گئی کہ ان سارے قاتلوں میں 84 فیصد گورے تھے جب کہ پوری دنیا کالوں سے خوفزدہ ہوتی رہتی ہے۔ ان میں سارے کے سارے ایسے تھے جو مذہب سے بیگانہ، نشہ کے عادی، کلبوں میں زندگی گزارنے اور جنسی آزادی کے نقیب تھے۔

مجھے جیک آر مسٹر انگ نظر آیا جو جہاز پر سفر کرتا رہتا اور جس شہر میں ایسی عورت ملتی اسے قتل کر دیتا۔ مجھے کیلئے بیانی کی کاچرہ نظر آیا جس کے خوف سے لاس اینجلس میں عورتوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ لارنس ہنکر اور رے نورس نظر آئے جو دن میں گھومتے، عورتیں اٹھاتے، زیادتی کرتے اور قتل کر دیتے۔ کیا کیا نام تھے Free Way Killer یا River Side Killer شاہراہوں کے نزدیک قتل کرنے والا یا دریاؤں کے کنارے مارنے والا۔ کہیں بیوی کو کین کر نظر آتا ہے جس نے فلوریڈا کی خوبصورت عورتوں کو قتل کر کے شہرت حاصل کی۔

یہ جنون صرف مردوں تک محدود نہ تھا بلکہ ایلزبتہ پتھوری جیسی خاتون بھی تھی جو عورتوں کو قتل کر کے ان کے خون سے غسل کرتی۔ ایک لمبی فہرست ہے ان قاتلوں کی جو ملک در ملک پھیلی ہوئی ہے جس کا آغاز آسٹریلیا سے ہوتا ہے۔ سیریل کھریا جنونی قاتلوں کی فہرست میں مجھے ایک بھی مسلمان ملک نظر نہیں آیا اور نہ ہی عورتوں کو قتل کرنے والے خوفناک جنونیوں میں کسی مسلمان کا نام۔

لیکن شاید کیمروں، روشنیوں اور رنگوں کے نشے میں گم ”میرا“ کو اندازہ نہیں کہ اس نے ایسی قوم کو طعنہ دیا ہے جس نے صدیوں سے یہ گناہ کیا ہی نہیں۔ کاش! وہ اپنی ساتھی اداکاراؤں کی ان اکاڈکا قاتلوں کے خدو خال ہی دیکھ لیتی جو کبھی بے وفا کی پرتیزاب پھینک گئے اور کبھی روپے ہڑپ کرنے پر قتل کر بیٹھے۔

اس ناکردہ گناہ پر جو الزام اس قوم پر لگایا گیا ہے جی چاہتا ہے کاش! کہ کسی کٹہرے میں، کسی منصف کے رو برو، کسی عدالت کے سامنے صرف ایک سوال کا جواب طلب کرے کہ ہمیں ان انتہا پسندوں کے چہرے تو بتا دو، ان کے نام تو رکھ دو جو اس قوم میں ایسی عورتوں کو قتل کرتے پھرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ نام تو ہمارے بدترین دشمنوں کو بھی ہماری تاریخ ڈھونڈنے پر نہیں مل سکے تھے۔



## صرف ایک سوال

(06 صفر 1426ھ بمطابق 18 مارچ 2005ء)

”مجھے اس ملک، اس شہر اور ان گلی محلوں میں بسنے والے ”انتہا پسندوں“ سے خطرہ ہے۔ وہ مجھے قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ صرف اور صرف سین کی ڈیمانڈ تھی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ مجھے ان انتہا پسندوں کے خلاف تحفظ فراہم کیا جائے۔“ ان الفاظ کی گونج اس وقت دنیا بھر کے اخباروں، رسالوں اور ٹیلی ویژن چینلز پر پائی جاتی ہے۔ پاکستان کی فلمی دنیا کی ایک ہیروئن جس نے بھارت کی ایک فلم میں کام کیا۔ فلم پتہ نہیں کیسی ہوگی؟ لیکن اس کی عریانیٹ کا چرچا نمونے کے طور پر تصاویر اخباروں میں آ گئیں۔

یہ سب کچھ تو ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ نہ اس دنیا جسے فلم ورلڈ کہتے ہیں اس میں یہ الزامات نہیں اور نہ ڈھٹائی کے ساتھ اس کا دفاع کرنے والوں کی کوئی کمی ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں جب فن، آرٹ، فلم کی ضرورت کے تحت عریانیٹ کا دفاع کرنے والی نے میرے ملک میں بسنے والے لوگوں سے اور پھر خصوصاً ”انتہا پسندوں“ سے (کہ یہ آج کل سب سے محبوب لفظ ہے) خطرے کا اعلان کیا تو ایسے لگا جیسے کسی نے اس مملکت خدا داد پاکستان ہی نہیں پوری امت مسلمہ کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔ مجھے ایک طویل عرصہ لکھتے گزرا لیکن شاید ہی کسی الزام سے مجھے اتنا دکھ پہنچا ہو جتنا اس الزام سے کرب و اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔

کاش! اس روشنیوں اور کیمروں کی چکا چوند میں گم خاتون نے بولنے سے پہلے سوچا ہوتا صرف ایک دفعہ تاریخ پر نظر ڈال لی ہوتی۔ اپنی ہی ہم پیشہ فنکاروں کے قاتلوں کا حسب و نسب اور عادات و اطوار دیکھ لیتے ہوتے تو یہ بات نہ کہتی۔ میں گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو مجھے ملائیشیا کے ساحلوں سے لے کر افریقہ کے ریگستانوں تک پوری مسلم امت میں ایک بھی ایسا انتہا پسند نظر نہیں آتا جس نے کبھی بھی بے راہ و جسم فروش یا جسم کی نمائش کرنے والی خاتون کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہو اور پھر قتل کرتا چلا جائے۔

لیکن شاید اس خاتون کی بات کو سچ سمجھنے والوں اور انتہا پسندی کے مقابلے میں روشن خیال اعتدال پسندی کی روایت جنم دینے والوں کو یہ بات حیرت میں ڈال دے کہ دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا انتہا پسند جنونی قاتل جس کے خوف سے لندن کی گلیوں پر مختصر لباس پہن کر چلنے والی عورتیں کانپا کرتی تھیں Jack the Ripper تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ نے نئی نئی مذہب سے آزادی حاصل کی تھی۔ اس نے 1888ء میں 31 اگست کو سب سے پہلے این گوبس کو قتل کیا جو خاوند کے مرنے کے بعد چار بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے جسم کا دھندا کرتی تھی۔

وہ شوخ لباس پہننے والی، بے راہ رو، جسم کی دھندا کرنے والی یہاں تک کہ گلیوں میں مسکرا کر پھول بیچنے والی عورتوں کو اکیلے میں پکڑ کر ایک تیز دھار آلے سے ان کی گردن کاٹا، جسم پر نشان بناتا، پیٹ پھاڑتا اور انہیں عبرت کا نشان بنا دیتا۔ لندن میں چلنے والے 62 بازار حسن لاٹھوں سے سجے لگے اور جب اس کے کئی سال بعد تحقیق ہوئی تو پتہ

کے آباء و اجداد یاد آگئے کہ جب 1947ء میں یہ ہندوستان تقسیم ہو رہا تھا، مسلمانوں کے لیے پہلے قافلے ہجرت کر رہے تھے تو اس وقت مہاراجہ پنڈیالہ نے اپنی فوج کو جتھوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا کہ شہروں، گلیوں، محلوں اور دیہاتوں میں پھیل جاؤ اور جہاں کوئی مسلمان مرد، عورت اور بچہ نظر آئے اسے ذبح کر دو۔

ان کے مکانوں کو آگ لگا دو اور پھر انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام ہوا تھا۔ میدان مسلمان مردوں کی لاشوں سے پٹ گئے تھے اور مشرقی پنجاب کے کنوئیں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے جنہوں نے اپنی عصمتیں بچانے کے لیے ان میں چھلانگ لگا کر خودکشیاں کی تھیں لیکن امریندر سنگھ کیوں نہ مسکراتا؟ وہ تو جب واہگہ سے اس ملک کی سرزمین میں داخل ہوا تو ہزاروں مجبور اسکولوں کے بچوں کے ہاتھوں میں ہندوستان کے پرچم اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ جس سرحد پر ابھی خون کے دھبے خشک نہیں ہوئے وہاں سرخ اور زرد پھولوں کی پتوں کی تہیں لگی ہوئی تھیں۔ اس دستاویز کو امریندر سنگھ کے سامنے رکھتے ہوئے اس افسر نے اپنے آنسو ایک اور وجہ سے بھی ضبط کیے تھے، اس لیے اسی دن کے اخبارات میں ایک ایسی خبر موجود تھی جو شاید کشمیریوں کا سودا کرنے والی دستاویز سے زیادہ تلخ تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونوں میں ضبط آنسو تھے اور وہ سوچ رہا تھا جب کشمیر کو 75 لاکھ میں بیچا گیا تھا تو اس وقت اس سرزمین پر ایک بھی شہید کی لاش دفن نہیں ہوئی تھی۔ ایک بھی مانگ کا سینہ دور نہیں اجڑا تھا۔

ایک بھی گھر نذر آتش نہیں ہوا تھا۔ ایک بھی عصمت درندگی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب تو فروخت کے بعد شروع ہوا..... لیکن آج کی یہ خبر عجیب تھی۔ مظفر آباد سے دریائے جہلم کے کنارے کنارے سڑک گھنے درختوں کے سائے میں رواں دواں ہے۔ اس سڑک پر آباد ہر گاؤں میں آپ کو بھارتی گولہ باری کے نشان ملیں گے اور کسی نہ کسی شہید کی قبر بھی۔ اس سڑک کے ساتھ دریائے جہلم ہے اور دوسری جانب مقبوضہ کشمیر۔

سڑک بل کھاتی چٹوٹی کے مقام تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں سامنے والی پہاڑیوں پر بھارتی افواج کے مورچے ہیں اور اس طرف کی پہاڑیوں پر پاکستانی افواج کے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا پل ہے جو ٹوٹ چکا ہے۔ آج اس پل کی مرمت کی نگرانی بھارتی اور پاکستانی فوج کے افسران کر رہے ہیں۔ چائے کی میز پر بٹھنے ہوئے مرغ، سینڈویچ اور چاٹ پڑی ہے۔ ایک دوسرے کو لطیفے سنائے جا رہے ہیں۔ پل پر کام کرنے والے جوان ہندوستانی فلموں کے گیت گا رہے ہیں۔ یہ پل دوبارہ تعمیر ہو رہا ہے، یہ راستہ کھل رہا ہے۔

یہ سب کچھ ایک ایسی سرزمین پر ہو رہا تھا جہاں آج بھی ہر روز کسی مسلمان گھر سے شہید کی میت اٹھتی ہے۔ جس کے قبرستانوں میں ایک لاکھ شہید دفن ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اس دستاویز کو پکڑے امریندر سنگھ کے چہرے کو دیکھتے اور یہ خبر پڑھتے میری آنسوؤں بھری آنکھوں کے سامنے صدیق سالک کے وہ فقرے تیر گئے جو اس نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالتے ہوئے جنرل نیازی کے بارے میں لکھے تھے: ”وہ شخص جنرل اروڑہ کا استقبال کرتے ہوئے اسے خوش کرنے کے لیے گندے لطیفے سناتا تھا.....“

لیکن تاریخ شاہد ہے تو میں فروخت کرنے پر شاید اتنی سزا کبھی نہیں ملی جتنی شہداء کی میتیں اور آرزوئیں فروخت کرنے پر ملتا کرتی ہے کہ ان کی روئیں تو اس ذات واحد سے فریاد کرتی ہیں جس کے لیے انہوں نے جان دی تھی۔

## شہید روحوں کی فریاد

(13 صفر 1426ھ بمطابق 25 مارچ 2005ء)

لاہور میں سول سیکرٹریٹ کے بچوں بیچ سفید رنگ کی چونے سے ڈھکی ایک مقبرہ نما عمارت ہے جسے عرف عام میں انارکلی کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ انارکلی کا وجود تھا یا نہیں؟ لیکن اس مقبرے کی ایک تاریخ ہے جس پر اہل لاہور کے خون کے دھبے ثبت ہیں۔ اس بلند و بالا گنبد اور میناروں والی عمارت کو اس وقت فرانسیسی جرنل ونچورا کی رہائش گاہ بنادیا گیا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی افواج اس جرنیل کی قیادت میں لاہور میں مسلمانوں کے خون سے ہوئی کھیل رہی تھیں اور ہزاروں عفت مآب مسلمان عورتوں کو شاہی قلعہ لاہور کی سیڑھیوں، والانوں اور خوابگاہوں میں عفت و عصمت سے محروم کر چکی تھیں۔

ونچورا کے بعد یہی مقبرہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے کھڑیک سنگھ کی رہائش گاہ بنادیا گیا۔ پھر وقت بدلا، انگریز فاتح قرار پائے تو انہیں پورے لاہور میں عبادت کرنے کے لیے کوئی جگہ میسر نہ تھی۔ انہوں نے مقبرے کے گنبد پر صلیب گاڑ دی۔ قبر کا تعویذ جس پر اللہ کے ننانوے نام کندہ تھے اسے اٹھایا اور ایک جانب کھڑکی کے پاس رکھ دیا۔ اس کے سامنے پادری کی کرسی سجائی اور یوں اس مقبرے میں چرچ کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔

جب پہلے پہل چرچ کی عمارت تعمیر ہوئی تو انگریزوں نے اسے قیمتی دستاویز محفوظ کرنے کے لیے ریکارڈ روم میں تبدیل کر دیا اور یہ آج تک ایک ریکارڈ روم کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر آج تک ان سب اہم واقعات کے متعلق دستاویز موجود ہیں جو اس برصغیر میں ہوئے..... شہیدوں کے خون کی کہانیاں، مجاہدین کو قتل کرنے کے احکام اور پھانسی چڑھانے اور کالا پانی بھیجنے کے فیصلوں کی فائلیں۔

لیکن صرف چند دن پہلے چند منٹوں کے دوران میری آنکھوں کے سامنے سے شہیدوں کی لاشیں، عورتوں کی مجبوری کے عالم میں بلند ہوتی ہوئی چیخیں اور معصوم بچوں کے نیزوں کی اینیوں پر اچھالے گئے جسم گھوم گئے۔ 17 مارچ 2005ء کو شام پانچ بجے بھارتی پنجاب کا وزیر اعلیٰ امریندر سنگھ اس مقبرے کی سیڑھیاں چڑھتا اندر داخل ہوا۔ مختلف ریکارڈ دیکھنے کے بعد جب اس کے سامنے وہ دستاویز رکھی گئی جس کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کو سالانہ اقساط کے ساتھ 75 لاکھ روپے گلاب سنگھ ڈوگرہ کو بیچا گیا۔

کاغذ پلٹتے ہوئے پاکستانی افسر کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ اس قیمت میں یہاں ایک دس مرلے کا مکان نہیں آتا جب ایک پوری جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، قوم بیچ دی گئی تھی۔ امریندر سنگھ کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ صرف مسکرا دیا..... لیکن پتہ نہیں کیوں یہ مسکراہٹ بہت تلخ معلوم ہوئی۔ مجھے اس ریاست پنڈیالہ کے نواب



کے وجود سے آغاز کرنے والے یہ اسکا لکھی لارنس آف عربیہ کے روپ میں سامنے آئے تو ترکی کے مدرسوں میں عربی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کر کے قرآن و حدیث کا درس لیتے ہوئے مسلمانوں میں لوٹے اور پھر ان میں نفرت، تعصب اور علاقائی سوچ کا ایسا بیج بونے لگے کہ ایک خلافت عثمانیہ 20 سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

یہودی خاندان میں جنم لینے والے اتاترک کی صورت میں ترک کی قیادت کی ..... اور وہ ترک جن کے دل مکہ و مدینہ کے ساتھ دھڑکتے تھے، جن کی قوت سے مغرب کی صلیبی طاقتیں لرزہ بر اندام ہوا کرتی تھیں انہیں اسی مغرب کا دیوانہ اور ان کی اقدار کا حاشیہ نشین بنادیا اور انکی طرح مادہ پرستی، عیاشی اور فحاشی میں غرق کر گئے۔

آج اس نماز کی امامت کے بعد میرے ملک میں ڈونز کی مدد سے چلنے والی این جی اوز مذاکرے کروا رہی ہیں۔ حقوق کی بنیاد پر عورت کو یہ مقام بھی ملنا چاہیے۔ میں یہاں کسی مذہبی تعبیر میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ صرف صاحبان علم و فقہ کا کام ہے لیکن یہ خیال ضرور پریشان کرتا ہے یہ سوال پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ مغرب اتاترکی کر چکا ہے، وہاں عورت کو برابر کے حقوق دیے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟

کیا وہاں دو ہزار سال گزرنے کے باوجود آج تک روم کی ویٹی کن سٹی میں کسی عورت کو پوپ کے منصب پر فائز کیا گیا ہے؟ دنیا بھر کے چرچوں میں مرد اور عورتیں اکٹھی عبادت کرتی ہیں لیکن مجھے آج تک ایک مثال ایسی نہیں ملی کہ کسی عورت نے چرچ کی دعا کی قیادت کی ہو۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں یہ درس وہاں کیوں نہیں سکھا دیتی؟

کرڈوں ہندو مندروں میں پوجا پاٹ کرتے ہیں، عورتیں ان کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہیں لیکن کبھی کسی گرو، کسی پروہت کی کرسی پر عورت کیوں بیٹھتی؟ یہ انسانی حقوق کا عظیم مظاہرہ وہاں کیوں نہیں ہوتا؟ بلکہ وہاں تو اس لیے زیادہ ضرورت ہے کہ ان دونوں مذہبی اداروں میں عورت کی حیثیت ایک غلام، باندی اور نچلے درجے کی ہے۔ چرچ میں نن کا منصب صرف اور صرف بڑے پادری اور اس کے حواریوں کی خدمت میں لگے رہتا اور عاقبت سنوارنا ہے۔

میں یہاں پرنسٹن فریڈرک کے بانی مارٹن تھر کے انکشافات نہیں درج کرنا چاہتا جو اس نے بتائے ہیں کہ ان بیچاری راہباؤں (Nuns) پر چرچ کے پادریوں کے ہاتھوں کیا جاتی ہے؟ میں مندروں میں موجود ہندو دیوتاؤں کی کہانیاں نہیں لکھنا چاہتا کہ خود ہندوستان کا پریس ان کی ظلم سے بھری داستانیں روز شائع کرتا ہے۔

لیکن آزادی حقوق نسواں کی یلغار اسلام کے خلاف ہے۔ کوئی کسی مندر کے سامنے، کسی چرچ کے آگے بینر لے کر کھڑا نہیں ہوا کہ ان مظلوم عورتوں کو آزاد کراؤ۔ انہیں پوپ کی کرسی پر بٹھاؤ، انہیں برہمن کا مقام دو، اس لیے کہ جن لوگوں کا ضمیر آقاؤں کے ہاتھوں بک چکا ہو۔

انہیں آقا کے گھر میں ظلم پر آنکھیں بند کرنے اور اپنے گھر فتنہ پیدا کرنے کے پیسے ملتے ہوں وہاں ایسی ہی خواتین کو حوصلہ ملتا ہے، ایسے ہی حکومتی دور بنائے جاتے ہیں اور ایسی ہی روشن خیال سیاسی پارٹیاں جنم لیتی ہیں ..... لیکن تاریخ ایک بات ثابت کرتی ہے کہ عبداللہ بن سبا سے امینہ داؤد تک ..... کوئی بھی اس امت کی اجتماعی سوچ نہیں بدل سکا کہ اس میں ایسے پروانے موجود ہیں جن کی بیعت سے، لباس سے، اخلاق سے، رہن سہن سے، آج بھی چودہ سو سال پہلے کے مسلمان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ایسے رول ماڈل موجود ہوں تو امت ڈگر گاتی ضرور ہے بھٹک نہیں سکتی۔ اسے فتنے کے مقابل ڈھال جو میسر ہے۔

## فتنے کے مقابل ڈھال

(20 صفر 1426ھ بمطابق یکم اپریل 2005ء)

امریکا کے نیگرو باشندوں کے ایک عیسائی گھر میں جنم لینے والی خاتون نے اپنی تعلیم کا سلسلہ مشرقی علوم کی سمت پھیرا اور پھر ان علوم میں مذاہب کا علم حاصل کرنے لگی۔ یوں اس نے ان مذاہب میں سے اسلام کو چنا اور اپنے مغربی پروفیسروں سے اس کی تعلیم حاصل کی۔ امریکی معاشرے اور مغربی اقدار کی منطق اس پر لاگو کی اور پھر اپنے عجیب و غریب قسم کے نظریات رکھتے ہوئے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد مغربی دنیا میں عورت کی آزادی، بے پردگی، حقوق، مخلوط زندگی اور ایسے کئی اخلاقی معیارات کو سامنے رکھ کر قرآن کی اپنی الگ تعبیر کرتے ہوئے ایک کتاب "Quran and Women" لکھ ڈالی۔ جلد ہی یہ عورت مغربی دنیا میں منظور نظر ہو گئی اور اسے ورچینیا کی کامن ویلتھ یونیورسٹی میں پروفیسر کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اسے اسلام کی ترقی یافتہ، ماڈرن اور روشن خیال فکر کا رہنما تصور کیا جانے لگا۔

یوں تو پوری اسلامی دنیا میں ایسے چند نام نہاد اسکا لرموجود ہیں جنہیں دنیا بھر کے اخبارات، ٹی وی چینلوں اور ریڈیو ایسے موقعوں پر سامنے لے آتے ہیں جب اسلام کی اپنی مرضی کے مطابق کوئی تعبیر کرنی مقصود ہو لیکن 18 مارچ 2005ء کو اس پروفیسر خاتون امینہ داؤد کا استعمال ایک ایسے ہتھیار کے طور پر کیا گیا جو شیطان کا سب سے کارآمد اور کارگر وارث ثابت ہو سکتا ہے۔

18 مارچ کو جمعہ کے روز نیویارک کے ایک چرچ کے بگلی کمرے میں اس خاتون کے چند ساتھیوں کو جمعہ کی نماز کے لیے مدعو کیا گیا۔ پورے امریکا کی کسی مسجد، کسی اسلامی سینٹر میں ان کو جگہ تک نہ ملی تھی۔ امریکی انتظامیہ نے مشورہ دیا کہ سمندر کے کنارے گرے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے سامنے میٹری پارک میں یہ سب منعقد کر دیا جائے لیکن پھر خوفزدہ انتظامیہ والے اپنے ان پروردہ افراد کو اس گرجا گھر کے کمرے میں لے گئے۔ وہاں جمعہ کی نماز کا اہتمام تھا۔ ایک خاتون نے اذان دی اور پھر امینہ داؤد نے خطبہ پڑھنے کے بعد امامت کروائی۔

شاید میں اس واقعے کو اہمیت نہ دیتا کہ ایسے چند لوگ ہر زمانے میں رہے اور ان کی آواز صدا بصر اٹھہرتی رہی لیکن صرف ایک دکھ اور ایک المیہ ہے کہ چین نہیں لینے دیتا اور وہ یہ کہ اس خاتون کی امامت میں جمعہ کی نماز میں حکومت پاکستان کا وفد بھی شامل تھا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا روشن خیال گروہ بھی۔

تاریخ ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اسلام قبول کر کے اس کے بنیادی عقائد کی بنیاد متزلزل کرنے کی کوشش کی لیکن امت مسلمہ کی اکثریت نے ان کے ان عقائد کو خاک سے بھی کم قیمت پر رکھا۔ عبداللہ بن سبا

مشیر، وزیر یہاں تک کہ اس کی تقریر لکھنے والے تک سب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں دنیا سے دہشت گردی کو ختم کرنے کی جنگ کا آغاز ہوا۔

دو مسلمان ملک افغانستان اور عراق تہ تیغ کر دیے گئے۔ لاشوں کے انبار لگے اور بموں کے دھوکے سے دنیا کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ دنیا میں اتحادی ڈھونڈے گئے۔ کسی کو خوف سے تو کسی کو لالچ کے ساتھ۔ اب بٹش دوسری دفعہ جیتا۔ اب جو تدبیریں اور منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں اس میں لگتا ہے کوئی اتحادی شامل نہیں۔ ہم اکیلے اس دنیا پر راج کریں گے جیسا چاہیں ویسا لاگو کریں گے۔

اس منصوبے کے آغاز میں سب سے پہلے اندر کی انتظامیہ سے کلن پاؤل جیسے غیر ذمہ دار لوگوں کو خارج کیا گیا۔ پھر دوسری تنظیموں، اقوام متحدہ اور ورلڈ بینک میں قبضہ جمایا گیا۔ ورلڈ بینک کے سربراہ کی حیثیت سے Neocon کے سب سے متعصب شخص پال وولف ووٹز کی تقرری کی گئی اور اقوام متحدہ میں امریکی نمائندے کو برطرف کر کے ایک دوسرے کٹر یہودی ہون بولٹن کو مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں تقرریاں ایسی تھیں جن پر اتحادی یورپی ملک تھوڑا ناراض ہوئے لیکن اب ناراض اور خمر اٹھانے کی پالیسیاں ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔

ایک نئی سوچ دی گئی کہ امریکا واحد سپر پاور ہے اسے دنیا بھر کے عالمی قوانین اور معاہدوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ ان معاہدوں کو غیر موثر کرنے کے لیے لاطعلقی کارروایاں اختیار کیا جانا چاہیے۔ اسی لیے عالمی عدالت انصاف، جینیوا کنونشن اور ایسے معاہدوں کو امریکی طاقت اور غلبے کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے ان پر عملدرآمد سے انکار کیا گیا بلکہ ان کی تضحیک بھی کی گئی۔ معاشی جنگ میں تمام عالمی اداروں پر اپنے نمائندے بٹھا دیے گئے اور یورپ دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب یورپ نے چین کے حق میں اسلحہ پر پابندی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔ ادھر یورپ کو طفل تسلیم دی جا رہی ہیں اور دوسری جانب ایک اور کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

امریکا کے وزیر دفاع اور اسی گروہ کے سرخیل ڈونلڈ رمزفیلڈ نے ایک خفیہ دستاویز مرتب کی ہے جس میں امریکی فوج کی پلاننگ مختلف عراقیوں سے یوں کی جائے گی کہ وہ ایک Proactive طاقت بن کر دنیا پر چھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف وہاں نہ جائے جہاں کوئی لڑائی، جھگڑا یا فساد برپا ہو بلکہ اس کی طاقت کو ایسا منظم کیا جائے کہ وہ پوری دنیا کے نقشے، اس کی حکومتوں اور عوام کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کے لیے پہلے سے وہاں موجود ہوا بھیجی جائے۔ اس کے لیے فوج کی سو سے زیادہ ایسی ٹیمیں مرتب کی جائیں گی جو دنیا میں سو سے زیادہ مقامات پر اپنی مرضی کی کارروائی بیک وقت شروع کر سکیں اور اسے کسی ایک مقام یا ہیڈ کوارٹر سے کنٹرول کیا جائے۔ ایک وسیع ٹیکنالوجی کا خاکہ دیا گیا جو انتہائی قیمتی ہو اور اعلیٰ درجے کی تاکہ دنیا کا کوئی امیر سے امیر ملک بھی اسے حاصل کرنے کا خواب نہ دیکھ سکے۔

اس رپورٹ کی منظوری کے بعد پہلے مرحلے میں امریکا ایک بہت بڑا ریڈار دنیا کے سب سے بلند علاقے الاسکا میں لے جانا چاہ رہا ہے جو بحری جہاز پر نصب ہوگا اور دنیا کے گرد گھوم پھر کر معلومات حاصل کرے گا۔ دو ہزار ٹن وزنی یہ X Band ریڈار ایک اتنے بڑے فلیٹ فارم پر نصب ہوگا جو دو فٹ بال گراؤنڈوں کے برابر ہو۔ اس میں 69,632 ملٹی سیکشن سرکٹ ہوں گے۔ یہ دنیا بھر کے سمندروں میں گھومے گا اور کہیں پر بھی اسلحہ، میزائل، ایٹمی پلانٹ کی خبر دے گا۔ یہ اس سال کے آخر تک اپنے اڈے آداک جزیرے پر پہنچ جائے گا اور ابھی تک یہ میکسیکو کی خلیج کیپ

## کیا کچھ ہونے والا ہے؟

(27 صفر 1426ھ بمطابق 08 اپریل 2005ء)

یوں تو عالم الغیب اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے جو جانتی ہے کہ اگلے لمحے کس کے ارادے خاک میں مل جائیں گے اور کون سرفراز و کامیاب ٹھہرے گا؟ لیکن تاریخ، زمین پر خدا بن کر بیٹھنے والوں کے دعووں اور ان کی تدبیروں سے بھری پڑی ہے۔ ہر دور کے فرعونوں کی یہ سرشت رہی ہے کہ وہ اپنی طاقت، دولت اور مادی وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے غلبے کا کھیل کھیلتے ہیں۔

کمزوروں کو دباتے اور سرکشی کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ ان کے مشیر اور اتحادی ہر لمحہ ایسی تدبیروں اور منصوبہ بندیوں میں لگے رہتے ہیں جس سے ان کے حاکم کی مطلق العنانیت کا جال وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔

ایک زمانہ تھا جب یہ طاقت کا خواب فرعون دیکھتا تھا اور اس خواب کی تکمیل کے راستے اس کے مشیر، اتحادی اور افواج تلاش کیا کرتی تھیں..... لیکن تاریخ اب ایسے سارے غلبے کے کھیل کو بالکل الٹ پس منظر میں دیکھ رہی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد رسوا اور در بدر یہودی دانشوروں نے طاقت اور غلبے کا ایک خواب دیکھنا شروع کیا تھا۔ پوری دنیا پر بلا شرکت غیرے اپنے اقتدار کا خواب۔

اس خواب کو تعبیر میں بدلنے کی کہانی بڑی طویل ہے اور سال بہ سال اپنا طریقہ بدلتی نظر آتی ہے لیکن ایک قدر مشترک اس میں یہ ہے کہ امریکا کے تخت پر جو بھی صدر بیٹھے، اس کا تعلق کسی بھی مذہب، فرقے یا گروہ سے ہو، بس ہماری مٹھی میں رہے۔ اب تک کے تمام صدور ان کی مٹھی میں تو رہے لیکن بغاوت کر کے اپنے انجام کو پہنچنے والے بھی موجود تھے۔ سر بازار قتل کیے گئے یا پھر بے آبرو ہو کر وائٹ ہاؤس سے نکالے گئے۔

لیکن گزشتہ پندرہ سالوں سے وہ لوگ جو پس پردہ رہ کر امریکا کو اپنے ارادوں کی تکمیل کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ انہوں نے سامنے آنے کا سوچا۔ یکساں سوچ اور یہودی غلبے کے علمبردار پالیسی سازوں، دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے ایک گروپ بنایا اور پھر کھل کر اپنے ہدف بتانا شروع کیے۔ اس گروہ میں آج پورے امریکا کے 99 فیصد کے قریب یہودی النسل اور کٹر تعصب کے حامل افراد شامل ہیں۔

یہ لوگ کھل کر بات کرتے ہیں کہ اسرائیل کی سیکورٹی اور تحفظ میں امریکا کی بقاء ہے اور مسلمانوں میں لبرل ازم، آزادی اور مغربی اقتدار کی پیروی ہی دنیا میں امن لاسکتی ہے۔ جو بھی ”رجعت پسند“ ہے اسے اس دنیا کے نقشے سے مٹ جانا چاہیے۔ ان Neocons کا غلبہ پہلی دفعہ صدر بٹش کے اقتدار میں آنے سے شروع ہوا اور اس کے اکثر و بیشتر

بارن اور ارد گرد سمندروں میں آزمائشی سفر کر چکا ہے۔

یہ صرف ایک ٹیکنالوجی کی مثال ہے جو اس نئی پالیسی کے بعد دنیا کے سامنے آئی ہے جس کا مقصد پوری دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا اور تسخیر کرنا ہے۔ طاقت اور غلبے کی عجیب و غریب کہانی ہوتی ہے۔ فرعون کو کبھی بھی کمزور اور مجبور، طاقت ور نظر نہیں آتا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان کا خاتمہ انہی کمزوروں کے ہاتھ سے ہوا ہے۔

زمین پر خدا بن کر بیٹھنے کا خواب اور اس کی تیاریاں مکمل ہیں لیکن وہ جنہیں ان کے پروردگار نے یہ فریضہ سونپا ہے، ان سے لڑنے کا جو اس کی زمین پر خدا بن بیٹھیں، خاموش ہیں، مصلحت کوش ہیں۔ شاید انہیں یقین ہے کہ ان کی اس غفلت پر ان سے سوال نہیں ہوگا۔

## طاقت کی کہانی

(04 ربیع الاول 1426ھ بمطابق 15 اپریل 2005ء)

بلڈوزر اپنی حرکت کا آغاز کرتے ہیں، بجری کوئی جارہی ہے، تارکول اور دوسرے میٹریل سے بنائے جانے والے اسفالٹ کی مشین گھوم رہی ہوتی ہے اور پھر چند ماہ میں بے آب و گیاہ علاقے یا ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان چمکتی دورویہ سڑک تیار ہو جاتی ہے لیکن اس سڑک کے نکلنے سے پہلے واقفان حال لوگ اس بے آب و گیاہ علاقے یا ہرے بھرے کھیتوں کو خرید چکے ہوتے ہیں۔ پھر شہر کے بڑے بڑے چوراہوں پر چمکتی روشنی اور خوبصورت رنگ و روپ والے بورڈ نظر آنے لگتے ہیں۔

اخباروں کے اشتہارات سے میڈیا کے دروہام کو بچنے لگتے ہیں۔ کہیں قرعہ اندازی ہوتی ہے تو پلاٹ میسر آتے ہیں اور کہیں یونہی رقم جمع کرانے پر الاٹمنٹ ہو جاتی ہے۔ فائل ایک ہاتھ سے دوسرے اور پھر دوسرے سے تیسرے تک اپنی قیمت بڑھاتی پہنچنے لگتی ہے۔

پورے شہر کے ہر کاروباری ادارے، دفتر، دکان یا گھر میں ایک ہی بحث چل رہی ہوتی ہے کہ کون سی اسکیم کی فائل کاربٹ آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک ایسی دوڑ ہے جس میں سالوں نہیں مہینوں بلکہ دنوں میں ہزاروں کی جائیداد لاکھوں اور لاکھوں کی کروڑوں میں پہنچی اور خریدی جانے لگتی ہے۔

کسی ایک رہائشی علاقے میں چند دکانیں روزمرہ کی ضروریات کی کھلتی ہیں پھر آہستہ آہستہ دکانوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ لوگوں کی توجہ اس طرف ذرا سی مبذول ہوئی اور ادھر کسی صاحب حیثیت بلڈر کا دماغ کام کرنے لگا۔ چند چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ایک دو گھر خریدے اور پھر اس جگہ کو صاف کر کے گہری کھدائیاں شروع ہو گئیں۔ زیر زمین منزلوں سے لے کر آسمان کو چھوٹی پلازہ نما عمارت کھڑی کر دی گئی۔ زرق برق، رنگین اور چمکتی دکانیں وجود میں آئیں۔

دفاتر کے بورڈ لگے اور فلیٹوں میں کاروباری زندگی کا آغاز ہو گیا۔ جس علاقے میں دولت کے پرستاروں اور منافع کمانے کی ہوس میں گرفتار لوگوں کے لیے اس طرح کے مواقع جنم لے رہے ہوں وہاں پھر شہروں کی سرحدیں میلوں پھیلنے لگتی ہیں۔ یہ میلوں پھیلنے کا عمل بھی اتنا منظم ہوتا ہے کہ اس میں فائدہ صرف ان لوگوں کا ہوتا ہے جو جانتے ہیں، جن کی رسائی ہے یا پھر جن کے زور بازو میں طاقت ہے کہ سڑک کا رخ کس جانب مڑتا ہے اور زمین کی قیمتوں کو کیسے آسمان پر پہنچاتا ہے؟ کس علاقے کو رہائشی سے کمرشل کرتا ہے اور کس حد تک کرتا ہے؟

مجھے اس سارے کھیل کے بگڑنے اور بننے میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن اس تو وسیع شہر کے سارے عمل میں ان لوگوں کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھنے کی شاید ہی کسی کو ضرورت پڑی ہو جو اس سارے چمکتے جگمگاتے منظر نامے کو تخلیق

## فتنے کی علمبردار خواتین

(12 ربيع الاول 1426ھ بمطابق 22 اپریل 2005ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب پورے یورپ پر کلیسا کا راج تھا۔ روم کی پاپائیت کا غلبہ اور اقتدار اس قدر غضبناک تھا کہ بڑے بڑے بادشاہ اس سے کانپتے تھے۔ پادری جانیدادوں کے مالک اور عالی شان محل نما مکانات میں رہا کرتے تھے۔ لیکن ان سب سے خوفناک پہلو کلیسا کی احتساب عدالتیں تھیں جو مذہب کے خلاف کسی بھی قسم کی کوئی حرکت کوئی بیان یا کسی تحریر پر سزا سنائیں دیا کرتی تھیں۔ سزاؤں کا عالم بہت سخت تھا۔ آگ کا الاؤ روشن کر کے زندہ انسانوں کو اس میں پھینک دیا جاتا۔ کئی سو فٹ اونچی جگہ پر ایک بہت بڑا چھرا جسے گیلوشین کہا جاتا اس کے عین نیچے ایک مجرم کی گردن رکھی جانی اور چھرے کو اوپر سے گرا دیا جاتا۔ سرتن سے جدا ہوتا اور لہو کے فوارے پھوٹ پڑتے۔

ان سارے مناظر کو مجبوراً شہریوں کو دیکھنے اور تالیاں بجانے کا حکم تھا۔ اسی زمانے میں دستور نسکی کے ایک ناول کا بہت چرچا ہوا۔ یہ ناول حقیقت پر مبنی ظلم اور زیادتی کے واقعات کے گرد گھومتا تھا لیکن آخر میں ناول نگار نے لکھا کہ آسمانوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب اپنے عیسائیوں پر ظلم نے بہت پریشان کیا تو وہ بھیس بدل کر اسپین کے ایک شہر میں آ گئے۔

انہوں نے لوگوں کو پریشان حال دیکھا تو اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لیے ایک کوڑھی پر ہاتھ پھیرا تو وہ شفیاب ہو گیا اور ایک اندھے کو عادی تو اس کی آنکھیں واپس آ گئیں۔ لوگ انہیں پہچان گئے، ادھر شہر کے اسٹڈیم میں آگ کا الاؤ روشن تھا۔ ایک ہزار کے قریب مجرموں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ جب بڑا پادری انہیں جلا کر واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے لوگوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پایا اور فوراً پہچان گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

رات کو اس اندھیری کوٹھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام قید تھے، بڑا پادری وہاں پہنچا اور اس نے کہا: ”آپ کو ہمارے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ آپ اپنا اختیار پاپائے روم کو سونپ کر آسمانوں پر جا چکے ہیں۔ میں اس قید خانے کا دروازہ پیچھے سے کھول کر جا رہا ہوں آپ چلے جائیں ورنہ میں صبح آپ کو کلیسا کا باغی قرار دے کر آگ میں زندہ جلوا دوں گا اور لوگ میری بات پر یقین بھی کر لیں گے۔“

تحریف کے اختیار اور پوپ کو مذہب کی اپنی تشریح بلکہ تشریع (شریعت بنانے) کرنے کی آزادی کا یہی وہ تیر تھا کہ جب یورپ میں آزادی، غربت، نسوانی حقوق اور مذہبی آزاد خیالی کی تحریک شروع ہوئی اور ظلم سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے کلیسا کا اقتدار ختم کرنے کی ٹھانی تو پھر یہی پاپائے روم اور پادریوں کی فوج ظفر موج تھی جسے اپنا اقتدار

کرتے ہیں جو اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں چھوڑ کر ہاتھ میں مزدوری کا کوئی نہ کوئی اوزار لیے شہر میں آتے ہیں اور پھر اس خوبصورت شہر کے ارد گرد کچے مکانوں، گندی گلیوں، سڑی ہوئی بدبودار نالیوں اور سہولتوں سے عاری بستیاں قائم ہونے لگتی ہیں۔ ان بستیوں میں بیماریاں بھی ہیں اور غربت بھی۔ جہالت کے ڈیرے بھی ہیں اور بے روزگاری کا سایہ بھی۔

بڑے شہر آباد کرنے والوں کو ایک ہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس جگہ سب کچھ یوں جمع کر دیا جائے کہ کوئی اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ سارے اچھے اسکول، سارے اچھے ہسپتال، سارے اچھے تفریحی مقامات، سب خوبصورت سڑکیں، پارک اور چوراہے یہاں تعمیر کر دیے جاتے ہیں۔ یہ سب یہاں نہ ہوں تو زمین ہزاروں سے لاکھوں اور کروڑوں تک کیسے جائے؟ یوں پورے ملک میں جس کے مقدر میں چند روپے آتے ہیں وہ یہاں بھاگ آتا ہے۔ کوئی اولاد کی تعلیم کے لیے، کوئی بہتر رہائش کے لیے، کوئی نوکری کے لیے اور کوئی صرف پر تعیش زندگی کے لیے۔

اس لیے شہروں کی خوبصورت اور بد صورت آبادی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بدبودار علاقے اور پھولوں سے سجے باہم ایک ہی شہر کے باسی ہوتے ہیں کہ ان راستوں کو صاف شفاف بنانے والے، گھروں کی، دکانوں کی اور پلازوں کی چمک دمک کو زندہ کرنے والے سب انہی بدبودار علاقوں سے آتے ہیں۔ ان کی حالت ویسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ دولت کے گرد گھومتا ہوا شہر ایک عجیب گھن چکر ہوتا ہے۔ بے تحاشا دولت اپنا راستہ بڑے گھناؤنے طریقے سے نکالتی ہے۔

دنیا کے ہر بڑے شہر میں یہ راستے ایسے نکلے کہ الامان والحفیظ۔ وہ جرم چھوٹی بستیوں میں خواب ہوتے ہیں یہاں معمول بن جاتے ہیں۔ چوری، ڈاکے اور ہزنی سے لے کر جسم فروشی، عیاشی اور نشیات سے لے کر کالے دھن تک ان شہروں کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ سکون کی جگہ بے سکونی راج کرتی ہے اور قناعت کی جگہ دولت کی ہوس اور دکھ سکھ بانٹنے کی بجائے ساتھ والے پڑوسی سے بھی لافعلی رواج بن جاتی ہے۔

لیکن پھر بھی ہم یہاں دوڑے چلے آتے ہیں دولت کا کاروبار کرنے والے وہ تعلیم، وہ صحت اور وہ زندگی کی سہولتیں چھوٹے شہروں تک جانے ہی نہیں دیتے کہ اگر ایسا ہو گیا تو اس شہر میں قیمتیں ہزاروں سے لاکھوں سے کروڑوں تک کیسے پہنچیں گی؟

اس موقع پر مجھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ قول یاد آ رہا ہے جو علامہ اقبال نے مسولینی سے ملاقات میں سنایا تھا۔ مسولینی نے علامہ اقبال سے کہا اپنے بڑوں کا کوئی قول سناؤ۔

لمی میز کے دوسری جانب بیٹھے اقبال نے کہا: خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”ہم مدینے کی آبادی کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ ایک دوسرا شہر آباد کریں گے۔“

مسولینی کھڑا ہو گیا اور بولا: ”انسانیت کو بچانے کے لیے اس سے بڑا قول نہیں ہو سکتا۔“

لیکن ہم تو اپنے شہروں کو نیویارک، لاس اینجلس، بمبئی اور بنگاک بنانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ خواہ اس میں ہماری تباہی و بربادی کی کہانیاں کیوں نہ لکھی ہوں؟ ہمارے اخلاق، خاندان، شرافت اور غیرت و حمیت کا جنازہ کیوں نہ نکل رہا ہو؟



میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ اس خاتون کے ڈیٹیل پرل کے ساتھ کیسے رابطے تھے اور اغوا ہونے تک وہ اسے روزگاری بارفون کرتا رہا؟ وہ کن ایجنسیوں کے لیے کام کر رہی ہے؟ یہ سب ایک طویل بحث ہے۔ اس کے اسلامی اصولوں کے احترام کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں ہے اور اسے پال رہی ہے۔

یہ صرف چار خواتین نہیں ہیں بلکہ امریکا یورپ اور دیگر ممالک سے آزاد خیال مسلمان عورتوں میں بہت سوں کو چنا گیا جنہیں تھوڑا بہت اسلام یا قرآن کا علم ہے اور پھر انہیں ایک لڑی میں پرو کر ان سے مختلف علاقوں میں اس امت کی اساس کو تبدیل کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ ڈرتا اس بات سے ہوں کہ اس دفعہ اس امت پر کاری ضرب لگانے کے لیے عورت کو استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین کا سب سے کارگر ہتھیار ہے۔

لیکن اُمید اس بات پر ہے کہ ابھی اس قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اشک سحر گاہی سے وضو کرتے ہیں۔ جن کی آنکھوں کی حیا اور چہرے کی پاکیزگی مغرب کی پروردہ عورتوں کو بھی مسلمان ہونے پر قائل کر دیتی ہے۔ شاید اس بار بھی حملہ ناکام ہوگا کہ ڈھال ابھی تک مضبوط ہے۔ اسلام کے راستے پر چودہ سو سال سے حرف بہ حرف عمل کرنے کی ڈھال۔



خطرے میں لگا، انہوں نے اپنے حاصل کردہ وسیع اختیارات سے اپنی مقدس کتاب میں بھی تبدیلی کرنا شروع کر دی۔ ان دنوں بھی امریکا میں مختلف کلیساؤں کے ایسے پادریوں کو اکٹھا کیا گیا ہے جو بائبل کے تراجم اور اصل متن سے ایسے اشارے ختم کریں جن میں مرد اور عورت کی تفریق ہوتی ہو۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے کی بجائے اللہ کی اولاد کہا جائے۔ خداوند کی ذات کو بھی He یعنی مردانہ اشارے سے نہ پکارا جائے تاکہ تحریک آزادی نسواں کے مطالبات کے مطابق ان کی مقدس کتاب بھی مرد و زن کی درجہ بندی سے پاک ہو جائے۔

اپنے معاشرے کو آزاد خیال اور مذہبی جکڑ بند یوں سے دور کرنے والے ہمیشہ ہی سے اس راستے پر مسلمانوں کے دین میں بھی حسب منشا تبدیلی کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں۔ ایک طویل فہرست ان مسلمان اور غیر مسلم ماہرین کی ملتی ہے جنہوں نے اپنی کتابوں اور افکار کے ذریعے صدیوں پرانے اسلاف کے مروجہ طریقہ کار اور راستے کو بدلنے کی لیے عقلی دلیلوں پر عرصہ صرف کی لیکن اس امت میں دراڑ ڈالنے کا ان کا یہ منصوبہ ناکام رہا کہ یہاں نہ تو کوئی پاپائے روم قاجو یہ اختیار رکھتا ہو کہ اپنی مقدس کتاب بدل دے اور نہ ہی یہاں مذہب اور دین پر عمل کا تسلسل ٹوٹا تھا۔ اسی لیے یہ سب لوگ بے آبرو رہے اور ان کی آواز صد بھرا ٹھہری۔

لیکن مغرب اپنی چالوں سے کبھی تھک کر نہیں بیٹھا۔ ہر لمحہ اور ہر آن ایک نئے انداز سے امت مسلمہ پر، اس کی اقدار پر اور اس کے مسلمہ نظام زندگی پر ضرب لگانے کی کوشش کرتا ہے اور اس دفعہ فتنے کی شدت یوں ہے کہ یہ ہتھیار عورت کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے۔ پہلے مرد مفکرین یہ ذمہ داریاں نبھاتے تھے اب اس امی کی نام نہاد مسلمان خواتین مفکرات کو چنا گیا ہے۔

جن میں سے ایک کو اس ہفتے کے ”ٹائم“ میگزین نے ان لوگوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جو دنیا کے لیڈر ہیں۔ یہ خاتون جس کا نام ہوسی علی ہے صومالیہ کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی اور پھر ہالینڈ میں جا کر آباد ہو گئی۔ یہ وہی خاتون ہے جس نے چند ماہ پہلے ایک فلم بنائی تھی جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ اسلام عورت پر ظلم اور زیادتی کرتا ہے اور اس نے توہین کی حدیں پار کرتے ہوئے ایک خاتون کے جسم پر قرآنی آیات ایسے لکھی تھیں جیسے کوئی کیٹنوس ہوتا ہے۔ یہ خود تو اس توہین کے غیظ و غضب سے بچ گئی لیکن اس فلم کا ساتھی پروڈیوسر دان گوغ قتل کر دیا گیا۔

اس قانون پر جس دوسری عورت نے ٹائم میں مضمون لکھا ہے وہ ارشاد مانجی ہے جو کینیڈا میں رہتی ہے اور ایک ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے بھی اسلام پر اپنی کتابیں تحریر کر کے اسے مغرب کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیا ہے اور عورت کی آزادی کی تشریح کی ہے۔ تیسری اسری نعمانی ہے جو امریکا میں مقیم ہے۔ اسلام کی ماڈرن تشریح پر دو کتابیں۔ Standing alone in Macca اور Tantrica لکھ چکی ہے۔

جس کے مطابق وہ مردوں کے عورتوں سے بغل گیر ہونے، لباس کو موسم کے مطابق مختصر کرنے، مسجد میں ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کے علاوہ بہت سے معاملات پر اس نے ایک بے ربط استدلال قرآن سے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہی اسری نعمانی ہے جس نے چوتھی مفکر مسلمان عورت امینہ داؤد کو جو امریکا میں درجنیا یونیورسٹی کی پروفیسر ہے قائل کیا کہ نیویارک میں نماز کی امامت کرے اور پھر اس نے اس طرح امامت کی کہ عورتیں نیگے سر، پیٹ شرت میں لباس مردوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس نے خطبے کی کتاب کو پاؤں کے پاس رکھا اور نماز شروع کرادی۔

ادھر حالات یہ ہیں کہ گزشتہ چند مہینوں سے بھرتیوں کے مرکز ویران ہیں اور تینوں افواج میں بھرتی کے لیے لوگ ان مراکز کا رخ نہیں کرتے۔ دوسری جانب امریکا نے اپنے تین لاکھ پچاس ہزار ریزرو فوجیوں کو عراق بھیجنے اور ایک مدت تک قیام کرنے کا پلان بنایا۔ یہ لوگ گئے ہیں لیکن ان میں سے 50 فیصد ایسے ہیں جنہوں نے دوسری مدت کے لیے اپنا نام فہرست سے خارج کر دیا لیکن ان ریزرو فوجیوں کا حال یہ ہے کہ اس کے سربراہ نے اس ہفتے امریکا کو خط لکھا ہے کہ عراقیوں کے خوف نے انہیں ایک مردہ طاقت اور ٹوٹی ہوئی قوت بنا دیا ہے۔

ان دنوں امریکا کے تمام اخبارات، رسالوں اور چینلوں پر فوج میں بھرتی کے اشتہارات کی بھرمار ہے۔۔۔۔۔ پورے ملک میں 150 ملین ڈالر کے خرچے سے ایک اشتہاری مہم شروع کی گئی ہے لیکن نتیجہ صفر ہے۔ حالت یہ ہے کہ امریکی ریزرو فورس جبری بھرتی کے خلاف اٹھ کھڑی ہو سکتی ہے۔

اس کا آغاز گزشتہ دنوں نیویارک میں ایک کانفرنس سے ہو بھی چکا ہے جس میں کچھ پرانے فوجی اور بھرتی کے مخالف جمع ہوئے اور انہوں نے امریکی حکومت کے ان بودے اور گمراہ کن اشتہاروں کا پول کھولا جس میں فوج ہی بھرتی نہیں بلکہ ٹریننگ کور کے نام پر لوگوں کو بھرتی کا جھانسا دیا جا رہا ہے۔ سب سے بڑا احتجاج اس وقت ہوا جب مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بھرتی کے سیلوں میں فوج میں بھرتی کرنے والوں کو داخل ہونے سے روک دیا گیا۔

امریکہ میں نیویارک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر روڈریگو ز اور بیس طالب علموں کو ان فوجی بھرتی کے مراکز کے خلاف احتجاج کرنے پر معطل کر دیا گیا ہے اور اب اس یونیورسٹی میں ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ یہ وہی ویت نام والی حالت آئینچی ہے جب فوجی بھرتی سے خوفزدہ پچاس ہزار امریکی کینیڈا بھاگ گئے تھے۔

آج بھی ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب کینیڈا اس وقت تک پناہ نہیں دیتا جب تک آپ وہاں جائیں نہیں۔ اس کا بھی حل نکال لیا گیا۔ نوجوان پہلے سیاح کے روپ میں کینیڈا جاتے ہیں اور پھر وہاں پناہ کی درخواست کر دیتے ہیں۔ اسے وہاں ”مہاجر“ کا درجہ دیا جاتا ہے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ جس امریکا کے ظلم و ستم سے لاکھوں لوگ اپنے گھر بار چھوڑ جاتے ہیں، جس کے تشدد سے فلوچہ انسانی تاریخ کا وہ کھنڈر بن جاتا ہے، جس کے تین لاکھ باشندے خیموں اور بیابانوں میں رہ رہے ہیں، جس کی دہشت سے نہ شہروں میں امان ہے اور نہ ریگستانوں میں، وہاں اس کے اپنے شہری اس قتل گاہ کے خوف سے بھاگ کر ”مہاجر“ بنتے پھر رہے ہیں۔

سچ ہے جو بچوں کو قتل کرنے نکلتا ہے وہ ایک خوف ساتھ لے کر نکلتا ہے کہ خود بھی قتل ہو جائے گا اور یہی خوف ہے جو آج پوری امریکی قوم کو تھر تھر کانپنے پر، چھپنے پر اور ”مہاجر“ بننے پر مجبور کر رہا ہے۔



## خوف میں مبتلا بھگوڑے

(26 ربیع الاول 1426ھ بمطابق 06 مئی 2005ء)

1986ء سے امریکا کا اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ دہشت گردی کے بارے میں ہر سال ایک رپورٹ شائع کرتا ہے جس کے آغاز میں دہشت گردی کے بارے میں ایک مختصر سا نوٹ، لوگوں کے رویے اور حکومتوں کا تعاون درج ہوتا ہے اور پھر آخر میں اعداد و شمار کے روپ میں علاقہ، ملک، واقعہ کی تفصیل اور مرنے والوں کی تعداد درج ہوتی ہے۔ ایک طویل عرصے سے سال بہ سال یہ رپورٹ امریکی حکام تک پہنچتی رہی ہے لیکن اس سال جب یہ رپورٹ امریکی حکام تک پہنچی تو امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس نے حکم جاری کیا کہ صرف رپورٹ کا پہلا تعارفی اور ابتدائی حصہ جاری کیا جائے اور باقی اعداد و شمار اور تفصیلات کو حذف کر دیا جائے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ایش جھوٹ بول کر امریکی عوام کو یہ تسلی دلانے میں مصروف ہے کہ افغانستان اور عراق پر امریکی قبضے اور حملے کے بعد کا دنیا میں دہشت گردی کے واقعات کم ہو گئے ہیں لیکن رپورٹ کے اعداد و شمار نے بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ رپورٹ کے اعداد و شمار کے مطابق 2003ء میں دہشت گردی کے کل 172 واقعات ہوئے جب کہ 2004ء میں ان کی تعداد 655 ہو گئی اور سب سے خطرناک بات یہ تھی ان میں 90 فیصد واقعات عراق میں ہوئے جہاں امریکی قابض ہیں اور دنیا بھر میں وہ اسے امن کا گوارہ بنانے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

یہ حقیقت اس لیے چھپائی گئی ہے کہ میڈیا کے سامنے اور دنیا کے سامنے امریکا کی ناکامی کو چھپایا جاسکے۔ ایسا بھی ہے لیکن اس کی اصل وجہ اس سے زیادہ گہری اور امریکی حکومت کے لیے تشویش ناک ہے۔ یہ وجہ امریکا کے فوجی بھرتی کے قومی ادارے کی وہ حیران کن اور حکومت کے لیے تشویش سے بھری ہوئی رپورٹ ہے جس میں انہوں نے امریکی حکومت سے اگلے 75 دن کے اندر قانون میں تبدیلی کر کے فوج میں بھرتی کے طریقہ کار کو بد لنے اور لازمی قرار دینے کے لیے کیا ہے۔

یہ رپورٹ بھی گزشتہ ہفتہ پیش کی گئی ہے اور اس کی سفارشات کے مطابق اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک دن امریکا میں موجود فوجی چھاؤنیاں خالی ہو جائیں گی اور لوگ فوج میں بھرتی کے خوف سے ملک چھوڑ جائیں گے۔

اس وقت امریکا کی کل 4,82,000 فوج میں سے تین لاکھ فوجی عراق، افغانستان، جنوبی کوریا اور یوگوسلاویہ میں تعینات ہیں۔ یعنی تین فوجیوں میں سے دو ملک سے باہر ہے اس کے باوجود نہ تو وہاں امن قائم ہوا ہے اور نہ ہی لوگوں کی مخالفت انہیں امریکی مقاصد حاصل کرنے دے رہی ہے۔ اگر امریکا کے حالات ان ملکوں میں چند ماہ اور ایسے رہے تو اسے اپنی سیکورٹی کے لیے مزید ایک لاکھ فوجی بھرتی کرنے ہوں گے۔

یہ بچے کام کرتے کرتے اونگھتے تو مشینوں کے پنوں پر گر پڑتے، کسی کا بازو کٹتا اور کسی کا ہاتھ اور کوئی اپنی معصومیت کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاتا۔ اسی دور میں مزدوروں کی مانگ بڑھی تو دولت کے لالچ اور دنیا کمانے کی حرص میں برصغیر سے ہزاروں لوگ اپنے کھیت کھلیاں چھوڑ کر بحری جہازوں میں بیٹھ کر انگلستان کے ساحلوں پر اترنے لگے۔ ملوں کے مالک ان ہوس زرمیں گرفتار لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور پھر یہ وہاں کی صنعتی ترقی کا پہرہ چلانے میں مددگار بننے لگے۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کا شوق دیدنی تھا۔ وہ انگلستان میں مقیم اپنے رشتے داروں کو خط لکھتے، مٹیس کرتے کہ ہمیں وہاں بلا لویہ لوگ انہیں وہاں بلاتے۔ پھر ایک طریقہ بہت عام ہو گیا کہ وہ اپنے مل مالک کو کسی سالگرہ وغیرہ پر گھر مدعو کرتے جہاں اپنے بھائی کا دکھڑا روتے اور یہ بھی کہتے کہ اس کا سارا بوجھ ان پر آن پڑا ہے۔ یوں اسے بھی کسی مل میں ملازمت مل جاتی۔ اس زمانے کے انگلستان کے اخبارات ان کی کہانیوں سے بھرے ہوئے ہیں کہ یہ لوگ سال میں کئی کئی دفعہ اپنی سالگرہ مناتے، لیکن مل مالک اپنی غرض کی وجہ سے ان کے رشتہ دار کو ملازم بھی رکھتا اور ان پر احسان بھی دھرتا۔

یوں انگلستان کے شہروں، برمنگھم، پریڈ فورڈ اور مانچسٹر میں ان لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ان کے علاقے اور کالونیاں بنتی گئیں۔ کچھ نے اپنے بیوی بچوں کو وہاں بلا لیا اور کچھ نے وہیں پر موجود انگریز خواتین سے شادیاں کر لیں۔ یہ شادیاں دوسری جنگ عظیم کے بعد بہت زیادہ ہوئیں جب دونوں جانب سے مرد بہت تعداد میں جنگ کی نذر ہوئے تو عورتوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ انہیں مناسب رشتوں کے لیے ان ایشیائی باشندوں کی طرف دیکھنا پڑا۔

ادھر اپنے ملکوں میں ان کے گھر اور گاؤں بے آباد ہوئے اور آج بھی بڑے بڑے مکانوں میں ایک بوڑھا باپ، بوڑھی ماں اور ایک بھینس بندھی نظر آتی ہے۔ باقی سارا گھر انگلستان جا آباد ہوا، لیکن انگلستان میں ان خاندانوں پر جو گزری وہ مزید قیامت خیز ہے۔ کسی کی بیٹی اس ماحول میں جوان ہوئی، اس نے ایک دن اپنے بوائے فرینڈ کے پاس جانے کی اجازت چاہی، ماں رونے لگ پڑی اور باپ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔

کسی نے اپنی بیٹی کو پارک میں کسی غیر لڑکے کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھ کر تپشور سید کیا۔ بیٹی پولیس تک جا پہنچی اور باپ کو تشدد کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ کئی نفسیاتی مریض ہو گئے جن کے علاج کے لیے انگلستان میں خاص طور پر TRANS CULTURAL UNIT OF PSYCHIATRY (بین الثقافتی نفسیاتی علاج گاہ) کھولیں گئیں جہاں ایسے مخصوص کلچر کے مارے ہوئے لوگوں کا علاج ہوتا تھا۔ پریڈ فورڈ کا یونٹ آج بھی سب سے بڑا ہے۔

ان لوگوں نے یہ سب کچھ سہا لیکن روپے کی طلب اور آسائش کی خوں نے انہیں گھر لوٹنے نہ دیا۔ ان کی زندگی کی ساری بھاگ دوڑ اسی دولت اور آسائش کے گرد گھومتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں جتنے بھی ایکشن آئے انہوں نے ہر پارٹی کے سامنے ایک ہی طرح کے مطالبات رکھے۔ ہماری صحت، تعلیم، ہماری نوکری کا تحفظ، ہمارے لیے سوشل سیکورٹی اور ہمارے عزیز واقارب کے ملنے کے لیے ویزوں میں سہولت۔

زیادہ سے زیادہ مطالبہ یہ ہوتا کہ ہمارے بچوں کے لیے علیحدہ اسکول کھولے جائیں، لیکن یہ مطالبہ کبھی بھی نہ مانا گیا حالانکہ انگلستان میں یہودیوں اور کیتھولک بچوں کے لیے علیحدہ اسکول موجود تھے۔ البتہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی پارٹی میں ان کے لالچ میں ڈوبے مطالبات پورے کرنے کا دلاسہ دیتی اور کچھ پورے بھی کر دیتی۔

مادیت اور دنیاوی عیش و عشرت کی طالب اس مسلمان قوم کی اس ذہنیت سے لیبر پارٹی کے لیڈر ان خوب واقف تھے، وہی ہوا۔ وہ جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، جن کے سپاہیوں کے چہروں پر

## مادی آسائش میں ابھی امت مسلمہ

(04 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 13 مئی 2005ء)

کیا عجیب و غریب اور حیران کن خبر ہے کہ وہ شخص جن کی افواج افغانستان اور عراق میں امریکی افواج کے شانہ بشانہ علاقوں کے قتل عام میں شریک ہوئیں، لاکھوں مسلمانوں کا خون کیا۔ ابو غریب جیسے بدنام زمانہ اسکیڈل جس کی فوج کے سپاہیوں کی مدد سے ممکن ہوا جس میں مسلمان قیدیوں کی تذلیل، بے حرمتی اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شخص اپنے ملک کے سفید فام لوگوں کے ووٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ووٹ سے جیتا۔ اس کی جماعت کو 37 فیصد اور اس کی مقابل جماعت کو 33 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ لیکن ان چار فیصد زائد دونوں میں مسلمانوں کے ووٹ شامل تھے جنہوں نے اس امت مسلمہ کے مجرم کو برسر اقتدار لانے میں مدد دی۔

یہ احمیہ بھی ہے اور سانحہ بھی۔ یہ امت مرحوم کا ماتم کا مقام بھی ہے کہ جس شخص کے خلاف برطانیہ کی تاریخ میں سب سے بڑا مظاہرہ ہوا جسے خود اس کے عوام نے انسانیت کا قاتل اور معصوم اور بے گناہ لوگوں کی جانوں سے کھیلنے والا قرار دیا اسے اسی قوم کے ووٹوں نے جیتنے میں مدد دی۔ ووٹ دیتے ہوئے وہ بھول گئے کہ مرنے والے انہیں کی طرح کلمہ پڑھتے تھے، مسجدوں میں سجدہ ریز ہوتے تھے، ایک اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

یہ لوگ کون تھے، کیسے تھے اور کس مفاد میں گرفتار تھے؟ یہ اب مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا ایک اہم سوال بن گیا ہے ذرا ان مسلمانوں کی برطانیہ میں بستیاں بسنے کی تاریخ کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی چار بڑی طاقتیں انگریز، ولندیزی، پرہنگلی اور ہسپانوی دنیا کی کمزور قوتوں کو فتح کرنے اور انہیں مغلوب کرنے نکلے ہوئے تھے۔ جنوبی امریکا پر ہسپانوی پرچم لہراتا تھا تو برصغیر میں انگریزی، انڈونیشیا میں ولندیزی تو بحر الکاہل میں پرہنگلی۔ ان ملکوں کی دولت لوٹ کر ان اقوام نے اپنے ہاں ترقی اور تعمیر کی راہیں کھولیں۔

یہ وہی دور تھا جب موجود انگلستان میں صنعتی انقلاب آ رہا تھا۔ برصغیر کی ملل اور لٹھے کی کھڑیاں بند ہو رہی تھیں اور مانچسٹر، برمنگھم میں نیکسٹائل ملیں لگ رہی تھیں۔ یہی صنعتی انقلاب تھا جس کا مکروہ چہرہ آج بھی چائلڈ لیبر کے داغ لیے ہوئے ہے۔ پورے انگلستان میں گرجوں کے ساتھ بنے ہوئے یتیم اور بے سہارا بچوں کے اداروں سے فلاح اور بہبود کے نام پر بچوں کو حاصل کیا جاتا اور پھر ان سے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے ملوں میں کام لیا جاتا۔ ظلم کا ایک منظر تو آج بھی دنیائے ادب میں رو گئے کھڑے کر دینے والی تحریروں کا حصہ ہے۔ وہ یہ کہ کارخانوں کی چنیاں تنگ ہوتی تھیں ان میں بڑے مرد نہیں گھس سکتے تھے۔ ان میں ننھے ننھے بچوں کو صاف کرنے کے لیے اتارا جاتا اور جب وہ ان گرم چنٹیوں سے باہر نکلتے تو ان کے جسم آبلوں سے بھرے ہوتے۔

مسلمانوں کی عصمت تار تار کرنے کے داغ تھے۔ جن کے ظلم اور بربریت کے خلاف دنیا کے ہر بڑے شہر میں لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ جب مسلمان ووٹروں کے پاس گئے تو یہی کیا۔ عراق تو ہزاروں میل دور ہے، افغانستان تو خود پس ماندہ ہے۔

تم ان کے درد میں کیوں اپنے مستقبل، اپنی آسائش اور اپنے آرام کو برباد کرتے ہو؟ اپنی زندگی کے عیش سے غرض رکھو اور آرام سے رہو اور پھر اس ملک میں بسنے والے لاکھوں مسلمانوں نے صرف ویزہ کی سہولت، سوشل سیکورٹی کے وظائف اور ہسپتال کی دوائیوں کے عوض امت مسلمہ کے خون کا سودا کر دیا۔ سوچتا ہوں کہ جب یہ لوگ ٹوٹی بلیر کے ساتھیوں کے بلیٹ بکس میں دوٹ ڈالنے جا رہے تھے انہیں کہیں بھی عراق میں روتی ہوئی مائیں ہلکتے ہوئے بچے اور خون میں لتھڑے ہوئے لوگ نہیں یاد آئے تھے۔

جب وہ بکس میں دوٹ ڈال رہے تھے ان کی آنکھوں کی سامنے ٹھڈے مارتے سپاہی، بارات پر گولیاں برساتے ہیلی کاپٹر اور پوری پوری رات گرجتے، گرتے آگ برساتے میزائل گھومے ہوں گے۔ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان جسد واحد کی طرح ہے اگر ایک حصے کو کاٹنا چھتا ہے تو پورے بدن کو تکلیف ہوتی ہے۔“

پتہ نہیں یہ سوال مجھے کن سے پوچھنا چاہیے؟ جن کی کھال مادی آسائش نے اتنی موٹی کر دی ہے کہ اس پر کسی درد کا اثر ہی نہیں ہوتا۔



## کون کس کا ساتھی؟

(11 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 20 مئی 2005ء)

چار صدیاں پہلے یہاں وہ انتہا پسند عیسائی قوم حملہ آور ہوئی تھی جس نے قرطبہ اور غرناطہ میں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ ظلم و تشدد کا عالم یہ تھا کہ اس مملکت ہسپانیہ میں ایک بھی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ جو بچ گئے وہ بھاگ کر افریقہ اور سلطنت عثمانیہ میں پناہ گزین ہو گئے۔ مسجد قرطبہ کو گر جا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے دروازے پر بڑی سی صلیب لٹکا دی گئی۔ قرآنی آیات مٹا کر عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصاویر بنائی گئیں اور بت نصب کیے گئے۔ یہ سب آج بھی اسی طرح ہے اور مسجد قرطبہ اذانوں کی آواز کی بجائے پادریوں کی آوازوں سے گونجتی ہے۔

یہ قوم جسے عرب ہسپانوی اور یورپ Spanish کہتا ہے، جب ہزاروں میل کا سمندری سفر کر کے فلپائن کے جزیروں پر اتری تو شمالی علاقوں میں تو اسے کامیابی حاصل ہو گئی لیکن دو سو سال کی خانہ جنگی کے باوجود وہ جنوب میں موجود مسلمانوں کے علاقے جسے مورد کہا جاتا ہے، کامیاب نہ ہو سکی۔

پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں رہنے والے یہ سیدھے سادھے مسلمان جن تک کلمہ تو حید مسلمان تاجروں اور مبلغوں کے ذریعے پہنچا تھا، ان کے سامنے ایسی دیوار بن گئے جیسے قرون وسطیٰ کے مسلمان جہاد کی آواز پر لبیک کہا کرتے تھے۔ کہیں اور کسی مقام پر بھی ان مسلمانوں پر اسپین کی فوجیں غلبہ حاصل نہ کر سکیں۔ منڈاناؤ اور سولو کے علاقے میں آباد یہ مسلمان اپنی حریت اور آزادی کی حفاظت کرتے رہے اور یہ مقامات کلمہ تو حید سے گونجتے رہے۔

دوسری جانب شمال کے فلپائن پر میلا سے لے کر باگیو تک اسپین کے فوجیوں نے تشدد کے ذریعے مقامی آبادی کو رومن کیتھولک عیسائی ہونے پر مجبور کیا۔ ظلم کی داستانیں اتنی کر بناک ہیں کہ صرف چند واقعات پڑھنے کے بعد نہ حوصلہ ساتھ دیتا ہے اور نہ ہی آنکھ کے آنسو تھمتے ہیں۔ یوں شمال کا فلپائن آج رومن کیتھولک عیسائیوں کا دنیا بھر میں ایک بہت بڑا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر گلی اور ہر محلہ کسی نہ کسی سینٹ کے نام پر ہے۔

جنسی تشدد کا عالم یہ ہے کہ ایک کثیر تعداد اس نسل کی ہے جو ہسپانوی سپاہیوں کی زیادتیوں سے وجود میں آئی۔ دنیا کے رنگ بدلے تو اسپین کی جگہ امریکا نے لے لی۔ یہاں کے عوام کو آزادی دلانے کے نام پر آنے والے امریکی سپاہی پھر اس ملک پر قابض ہو گئے لیکن نام نہاد اقتدار عوام کے پاس، چھاؤنیوں میں فوج امریکی اور حکم امریکا بکا در کا۔ لیکن اس ساری تبدیلی میں ایک نقصان یہ ہوا کہ وہ مسلمان جو اسپین کی سپاہ سے جنگ کر کے آزاد حیثیت میں زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہے تھے، پرفریب طریقے سے وسیع تر فلپائن کے اندر ضم ہو گئے، لیکن چند سالوں میں ہی



انہیں احساس ہو گیا کہ اسپین کے سپاہی تو ہمارے کھلے دشمن تھے۔ میدان جنگ میں لے کر وار کرتے تھے۔ اس کی تو ہماری اقدار، روایات، شرم و حیا اور اخلاقیات پر چھپ کر، بھیس بدل کر اور آرٹ کچھ اور روشن خیالی کے نام پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور یوں یہ حریت کے پیکر ایک دفعہ پھر میدان جنگ میں اتر آئے۔ اب سامنے طاقت بھی بہت بڑی تھی اور سامان حرب بھی قلیل تھا۔

یہ سب آج مجھے اس لیے یاد آ رہا ہے کہ گزشتہ ہفتے عالمی میڈیا پر دو اہم خبریں جلوہ گر ہوئیں۔ ایک خوش کن اور دوسری مکر کی چالوں سے بھری ہوئی۔ رائٹرز کا صحافی سنو رائٹ گروڈنگ فلپائن کے شہروں سے ایک حیران کن خبر لے کر لوٹا۔ اس مسلمانوں کے علاقوں سے جنہیں آج دہشت گردی کی جنگ میں اسامہ بن لادن اور ابوسفیان کا ساتھی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مندوناؤ میں جہاں ساٹھ لاکھ پیدائشی مسلمان ہیں، گزشتہ چند سالوں میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ صرف بوگیلو شہر کی المعارف مسجد میں ہر ماہ سات نئے عیسائی مسلمان ہوتے ہیں اور پھر ان لوگوں کے ساتھی بن جاتے ہیں جن کے خلاف پوری دنیا ہے۔

اس نے ایک اسلام قبول کرنے والے شخص عیسیٰ سے کہا: ”تم کو اسلام کے متعلق کیسے پتہ چلا؟“

اس نے جواب دیا: ”مجھے اسلام کا پتہ بائبل سے ملا۔“

حیران ہو کر سوال کیا: ”وہ کیسے؟“

کہنے لگا: ”اس کے باب 8، آیت 32 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا جی تلاش میں نکلو کیونکہ سچ تمہیں آزاد کر دے گا۔“

اور پھر میں جگہ جگہ تلاش کرتا رہا اور اسلام کے سچ تک جا پہنچا۔

عیسیٰ اور ایسے دوسرے عیسائی جو مسلمان ہو جاتے ہیں انہیں فلپائن میں بالک اسلام (Balic Islam) کہتے ہیں۔ اس نمائندے کے مطابق ان نو مسلم لوگوں پر جس قدر حالات تنگ کیے جا رہے ہیں، ایسا کبھی اسپین کی حکومت کے دور میں بھی نہیں ہوا تھا۔ کہیں دھماکہ ہو فوج سے لڑائی ہو، کوئی فوجی مارا جائے، سب سے پہلے ان لوگوں کو اٹھا کر لے جایا جاتا ہے جو تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہیں لیکن حیرت کی انتہا یہ ہے کہ کئی ہفتوں کے تشدد کے بعد جب یہ لوگ واپس لوٹتے ہیں تو صرف ان کی استقامت دیکھ کر لوگ مزید اسلام قبول کرنے لگتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے مکہ کے کفار مسلمانوں پر تشدد کرتے تو ان کی استقامت دیکھ کر ہدایت کے طالب یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوتے کہ یہ لوگ جو اتنی مصیبتوں کے بعد بھی اپنے دین پر قائم ہیں تو ضرور ان کے پاس جو ہے وہی سچ ہے۔

دوسری جانب وہ خبریں ہیں جو گزشتہ ایک ماہ سے گردش کر رہی ہیں۔ وہ جو اس جنگ میں امریکا کے ساتھی ہیں اور مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد سے خوفزدہ ہیں، سب فلپائن کی حکومت سے یکجہتی کا اظہار کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کے معاہدے کر رہے ہیں۔ امریکا جس نے 1952ء میں اپنے فوجی اڈے وہاں ختم کر لیے تھے اب واپس وہاں جا رہا ہے۔

دوسو ملین ڈالر فوجی امداد جو آدھی ہو گئی تھی اب اسے دوبارہ بڑھا دیا گیا ہے۔ امریکی جریدے ”ٹائم“ نے ایک مکمل ہائٹل رپورٹ بنائی ہے تاکہ امریکی پالیسی سازوں کو قائل کرے کہ اس وقت فلپائن کی فوج کمزور ہے اور مسلمانوں کی ”دہشت گردی“ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اسے مضبوط بنایا جائے۔ کمزور، نہتے، بے سروسامان مسلمان ظلم سہتے

ہیں لیکن حیرت ہے ان کے زخموں سے رستے خون سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن میرا دکھ اور میرا المیہ عجیب ہے۔ میں اس ظلم اور مظلوم کے درمیان جنگ میں ایک ملک کا باشندہ ہوں جس کے لوگوں کو علم ہی نہیں کہ ہم معاہدوں پر دستخط کرتے وقت کن طاقتوں کے ساتھ ہیں؟

ہمارے نامہ اعمال میں یہ گواہی ہمارے خلاف استعمال ہوگی، لیکن ہمیں اس بات کی نہ پروا ہے اور نہ احساس۔ ایسے میں کوئی ہماری وفاداریوں کا کارٹون بنائے یا ہماری مقدس کتب کی توہین کرے۔

ہم وہ بے حس لوگ ہیں کہ اس توہین پر ایک مغلوب اور محکوم قوم جلال آباد میں احتجاج کے لیے اٹھتی ہے اور ہمارے اعمال کی سیاہی ہمارے منہ پر ٹلی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کل مندوناؤ میں مظلوم مسلمان اپنے ظلم کے جواب میں احتجاج کرنے نکلیں تو وہاں بھی نشانہ ہم ہی ہوں، جو جن کے ساتھ ہوگا ان کے حصے میں آنے والی نفرت سمیٹے گا۔



لیکن یہ لوگ بھی بلا کے جانباز ہیں۔ جہاں مسلم امہ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے وہاں یہ لوگ موجود ہوتے ہیں۔ چچینیا ہو یا کشمیر، افغانستان ہو یا عراق اس دھرتی کے لوگ اپنی جان کا نذرانہ دینے کے لیے تیار..... لیکن اس دفعہ تو مسئلہ ان کی اپنی سرزمین کا ہے۔ ان کے ہم وطن ساتھی کریموں کی ظلم و زیادتی سے تنگ آ چکے تھے۔ وہ اس پورے جبر کے نظام کے خلاف اٹھنا چاہتے تھے۔ ادھر امریکا اور مغربی دنیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پورے ازبکستان میں کوئی ایک بھی وفادار لیڈر میسر نہ تھا۔ لوگوں کے دل ان قوتوں کے ساتھ دھڑکنے شروع ہو گئے تھے جنہیں امریکا اسلامک دہشت گرد کہتا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا، وہی راستہ جو عراق، افغانستان اور چچینیا میں آزمایا گیا۔

طاقت کے زور پر کھپتی حکمران مسلط کر دیا اور پھر اس مہذب دنیا کے سامنے کسی کے دوسرے ہفتے کے آغاز میں نہتے لوگوں کے خون سے ہولی بھیلی گئی۔ وہ جو کسی اسلحہ سے لیس نہ تھے جن میں عورتیں، بچے اور بوڑھے شامل تھے جو صرف اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو پولیس اٹھا کر لے جاتی ہے اور پھر ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں کسی مسلمان کی زبان سے یہ ظلم کی داستان نہیں سنانا چاہتا۔ آئیے مغرب کے گواہ صحافی کیا کہتے ہیں؟ ایسوی لیڈ پر لیس کے نمائندے نے کہا کہ ہفتے کی صبح جب اندیجان کے شہر پر ظلم و دہشت کے بعد اداسی اور غم طاری تھا۔ حکومتی فوج چارٹرڈ اور ایک بس لے کر آئی اور سڑک پر بکھری ہوئی لاشیں اٹھانے لگی۔ اس نے اپنے سامنے تین سو لاشیں اٹھاتے ہوئے دیکھا، پھر تو لوگ طیش میں تھے۔

ایک قصبے میں انہوں نے پولیس تھانے کو آگ لگا دی اور گورنر کو ریغمال بنالیا۔ اندیجان میں تھانے پر حملہ کیا ہتھیار حاصل کیے اور ان 23 ازبک دکانداروں کو رہا کر لیا جن پر اسلامی شدت پسندی کا الزام تھا۔ یہ سب لوگ جب عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سمیت شہر کے بازاروں میں حکومت کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے تو چاروں طرف سے فائر کھول دیئے گئے۔ جو کوئی جس عمارت میں پناہ لیتا اسے آگ لگا دی جاتی تاکہ وہ وہیں زندہ جل جائے۔ ریڈیو کی نشریات ان ظلم کی داستانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لوگ غصے میں بھی تھے اور آنسوؤں کی لڑیاں بھی ان کی آنکھوں سے جاری تھیں۔ تمام عالمی اداروں کو نشریاتی ایجنسیوں کو خبریں دینے اور نشر کرنے سے روک دیا گیا۔

وہ ملک جس نے 11 ستمبر کے بعد سب سے پہلے امریکا کو افغانستان کے خلاف اپنے اڈے دیے جس میں اگر آج ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھتی ہو تو امریکا کا وہ خواب جس کے ذریعہ وسطی ایشیا کے قیمتی ذخائر کو حاصل کرنا ہے ٹوٹ جاتا ہے، جو اس پورے خطے میں آزادی کی تحریکوں کو ایک نئی روشنی اور تازگی عطا کر سکتا ہے، جس کے اقتدار پر کریموں کے بعد کسی اور کی جھلک دکھائی نہیں دیتی جو امریکا کا حامی ہو..... تو پھر ایسے ملک میں اسی کی فوج سے ایسے ہی ظلم روا رکھے جاتے ہیں۔ امریکا کی مجبوری یہ ہے کہ اب اس کے پاس فوج نہیں ہے کہ باہر بھیج سکے۔

اس کے ہر تین میں سے دو سپاہی ملک سے باہر ہیں۔ جو باہر ہیں وہ خوف میں ہیں، جو اندر ہیں وہ فوج چھوڑنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ جنرل مائر کا کہنا ہے ہم عراق اور افغانستان میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ امریکا میں جبری بھرتی کا آغاز نہیں ہو سکتا کہ پوری قوم کو صدیوں سے تقیث کا عادی بنایا جا چکا ہے۔

ایسے میں صرف مسلمانوں میں سے ہی کاسہ لیس، ٹوڈی اور غدار ڈھونڈے جاتے ہیں جو اپنے ہی ہم وطنوں کا خون بہا دیں لیکن شاید اب دیوار گرنے والی ہے۔ راستے کھلنے والے ہیں کہ جب نہتے سینے پر گولیاں کھانا سیکھ لیں تو بندوقیں خاموش ہو جایا کرتی ہیں۔

## صیاد کے دن تھوڑے ہیں

(25 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 03 جون 2005ء)

یہ ابونصر فارابی، ابن سینا، الخوازمی، البیرونی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین، علماء اور سائنس دانوں کا ملک رہا ہے۔ شاہراہ ریشم کے کنارے واقع یہ ملک صدیوں پرانی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے..... لیکن اسلام کے در آنے سے اسی سرزمین تے جہاں دنیاوی علوم میں اپنے سکے جمائے وہیں رشد و ہدایت کے چراغ بھی روشن کیے۔ یہ کبھی تیمور کے زیر سایہ ترکستان جیسے ایک ملک کا بھی حصہ رہا، شمرقد و بخارا کی درس گاہیں رہنمائی کا سرچشمہ بنی رہیں۔

پھر اس پورے خطے کو رنگ، نسل اور قوم کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا۔ سوویت یونین کے کمیونسٹ حکمران یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان کی شناخت ختم کرنے کے لیے اسے رنگ، نسل اور قوم کی بنیاد پر تقسیم کر دو۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے یہ وہی لوگ تھے جو تین صدیاں اسلامی شعائر کے تحفظ کے لیے طرہ کمیونسٹوں سے ٹکراتے رہے۔ ان کی تاریخ ان ہزاروں شہدا کے خون سے رنگین ہے جو کمیونسٹ انقلاب کے بعد لادینیت کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔

دائم اور قائم اقتدار تو صرف اللہ کا ہے۔ وہ جو 1917ء میں ہیرودین کروں کے تخت پر متمکن ہوئے تھے، جن کا خواب پوری دنیا کو کمیونسٹ بنانا تھا، جنہوں نے 75 سال تک مسجدوں کو تالا لگائے رکھا اور قرآن پاک کے نسخے تک بازاروں سے غائب کر دیتے تھے، 1991ء میں یوں زمین بوس ہوئے کہ اپنے ہی شہروں میں ذلت، بے آبروی اور ہزیمت کے ساتھ ان کے بڑوں کے مجسمے زمین بوس کر دیے گئے۔ روس ٹوٹا تو تب بھی ایک چال چلی گئی۔ مسلمانوں کو ایک ملک کی حیثیت سے آزاد کرنا انہیں خطرے سے خالی نہیں لگتا تھا۔

وہ جو بنی امیہ، بنو عباس، خلافت عثمانیہ تک ایک ملک کے طور پر زندہ رہے انہیں ترکمانستان، گرغستان اور ازبکستان جیسے ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ سوچا یہ گیا کہ رنگ اور نسل عقیدے پر غالب آ جائے گی مگر وہ کہ جن کے آباء اجداد نے مشرق و مغرب کے میدانوں میں تکبیر کی آواز بلند کی تھی، جن کی نسل در نسل جدوجہد نے دین کی تعلیم کی شمع روشن رکھی تھی ان کے بارے میں یہ خواب پورا کیسے ہو سکتا تھا؟

ان سب ممالک میں سب سے خطرناک ازبکستان سمجھا جاتا تھا اور آج بھی اسے مسلم نشاۃ ثانیہ کا امین کہا جاتا ہے۔ یہ وہ واحد ملک ہے کہ روس اور امریکا کے درمیان معاہدے کے باوجود یہاں امریکی فوجیوں نے اپنے اڈے بنائے ہوئے ہیں۔ اس کے عوام کو لبرل، ماڈرن اور روشن خیال بنانے کے لیے شمالی علاقہ جات کے شہر ہنزہ میں کام کرنے والی این جی او آغا خان کویش بہافٹرز دیے گئے تاکہ وہ وہاں پر بھی اپنے دفاتر کھولے، اسکول قائم کرے اور ہسپتال چلائے۔ گزشتہ پندرہ سال سے ایک آمر مطلق اور ڈکٹیٹر کریموں کو پوری مغربی دنیا، روس اور امریکا نے مکمل مدد اور حوصلہ افزائی کے ساتھ مسلط کیا ہوا ہے تاکہ وہ اپنے باشندوں پر ظلم و تشدد سے اور جبر سے مسلمانوں سے بیگانہ رکھے۔

دو سال لگا تار کام کرنے کے بعد ٹاسک فورس نے جون 2003ء میں ایک پالیسی ترجیحات مرتب کیں جن کا نام تھا New Priorities یعنی نئی ترجیحات، 107 صفحے کی ان ترجیحات پر عملدرآمد ہوتے ہوئے آج دو سال گزر گئے ہیں۔ اس کے عملدرآمد سے کس نے کتنا ساتھ دیا اور کس نے امت مسلمہ کے مفاد کو نیلام کیا؟ ترجیحات پڑھتے جائیے اور اپنے ارد گرد لوگوں کا عمل دیکھتے جائیے!!

رپورٹ اس نکتے کے ارد گرد گھومتی ہے کہ جنوبی ایشیا میں اس وقت تک امریکی مفادات اور پالیسیاں کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک پاکستان ایک آزاد خیال، ماڈرن اور سیکولر ریاست کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن اس آزاد خیالی اور ماڈرن بننے کی کوشش میں سب سے بڑی رکاوٹ کشمیر میں جاری جہاد ہے۔ وہاں مسلمان جس طرح اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں پاکستان کے عوام ان سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور جب تک یہ جہاد کی کیفیت جاری ہے جذباتی لگاؤ بھی بڑھے گا اور اسلام سے وابستگی بھی، اس لیے آزاد خیالی کے نعرے کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کو بھی ختم کیا جائے۔ رپورٹ میں پالیسی ترجیحات ملاحظہ ہوں:

”صدر پرویز کو مجبور کیا جائے کہ لائن آف کنٹرول سے دراندازی بند کروائے اور اپنے علاقے کو بھارت اور افغانستان کے لیے حملہ آوروں کی پناہ نہ بنائے۔ اگر اس مسئلہ میں ذرا بھی کمی ہوئی تو امریکا اپنی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔ لائن آف کنٹرول کی حرمت اور تقدس کو بحال کروایا جائے اور دونوں ملکوں کو مجبور کیا جائے کہ اگر علاقوں کی کوئی مزید تقسیم یا درجہ بندی ہوتی ہے تو میز پر ہو، اسے فوج کے ذریعے یا حریت پسندوں کی کارروائیوں سے نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان میں آزاد خیال این جی او اور تعلیمی اداروں کو خطیر رقم دی جائے تاکہ وہ ان تمام اقدار کو امریکا اور یورپ میں موجود ہیں، رواج دینے میں اپنا کردار ادا کریں۔“

رپورٹ پاکستان میں مذہبی قوتوں کو ”فتح“ کرنے کے بارے میں بھی کہتی ہے کہ اسے مدرسوں کی ناکہ بندی، ان کے فنڈز پر پابندی اور ان کو ہراساں کر کے اس قوت کو توڑا جاسکتا ہے۔

ان دو سالوں میں اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا اور سب نے اپنا حصہ ڈالا، اپنے اقتدار کو طول دیا اور اپنے لیے امریکا کی نظروں میں جگہ بنائی لیکن آج ٹھیک دو سال بعد امریکی اس پالیسی پر عمل درآمد کرنا بھول چکے ہیں۔ آج وہ جس خوف کا شکار ہیں وہ ان کی تقریروں اور میٹنگوں کی کارروائیوں سے ظاہر ہے۔

ان کی فوج کا سربراہ کہتا ہے: ”امریکی فوج ایک شکست خوردہ فوج بن چکی ہے۔“

ان کے نوجوان بھرتی کے خلاف ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ افغانستان جہاں نہ تو جلوں کی روایت تھی نہ مظاہروں کی، وہاں لاکھوں لوگ ہر شہر میں قرآن پاک کی بے حرمتی پر باہر نکل آئے ہیں۔ ہر روز عراق میں اوسطاً سات حملے ہو رہے ہیں۔ پورے افغانستان میں کوئی امریکی آپ کو محفوظ خیال نہیں کرتا۔ گھبرائے ہوئے امریکی کبھی اقوام متحدہ کا رخ کرتے ہیں کبھی یورپ کا تاکہ عزت سے واپسی کا راستہ نکلے۔

ایسی حالت میں مجھے وہ لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ ان کی حالت پر رحم آتا ہے جو طاقت کے پجاری تھے۔ امریکا کی طاقت کے بت کو پوجتے پوجتے یوں تجدد پر یز ہوئے کہ سر اٹھا کر نہ دیکھا کہ وہ بت تو چند نہتوں، کمزور انسانوں لیکن جذبہ ایمانی سے پر مسلمانوں نے شکستہ کر دیا ہے، گرنے والا ہے لیکن اگر یہ بت گریں تو ہر لمحہ جدہ کرنے والوں، طاقت کے پجاریوں کو دوسرا بت کہاں سے ملے گا کہ اب بت کے پجاریوں کو بھی یقین ہونے لگا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہے؟؟؟

## پجاری اور شکستہ بت

(03 جمادی الاول 1426ھ بمطابق 10 جون 2005ء)

ابھی گیارہ ستمبر کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ پورے امریکا میں طاقت کا غماز موجود ہی تھا۔ اپنی مرضی سے دنیا کو بدلنے اور اپنے اصولوں کے مطابق چلانے کا گھمنڈ ان کے لیڈروں کی تقریروں اور ان کے پالیسی ساز اداروں کی رپورٹوں میں نظر آتا تھا۔ یوں اس وقت بھی مسلم اُمہ پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ بوسنیا کی وحشت و بربریت سب کے ساتھ تھی۔ چیچنیا کی شہر گروزی پر آگ و آہن کا سیلاب اور مسلمانوں کی بکھری ہوئی لاشوں کا منظر بھی موجود تھا۔

فلسطین میں دن بدن بڑھتے ہوئے شہدائے اعدا بھی اخبارات کی زینت تھی اور کشمیر کے قبرستانوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا..... لیکن امریکا مسلمانوں پر ہونے والے اس ظلم سے بے خبر اپنے لیے دنیا میں نئے اتحادی بنانے، نئی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے اور بالادستی کے لیے نئے اڈوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ایسے میں اس نے جنوبی ایشیا میں اپنے لیے ایک ملک کو چنا جس کا نام تھا بھارت اور پھر اس کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے، اسے اپنا قریبی حلیف بنانے اور اسے اس علاقے میں اپنا نمائندہ طاقت ور ملک بنانے کے لیے پالیسیاں مرتب کرنا شروع کیں۔

دو بڑی ٹاسک فورسوں کو اکٹھا کر کے ایک بڑی ٹاسک فورس بنائی گئی جسے جون کے مہینے میں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ایک ایسی پالیسی مرتب کرے جس سے امریکا اور بھارت دو مستقل اتحادی کے طور پر قائم و دائم رہ سکیں۔

اس ٹاسک فورس کو ابھی چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ ملک جو پوری دنیا میں دہشت گردی کی سرپرستی کرتا تھا، جس نے جنوبی امریکا کے تقریباً ہر ملک میں خون کی ندیاں بہائیں اور پھر ندیاں بہانے والوں کو اپنے ملک میں مستقل پناہ بھی دی، جس نے اسرائیل کے مظالم کی پشت پناہی کی خود اس کی سرزمین پر، اس کے سب سے مشہور شہر کے بچوں بچ اور وہ میڈیا جس پر اسے ناز تھا اس کے رد و اس کی طاقت کا نمرود دھڑام سے نیچے گرا۔ کروڑوں لوگوں نے اس سارے واقعے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔

امریکی چیف اٹھے، ہماری سرزمین پر ایسے کیسے ہو گیا؟ ہم تو دوسروں کی زمینوں کو تختہ مشق بناتے تھے۔ جرمنی سے لڑے تو وہ فرانس پر حملہ آور ہوئے۔ جاپان پر بم برسائے تو ان کی زیادہ سے زیادہ پہنچ ملائیشیا اور برما تک ہوئی۔ یہ ہماری سرزمین پر حملہ آور ہونے والے کون ہوتے ہیں؟

ادھر دنیا بھر میں جہاں جہاں ایسے مسلمان موجود تھے جن کی گفتگو سے، اقدار سے اور حکومت سے خود سری اور عزت نفس کی بو آتی تھی ان کے خلاف کارروائی کا ارادہ کیا گیا۔ میں افغانستان اور عراق کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا تھا کہ سب عیاں ہے لیکن اس ٹاسک فورس کو جو بھارت کے ساتھ تعلقات کے لیے بنائی گئی تھی ایک نیا ٹاسک دا گیا۔ اب صرف بھارت نہیں پاکستان اور افغانستان بھی اس کے دائرہ عمل میں دے دیے گئے۔

پاکستان ہے۔ اپنے آبائی ملک کے افراد کے ہاتھوں تشدد، زیادتی، خوف اور بے پناہ مار پیٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں بار بار مختلف تصویریں دکھائی جاتی ہیں کہ دیکھو ان لوگوں کا پتہ بتا دو ان کے بارے میں معلومات دے دو، ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم تم کو گوانتانا مو بے بھیج دیں گے۔

وہ دونوں امریکی شہری جنہیں پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ امریکا ان کی مدد اور دادرسی کو آئے گا۔ انہیں ان اغوا کنندگان کے ظلم اور تشدد سے نجات دلانے کا۔ وہ بار بار یہ کہتے ہیں تمہیں معلوم ہے ہم امریکی شہری ہیں، تم ہمیں بغیر مقدمہ چلائے، بغیر ثبوت کے قید میں نہیں رکھ سکتے۔ ہمارا ملک تمہیں دیکھ لے گا اور پھر ان کے ان دعوؤں کے جواب میں ایک دن ایف بی آئی کے امریکی عہدیدار خود اس قید خانے میں آ جاتے ہیں۔ وہ اپنے امریکی شہری ہونے کی بات کرتے ہیں تو گالیاں سنی پڑتی ہیں۔

وہ اپنے لیے امریکی قانون کے مطابق وکیل کا حق طلب کرتے ہیں تو تشدد کی شدت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ اپنا جرم پوچھتے ہیں تو ایف بی آئی کے افراد چیختے ہیں، ہمیں نہیں پتہ کہ تم لوگوں کا جرم کیا ہے؟ ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں لیکن ہمیں پتہ ہے کہ تم لوگ دہشت گرد ہو اور تمہارا ٹھکانہ گوانتانا مو بے کا ذیت ناک جیل خانہ ہے۔ آٹھ ماہ کی قید تنہائی، تشدد، ظلم اور زیادتی کے بعد جب ان بھائیوں کی بیویاں اور مائیں پردیس میں بیان دینے لگتی ہیں تو امریکا کا پریس خاموش ہو جاتا ہے۔

وہ عدالت جانے لگتی ہیں تو کوئی ان کے بارے میں عدالت میں جواب نہیں دیتا۔ تحقیق اور تفتیش جاری ہے۔ جب سب حربے آزمائے جاتے ہیں تو انہیں لاہور کے ایئر پورٹ پر چھوڑتے ہوئے کہا جاتا کہ اگر تم لوگوں نے ہمارے بارے میں زبان کھولی تو پھر صرف تمہاری شامت نہیں آئے گی بلکہ تمہارا پورا خاندان عذاب میں ہوگا۔ یہ دونوں 22 اپریل کو رہا ہوئے اور ان سے ان کی وہ شناخت بھی لے لی گئی جسے امریکی پاسپورٹ کہتے ہیں جو شاید انہیں اس وقت بہت عزیز ہوگا جب انہیں ملا تھا۔

یہ کہانی کسی مذہبی رجحان کے حامل جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد کی نہیں، کسی جلیے جلوس نکالنے، پلے کارڈ اٹھانے والے جذباتی مسلمانوں کی نہیں، عام سے امریکی شہریوں کی ہے جن کے نام مسلمانوں جیسے تھے اور ان کی شامت اعمال کی ان کے حلیے بھی ویسے ہی تھے۔ میں یہاں تشدد کی وہ داستانیں نہیں دہرانا چاہتا جو اللہ کی وحدانیت کا اظہار کرتے ہوئے بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کرتی رہیں، جو تشدد کے عالم میں صبر کی معراج پر تھے۔

صرف مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا اور ویسے نام رکھنا اتنا بڑا جرم نہیں بلکہ جرم یہ ہے کہ یہ دونوں پاکستان کے کسی ڈانس کے اڈے سے اغوا نہیں ہوئے تھے، اپنے ماں باپ کی توہین مرتکب نہیں ہوئے تھے، انہوں نے شراب پی کر غل غپاڑہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس جرم میں تھانے گئے۔ یہ لوگ اگر کسی بدترین اخلاقی جرم میں بھی گرفتار ہوتے یا اغوا ہوتے تو آج امریکا کی حکومت، میڈیا، سفارت خانہ ان کی رہائی کے لیے سرگرداں ہوتا۔

رات دن ایک ہو جاتے لیکن کیا کیا جائے یہ تو بس مسلمان تھے، سیدھے سادھے تھے اور مسلمان تو مسلمان ہوتا ہے۔ اسے نہ امریکی پاسپورٹ تحفظ دیتا ہے اور نہ امریکی شہریت اس کی عزت میں اضافہ کرتی ہے..... لیکن شاید کوئی سمجھ سکے کہ عزت تو اس اعزاز کو ٹھکانے میں ملتی ہے۔ سیدہ تان کر بتانے میں ملتی ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہماری پچان پاسپورٹوں اور شہریتوں میں نہیں۔

## پہچان

(10 جمادی الاول 1426ھ بمطابق 17 جون 2005ء)

گزشتہ پانچ دہائیوں سے امریکا اور مغرب کے ممالک کا ایک دستور رہا ہے کہ وہ پوری دنیا میں کہیں بھی آباد اپنے کسی شہری کے ساتھ کسی قسم کا کوئی ظلم، زیادتی، نا انصافی یا اس کی جان و مال کا نقصان برداشت نہیں کرتے تھے۔ کوئی خاتون اگر کسی مشرقی یا افریقی ملک کے باشندے سے شادی کر لے، لڑائی جھگڑا شروع ہو، طلاق تک نوبت آ پہنچے، مرد اپنی اولاد کو لے کر اپنے ملک آ جائے تو اس ملک میں موجود سفارت خانہ عدالتوں، تھانوں، سرکاری دفاتر اور حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی مچا دیتا رہا ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے جب تک اس امریکی یا مغربی ماں کو اس کی اولاد چھین کر واپس نہ دلا دیں۔

کوئی رزق کی تلاش میں کسی یورپی ملک یا امریکا میں پناہ لے لے، ان کا شہری بن جائے، پھر وہ اگر اپنی مرضی سے اپنی اولاد کی شادی کرنا چاہے، اولاد اگر انکار کرے تو پھر اس اولاد کے ”حقوق انسانی“ کے نام پر کیا کیا تماشے نہیں کیے گئے؟ اخبارات سے لے کر ٹیلی ویژن کے پروگراموں تک اس ”دقیقہ نویسی“ باپ کو ذلیل و رسوا کیا جاتا رہا ہے۔ اگر اولاد کہیں اپنے باپ کے ساتھ واپس اپنے آبا و اجداد کے ملک میں آئی ہو تو حکومت کو مجبور کیا جاتا ہے کہ پولیس کے ذریعے اسے اس ”جس بے جا“ سے نجات دلائی جائے اور پھر کمزور حکومتیں اسے چھین کر مغرب کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے لیے واپس روانہ کر دیتی ہیں۔

کسی بھی مقام پر ان کے ممالک کا کوئی عام شہری جو تفریحی سفر پر نکلا ہو چند دن کے لیے غائب ہو جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔ وزارت داخلہ کے افسران سے لے کر عام تھانے کے سپاہی تک سب کی نیندیں حرام ہوتی ہیں۔ کبھی اسے کسی پہاڑ کی غار میں بیٹھے لطف اندوز ہوتے ہوئے شخص کو ڈھونڈ کر انعام حاصل کیا جاتا ہے اور کبھی اسے اغوا کنندگان سے چھڑا کر اپنے سینوں پر تنہ سجائے جاتے ہیں اور اگر کبھی اغوا طویل ہو جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔

ایک گھر کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ تیس کے قریب افراد نے ایک گھر کو گھیرا ہوا ہے۔ لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں تو انہیں بند و قید دکھا کر واپس جانے، کھڑکیاں بند رکھنے اور اپنے کام سے کام رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ ٹھڈے مارتے اور رانٹوں کے بوٹوں سے دروازے کھولتے یہ لوگ جن کی کوئی شناخت نہیں اور نہ وہ ظاہر کرتے ہیں، گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

ان کا ہدف دو سنگے بھائی کا شان افضل اور زین افضل ہیں۔ انہیں قابو میں کرنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ کیا جاتا ہے: کہاں ہیں تمہارے امریکی پاسپورٹ اور دیگر کاغذات؟ یہ دونوں امریکی شہری ایک دوسرے ملک کی زمین پر ہیں۔ کاغذات حاصل کرنے کے بعد آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا کر، چپ میں ڈالا جاتا ہے، پھر اس کے بعد کسی کو کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟

وہ کہانی بہت دلگداز ہے جو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ دونوں امریکی شہری کہ جن کا آبائی ملک



پچاس فیصد صرف امریکا اپنی فوج پر خرچ کر رہا ہے۔ یہ رقم ہی 2003ء میں 415 بلین ڈالر تھی اور 2004ء میں 456 بلین ڈالر ہو گئی۔ عوام کے پیسوں سے کیے جانے والے یہ اخراجات ان کو یہ یقین دلا کر کیے گئے کہ اگر ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں کریں گے تو امریکا کا مستقبل محفوظ نہیں ہوگا۔

شروع شروع میں تو امریکی عوام ان خوبصورت الفاظ کی بھول بھلیوں میں آ گئے۔ ان کی اکثریت اس بات کی قائل ہو گئی کہ ایسا ٹھیک ہی ہوگا، لیکن صرف گزشتہ ماہ مئی میں جب 80 امریکی اور سات سو امریکا کے حامی عراق کے سپاہی حریت پسند مسلمان عراقیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تو پورے امریکا کو واشنگٹن میں وہ دیوار یاد آگئی جو دیت نام میں مرنے والے سپاہیوں کے نام سے آراستہ ہے۔

مئی کے اس بڑے قتل عام کے بعد جب ہر سال کی طرح پوسٹ ABC نیوز امریکی عوام کے پاس دہشت گردی کے خلاف جنگ میں رائے لینے کے لیے پہنچی تو سب کے سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ صرف دو سالوں میں کیسے ہو گیا؟

52 فیصد لوگوں نے کہا کہ عراق کی جنگ نے امریکا کی سیکورٹی اور تحفظ کو مزید خطرے میں ڈالا ہے۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ امریکیوں کی اکثریت نے بش کے اس فلسفے کا انکار کیا ہے کہ جنگ عراق امریکا کے عوام کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ یہ دس میں سے چھ افراد نے کہا کہ یہ جنگ دیت نام سے زیادہ امریکیوں کو موت کے منہ میں دھکیلے گی اور انہیں چھنے کہا کہ اس جنگ نے امریکا کو ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا ہے جس سے نکلنا مشکل ہے۔

مجھے آج اس رپورٹ کے بعد وہ دن یاد آ رہے ہیں۔ جب ”فاتح“ امریکی فوج بغداد میں داخل ہو رہی تھی، ایک سناٹا تھا۔ صرف سو کے قریب لوگ مجسمہ گرا رہے تھے اور پوری دنیا میں تبصرہ نگار اس ”فاتح فوج“ کے گن گارہے تھے۔ اسے ظالم سے نجات دلانے والا اور عراقی عوام کو آزادی دلانے والا قرار دے رہے تھے۔ لیکن عین جس وقت یہ مجسمہ گرایا گیا تھا صرف چند گلیاں دور ایک عورت اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر امریکی فوجیوں سے ٹکرائی۔ دو مارے گئے اور آٹھ زخمی ہو گئے اور پھر یہ جنگ یوں چلی کہ تابوتوں کے قافلے امریکی سرزمین پر اترنے لگے۔ موت کی دستکیں دروازوں پر ہونے لگیں اور پھر صرف دو سال کے بعد (یہ عرصہ نہتوں کی جنگ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا) آج 456 بلین ڈالر خرچ کرنے کے بعد فتح نصیب نہیں۔

مجھے آج بھی ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو طاقت کو خدا مانتے ہیں اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں لیکن میرا اللہ تو ایمان والوں کے ایک چھوٹے گروہ کو بے ایمانوں کے بڑے گروہ پر غالب کرنے کی بشارت دیتا ہے۔



## بشارت کے دن

(16 جمادی الاول 1426ھ بمطابق 24 جون 2005ء)

کون جانتا تھا کہ یہ سب کچھ صرف دو سال کے اندر اندر ہو جائے گا۔ طاقت کے نشے میں چور امریکی حکمران تو گزشتہ تجربے کی مثالیں دے کر کہا کرتے تھے کہ دیت نام میں ہم نے کئی سال جنگ کی۔ لوگوں کو بری طرح کچلا۔ ظلم و ستم کا بازار گرم کیا اور اپنے عوام کو اس خوف میں مبتلا رکھا کہ اگر ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑ گیا تو کیونسٹ دنیا کے سامنے ہماری تڑپیل ہوگی اور پھر اس اخلاقی فتح سے ان کے حوصلے بلند ہوں گے۔ یوں ایک دن وہ لوگ امریکا کی آواز ندگی اور اس کی سلامتی کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

یوں دس سے چندہ سال تک امریکی عوام اپنی حکومتوں کی ان میٹھی میٹھی باتوں اور بہلاؤں میں آتے رہے۔ نوجوان وردیاں بچتے جہازوں، ہیلی کاپٹروں اور بحری بیڑوں کے ذریعے دیت نام کے ساحلوں پر اترتے رہے۔ امریکی عوام کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے کے لیے فلمیں بنانے والے ایسے کردار تخلیق کرتے رہے جو مافوق الفطرت تھے۔ ریمبو کا کردار ان میں سے ایک تھا جو جسمانی طاقت، پھرتی اور چالاکی سے پستہ قد دیت ناموں کو گھنے جنگوں میں شکست دیتا ہے لیکن پندرہ سالوں کی طویل جنگ کے دوران جب قبرستانوں کی آبادیاں بڑھنے لگیں، امریکی سپاہیوں کے گم ہونے، مرنے یا لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی خبروں سے اخبار سجنے لگے تو پھر اس ملک کے عوام چیخ اٹھے۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ ان کے حکمرانوں نے ہر علاقے، ہر شہر اور ہر نسل کو موت کا تحفہ دے دیا ہے۔

آج بھی واشنگٹن میں پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے پارک میں ایک بہت ہی طویل دیوار پر ان سپاہیوں کے نام کندہ ہیں جو دیت نام میں ہلاک ہوئے۔ ایک طرف ایک بہت ہی موٹی سی کتاب میں بھی ان کے نام موجود ہیں۔ یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ اسے اٹھایا نہیں جاسکتا لیکن اس سب کے باوجود جب امریکی عوام اپنے خوف، اپنے پیاروں کی موت اور اپنی ظالم حکومت کے خلاف ہوئے تو ذلت سے دیت نام سے نکلنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

لیکن آج پوری دنیا حیران ہے کہ جو قوم پندرہ سال تک اپنے جوان جنگ کی آگ میں جھونکتی رہی اور خاموش رہی، وہ اب صرف دو سالوں میں یوں چیخ اٹھے گی! کسی کو یقین نہیں آتا۔ میرے سامنے اس وقت دو مختلف رپورٹیں ہیں: ایک امریکی حکومت کے جنگی جنون کے بارے میں اور دوسری اس کے عوام کی بدلتی ہوئی سوچ اور عراق کی جنگ کے بعد تنگ آئی ہوئی، بے چین ہوتی ہوئی رعایا کے بارے میں.....

جنگی جنون کا عالم تو پوری دنیا کے ”مہذب“ کہلائے جانے والے ممالک میں گزشتہ دو سالوں میں شدت سے بڑھا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ پوری دنیا جتنا اپنی افواج پر خرچ کرتی ہے اس کا آدھا یعنی اس میں سے

اس تعصب کے آغاز سے لے کر آج تک کی قدم بقدم کہانی امریکا کی ایک تنظیم (CAIR) Council of American Islamic Relation نے اپنی کتاب ”امریکا میں مسلمانوں کے انسانی حقوق“ The Status of Muslim Civil Right in US میں رقم کی ہے۔ اس کتاب نے اس تعصب کے آغاز سے ایک ایک واقعے کو جمع کیا ہے جو کہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے لیکن 14 مئی 2005ء میں ہونے والی CAIR کانفرنس واشنگٹن میں انہوں نے صرف 2001ء اور 2002ء کی واقعات کی تفصیلات والا حصہ پیش کیا۔

کتاب کے مطابق 1996ء سے امریکا کے ایئر پورٹوں پر Passenger Profiling یعنی مسافروں کے کوائف کا ایک عجیب و غریب سسٹم شروع کیا گیا جس کے مطابق مسلمانوں خصوصاً ڈاڑھی والوں یا عربی شکل و شہادت والوں کو جہازوں سے اتار کر بری طرح تلاشی لینے اور گندی زبان استعمال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کوئی عورت اگر حجاب میں نظر آتی تو بندوق کی نالی اس کے حجاب میں پھنسا کر کہا جاتا کہ اس کو اتار دو۔ کتاب نے جو ایک تاریخی دستاویز ہے، ان چند واقعات کو مرتب کیا ہے جو امریکا کے ایئر پورٹوں پر ہوئے اور محفوظ رہ گئے۔ ان میں یہ چند واقعات ہی اسلام اور مسلمانوں سے تعصب کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ایک مسلمان خاتون کو تمام مسافروں کے سامنے بری گفتگو کرتے ہوئے حجاب اتارنے کو کہا گیا۔ وہیں اس کی تلاشی لی گئی اور پھر کچھ نہ ملنے پر اس کے پیٹ پر رائفل سے ٹھوکر ماری گئی۔ وہ درد سے چلا اٹھی کیونکہ وہ آٹھ ماہ سے حاملہ تھی۔

ایک اور خاتون کو حجاب اتارنے کو کہا گیا، اس نے انکار کیا تو اسے دھکے دیتے ہوئے ایک گندے سے کمرے میں جہاں چائے وغیرہ بنائی جاتی تھی، لے جایا گیا اور اب اسے حجاب نہیں بلکہ تمام کپڑے اتارنے پر مجبور کیا گیا۔ تین مسافروں کو ایک جہاز پر سوار ہونے سے اس لیے روک دیا گیا کہ پائلٹ نے انہیں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان کی موجودگی میں اطمینان سے جہاز نہیں چلا سکتا اور ایئر ہوسٹس ان کے سامنے مسافروں کی صحیح خدمت نہیں کر سکتیں۔

چار مسلمان مسافروں کو ایک جہاز پر چڑھنے سے اس لیے روکا گیا کہ دیگر مسافران کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔

ایک عورت اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ سوار ہونے لگی تو اسے اتار لیا گیا اور دو سالہ بچے کو بھی برہنہ کر کے تلاشی لی گئی۔

کتنے ایسے واقعات ہیں جن میں مسلمان مسافروں کو روکا گیا۔ کمروں میں بند کر کے تلاشیاں لی گئیں اور ان کی فلائیں روانہ ہو گئیں اور پھر کسی نے ان کے لیے رہنے تک کا بندوبست نہ کیا جو ایئر لائن کی ذمہ داری شمار ہوتی ہے۔ یہ داستان بہت طویل ہے اور واقعات بہت زیادہ لیکن ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ سب کچھ امریکا کے اپنے شہریوں کے ساتھ ہوا، کسی مسلمان ملک کے رہنے والوں کے ساتھ نہیں۔ ان سب مسلمان امریکی شہریوں کو جہاز پر سوار ہوتے ایک سوال پوچھا جاتا ہے۔

یہ وہ سوال ہے جس سے یہ مسلمان چند سال پہلے کتراتے تھے۔ تمام کوائف پڑھنے کے بعد کہا جاتا ہے:-

## تمہارے آبا و اجداد کون تھے؟

(23 جمادی الاول 1426ھ بمطابق یکم جولائی 2005ء)

صرف چند سال پہلے تک یورپ اور امریکا میں تلاش رزق میں جا کر بسنے والے مسلمانوں کے خواب، خواہش، رویے اور اپنے مذہب سے وابستگی کا عالم بالکل مختلف تھا۔ یہ لوگ دن رات کی مشقتوں اور محنتوں کے بعد جب گھروں کو لوٹتے تو اس آسودہ ماحول میں امریکی یا یورپی معاشرے کی خصوصیات کے گن گاتے۔ کوئی اپنے آبائی وطن کی پولیس سے تنگ آیا ہوا ہوتا تو یہاں کی پولیس کو سراہتا، کسی کونسل اور گروہی تعصب کا سامنا کرنا پڑا ہوتا تو وہ یہاں پر موجود رواداری اور انسانی احترام کے قصیدے پڑھتا۔

کسی کو دفتروں میں رشوت خوروں نے ستایا ہوتا تو وہ یہاں کے صاف شفاف نظام کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا۔ یہ لوگ جو اس مخصوص ماحول میں اور ظاہری رویوں کی چمک دمک میں زندگی گزار رہے تھے آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگتے گئے۔ ان کی شراب کی دکانوں پر جنہیں ”بار“ کہتے ہیں وہاں مختلف مسلم ممالک کے نوجوان کام کرتے نظر آنے لگے تھے۔

ان کے ڈانس گھروں، تھیٹروں، اور بڑے بڑے کنسرٹوں میں بھی ان کی کثیر تعداد موجود ہوتی۔ اپنے علاقائی تعلقوں، ملکی وابستگی اور خصوصاً اپنے دین سے رشتہ کو صرف جمعہ کی نماز یا عید ملن پارٹیوں تک محدود کرنے کے بعد یہ لوگ اس زعم میں تھے کہ پوری مغربی دنیا انہیں بالکل اسی طرح قبول کر لے گی، اپنا لے گی جیسے وہ ہنگری، آسٹریا، جرمنی، روس اور حتیٰ کہ چین اور فلپائن سے آئے ہوئے کیتھولک، پروٹسٹنٹ یا یہودیوں کو اپناتی ہے۔

یہ سب لوگ بھی تو اپنے ملکوں میں جبر، جنگ، زیادتی یا معاشی نا آسودگی کی وجہ سے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کے ملک کے شہریوں نے بھی تو امریکا کے ساتھ جنگیں لڑی تھیں۔ جرمنی اور جاپان کے شہری کس خوش دلی کے ساتھ امریکا میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ یہ ”مسلمان“ بھی اسی خام خیالی میں تھے۔ انہوں نے اپنا رنگ ڈھنگ بدلا، پہنا وابدلا، گفتگو کا انداز بدلا اور چین سے رہنے کا خواب دیکھنے لگے لیکن یہ اچانک کیا ہو گیا؟

امریکا کا قدیم حریف کمیونسٹ روس افغانستان کے جیالے مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ وہ فتح جس کا شاید امریکا کو بھی یقین نہیں تھا لیکن اس شکست نے مسلمانوں کو ایک بشارت پر یقین محکم کر دیا کہ اگر تم مومن ہو تو ہم چھوٹے سے گروہ سے بھی بڑے بڑے گروہ پر غلبہ دے دیں گے۔ اب طرز احساس بدلا، اب رویوں میں تبدیلی آئی اور اس مغربی دنیا کا اصل اور متعصب روپ سامنے آنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تعصب کا آغاز گیارہ مئی کے واقعے سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ یہ آغاز عین اس دور میں ہوا جب افغانستان میں طالبان نے ایک مستحکم حکومت قائم کر کے اسلام کا

”تم کہاں کے ہو؟“

وہ کہتا ہے: ”میں امریکی ہوں۔“

سوال کرنے والا کہتا ہے: ”نہیں! اصل جگہ بتاؤ۔“

وہ اپنے شہر یا امریکی ریاست کا نام بتاتا ہے تو غصے میں آیا ہوا امریکی افسر دھاڑتا ہے: ”تمہارے آبا و اجداد

کہاں کے تھے؟“ (What is your Ancestry?)

شاید اسی سوال پوچھنے کی وجہ سے یا اس رویے کا رد عمل کہ چند سال پہلے جس امریکا میں مسلمان عورتوں میں

حجاب کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی، اب وہاں حالات کچھ اور ہیں۔

14 مئی کی CAIR کانفرنس میں 90 فیصد عورتیں ایسی تھیں جو نہ صرف حجاب بلکہ اپنے آبا و اجداد کے

طریقہ پر مکمل پردے میں تھیں۔



## یہ انعام تو ملنا ہی تھا

( یکم جمادی الثانی 1426ھ بمطابق 08 جولائی 2005ء )

یہ وہی انعام ہے جسے فرانس میں پیدا ہونے والے حریت پسند ادیب سارتر نے ٹھکرا دیا تھا۔ وہی سارتر جو فرانس کا باشندہ تھا لیکن اپنے ہی ملک کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا کہ اس نے ایک مسلمان ملک الجزائر پر غاصبانہ قبضہ جمارکھا ہے۔ 1901ء سے لے کر آج تک ہر سال دیے جانے والے نوبل انعام کو صرف تین افراد ایک انیکسل، بورس پاسٹر ناک اور سارتر نے ٹھکرایا۔ ان سب کا نقطہ نظر ایک ہی تھا کہ یہ غاصب دنیا کا مخصوص مفادات کے تحت دیے جانے والا اعزاز ہے اور اس اعزاز کو اپنے نام کے ساتھ لکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

21 اکتوبر 1833ء کو اشاک ہوم میں پیدا ہونے والا ایک ان پڑھ مگر ذہین شخص الفریڈ نوبل جس کے والدین کھیتی باڑی کرتے تھے اور لوگوں میں معزز جانے جاتے تھے لیکن اسے نئی ایجادات کرنے کا شوق ہو گیا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی ایجاد کی دھن میں سائنس کی لیبارٹریوں میں گھسارہتا اور پھر ایک دن اس نے ڈائنامائٹ ایجاد کر لیا۔ ایک ایسا ہتھیار جس سے پل، عمارتیں، سرکیں اور گاڑیاں تباہ کی جاسکتی تھیں لیکن ایک دن کسی اخبار کو یہ جھوٹی خبر ملی کہ الفریڈ نوبل مر گیا۔ اس نے فوراً ایک ہیڈ لائن لگائی ”موت کا شہنشاہ مر گیا“ اور چھاپ دی۔

الفریڈ نوبل تک پہنچی تو حیران رہ گیا جسے وہ اپنی کامیابی سمجھتا تھا وہ تو اس کی بدنامی ہے۔ لوگ اس سے رہتی دنیا تک نفرت کرتے رہیں گے۔ اس نے ایک وصیت کی کہ میں نے تو اس دنیا کی خیر خواہی کے لیے سب کچھ کیا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب میں اپنی تمام جائیداد اس بات کے لیے وقف کرتا ہوں کہ اس سے انسانیت کے محسنوں، ادیبوں اور سائنس دانوں کو انعام دیے جائیں۔

الفریڈ نوبل تو مر گیا لیکن یہ سب کام ایک سویڈش اکیڈمی کے ذمے سونپ دیا گیا جو ہر سال دس دسمبر کو دنیا بھر کے لوگوں میں سے ادیب، شاعر، سائنس دان اور امن کے داعی افراد چنتی ہے اور ان کو انعام دیتی ہے۔ یوں تو یہ انعام پوری دنیا میں معتبر جانا جاتا ہے اور قابل احترام بھی ہے لیکن وہ کہ جن کی زندگی میں ضمیر، غیرت اور حمیت نام کی کوئی چیز ذرا سی بھی موجود ہے وہ ہمیشہ اس انعام کو مغرب کے مخصوص مفادات کا ایک پروپیگنڈا ہتھیار سمجھتی ہے۔ یوں تو صرف تین لوگوں نے اب تک تاریخ میں اس انعام کو لینے سے انکار کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ انعام ان قوموں کے حصے میں ہی کبھی نہیں آیا جو اسے ایک فراڈ سمجھتے ہوئے ٹھکرا سکیں۔ یہ ان کروڑوں مغربی باشندوں میں سے تین تھے جو غیرت اور حمیت کا ثبوت دے گئے۔

یہ انعام عجیب ہے جو اسرائیل کے وزیراعظم کو امن کا نوبل پرائز دیتا ہے اور اپنی سرزمین پر قربانیاں دینے،

## ہر میدان میں عورت کا ساتھ کیوں؟

(08 جمادی الثانی 1426ھ بمطابق 15 جولائی 2005ء)

میرے بہت سارے البموں میں ایک تصویر ایسی ہے جس میں صرف ایک دروازے پر لگے ہوئے سفید موٹے کاغذ پر موٹے موٹے انگریزی حروف میں ایک تحریر لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب ہے: ”اس دروازے کو شام چھ بجے کے بعد اندر سے قفل کر لیجیے۔“

یہ تصویر میں نے نیویارک کے ایک دفتر کے ہال کے دروازے کی لی ہے۔ اس دفتر میں مردوزن ساتھ ساتھ..... لیکن علیحدہ علیحدہ میزوں پر کام کرتے ہیں، چونکہ اس بلندو بالا عمارت جس کے 80 سے زیادہ فلور ہیں اور ہر فلور پر کئی کئی دفاتر، تو اکثر یہ خوف ضرور مسلط رہتا ہے کہ کہیں کوئی خاتون اپنے دفتری کام میں دیر تک مصروف ہو اور دوسری جانب دفاتر سے چھٹی کرنے والے افراد یا باہر سے آنے والے ملاقاتی اسے اکیلا پا کر اپنی نیت خراب نہ کر بیٹھیں، اس لیے اسے احتیاط کرنا چاہیے۔

میں نے پورے امریکا کے ایسے کئی دفاتر میں اس خوف کے پہرے میں درج ہدایات دیکھی ہیں یا پھر کچھ سینہ بہ سینہ ہدایات پر عمل درآمد ہوتے دیکھا ہے۔ کسی دفتر میں اگر کوئی مہمان خاتون اچانک ہاتھ روم جانے کی ضرورت محسوس کرے تو اسے لیڈیز ہاتھ روم کا دروازہ بند ملے گا اور پھر وہ مایوس ہو کر واپس اس دفتر میں آ کر سوال کرے گی کہ یہ دروازہ کیوں نہیں کھلتا؟ کیا کوئی خاتون اندر ہے؟ تو اس پر اس دفتر میں کام کرنے والی کوئی خاتون اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔

اس ہاتھ روم کا تالہ جس کے نمبروں کا کوڈ اس دفتر میں کام کرنے والی خاتون کو معلوم ہوتا ہے، وہ گھمائے اور پھر مہمان سے یہ کہہ کر واپس آ جائے گی کہ دروازہ واپسی پر خود بخود بند ہو جائے گا لیکن وہ اسے اس تالے کا کوڈ نہیں بتائے گی۔ اگر وہ خاتون اپنی کوئی چیز اس ہاتھ روم میں بھول آئے تو اسے دوبارہ اس خاتون کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔ یہ سب اس احتیاط کے پیش نظر ہے کہ کہیں کوئی مرد پہلے سے اس ہاتھ روم میں چھپ کر نہ بیٹھا ہو اور پھر خاتون کو اندر داخل ہوتے ہی دبوچ نہ لے۔

لفٹ استعمال کرنے کی احتیاطیں تو بہت زیادہ ہیں اور یہ احتیاطیں اس وقت اور زیادہ ضروری ہیں جب دفتر تقریباً خالی ہو چکا ہو اور کسی خاتون ملازمہ کو دیر تک وہاں رکن پڑ جائے۔ نہ تو اس بلڈنگ کے چوکیدار پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی لفٹ آپریٹر پر۔ بھروسہ ہے تو اس ایمر جنسی الارم پر جو اس لفٹ میں لگا ہے تاکہ آپ کی عزت و عصمت کو بچانے کے لیے آواز دے سکے۔

جدوجہد کرنے اور شہادت کا رتبہ حاصل کرنے والے فلسطینیوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہ وہی نوبل انعام ہے کہ جب علامہ اقبال کا چرچا پوری دنیا میں ہو رہا تھا اور ان کی شاعری کو انسانی تاریخ کی چند یادگار شعری کاوشوں میں تصور کیا جاتا تھا اس وقت صرف اپنے تعصب کی وجہ سے ایک ہندو پنڈت رابندر ناتھ ٹیگور کی نظم گیتا گھبلی پر اسے انعام دے دیا گیا۔

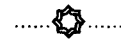
یوں تو میں اس انعام کی بہت سی کہانیاں سنا سکتا ہوں لیکن مسلمانوں پر اس کی ”مہربانیاں“ عجیب ہیں۔ ایران سے ایک وکیل قانون کو چننا گیا جو اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے میں مشہور تھی۔ مصر سے نجیب محفوظ کو لیا گیا جو مسلمان کہلاتا تھا لیکن ملحدانہ نظریات پر کتابیں لکھتا تھا۔ یہ سب میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ اس دفعہ اس انعام کے کرتا دھرتا افراڈانے مغرب کے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی سعی کی ہے کہ جس کے ذریعے وہ امت مسلمہ کے اخلاقی تار پود کو کھیرنے کی کوشش میں صدیوں سے مصروف ہے۔

یہ ہتھیار ہے ”عورت“..... جس کی مستور اداؤں کو برسر عام نمائش بنا کر اقدار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اخلاقیات کا جنازہ نکالا جاتا ہے اور صرف یہی نہیں اپنا کاروبار بھی چکایا جاتا ہے۔ یہ عورت اگر اشتہارات کی دنیا سے نکل جائے تو ہاتھیں کتنی ملٹی میشل کمپنیوں کا رزق بند ہو جائے۔ یہ اگر آزادی، حقوق اور یکساں مواقع کا نعرہ بلند نہ کرے تو خبر نہیں کتنے بازار ٹھنڈے پڑ جائیں۔ خاندان اجڑتے ہیں تو بازار آباد ہوتے ہیں اور خاندان اسی وقت اجڑتے ہیں جب ان کی اساس پر حملہ کیا جائے۔ اس کی محبتوں پر حقوق، آزادی، یکساں مواقع کی تلوار چلائی جائے۔

اس سال دنیا بھر سے ایسی ایک ہزار خواتین کو منتخب کیا گیا ہے جو توڑ پھوڑ کے عمل میں سالوں سے کام کرتی آرہی ہیں۔ ان میں سے پہلی دفعہ مسلم امہ کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ میرے ملک پاکستان سے 29 خواتین اس انعام کے لیے منتخب ہوئیں۔ چند نام پڑھ لیں تو سارا پس منظر آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا: عاصمہ جہانگیر، عورت خاوند فاؤنڈیشن کی نگار احمد، مشہور ڈانسر شیمہ کرمانی، مدیحہ گوہر، کشورنا ہید اور کئی..... ساری کی ساری خواتین کسی نہ کسی این جی او کی سرپرست یا سربراہ ہیں۔ کسی نہ کسی ڈونر کی محتاج ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسی نہیں جو کشمیر پر ظلم و ستم، فلسطین پر غاصبانہ قبضہ، عراق اور افغانستان پر جارحیت کے خلاف بولی ہو۔

ان کی زندگی کا مقصد عورت کو مہذب طریقے سے بازار میں لانا ہے۔ خواہ میراثیں رلیں کے ذریعے ہو یا فیشن شو اور ہنست کے نام پر۔ ان کے لیے عورت کا مسئلہ بھوک افلاس اور بیماری نہیں بلکہ چار دیواری سے نمائش تک ہے۔ اب ایسے کام کا انعام انہیں آقاؤں سے کیسے نہ ملتا؟

یہ کام وہ صدیوں تو خود نہ کر سکے تھے۔ مسلم معاشرہ کو بدنام، بے آبرو اور غیر مہذب کہنے کا کام، ان عورتوں نے صرف چند سکوں کے عوض کر دکھایا۔





اگر ایسا ہے تو پھر اتنے ہی لیگل ایڈ کے دفاتر کھلیں گے۔ اتنے ہی خواتین کے کرائس سینٹر (Crisis Center) بنانے پڑیں گے۔

اتنے ہی ”دارالامان“ یا تحفظ کے گھر کھولنے ہوں گے۔ اتنے ہی بچوں کے ڈے کیئر سینٹر بنیں گے۔ ان سب مظلوموں کی آواز بلند کرنے کے لیے اتنی ہی این جی اوز میدان میں آئیں گی۔ سیمینار ہوں گے، ورکشاپ ہوں گے، واک ہوں گے، ڈونرز آئیں گے، گاڑیاں آئیں گی، کچھ کے لیے عالمی کانفرنسوں کے دعوت نامے آئیں گے۔ آخر کسی کو روزگار بھی ملنا ہے۔ پاپی پیٹ کے لیے تو بندر اور ریچھ بھی مداری کی ڈگڈگی پر ناپتے ہیں ہم تو انسان ہیں۔ زیادہ مہذب، اشاروں پر زیادہ بہتر رقص پیش کرنے والے۔



یہ سب تو دفاتر کے باہر کے حالات ہیں یعنی اس بلڈنگ، علاقے یا گرد و نواح میں پائے جانے والے خطرات کی بات ہے جب کہ دفتر کو ان تمام احتیاطوں سے پاک سمجھا جاتا ہے کہ وہاں اس معاشرے کے اصولوں کے مطابق Colleagues ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور یہ ایک فیملی کا سا ماحول ہوتا ہے لیکن اس فیملی کے سے ماحول میں عورت پر جوتی ہے اس کا تصور بھی وہ چار دیواری میں نہیں کر سکتی جہاں سے اسے نکال کر یہاں لا بٹھا یا گیا۔ امریکا میں خواتین کے حقوق اور انسانی حقوق کی کوئی تنظیم ایسی نہیں جس کی رپورٹوں کے مطابق ہر سال ساٹھ سے ستر فیصد خواتین اپنے باس بائیسٹر کے ہاتھوں جنسی خوفزدگی، جنسی ہلیک میلنگ اور بعض اوقات جنسی تشدد کا شکار نہیں ہوتیں۔ ان عورتوں کے انٹرویو دیکھیں تو آپ دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔

ان کے مطابق ان کے باس بات کرتے ہوئے یا ازراہ مذاق ان کے جسم کے ایسے حصوں کو دانستہ ہاتھ لگاتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تعریف میں اکثر الفاظ ان کی خوبصورتی، جسمانی کشش اور لباس کی تراش خراش کے متعلق ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی نظر ایسی ہو جو ان کے جسم کا جائزہ نہ لے۔ اکثر خواتین یہ کہتی ہیں کہ انہیں اپنے باس کی نظروں میں بہتر رہنے کے لیے اپنے خاوندوں سے بھی کہیں زیادہ غرے کرنے پڑتے ہیں۔ ہر دقت تیار اور بن ٹھن کر رہنا پڑتا ہے۔ شدید پریشانی میں بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ رکھنا پڑتا ہے، جھڑکیاں سننا پڑتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس منظور نظر رہنے اور نوکری میں آگے بڑھنے کے لیے ان کے ساتھ دوڑ میں کئی اور خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ دلوں میں گھر کرنے کی ایک تھکا دینے والی دوڑ۔

ایک پل بھی غافل نہیں رہا جاتا کہ ذرا ناز و انداز میں کمی آئی تو کوئی دوسری جگہ لے لے گی۔ خاوندوں کے ساتھ تو لڑ بھی لیتی ہیں، بغیر استری کے کپڑے بھی پہن لیتی ہیں، پریشانی کا بہانہ بنا کر آرام بھی کر لیتی ہیں لیکن یہاں کون سنتا ہے؟

یہ ہے اس معاشرے کی ایک چھوٹی سی جھلک جہاں زندگی کے ہر کاروبار میں عورت کو مناسب مواقع دے کر جینڈر مین سٹریٹنگ یعنی ”ہر مقام پر مرد اور عورت ساتھ ساتھ“ اپنایا گیا ہے۔ یہ خوف صرف امریکا میں نہیں بلکہ ہر اس ملک میں آئیہب کی طرح عورت کے سر پر سوار ہے جو اپنی سلطنت یعنی گھر سے باہر مردوں کے شانہ بشانہ دفاتر اور کاروبار میں آ کر کھڑی ہوئی۔ جہاں ملازمہ رہی وہاں سب سہتی رہی اور جہاں خود باس بن گئی وہاں ویسا ہی انتقام مردوں سے لینے لگی کہ Sliver جیسی کہانیاں وجود میں آئیں اور فلموں کی زینت بن گئیں۔

مجھے امریکا یا یورپ سے کوئی سروکار نہیں کہ اپنے عذاب خود بھگتے لیکن گزشتہ پانچ سال سے میرے ملک میں عالمی اداروں کے اشاروں سے اور این جی اوز کی کرم فرمائی سے اسی ”جینڈر مین سٹریٹنگ“ کے لیے لائحہ عمل بنائے جا رہے تھے۔ قانون، طریق کار، کوڈ سب طے کرنے کے بعد اسے اب نافذ کیا جا رہا ہے۔ میں اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ ان سب خواتین نے اس سارے عمل کا وہ بھیانک منظر ضرور دیکھا ہو گا جو مجھے دفاتر میں نظر آیا۔ تو پھر یہ کیوں اس قدر ذوق و شوق سے اس خوف کو گلے لگانا چاہ رہی ہیں؟ اس گہری کھائی میں گرنا چاہتی ہیں؟

شاید کوئی اس طرف غور نہیں کرتا کہ جتنی عورتیں گھریا خواتین کے علیحدہ ملازمتی ادارے چھوڑ کر مردوں کے شانہ بشانہ دفاتر میں آئیں گی اتنے ہی جنسی خوفزدگی کے کیس بڑھیں گے۔ اتنی ہی خاندانی ناچاقیاں زیادہ ہوں گی، اتنی ہی جنسی دہشت گردی اور ہلیک میلنگ میں اضافہ ہو گا۔ اتنے ہی بچوں کو سنبھالنے کے لیے اداروں کی ضرورت ہوگی۔

قوانین اسمبلیوں میں پیش ہوئے کسی نے اٹھ کر یہ سوال نہیں کیا کہ جب پہلے سے یہ سب کچھ قانون میں موجود ہے تو پھر یہ نیا قانون بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ کسی نے اسمبلی فلور پر اس نئے قانون کی کاپیاں نہیں پھاڑیں، احتجاج نہیں کیا۔ انتظامیہ کو عدلیہ سے علیحدہ کر دیا گیا، خوب کیا گیا لیکن روز کبھی رمضان المبارک کے احترام کے نام پر، کبھی قیمتوں کے کنٹرول کے لیے، کبھی واپڈا کی چوری روکنے، کبھی ٹیلی فون کا جرم پکڑنے یہاں تک کہ معمولی معمولی جلے جلوسوں کو روکنے کے لیے انتظامی افسروں کو عدالتی اختیار دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک الیکشن کے دوران پولنگ افسران کو اس ایک دن کے لیے عدالتی اختیار اس سطح کا دے دیا جاتا ہے کہ وہ موقع پر ہی جج بن جاتا ہے اور چھ ماہ تک قید کی سزا سناسکتا ہے۔ یہ سب سالوں سے ہوتا آرہا ہے کبھی کسی نے نہیں کہا کہ یہ سب ایک متوازی عدالتی نظام قائم ہو رہا ہے۔ کیا ضرورت ہے سب کرنے کی، عدالتیں جو موجود ہیں۔

اس ملک کا کوئی ایسا بڑا محکمہ نہیں جو اپنے امور کی انجام دہی کے لیے پولیس سے ڈیپوٹیشن پر افراد اپنے پاس نہیں لیتی اور وہ پولیس والے ہنسی خوشی جاتے ہیں۔ اینٹی کرپشن کا محکمہ ہو، نیب ہو، واپڈا ہو، ریلوے ہو، سب اس کے لیے قانون کا سہارا لیتے ہیں لیکن کبھی کسی نے اعتراض نہیں اٹھایا کہ ایسا کرنے سے ایک متوازی حکومت قائم ہو جائے گی، یہ تو لوگوں کو ہراساں کرنے کا کام ہے جب تھانہ موجود ہے تو پھر ایسا کیوں؟

لیکن آج یہ سب اعتراضات ایک ایسے قانون پر ہو رہے ہیں جسے چند بوریا نشینوں نے اسمبلی کے سامنے پیش کیا ہے..... اس قانون میں سب کچھ وہی ہے جو پہلے قوانین میں تھا لیکن اس کی پیشانی پر ایک مقصد ایسا درج ہے جو ”روشن خیال، اعتماد پسند“ اور انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں کو پسند نہیں آ رہا۔ یہ لفظ ہے ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر“ وہ حرف جسے اس امت کی ذمہ داری بنادیا گیا۔

ہم اسے ادا کرنے سے خوف کھاتے ہیں، ورنہ اس قانون میں وہی سب کچھ روکنے کا بندوبست ہے جو پہلے قوانین میں تھا۔ بس خوف صرف یہ ہے کہ کہیں اس قانون کے تحت ایسے بوریا نشین، اللہ پر توکل اور بھروسہ کرنے والے اور آخرت کے خوف سے کانپتے ہوئے لوگ ذمہ دار نہ بن جائیں جو صرف حق کی بات کریں، جو حکم ملنے پر بے گناہ کو گرفتار اور گنہگار کو چھوڑ نہ سکیں، جو اللہ کے خوف میں اپنے دشمنوں سے انصاف کریں اور اولاد کو بھی کٹھرے میں کھڑا کریں۔

اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہم فون کس کو کریں گے؟

سفارش کہاں ہوگی؟

رشوت کس کو پیش ہوگی؟

ہمارا جاہ و جلال کس دن کام آئے گا؟



## اصل خوف کیا ہے؟

(15 جمادی الثانی 1426ھ بمطابق 22 جولائی 2005ء)

پوری دنیا میں قانون اور انصاف کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے جب تک دلائل و شواہد سے اسے گنہگار ثابت نہ کیا جاسکے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اس اصول کی بنیاد پر قوانین وضع نہیں کیے جاتے لیکن آج سے سات سال قبل جب اس ملک میں احتساب کا قانون نافذ کیا گیا تو اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ جس شخص کو نیب کے لوگ بددیانتی، کرپشن، اقربا پروری یا جائیداد بنانے کے جرم میں گرفتار کرتے ہیں وہ گنہگار ہے، ملزم نہیں بلکہ مجرم ہے۔ اب یہ اس شخص کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے دلائل و شواہد لے کر آئے۔ یوں دنیا کا یہ مسلمہ اصول الٹ کر رکھ دیا گیا۔ بڑے بڑوں کو پکڑ کر جیل میں ڈالا اور پھر ان کے باہر آنے، رہا ہونے اور لوٹے ہوئے مال پر حصہ داری کی بنیاد پر سودے بازی کی کہانیاں منظر عام پر آئیں لیکن اس سب کے باوجود کسی انسانی حقوق کی تنظیم، کوئی آئین کا پاسدار یا کسی روشن خیال کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ قانون انسانی حقوق کی اس بنیادی اساس کے خلاف جس میں ہر شخص بے گناہ ہے جب تک گنہگار ثابت نہ ہو، کوئی نہیں چنچا کہ اس میں آئین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

اسمبلیاں بنیں، آمریت کا یہ قانون اسمبلی کے واسطے سے جمہوری اشیر باد بھی حاصل کر گیا لیکن کسی نے اسے عدالت میں چیلنج کرنے، اسے آئین سے متصادم کہنے کی جرأت نہ کی۔

پولیس کے قوانین میں ترامیم ہوئیں، پولیس کو اپنے مقاصد کے استعمال کے لیے طاقت ور بنانے کی کوشش ہوئی۔ ایک لفظ ہاتھ آ گیا تھا ”دہشت گرد“ بس اب کیا تھا پولیس کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ بغیر وارنٹ کے، بغیر کسی اجازت جب چاہے، جس وقت چاہے، جس کو چاہے، اٹھا کر لے جاسکتی ہے۔ جس کے چاہے حوالے کر سکتی ہے۔

کراچی سے خیبر تک اس قانون کی آڑ میں جو کھیل کھیلا گیا اس کو لکھتے ہوئے قلم خون کے آنسو روتا ہے۔ جس دن یہ قانون بنا اور ابھی اس کے نفاذ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ پولیس والوں نے جوش میں آ کر کراچی کے علاقے رام سوامی میں ایک گھر میں گھس کر اس کے باپ کے سامنے اس کی بیٹیوں کی آبروریزی کی۔ کوئی نہ چنچا، کسی کو آئین، انسانی حقوق، عالمی سطح پر بدنامی کا خیال نہ آیا۔

یہ ملک گزشتہ 56 سال سے قانون کے اوپر قانون بناتا جا رہا ہے۔ تعزیرات پاکستان میں تمام دفعات موجود ہیں پھر بھی اسلگنگ کے خلاف، ناجائز تجاویزات کے خلاف، منشیات کی روک تھام کے لیے، جسم فروشی کو روکنے کے لیے، گداگری کے قلع قمع کے لیے، حتیٰ کہ ہر دوسرے جرم کے لیے ایک نیا قانون موجود ہے لیکن کبھی بھی جب نئے

کے یہ فقرے آج بھی اسی طرح گونجتے ہیں جیسے نوٹی بلیئر کے فقرے۔

لارنس نے کہا: ”یہ جنگ یقینی طور پر ترک سلطان کو مذہبی اقتدار سے محروم کر دے گی۔ برطانیہ نے مصر میں نیا سلطان بنا دیا ہے لیکن کبھی خلیفہ المسلمین کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ ہم نے اس کے ساتھ اپنے تعلقات اتنے واضح دیے ہیں کہ مسلمان اسے کبھی بھی خلیفہ ماننے کو تیار نہیں ہوں گے۔

یوں تو خلافت کو ختم کرنے کی سازشوں کی ایک طویل تاریخ ہے..... لیکن اس خلافت کو ختم کرنے کے بعد یہودی سرمایہ داروں سے ایک وعدہ کیا گیا تھا، یہ وعدہ بالفور معاہدے کی بنیاد تھا کہ تمہیں ایک آزاد ریاست اسرائیل کے لیے فلسطین کی علاقے میں خطہ زمین دیا جائے گا۔

غرض خلافت کا خاتمہ اور اسرائیل کا قیام یہ دو ایسے ختے تھے جو برطانیہ نے اپنے سینے پر سجائے ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی ان دونوں ختوں کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے یا انہیں ذرا سا بھی شک گزرتا ہے تو ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں لیکن اس دفعہ تو معاملہ بالکل مختلف تھا۔

وہ دنیا بھر میں جہاں جہاں سے ایسی آواز اٹھتی رہی اس کو دباتے رہے۔ کہیں حکمران خریدے گئے اور کہیں عوامی رہنما، جو نہ مانے ان کے ملک پر چڑھ دوڑے۔ افغانستان سے لے کر عراق تک اور چینپا سے لے کر فلسطین تک، لیکن ان سب کوششوں سے ایک رد عمل پیدا ہونا ہی تھا اور وہ رد عمل پیدا ہوا ان مسلمانوں میں جو برطانیہ میں رہتے تھے اور ان انگریزوں میں جو ذرا سا عقل و ہوش رکھتے تھے، عراق اور افغانستان میں دہشت گردی کے بعد ایک حیران کن منظر سامنے آیا۔

جنگ عظیم اول کے وقت وزیر اعظم الیکو تھ جس نے خلافت ختم کی تھی اس کی پوتی مسلمان ہو گئی اور اس نے ایک کانفرنس بلا کر اعلان کیا کہ صرف میں مسلمان نہیں ہوئی میرے ساتھ ہزار سے زیادہ برطانیہ کے لاؤرز اور نوبل مسلمان ہوئے ہیں۔ اسنے اپنے گھر اور ساتھ پارک کو مسلم سینٹر میں تبدیل کر دیا۔ یہ سب لوگ امیر ترین تھے، ان لوگوں کو کیا ہو گیا؟ اب تو گھر کو آگ لگ گئی اسے کیسے بچایا جائے؟

پھر وہی M16 حرکت میں آ گئی۔ اس دفعہ الزام نہ القاعدہ پر ہے اور نہ کسی اور پر بلکہ ان لوگوں کو چنا گیا جو برطانیہ میں پیدا ہوئے اور برطانیہ میں پلے بڑھے۔ میں یہاں اس ڈرائیور کا بیان کیا درج کروں جس نے کہا کہ میری بس وہ واحد بس تھی جس کا روٹ دھماکوں کے بعد بدلا گیا۔ اس کا کیمبرہ خراب کر دیا گیا اور پھر اسے 20 گھنٹے مرمت کے بعد بھی نہیں بدلا گیا تا کہ جس شخص کا ڈرائیونگ لائسنس چاہے وہاں چھوڑ کر اسے مجرم بنا دیا جائے۔ کوئی پوچھے کہ وہ کیمبرے میں کیوں نہیں آیا؟ تو بتا دو کیمبرہ تو خراب تھا۔

یہ سب صرف اس لیے کیا گیا کہ اب اپنوں پر گھیرا تنگ کرنا تھا۔ جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے وہ جو یہ سوال کرنے لگ گئے کہ یہ سب عراق میں ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور خوفزدہ کیا جا رہا ہے اور ساری قوم کو خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔ دیکھو! خلافت واپس آ رہی ہے۔ ڈرو! اس وقت سے جب یہ سب اکٹھے ایک امت بن جائیں گے۔

## خلافت کی واپسی

(22 جمادی الثانی 1426ھ بمطابق 29 جولائی 2005ء)

”تم لوگ کیا سمجھتے ہو یہ کوئی آسان مسئلہ ہے کہ ہم ان لوگوں کا مطالبہ مان لیں اور عراق سے اپنی افواج واپس بلا لیں تو یہ سب دھماکے ختم ہو جائیں گے۔ یہ تم لوگوں کا خیال ہے۔ یہ سب تو برائی کا ایک سرچشمہ ہے، یہ لوگ مکمل طور پر اسرائیل کا وجود ختم کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ تمام مسلم ممالک کی ایک ہی حکومت چاہتے ہیں۔ یہ لوگ خلافت کو واپس لانا چاہتے ہیں کیا تم ان کے یہ مطالبے ماننے کے لیے تیار ہو؟“

یہ الفاظ برطانوی وزیر اعظم نوٹی بلیئر کے ہیں جو اس نے دریا کے کنارے بگ بین کی چھاؤں میں قائم پارلیمنٹ کی عمارت میں ممبران کے سامنے اپنی تقریر میں عین اس وقت ادا کیے جب وہ لندن کے دھماکوں کے بعد ان لوگوں کے رد عمل کا جواب دے رہا تھا جو بار بار کہہ رہے تھے کہ یہ سب عراق کی جنگ، مغرب کی مشرق وسطیٰ کی پالیسی اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی وجہ سے ہوا۔

یہ تقریر آپ کو 1917ء کے اس دور میں لے جاتی ہے جب دنیا کے نقشے پر مسلمانوں کی مرکزیت کے طور پر ایک خلافت قائم تھی اور برطانیہ کی خفیہ ایجنسی M16 اس کو ختم کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لا رہی تھی۔ نسلی منافرت کا بیج بو کر عربوں کو اس خلافت کے خلاف اکسایا گیا اور جگہ جگہ بغاوت کے لیے مختلف جھنڈے استعمال ہوئے۔ ترک فوج اتنی بہادر اور دلیر تھی کہ ان کے سامنے آ کر اس سے مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔

ادھر نسلی منافرت کے علمبردار چند مفاد پرست لوگ تھے۔ یوں ان کا ذہن ترین ایجنٹ لارنس آف عربیا اپنے شیطانی دماغ سے چالیں بناتا اور خود بھی اس کی نگرانی کرتا۔ M16 کے اس ایجنٹ نے سب سے پہلے جس طریقے کا استعمال کیا وہ ایک دو انجنوں والی ٹرین کو اڑانا تھا، اسے اڑانے کے لیے ایک برقی سرنگ بچھائی گئی جس کے لیے لارنس نے ایک موٹس گن استعمال کی۔ ٹرین انتہائی صفائی کے ساتھ دھماکے کا شکار ہوئی کہ سارا کام صرف دس منٹ کے اندر مکمل ہو گیا۔ یوں دنیا کو پہلی دفعہ اپنے سے طاقتور دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایک ہتھیار اور ایک طریقہ کار مل گیا۔

دوسرا طریقہ جو دہشت گردی کا اس M16 نے دیا وہ 35 مصری نوجوانوں کو پاؤنڈ بانٹ کر خریدا گیا اور انہیں جابجا بارودی سرنگیں بچھانے کے لیے تیار کیا گیا۔ صحرا میں ان سرنگوں کو بچھانے میں لارنس اور ہوگر تھ ساتھ ساتھ تھے اور پھر صحرا میں اسی ٹولے کی بچھائی ہوئی سرنگوں سے مسلمانوں کے جسموں کے پرچے اڑنے لگے۔ بغداد اور یلوے اڑادی گئی، مواصلاتی مرکز تباہ و برباد کر دیے گئے، سپلائی لائن کاٹ دی گئی اور پھر اس خفیہ دستاویز میں درج لارنس آف عربیا

دن آ گیا جب اس نے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن کو ہرا کر عالمی اعزاز حاصل کیا تو دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ آج اس نے اپنا مخصوص نعرہ نہیں لگایا: "I am Great" اور وہ سیدھا ڈرائیونگ روم میں گیا اور دو رکعت شکرانے کے نفل ادا کیے اور پھر جب کسی صحافی نے اسے کہا کہ "You are Great" تو اس نے کہا: "نہیں! Allah is Great!"

یہ واقعہ اللہ اکبر کا نعرہ تھا کہ جو اس نے بلند کیا تو پورے مغرب کا پر لیں اس کے خلاف ہو گیا۔ یوں امریکا کے لوگوں نے پیٹرن سے اپنی ساری توقعات وابستہ کر لیں۔ اس نے بھی محمد علی نہیں بلکہ اسلام اور اس کی روایت کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ محمد علی نے کہا کہ مجھے اس طرح یورپ اور کیتھولک مذہب کے خلاف بات کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کہ میرا مذہب نہیں سکھاتا۔ میں پیٹرن کو رنگ میں دیکھوں گا۔

دیکھنے والوں نے وہ منظر دیکھا کہ پیٹرن نے اس بری طرح مار کھائی کہ اسے اسٹریچر پر لاد کر رنگ سے باہر لے جایا گیا۔ یہی محمد علی تھا جس کو دیت نام کی جنگ میں زبردستی بھرتی کیا گیا۔ نہ جانے پر جیل میں ڈالا گیا اس سے باکسنگ کے تمام اعزاز چھین لے گئے مگر اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔

ورلڈ ہیرو مائیک ٹائسن بھی باکسنگ کی دنیا کا شہسوار تھا۔ جو مارچ 1987ء کی عالمی چیمپئن کے اعزاز سے سرفراز ہوا۔ یہ جیل اس کے لیے تبدیلی اور نور ہدایت کا راستہ بن گئی اور جب 25 مارچ 95ء کو جیل سے برآمد ہوا۔ تو مائیک ٹائسن فن ہو چکا تھا اور ملک عبدالعزیز برآمد ہو رہا تھا۔ اس کے مداحوں کا جھوم ارد گرد تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر اس پر پھولوں کی پیتاں بچھا رہے تھے، لیکن یہ جھوم حیران رہ گیا مائیک عبدالعزیز کی گاڑی پلین فیلڈ اسلامک سینٹر پہنچ گئی اور وہاں ہزاروں کیمروں کے درمیان جب وہ سر بسجود ہوا تو آنسوؤں اور ہچکچوں کی آواز دور تک آرہی تھی۔

اور اب اس شخص کا ذکر جس کی تڑپ اور لگن نے ان جیسے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ جرم کی دنیا کا بادشاہ اور منشیات کے کاروبار کا نگران میلکم ایکس کے نام سے جانا جاتا تھا بچپن میں یتیم ہونے کے بعد چرچ کی امداد پر پلا۔ ویٹر کی نوکری کی۔ بوٹ پالش کا دھندا کیا اور پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ فریب اور مکاری کا سہارا لے کر جرم کی دنیا میں آ نکلا لیکن اس کے ساتھ وہی ہوا جو کالوں کے ساتھ اس معاشرے میں ہوتا ہے۔

اسے ایک ناکردہ گناہ کے جرم میں دس سال قید ہو گئی۔ پھر جیل میں اسے لوگ مل گئے جو اس کی زندگی تبدیل کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ اس نے وہ تمام کتابیں پڑھ لیں جو پیغمبر اسلام سے متعلق تھیں۔ شراب نوشی چھوڑ دی، لیکن اس کے نزدیک وہ اسلام تو قبول کر چکا تھا لیکن مکمل ایمان کی حالت میں اس وقت آیا جب وہ حج پر گیا وہ حیران رہ گیا کہ اس اجتماع میں نہ کوئی گورا ہے نہ کالا، نہ مغربی ہے نہ مشرقی، سب ایک لباس میں اللہ اکبر کا نعرہ لگا رہے تھے۔

تقریروں اور دین کے علم نے ہزاروں امریکیوں کے دل بدلنے شروع کیے۔ وہ پورے امریکی معاشرے اور یہودی نواز طبقے کے لیے خطرہ بننا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ایک تبلیغی جلسے میں خطاب کے دوران شہید کر دیا گیا لیکن اس کی لگائی ہوئی شمع آج بھی اسی طرح روشن ہے۔

یہ سب اس لیے یاد آ رہا ہے کہ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم الیکوٹھ کی پوتی نے اسلام قبول کرتے ہوئے اعلان کیا ہے اس وقت سترہ ہزار سے زیادہ اعلیٰ نسل کے انگریز اسلام قبول کر چکے ہیں اور اگر برطانیہ میں ایک میلکم ایکس آ گیا تو پھر دیکھیں کیسے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرتے ہیں۔

## نور ہدایت کے راستے پر

(29 جمادی الثانی 1426ھ بمطابق 05 اگست 2005ء)

سید نابال رضی اللہ عنہ کی طرح ان تینوں کے آبا و اجداد بھی افریقہ کے ان حبشی قبائل میں سے تھے جن پر صدیوں سے غلامی کا طوق اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ بیچنے کی روایت مسلط تھی۔ انہیں خریدنے، گرفتار کر کے زبردستی محنت و مشقت کرانے، غلام بنا کر رکھنے یا پھر نفع کی خاطر آگے بیچ دینے کا دھندہ گزشتہ صدی تک چلتا رہا۔ خریدار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی کہ ان کا مذہب کون سا ہے، وہ کس نسل سے ہیں یا وہ کون سی زبان بولتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کی طرح ان کو پھندے لگا کر پکڑا جاتا اور جہازوں میں بھر کر منڈیوں میں فروخت کر دیا جاتا۔

لیکن آج ان غلاموں کی نسل سے تین ایسے ہیروز کی داستان بیان کرنے کو جی چاہ رہا ہے جن کے آبا و اجداد اسی طرح غلام بنا کر امریکا لائے گئے۔ مدتوں غلاموں کی طرح کام میں جتے رہے۔ اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں جس میں ان کے آقا رنگے ہوئے تھے۔ یوں ان کی آئندہ نسلیں بھی ارد گرد بسنے والوں سے مختلف نہ تھیں۔ آزاد خیال، رنگینوں میں ڈوبے ہوئے جرائم کی دنیا سے وابستہ۔

ان لوگوں میں سے تین افراد ایسے تھے جو امریکا کے معاشرہ میں اسی حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ گوروں کے خلاف ویسا ہی غم و غصہ اور نفرت لیے ہوئے تھے۔ اپنے آبا و اجداد کے قریب عیسائیت سے وابستہ تھے لیکن یہ تینوں کسی نہ کسی طور پر اپنے کھیل، اپنی صلاحیت اور اپنی شخصیت کی بنیاد پر پورے امریکا میں جانے اور پہچانے جاتے تھے پھر ان پر رب کا کرم ہوا اور انہیں راہ ہدایت مل گئی۔ ان کی زندگیاں کیسی تھیں؟ یہ کس قصر ذلت میں گم تھے اور اب ان کی زندگی میں کیسا انقلاب آیا؟ امریکی معاشرے نے ان کے ساتھ کیسا رویہ رکھا؟ یہ تینوں طبقے کا سس کلمے میں جو محمد علی کے نام سے مشہور ہوا۔ باکسنگ کا ناقابل تسخیر ہیرو مائیک ٹائسن باکسنگ کا دوسرا ہیرو جس نے اپنا نام شہباز عبدالعزیز رکھا اور میلکم ایکس منشیات کی دنیا کا بے تاج بادشاہ مسلمان ہوا تو نام ملک الشہباز رکھا۔

محمد علی کے نام سے کون آشنا نہیں؟ 18 جنوری 1942ء میں ایک بورڈینیٹر کا سس کلمے کے گھر پیدا ہونے والا یہ شخص بچپن سے کئے بازی کا شوقین تھا۔ 18 سال کی عمر تک 108 مقابلے لڑ چکا تھا جن میں 100 سے زیادہ میں فتح مند ہوا اور پھر 1960ء میں وہ روم میں ہونے والے اولمپک مقابلوں میں چیمپئن بن گیا لیکن اس چیمپئن کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ وہ غلطی سے ایک گوروں کے ہوٹل میں داخل ہو گیا لیکن عالمی ہیرو ہونے کے باوجود اسے دھکے مار کر وہاں سے نکال دیا گیا۔

نفرت کی اس دنیا میں اسے ایک ایسے مذہب کی تلاش تھی جہاں گورے اور کالے میں کوئی تمیز نہ ہو اور پھر وہ



دیا گیا اور آج تک اس کے خاندان میں سے جو بھی ذرا ساقیادت کے قابل ہوا ہے اسے موت کا سامنا کرنا پڑا۔  
یہ ایٹمی ہتھیار بھی راز میں رہتے اگر 80ء کی دہائی میں برطانوی ایٹمی کارمگر وینونو اس راز کو طشت از بام نہ کرتا جو وہاں اسرائیل میں کام کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگا تو اسے اپنے ملک میں بھی پناہ نہ مل سکی۔ ملکوں ملکوں خاک چھانتا ٹلی میں ایک اسرائیلی حینہ کے زرغے میں آ کر گرفتار ہوا اور آج تک اسرائیل کی قید میں ہے۔  
یہ عجیب و غریب کہانی یوں آج کی دنیا کے سامنے بہت بڑے انکشاف کے طور پر پیش ہوئی ہے لیکن شاید ہمارے لیے یہ انکشاف نہیں ہے۔ جو ملک جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ ختم کرنے کے بعد بالفور معاہدے کے تحت اسرائیل کے قیام کی ذمہ داری لیتا ہے اور پھر 25 سال اس کی ساری ایجنسیاں، فوج، دفتر خارجہ اور عالمی دباؤ اس دھن میں لگے رہتے ہیں کہ کب اس دنیا کے نقشے پر ایک ملک اسرائیل جنم لے اور پھر اس کی کوششوں سے یہ ملک معرض وجود میں آتا ہے، اس کے بیوروکریٹس کے سامنے یہ 20 ٹن ہیوی وائر کی ترسیل کیا حیثیت رکھی ہے۔  
یہ ہیوی وائر جسے بھاری پانی کہا جاتا ہے دیکھنے میں کتنا بے ضرر ہے لیکن شاید اس کی ترسیل کرنے والوں کو بھی اس کا علم نہ ہو کہ اس بھاری پانی کی قیمت بہت بھاری ہے جو بے گناہوں کے خون سے آج تک ادا ہو رہی ہے۔



## بھاری پانی کی بھاری قیمت

(06 رجب 1426ھ بمطابق 12 اگست 2005ء)

اس سودے کے اکثر کردار مرچکے ہیں۔ یہ سب اس وقت برطانیہ کے سیاسی اُفق پر چھائے ہوئے تھے لیکن ان میں ایک کردار لارڈ گل مور آج بھی زندہ ہے۔ وہ گزشتہ دنوں بی بی سی ٹیلی ویژن کی نیوز نائٹ پروگرام میں آیا اور اپنے انکشافات سے دنیا کو حیران کر گیا۔ اس نے کہا کہ برطانیہ ہی وہ ملک ہے جس نے اسرائیل کو بیس ٹن ہیوی وائر (Heavy Water) بیچا جس کی وجہ سے اسرائیل اس قابل ہوا کہ وہ لاتعداد ایٹم بم بنا سکے۔ اس نے کہا کہ پبلک ریکارڈ آفس میں وائٹ ہال دستاویز میں اس معاملے کی تفصیلات درج ہیں۔

بی بی سی نے یہ تمام دستاویز نکالیں اور مزید حیران کن انکشاف کیا کہ یہ کام سیاسی قیادت کی سطح پر نہیں بلکہ بیوروکریسی کی سطح پر انجام پایا اور وزیر اعظم میکملن کی حکومت کے ان افسروں نے خصوصی اہتمام کیا کہ اس ڈیل کو امریکا سے خفیہ رکھا جائے۔ لارڈ گل مور ٹی وی پر کہہ رہا تھا کہ میں بالکل حیران اور ششدر رہ گیا تھا کہ ہیرالڈ میکملن اور اس کے وزیروں کو اس بات کا اندازہ تک نہیں ہونے دیا گیا اور اسرائیل کو یہ 20 ٹن ہیوی وائر یوں بیچا گیا کوئی معاہدہ تک نہیں لکھوایا گیا کہ وہ اسے ایٹم بم بنانے میں استعمال نہیں کرے گا۔ کوئی بھی سول سرونٹ مفادات کی جنگ میں اس قدر بھی گر سکتا ہے یہ کبھی سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا! یہ مکمل طور پر ایک کاروباری ڈیل معلوم ہوتی تھی۔

سب سے پہلے برطانیہ کی ایٹمی انرجی اتھارٹی نے 1.5 ملین پاؤنڈ کی مالیت میں ناروے سے ہیوی وائر خریدا اور یہ عنندیہ دیا کہ اسے اپنے لیے استعمال کرے گی۔ یہ 1.5 ملین پاؤنڈ کی قیمت آج کے بازار میں 20 ملین پاؤنڈ سے کم نہیں اور پھر جیسے ہی اس کے جہاز برطانوی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے فوراً اسرائیل کو فروخت کر دیے گئے۔ دس ٹن ہیوی وائر لیے ہوئے دو جہاز باری باری اسرائیل کی بندرگاہ پر پہنچے جہاں سے یہ سامان اسرائیل کے زیر زمین صحرائی ایٹمی ری ایکٹر ڈائی مونہ میں پہنچا دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکا پر آئرن پاور کی حکومت تھی اور امریکی حکومت بہر طور یہ چاہ رہی تھی کہ اسرائیل اس کی امداد کا ہی محتاج رہے اور خود ایٹمی ہتھیار نہ بنائے لیکن 1961ء میں یہ راز بہر طور کھل گیا کہ اسرائیل ایٹمی ہتھیار بنانے کے قریب ہے لیکن اس ضمن میں برطانیہ کے بیوروکریٹ کی مدد پر پردہ ہی پڑا رہا۔ ادھر امریکا میں کینیڈی کی حکومت آگئی جو تمام امریکی صدور میں واحد تھا جو فری میسن تحریک سے کبھی بھی وابستہ نہیں رہا تھا۔

اس کے وزیر دفاع رابرٹ میکن مارا اور اس نے مل کر کوشش کی کہ اسرائیل کو ایٹم بم بنانے سے روکا جائے۔ یہ کوششیں جاری تھیں کہ کینیڈی ایک دردناک انجام سے دوچار ہو گیا۔ اسے دن دھاڑے ہیوی وائر بچوں کے سامنے قتل کر

رکھتے یا روزی کما تے۔ موصول کے کتب خانے میں طلبہ کو کتاب کے ساتھ کاغذ بھی مہیا کیا جاتا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں ذاتی کتب خانے کا شوقین نہ ہو۔ گھن نے لکھا ہے کہ ایک طبیب نے بخارا میں بادشاہ کی نوکری اس لیے ٹھکرا دی تھی کہ اس کی کتابوں کو لاد کر لے جانے کے لیے چار سواون درکار تھے۔

الواقدی نے ترکے میں 600 صندوق کتابوں کے چھوڑے جن میں سے ایک صندوق کو اٹھانے کے لیے دو صحت مند آدمیوں کی ضرورت تھی۔ مدرسہ، علم، سائنس، ریاضی فلکیات اور طب یہ وہ پہلو ہیں جو اسلام کے درخشاں دور کے نظام تعلیم کا خاصہ تھا۔ وہ نظام تعلیم جو بنیادی اخلاقی تربیت اور عقیدے کی مضبوط بنیادیں کھڑی کر کے شخصیت کی تعمیر کرتا تھا اور پھر اس کے بعد اسے علوم کے بحر بیکراں میں چھوڑ دیتا تھا۔ وہ گوہر (موتی) چن کر لاتا اور پھر اپنے علم کی روشنی آگے پھیلاتا۔

یہی لوگ تھے جنہوں نے 750ء سے 900ء تک تراجم کا وہ عظیم کام کیا کہ دنیا بھر کا علم عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ 830ء میں المانوں نے بغداد میں دو لاکھ دینار کی لاگت سے ”بیت الحکمہ“ بنائی جس میں ایک رصد گاہ، عوامی کتب خانہ اور مترجمین کی ایک فوج بھرتی تھی۔ پھر یہ ترجمے صرف عربی میں ہی نہیں، ہر بولی اور پڑھی جانے والی زبان میں ہوئے۔ اس علم کی اساس پر اور کردار کی بنیاد پر وہ عظیم فلسفی، سائنسدان، ریاضی دان اور طبیب پیدا ہوئے کہ جنہوں نے پوری دنیا کے علم کا رخ بدل دیا۔ ابوعلی سینا سے جابر بن حیان اور الخوارزمی سے البیرونی تک۔ ایک طویل فہرست ہے یہ لوگ نہ کبھی کسی کے علم سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی کسی کی تہذیب سے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی کوئی یونیورسٹی ان کی کتب کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

یہ سب بیان کرتے ہوئے اگر اپنے ارد گرد بکھرے ہزاروں اسکولوں، کالجوں کی طرف نظر جاتی ہے تو بس ایک فرق نظر آتا ہے۔ استاد بھی ہے، شاگرد بھی ہے۔ کتب بھی ہے، پڑھائی کا شوق بھی..... لیکن وہ مدرسہ کی سادگی، قناعت، بے لوث تعلیم اور کردار سازی کی اہمیت کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں روپے والدین خرچ کرتے ہیں اور ایک مرعوب اور بے یقین و بے اطمینان شخص یونیورسٹی سے نکلتا ہے اور اس طرح مدرسے کی روایت سے جنم لینے والا ایسا علم دے کر جاتا ہے کہ آج الجبرا کا لفظ مسلمانوں سے آغاز پاتا ہے، اعشاریہ کا آغاز، طب کے کارنامے اور ابوعلی سینا کی حیثیت۔ فرق صرف ایک ہے ایک طرف کچے جھونپڑے میں کردار سازی ہے پھر علم۔

دوسری طرف علم ہے اور اس کے بلند کاروبار۔ جس علم کے حصول کا مقصد کاروبار ہو جائے وہاں مٹی اور گارے کی عمارت تو کھڑی ہو سکتی ہے، کردار کا روشن مینار نہیں۔



## تھے تو آباوہ تمہارے ہی

(13 رجب 1426ھ بمطابق 19 اگست 2005ء)

میرے سامنے اس وقت بیٹی، ڈیورنٹ، پول اور یورپ کے دیگر کئی مؤرخین کی کتابیں کھلی پڑی ہیں اور سب کے ورق در ورق بیان کیے گئے مناظر سے ایک حیران کن تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ایک منظر نامہ، ایک طویل ڈاکومنٹری یا ایک متحرک زندگی پر مبنی فلم۔ میں اپنے آپ آنکھیں بند کر کے اس ماحول میں چلا جاتا ہوں..... یہ ساتویں صدی عیسوی کا آغاز ہے۔ پوری مسلم دنیا کے شہروں اور قصبوں میں جونہی بچ بولنا شروع کرتا اور تھوڑی سی زبان میں روانی آتی اس کی تعلیم شروع ہو جاتی۔ تقریباً چھ سال کی عمر میں عموماً تمام لڑکے، کچھ لڑکیاں اور کچھ غلام بچے ایک ابتدائی مدرسے میں داخل ہو جاتے جو عموماً کشادہ عمارت کے اندر یا کسی عوامی فارے کے نزدیک کھلی فضا میں ہوتا۔ تدریس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ نصاب بہت سادہ تھا۔ قرآن کی قراءت..... تاریخ، اخلاقیات اور قانون۔ فلکیات اور ریاضی کی تعلیم اس کے بعد دی جاتی۔

ابتدائی تعلیم میں کردار سازی مقصد اول تھا۔ پھر اس کے بعد ثانوی تعلیم کا مقصد علم کی منتقلی تھی۔ مسجدوں یا مدرسوں کے ستون یا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے مدرس نہ صرف قرآن، تفسیر اور حدیث کا علم دیتے بلکہ علم اللسان، علم البدیع، ادب، ریاضی، کیمیا اور علم الفلکیات بھی ان کی دسترس میں تھے تاکہ تشنگان علم کی پیاس بجھے۔ پوری مسلم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک علم کے طالب گھومتے پھرتے۔

دمشق، قاہرہ، بغداد، مکہ اور مدینہ..... غرض کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ اس میں کوئی اجنبی سیاح داخل ہو اور اسے توقع نہ ہو کہ یہاں کسی شہر کی مرکزی مسجد میں کسی عالم کا وعظ سننے کو نہیں ملے گا، بلکہ علم کی طلب میں شہر بہ شہر گھومتے طالب علم کو مفت رہائش اور کھانا بھی مل جاتا۔ جب تک علم کی پیاس رہتی وہ وہاں قیام کرتا اور پھر اس علم کی منتقلی یا کسی اور صاحب علم سے تلمذ کے لیے دوسری جانب روانہ ہو جاتا۔

پوری مسلم دنیا میں ان مدرسوں سے علم کی روشنی حاصل کرنے والوں کو کسی قسم کی کوئی سند یا سرٹیفکیٹ نہیں ملتا تھا۔ طالب علم کو بس اپنے استاد کی منظوری کا اشارہ کافی تھا۔ حتیٰ منزل ”آداب“ کا حصول تھا۔ یہ وجہ تھی کہ آج کی طرح کسی نے سند سامنے رکھتے ہوئے سوال پوچھ کر امتحان نہیں لیا بلکہ اس کا علم خود اس کی زبان سے تصدیق کر دیتا۔

علم کی پیاس میں نکلنے والے مدارس کے یہ طالب علم جب سمرقند پہنچتے تو انہیں معلوم ہوا کہ ایک کاغذ نام کی چیز بھی ہے جو علم کو کتاب کی صورت میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچاتی ہے۔ 707ء میں بغداد میں ایک سو سے زائد کتب فروش موجود تھے۔ بہت سے طلبہ مسودوں کی نقل کر کے ان کتب فروشوں کو پہنچاتے اور اس سے اپنی تعلیم جاری

ناظمین کی طرح تھا۔ یہ مہامیر لوگوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔

انسانوں کے درمیان ذات پات کی تقسیم سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جانوروں پر ظلم کرنے والے کو بھی سزا ملتی ہے۔ ہر فرد کے روزگار اور کھانے پینے کے لیے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اشوک کی حکومت صرف شمالی ہندوستان تک محدود تھی لیکن چند سال جو اس کے مہامیروں نے اس وعدے کا پاس کیا تو بغیر کسی جنگ لڑے پورا ہندوستان گلگت سے لے کر بنگال تک اور مدراس سے لے کر ہمالیہ تک اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ جو بھی پڑوس میں رہنے والے شہر تھے پکار پکار کر کہتے: ”ہمیں ایسا مہامیر دے دو، ہم تمہارے مطیع ہیں۔“

دوسرا منظر بھی قبل مسیح ایران کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران ایک ملک نہیں ہوتا تھا، چھوٹی چھوٹی حکومتیں اور ریاستیں تھیں۔ ان ریاستوں میں سے ایک حکمران ”کیقباد“ نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ لوگوں کو انصاف دے گا، ان پر ظلم نہیں ہونے دے گا، ان کی فلاح و بہبود پر زندگی صرف کرے گا۔ جب اس نے اپنی ریاست کے لوگوں کے ساتھ یہ عہد پورا کیا تو اس کی دھوم ارد گرد چمک گئی۔

اڑوس پڑوس کے لوگوں نے اپنے فیصلے اس سے کروائے تھے اور پھر اپنے ظالم حاکموں سے تنگ آتے ہوئے لوگ اسے اپنے علاقے کا سربراہ بھی تسلیم کرنے لگے۔ یوں صرف چند سالوں میں کیقباد پورے ایران کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔

یہ دونوں مثالیں میرے پیارے نبی، ہادی، برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے ہدایت سے قبل ایک فطری سچائی پر از خود عمل کیا یعنی عہد کا پاس کیا اور میرے اللہ نے انہیں عروج عطا کیا لیکن جب میں اس امت کے ان منتخب لوگوں کو عہد کرتے دیکھتا ہوں یہ کیسا کانٹوں کا تاج اپنے سر پر رکھنے جارہے ہیں؟ یہ تو اس نبی کے امتی ہیں جس نے فرمایا تھا: ”اس کا ایمان نہیں جس کا عہد نہیں۔“

یہ اختیار ان ہزاروں کونسلروں اور ناظمین کو ملے ہیں اس اللہ کے حضور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کا ایمان کیسا ہے؟ وہ بارگاہ جہاں جھوٹے وعدے، رنگارنگ پمفلٹ اور کارکردگی کی بے بنیاد رپورٹیں پیش نہیں کی جاسکتیں۔



## اس کا ایمان نہیں جس کا عہد نہیں

(20 رجب 1426ھ بمطابق 26 اگست 2005ء)

رنگ برنگے بینروں، پوسٹروں، چھوٹے بڑے پمفلٹوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اشتہاروں کی گونج میں حسین دعوؤں کی ایک فصل بوٹی جا رہی ہوتی ہے۔ دروازوں پر دستک دیتے ہوئے صاحب خانہ سے ملاقات کا شرف حاصل کرتے ہیں اور پھر خود اس گلی، محلے اور علاقے کی ترقی کے منصوبے بنانا شروع کرتے ہیں، نہیں تو صاحب خانہ کی شکایات سننے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھے سر کو بار بار کورنش کی صورت جھٹکتے ہوئے وعدے کرتے جاتے ہیں۔ عہد و پیمان کی یہ دوڑ ان الیکشنوں کے درمیان سب نے دیکھی ہوگی جو امیدواروں کی شکل سے محروم تھے۔ انہوں نے ان کے وعدے اشتہاروں میں پڑھ لیے اور جو ملاقات کا شرف حاصل کر گئے انہیں ہر امیدوار کی طرف سے خوش آئند وعدے سننے کو مل گئے۔ پھر ان لوگوں نے اپنا عہد نبھایا، جس کو جس کے وعدے پر یقین تھا اس نے اپنے اعتماد کا دوٹ دیا۔

جیتنے والوں کی اس فوج اور مستقبل میں ان کے سامنے کیے گئے وعدوں کی پاسداری کا پہاڑ ذہن میں آتا ہے تو پتا نہیں کیوں بے جا سوالات جنم لینے لگتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں ہم نے جس طرح عہد و پیمان کا تسخیراڑیا ہے شاید ہی اس دور میں کسی قوم نے ایسا کیا ہو۔ ہم اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ کر ہمیشہ ان سارے وعدوں کو بھول گئے جو ہم نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے روبرو کیے تھے۔

ایسے مواقع پر مجھے اس علاقے کی تاریخ سے دوا ایسے حکمران یاد آ رہے ہیں جنہوں نے لوگوں سے نہیں بلکہ خود سے ایک عہد کیا اور پھر اسے پورا کیا اور اس دور کے عوام نے جب ان سے کیے گئے عہد کے ثمرات دیکھے تو انہیں سینے سے لگایا، آنکھوں پر بٹھایا اور مدتوں ان کے گیت گاتے رہے۔

اس برصغیر میں پانچ ہزار سالہ معلوم تاریخ کے دوران صرف 150 سال کے قریب ہندوؤں کی حکمرانی بنتی ہے لیکن ان سالوں میں ذات پات کی تقسیم اور عام آدمی کی بے بسی اور حالت زار دیکھنے کے قابل تھی۔ کشت و خون سے لبریز اس تاریخ میں ایک شخص اشوک پیدا ہوتا ہے۔ کلنگہ کی جنگ میں دس لاکھ آدمی قتل کرنے کے بعد اچانک لاشیں دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

ہندو مذہب ترک کر دیتا ہے اور بدھ ہو جاتا ہے۔ یہ دور قبل مسیح کا دور تھا اور پھر اپنے آپ سے ایک وعدہ کرتا ہے کہ میں عام آدمی کے دکھ بانٹوں گا، انصاف دوں گا، کسی کو بھوکا مرنے نہیں دوں گا۔ اس عہد کی تکمیل کے لیے وہ ہر علاقے میں ایک ایماندار اور قابل افسر مقرر کرتا ہے ”مہامیر“ کہا جاتا ہے۔ اس کا اختیار اور کام کاج بالکل ہمارے

کرافورڈ میں صدر بش کی ذاتی رہائش گاہ کے پاس ایک ماں جس کا بیٹا عراق کی جنگ میں مارا گیا اس نے ایک احتجاجی کمپ لگایا ہوا ہے۔ اس کمپ میں دن بدن لوگوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور پورا امریکی میڈیا اس عورت کو (Peace Mother) امن کی ماں کا خطاب دے رہا ہے۔ گزشتہ اتوار کو وہی میڈیا جو اقوام متحدہ میں امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی تقریر دکھا رہا تھا جس میں عراق کے ہتھیاروں کا ذکر تھا، آج اسی CNN پر ایک فلم چلائی گئی جس کا نام Dead Wrong تھا یعنی مردہ غلطی یا موت کی طرف لے جانے والی غلطی۔

اس فلم میں بڑے بڑے جفا داری اور اہم افراد نے ان تمام تفصیلات سے لوگوں کو آگاہ کیا کہ کس طرح خفیہ رپورٹوں کو بدلا گیا، ان میں اپنی مرضی کا مواد شامل کیا گیا اور پھر سے لوگوں کو عراق میں جنگ کے لیے گمراہ کیا گیا۔ لیکن اس سب سے اہم بات وہ ہے جو کسی بھی امریکی صدر کے لیے ایک تہمت اور ایک ذلت و رسوائی سے کم نہیں اور وہ یہ کہ اس ہفتے پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ امریکا میں ان لوگوں کی تعداد 50 فیصد سے کم ہو گئی جو صدر بش کو ایماندار سمجھتے ہیں یعنی امریکا کی اکثریت اب صدر بش کو ایک بددیانت صدر کے طور پر گردانتی ہے۔

دوسری جانب امریکا کے تبصرہ نگار جو ہر چیز کو رقم کے پیمانوں پر ناپتے ہیں، انہوں نے اندازہ لگایا ہے اس عراق جنگ کی قیمت امریکیوں کو ایک ٹریلین ڈالر کے طور پر ادا کرنا پڑے گی۔ وہ آج کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس جنگ کے بعد امریکا کے زرمبادلہ کے ذخائر کی حالت یہ ہو گئی ہے اب جاپان پہلے نمبر پر چین دوسرے، تائیوان، جنوبی کوریا اور ہندوستان کے بعد نویں نمبر پر آ رہا ہے۔

لیکن اس غرور کا کیا کیا جائے؟ اس گھمنڈ کا کیا علاج ہے کہ ہم نے ایک کمزور قوم کو فتح کرنا ہے۔ غرور اور طاقت کے نشے کی ایک سرشت ہے کہ اسے نہ ماضی کا کوئی سبق یاد رہتا ہے نہ دوسروں کا انجام۔ نہ دیت نام کی پسائی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی برطانیہ کا زوال۔



## ماضی سے کون سیکھتا ہے؟

(27 رجب 1426ھ بمطابق 02 ستمبر 2005ء)

یہ زمانہ تھا جب برطانیہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے طاقتور حکومت سمجھتا تھا۔ مشرق سے مغرب تک اس کی طاقت کے ڈنکے بجتے تھے۔ لوگ کہتے تھے اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ شاہانہ جاہ و جلال کے اس دور میں دنیا کے کسی بھی ملک میں سراٹھانے، خلاف بولنے یا پالیسیوں سے انحراف کرنے کی جرأت اس عالمی طاقت کو برداشت نہیں ہوتی تھی۔

یہ 1899ء کا زمانہ تھا جب اس ملک نے ایک چھوٹے سے ملک بوئیر (BOER) کو اس کی آزاد روی کی سزا دینے کا ارادہ کیا۔ برطانوی فوج نے اس علاقے میں اپنی کارروائیاں شروع کیں۔ قبضہ حاصل کیا اور پھر اعلان کر دیا کہ اب یہاں مکمل طور پر کنٹرول حاصل ہو گیا ہے۔ یہ 1900ء کا جون کا مہینہ تھا جب برطانوی عوام کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ اب ہم بوئیر کے علاقے سے اپنی جنگ ختم کر رہے ہیں لیکن ٹھیک ایک ہفتے بعد اس مغلوب اور مفتوح قوم نے دنیا کی اس سپر پاور کے خلاف گوریلا جنگ کا اعلان کیا اور دو سال تک برطانیہ کی فوج کو اپنی کارروائیوں سے زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ ایک جگہ سے بچ نکلتے تو دوسری جگہ حملے کا شکار ہو جاتے۔

یہاں تک کہ برطانیہ کو اس قوم پر فتح حاصل کرنے کے لیے چار لاکھ پچاس ہزار افواج متعین کرنا پڑیں لیکن صرف فوج متعین ہی نہیں بلکہ تاریخ کی بدترین دہشت، ظلم اور بربریت کی مثالیں صرف اس بوئیر کی اس جنگ میں نظر آتی ہیں لیکن تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ صرف غرور اور تکبر، طاقت کے گھمنڈ کی اس جنگ نے برطانیہ کو جس معاشی اور اقتصادی بحران کا شکار کیا اس کی نظیر ڈھونڈنا مشکل ہے۔ لوگوں میں جس طرح اس کا اعتماد ختم ہوا، اس کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔

تاریخ کی یہ مثال آج ٹھیک اسی طرح امریکا کے شہروں، گلیوں اور بازاروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہی امریکا جو اپنی عظمت، حکمرانی اور طاقت کے گھمنڈ میں عراق کے میدان کارزار میں اترا تھا۔ دن رات اس کے ٹیلی ویژن رات کو ہونے والی بمباری اور عراقی عمارتوں سے اٹھنے والے شعلے دکھا رہے تھے، امریکی ٹینکوں کو صحرا میں بڑھنے اور صدام حسین کے مجسمے کو گرنے کا منظر نشر کر رہے تھے، آج ٹھیک دو سال بعد ان کا مشہور ٹی وی چینل سی این این این ہیڈ لائنز اس طرح بتاتا ہے کہ پورے امریکا میں کیے گئے سروے کے مطابق 54 فیصد امریکیوں نے کہا کہ عراق کی جنگ سب سے بڑی غلطی تھی اور 57 فیصد نے کہا کہ عراق کی جنگ کی وجہ سے ہم امریکی مزید خطرات سے دوچار ہو گئے ہیں اور اپنے آپ کو مزید غیر محفوظ تصور کر رہے ہیں۔



شہر والے دوسرے شہروں کی طرف بھاگ گئے۔ پانی میں گھرے ہوئے یہ لوگ لٹیروں کا نشانہ بنے۔ ان کو بچانے کے لیے ہیلی کاپٹر آئے تو اپنا شکار ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر اس ہیلی کاپٹر پر بھی فائر کر دیا گیا۔ دوسری جانب قدرت کا طوفان 225 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھتا رہا۔

جس دوران یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ہزاروں لوگ مر رہے تھے، لاکھوں لوگ جا رہے تھے، انسانی حقوق کی علمبردار حکومت کا سربراہ اپنی ٹیکساس کی رہائش گاہ میں ایک ماہ کی چھٹیاں گزارنے میں مصروف تھا جسے عراق کی جنگ اور مسلمان ملکوں پر گولہ باری کے دوران چین نہیں آتا تھا، ہر دوسرے روز اپنی فتح اور دہشت گردوں کے مرنے کی کہانیاں سنایا کرتا تھا لیکن ٹھیک جس دن یعنی منگل کے روز اس طوفان نے آبادی پر حملہ کیا اسی دن اس نے ایک بہت بڑی تقریب میں ایک گلوکار سے ایک گٹار تھنے میں وصول کیا۔

ایک ماہ کی چھٹیوں میں سے وہ شخص صرف دو دن کے لیے باہر نکلا اور واشنگٹن میں ایک ٹی وی کو انٹرویو دے کر واپس چلا گیا لیکن اس ساری آفت کے دوران اسے اپنی ٹیکساس کی رہائش گاہ پر سائیکل پر چہل قدمی کرتے ہوئے دکھایا جاتا رہا۔

وہ صدر جس کے بارے میں تمام جائزے یہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دس میں سے صرف تین لوگ اس کی عراق جنگ کی حمایت کرتے ہیں، جو سونامی کے طوفان میں مرنے والے 2 لاکھ انسانوں کی موت پر بھی خاموش سا رہتا ہے اور گیارہ ستمبر کے واقعے پر بھی فلوریڈا میں بچوں کے اسکول میں اپنی تقریب جاری رکھتا ہے، جس کے بارے میں نیویارک ٹائمز لکھتا ہے: ”اس طوفان کے موقع پر اس نے اپنی زندگی کی سب بڑی اور غیر جذباتی تقریر کی۔ یوں لگتا تھا اسے لوگوں کی موت کا کوئی احساس نہیں۔ اس کی تقریر میں لذت تو میزائل گرنے، ڈیزلی کٹر پھٹنے اور فوجوں کے علاقوں پر یلغار سے آتی ہے۔“

اس اخباری شہسرنی ہے کہ: آج امریکا ایک لیڈر کی تلاش میں ہے۔

یہ سب پڑھتے دیکھتے اور لکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ جن کی زبانیں اس تہذیب، اس معاشرے اور ماحول کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہیں جو ٹی وی پر، جلسوں میں، نجی محفلوں میں ان کی اقدار کے گن گاتے ہوئے تھکتے نہیں، جنہیں اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں سے بو آتی ہے، وہاں ان کے درمیان رہتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ جو صبح سویرے امریکی سفارت خانے کے ویزے کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ویزے کی بھیک مانگتے ہیں۔ اتنے لوگ کہ پاکستان میں کسی بھی کاؤنٹر کی اتنی آمدنی نہیں جتنی امریکی ویزا کاؤنٹر کی ہے۔ جو اپنی شناخت قربان کر کے گرین کارڈ اور امریکی شہریت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ کیا یہ سب کسی ایک آفت، کسی ایک سیلاب، زلزلے، بجلی فیل ہو جانے کے دوران اس ہولناک معاشرے کی سفاکیت کے سامنے اپنی غیرت، آبرو، جان و مال اور غیرت کا تحفظ کر سکتے ہیں؟

شاید انہوں نے آنٹوں کے دوران اس معاشرے میں ایک پل گزارا نہیں ورنہ چیخ چیخ کر کہتے: ”میرا شہر، میرا گاؤں، میرا محلہ مجھے واپس دے دو۔ میری شناخت مجھے واپس دے دو۔ میری زندگی کے اپنائیت والے موسم مجھے واپس دے دو۔ یہ تو اپنوں کے ساتھ غیر بن جاتے ہیں میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“

## آفت زدہ لوگ اور امریکی معاشرہ

(04 شعبان 1426ھ بمطابق 09 ستمبر 2005ء)

یہ لوگ پھر اسی طرح لوٹ مار، تشدد، چھینا چھٹی اور مار پیٹ پر اتر آئے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں کہ لوگ آفت زدہ ہیں، گھروں سے بھاگ کر اپنا سب سامان چھوڑ کر جان بچانے کے لیے ایک کنونشن سینٹر میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ آج سے ٹھیک 32 سال پہلے بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ نیویارک میں اچانک بجلی فیل ہو گئی، لاکھوں لوگ جہاں تھے وہیں پھنس کر رہ گئے۔

کوئی کسی بلڈنگ کے کسی فلور میں اور لفٹ میں..... پھر اس کے بعد جو آزاد تھے ان پر شیطانیت کا بھوت سوار ہو گیا۔ جس کسی کو لوگوں کے گھروں، دکانوں، بڑے بڑے اسٹوروں سے جو ملے اڑا۔ جنہیں کسی فلور پر یا لفٹ میں بند کوئی عورت مل گئی اسے بلا تخصیص عمر، رنگ اور نسل زیادتی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ پورا نیویارک ایسے لگ رہا تھا جیسے وہاں انسان نہیں درندے بستے ہیں۔

آج تو یہ لوگ ایک قدرتی طوفان کا شکار تھے۔ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا سمندری طوفان جو اس کی جنوبی اور سب سے بڑے دریا مسیسیپی کے کنارے آباد شہر نیو آریلینز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پانی بازاروں، گھروں، دکانوں اور پلازوں میں گھسا تو لوگ جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگ ایک بڑے گنبد نما اونچے پلازہ Sapy dome میں جمع ہو گئے۔ علاقے کے میئر نے نیلگن نے پولیس اور دوسری فورسز کو لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری سونپی۔ پولیس اس کام میں مصروف تھی کہ اس معاشرہ پر جرم، لوٹ مار اور دہشت گردی کا وہ راج چھا گیا جس پر روشنیوں کا پردہ پڑا رہتا تھا۔

غنڈے لوگوں کے گھروں سے بھی قیمتی اشیاء اٹھا رہے تھے اور راہ چلتے لوگوں سے بھی روپیہ پیسہ چھین رہے تھے۔ وہ اس قدر دلیر تھے کہ ان ساٹھ ہزار لوگوں میں جا گھسے جو وہاں بھیڑ بکریوں کی طرح پناہ لیے ہوئے تھے۔ وہاں موجود گارڈز کو گوئی مار کر زخمی کیا اور لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔ جو بھی ان لوگوں کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرتا اس کی جانب اندھا دھند فائرنگ کی جاتی تاکہ بھاگ جائے اور ان کے شکار ان مظلوم لوگوں کو وہیں چھوڑ جائے جو اپنی کاروں میں وہاں سے نکلے تو پیٹرول پمپ والوں نے کئی گنا زیادہ قیمت پر پیٹرول بیچا۔ جس نے کھانے کے لیے کوئی چیز خریدنا چاہی اسے دکان دار کی لوٹ مار اور اپنی مجبوری کا احساس ہوا۔

اکثر تو جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں رکھتے تھے کہ اس قیمت پر سامان خورد و نوش خرید سکیں۔ جو صاحب حیثیت تھے وہ بھاگ گئے اور کسی نے اپنے ساتھ سالوں سے رہنے والے غریب پڑوسیوں تک کا خیال نہ کیا۔ اس ”مہذب“ ملک کے ترقی یافتہ شہر میں ایک لاکھ بیس ہزار افراد ایسے تھے جنہیں سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کے اپنے

ترکی مغرب کے رنگ میں ڈھلتا گیا۔ ملبوس بدلا، زبان بدلی، طرز معاشرت مغربی ہوا اور خواب یورپ کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے دیکھے جانے لگے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سب کا یا کلپ کے بعد اس معاشرے میں طیب اردگان جیسے لوگ کیسے پیدا ہو گئے اور لوگوں کی اکثریت سے برسرِ اقتدار بھی آ گئے اور مغرب کی ساٹھ سال کی محنت پر پانی پھیر گئے۔

پورا مغرب خوش تھا کہ ترکی میں دینی تعلیم اور مدرسوں پر پابندی لگ چکی ہے اور دونوں نئے رنگ میں رنگ چکی ہیں۔ لیکن عین ترکی سرحدوں پر روس اور کیونسٹ ممالک کی موجودگی نے ترکی میں ایک اور عفریت کو جنم دیا۔ یہ عفریت صرف سیکولر معاشرے میں پروان چڑھ سکتا تھا اور وہ تھا کمیونزم کا زور جس سے مغرب کا سرمایہ دار خوفزدہ تھا۔ یوں اس بڑھتے ہوئے کمیونزم کے عفریت نے جب افغانستان پر یلغار کر کے وہاں کا اقتدار سنبھال لیا تو ایک لبرل معاشرہ اس کمیونزم کا مقابلہ کرنے کی کہاں صلاحیت یا اخلاقی جرأت رکھتا تھا؟ اب اتاترک کا خواب اس کے ہاتھوں سے بکھرنے کے دن آ گئے تھے۔ یہ خواب بھی اس کے اپنے تیار کردہ افراد کے ہاتھوں سے بکھرا۔

وہ لوگ جو چھپ چھپ کر خاموشی سے، دیہات اور دور دراز کے علاقوں میں بیٹھ کر مذہبی تعلیم دے رہے تھے، وہ شاید اس دن کے منتظر تھے۔ جیسے ہی تعلیم کے شعبے کو نجی ملکیت میں دینے کا اعلان ہوا، صرف دو سالوں میں ترکی کے ہر شہر میں قرآن کورسز کا آغاز ہو گیا۔ امام مسجدوں کی نگرانی میں نجی اسکول بننے لگے۔

دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کے لڑیچے کے تراجم ترکی زبان میں ہونے لگے۔ امام حاطب وہ شخصیت تھے جنہوں نے مسجدوں کے اندر خاموشی سے دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ جب جگہ جگہ لوگوں نے پرائیویٹ اسکول کھولے تھے تو یہ اساتذہ اپنی مذہبی تعلیم، اخلاقیات اور مغرب نما ڈگری کے ساتھ ان اسکولوں میں آ گئے چونکہ ان کی تمام تر مغربی تعلیم پر بھی قرآنی تعلیمات کی چھاپ تھی اس لیے چند سالوں میں تعلیمی اداروں کا نقشہ ہی بدل گیا۔

وہ گھرانے جو اپنی بیٹیوں کو حجاب کی وجہ سے مخلوط اداروں میں نہیں بھیج پارہے تھے، ان کے اسکولوں میں جانے لگیں اور گھر اور بازار دونوں کا رنگ کمال ازم سے مختلف ہونے لگا۔ جس قوم کو 60 سال میں مذہب سے بیگانہ بنایا گیا تھا صرف دس سال میں واپس اسی منزل کی طرف لوٹ گئی کہ اسٹیفن براؤن کو لکھنا پڑا:

”ترکی میں اسلام پسندوں کو وسعت مل رہی ہے اور اب وہ اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ وہ فوج جس کے ذمہ سیکولر ازم کی حفاظت تھی، اس کے کردار کو پارلیمنٹ سے ختم کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ تبدیلی تھی جس نے نجم الدین اربکان اور طیب اردگان جیسے لوگوں کو پیدا کر دیا۔“

پوری قوم کی تقدیر، اس کی اخلاقیات، اس کی طرز معاشرت، اس کی مذہب سے وابستگی، اس کی اقدار کی معراج صرف ایک چیز سے وابستہ ہوتی ہے، اسے علم کون دیتا ہے، کیسا علم دیتا ہے اور اس علم کا مقصد کیا ہے؟ یہ وہ نکتہ ہے جو مغرب کے پلے باندا ہے۔ جس قوم کو مذہب، اخلاق، اقدار اور شناخت سے دور کرنا ہو اس کے علم کا مآخذ بدل دو۔ بدلنے کے لیے سوچ رہے ہیں۔

یہ فرسودہ ہیں، دہشت گرد ہیں، پرانے خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن مگر ان چالوں کے مقابلے میں میرے اللہ کی حکمت ہمیشہ غالب رہتی ہے، 60 سال کی محنت 10 سال میں دریا برد کر دیتی ہے۔

## اللہ کی حکمت

(11 شعبان 1426ھ بمطابق 16 ستمبر 2005ء)

یہ نظم کسی انتہا پسند تنظیم کے رکن نے تحریر نہیں کی ہے، یہ الفاظ ایران کے کسی ”انتہا پسند“ کے بھی نہیں جو جنونی ہو اور اسے امریکیوں کو یرغمال بنا کر سیاسی فائدے اٹھانے میں مزا آتا ہو۔ یاد رکھیں یہ الفاظ اس ملک کے وزیراعظم کے ہیں جس پر آپ سب سے زیادہ بھروسہ کرتے ہو۔ جسے تم لوگ واحد مسلم سیکولر ریاست کہتے ہو۔ جسے یورپی یونین میں داخل کرنے کے لیے اجلاس کرتے ہو۔

یہ الفاظ 27 جولائی 2004ء کو امریکی اسٹیفن براؤن نے اپنے مضمون ”ترکی کے ملا“ میں تحریر کیے۔ اس نے کہا کہ طیب اردگان نے یہ نظم اس وقت تحریر کی جب وہ استنبول کا میئر تھا اور اسے اس ملک کے سیکولر نظام کو توڑنے کے لیے مہینوں نظر بند رکھا گیا تھا، نظم کے الفاظ یہ ہیں:

”میں ہمارے سگنیں

مساجد ہماری بیرکیں

خانقاہیں ہماری ڈھالیں ہیں

اہل ایمان ہمارے فوجی ہیں۔“

ایک ایسے ترکی میں جسے کمال اتاترک نے 1923ء سے ایک لادین اور سیکولر ریاست میں تبدیل کرنے کی مضبوط بنیادیں رکھیں تھیں۔ یوں تو کمال اتاترک نے فوج کے بل بوتے پر اپنے قوانین کو جبراً ترکی کی مسلمان رعایا میں نافذ کیا تھا لیکن ترک قوم کو جبراً اور ڈکٹیٹر شپ سے سیکولر نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اس زمانے میں تمام تعلیم، مدرسے کے گرد گھومتی تھی۔ مدرسے ہر مسجد کا حصہ ہوتا تھا۔ جہاں تمام تعلیم قرآنی تعلیمات کے گرد گھومتی تھی۔ یہی وہ واحد ذریعہ تھا جس کے راستے اسلامی اخلاقیات معاشرے میں پروان چڑھتی اور کسی بھی جبر کے سائے تلے پھیلائی گئی لبرل ازم کا توڑ کر سکتی تھیں۔

اس نے مذہبی ادارے اور مدارس بند کر دیے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظام رائج کیا۔ تعلیم لازمی قرار دی اور تمام نصاب لادینیت اور سیکولر ازم کی بنیاد پر ترتیب دیا۔ عربی رسم الخط ختم کر دیا گیا ترکی زبان سے عربی کے الفاظ کو خارج کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ مساجد میں بھی اذان ترک زبان میں دی جانے لگی۔ کمال اتاترک کے اس ایجنڈے کو جس شدت سے وہاں کے مذہبی رہنماؤں نے روکنے کے لیے بے مثال قربانیاں دیں اس کی داستان خونچکاں بھی ہے اور الم انگیز بھی۔

باسی بھی سڑکوں پر ڈانس کرتے اور گیت گاتے پھرتے تھے اور حکومت بھی مطمئن تھی کہ اس طرح کے مضبوط حصار کو کون توڑ سکتا ہے..... لیکن پھر میرا رب جب پکڑ کا فیصلہ کرتا ہے تو سب حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ تیز ہواؤں اور جھکڑوں نے پہلے بجلی کا نظام درہم برہم کیا تا کہ پانی سوراخوں سے نکلے تو اسے باہر نکالنے والی مشینیں بے کار ہوں۔

یہی نہیں بلکہ غصے کی آندھی اس قدر غضب ناک تھی کہ مشینوں کے پرزے کئی کئی کلومیٹر دور اڑ کر جا گئے۔ طوفان کے ساتھ سمندر اچھلا تو پانی مٹی سی دریا کی طرف واپس لوٹا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سارے ہنگامے میں بند کی کئی سو فٹ دیوار ٹوٹی نہیں بلکہ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر ڈرل مشینوں سے ہزاروں سوراخ کر دیے گئے ہوں جن سے پانی زور و شور سے باہر نکل کر اس شہر کے ہاتھ بکھر رہا تھا۔ پھر آخر میں اس بند کی دیوار کے اوپر سے اچھل اچھل کر شہر میں داخل ہوا اور پورا شہر ایک بھرے ہوئے سوئمنگ پول یا ہاتھ بکھرنے کی صورت بن گیا جس کے ارد گرد مضبوط بند اس پانی کو روک رہا تھا کہ لوگوں پر قیامت قائم رہے، نہ پانی کہیں جاسکے اور نہ لوگ وہاں سے بھاگ کر فرار ہو سکیں۔

اب بھی اس شہر سے صرف پانی باہر نکالنے کے لیے ایک سال کے قریب عرصہ درکار ہے۔ اسی شہر میں کاروباری علاقہ سب سے بلندی پر بنایا گیا تھا اور اس کا سب سے اونچائی کا علاقہ Safes Dome تھا۔ لوگوں نے وہاں ویسے ہی پناہ لی جیسے طوفان نوح میں لوگ نیلوں کی چوٹیوں پر چلے گئے تھے لیکن جب پانی امریکیوں کی بنائی گئی مضبوط فصیل کو بھرنے لگا تو یہ Safes Dome بھی نہ بچ سکا۔

72 گھنٹے یعنی تین دن تک اس شہر میں پانی ٹھہرا رہا، ہوائیں چلتی رہیں، گھروں کی چھتوں اور گھڑکیوں کو یوں اٹھا کر پھینکتی رہیں جیسے بدست ہاتھی جنگل کے درختوں کو بھس میں تبدیل کرتے ہیں اور جب سب سے پہلے اخباری نمائندوں اور کیمرا مینوں کی ٹیمیں وہاں پہنچیں تیرتی ہوئی لاشوں، چھتوں پر ہلکتے روتے بچوں اور مدد کو پکارتے لوگوں کے سوا کوئی منظر نظر نہیں آتا تھا۔ دنیا کی سب سے طاقت ور قوت کی مددگار ٹیمیں بھی اندر جانے سے خوف کھا رہی تھیں۔ لیکن انسان بھی عجیب ہے، نہ اپنے رب کے اشارے سمجھتا ہے اور نہ ان سے سبق سیکھتا ہے۔ آج طاقت کے نشے اور ٹیکنالوجی کے غرور میں چور امریکی ماہرین کہہ رہے ہیں کہ شہر کی تباہی دراصل وہ بند ہے جو آرمی کے انجینئروں نے طوفان کو روکنے کے لیے بنایا تھا۔ اس بند کو وہ لوگ Levees (کسی حکمران کا صبا جی دربار) کہتے ہیں، ان کے نزدیک اسے زیادہ اونچا اور مضبوط ہونا چاہیے تھے۔ لیفٹیننٹ رابرٹ فلاور نے کہا کہ ہم نے یہ تجویز دی تھی کہ اسے مزید مضبوط اور بلند کیا جائے لیکن کوئی اس طرف سوچنے کو تیار ہی نہیں کہ بند تو قائم رہا صرف اس لیے کہ شہر غرق ہو جائے۔

نئے پمپنگ اسٹیشن ڈیزائن کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں، تیل کی تنصیبات کو کسی اور رخ پر محفوظ بنائے جانے کی گفتگو ہو رہی ہے..... لیکن عجیب بات ہے یہ سب نظام جو 1990ء کے قریب بنایا گیا تو یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ خلیج میکسیکو کا کوئی طوفان امریکا کی تیل کی سپلائی اور شہر کے باسیوں کی زندگی تباہ نہیں کر سکے گا مگر بس ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور سب زمین پر دھڑام سے گر گیا۔

ٹیکنالوجی کا غرور بھی اور طاقت کا نشہ بھی۔ میرا رب تو ایسی تیز ہواؤں کی بار بار مثالیں دیتا ہے لیکن شاید جسے غرق کرنا ہو اس کی آنکھوں، کانوں اور دلوں پر مہر لگا دیتا اور پکارتا ہے: ”اور تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔“

## رب کی پکڑ بڑی سخت ہے!

(18 شعبان 1426ھ بمطابق 23 ستمبر 2005ء)

دنیا کے امیر ترین اور طاقت ور ترین ملک امریکا کا یہ علاقہ اس کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پورا علاقہ جو میکسیکو کی خلیج کی کنارے آباد ہے، آج اس کا منظر ہی عجیب ہے۔ صرف چند گھنٹوں کے طوفان نے اس ملک کے اس معاشی مرکز کے یوں بچے ادھیڑے ہیں کہ ایسے لگتا ہے جیسے غصے میں بھری ہوئی یہ طوفانی ہوائیں یہ بتانے آئی تھیں کہ ہم اسی کے حکم سے چلتی ہیں جو پکار پکار کر کہتا ہے: ”تو نے دیکھا نہیں تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کھائے ہوئے بھس کی طرح۔“

بکھرے ہوئے شہر کے لمبے کی کہانی تو اپنی جگہ لیکن وہ جو دنیا کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے چلا تھا، جس نے اس ہوس میں انسانوں کا قتل جائز اور بستیوں کو برباد کرنا روا کر دیا تھا، اس کے اپنے توانائی کے ذخیروں کا کیا حشر ہوا؟ اس شہر کے ساحلوں کے ارد گرد پانچ سو تیل کے کنویں تھے جنہیں عرف عام میں Oil Rigs کہا جاتا ہے یہ سب کے سب کچھڑ، مٹی اور پانی سے اٹ کر مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں اور ان کو دوبارہ چالو کرنے کے لیے کئی سال لگ سکتے ہیں۔ اسی شہر میں تیل کی پیداوار کی وجہ سے 9 عدد تیل صاف کرنے کے کارخانے (Refineries) تھے جو پورے امریکا کی ضروریات کا 12 فیصد تیل صاف کرتے تھے، وہ مکمل طور پر بند ہو گئے ہیں۔

طوفان نے ان کی مشینوں کو یوں زنگ آلود کیا، اکھاڑا پچھاڑا ہے کہ مدتوں انہیں ٹھیک کرنے میں لگیں گے۔ اس علاقے سے امریکا کو 20 فیصد قدرتی گیس مہیا ہوتی تھی جس کی سپلائی بند ہو گئی ہے۔ دو بڑی پائپ لائنوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی تو ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے ٹھونس ٹھونس کر اس میں کچھڑ بھرا ہے جو خشک ہو کر ایسے جم گیا ہے کہ پائپ لائن گھڑے ہوئے سریے کے ستون کی طرح لگتی ہے۔

انسان اپنی تدبیروں سے اپنے آپ کو محفوظ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا ہے۔ کبھی اونچے اونچے محلات سے اور کبھی پہاڑوں کو کھود کر گھر بنانے سے..... لیکن بستیوں کے اجڑنے کی داستان ان سب تدبیروں کو خاک میں ملائی نظر آتی ہے۔ اس معاشی مرکز کو مضبوط بنانے کے لیے بھی امریکا نے ایسی ہی تدابیر کی تھیں۔ نیو اور لینز شہر کے ارد گرد 365 کلومیٹر لمبا ایک مضبوط بند بنایا گیا تھا جو اسے مٹی سی دریا اور پونٹ چارٹین جھیل کے پانیوں سے محفوظ کرتا تھا۔ اس بند کی اونچائی اتنی تھی کہ پورا شہر یوں لگتا تھا جیسے ایک ہاتھ بکھرا ہے جس کے کنارے بہت اونچے ہیں۔

اس بند میں تھوڑے سے فاصلے پر مختلف سوراخ بنائے گئے تھے کہ اگر کبھی کسی وقت پانی زیادہ ہو جائے تو یہاں سے مشینوں کے ذریعے پانی نکال کر واپس سمندر میں پھینک دیا جائے۔ ان سب تدبیروں کے بعد اس شہر کے

ہر مجلے اور ہر ویب سائٹ پر صرف ایک ہی لفظ لکھا ہوتا "NO" یعنی قطعاً نہیں لیکن کہیں اس لفظ کے آگے یہ تحریر نہیں کہ اسے عالم الغیب اللہ کی ذات ہی جانتی ہے، لیکن پھر بھی انسان نے اس اللہ کی ذات سے رجوع کرنے کی بجائے اس آفت کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا اور اس سے بچنے کی تدابیر سوچنے لگا۔

بالکل اسی طرح جیسے طوفان نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کا نافرمان بیٹا ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا تھا اور گمان کرنے لگا تھا کہ یہاں تک سیلاب کا پانی نہیں پہنچ سکے گا، لیکن میرے اللہ کی دسترس میں سب کچھ ہے جسے جہاں چاہے موت سے ہم آغوش کر دے۔

پاکستان میں اس ہولناک زلزلے کے بعد مجھے یہ سب کیوں یاد آ رہا ہے؟ وہ آفت کہ جس دن دنیا و مافیہا سے بے خبر لوگ اپنی زندگی میں معمول کا ایک دن گزار رہے تھے، بچے اپنے اسکولوں میں خوبصورت یونیفارم پہنے علم کی تلاش میں مصروف تھے۔ انفران، ابلکار، نج، افواج کے نمائندے سب اسے معمول کا ایک دن سمجھ رہے تھے۔ سائیکلوں کے ہاتھوں میں دیے ہی درخواستیں تھیں اور انفران کے قلم و دیسے ہی فیصلے لکھنے میں مصروف۔ مائیں اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر مطمئن تھیں۔

بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنے مورچوں میں سپاہی اسی طرح چاق و چوبند تھے۔ دکانداروں کے ہاں بھی کاروبار زندگی ویسا ہی تھا، لیکن صرف چند سیکنڈ کے لیے میرے رب نے زمین کو جنبش دی تو سب کچھ زمین بوس ہو کر رہ گیا۔ جونچ نکلے وہ اپنے پیاروں کو ڈھونڈتے پھرے اور جو بلے کے نیچے پھنس گئے ان کی سسکیوں، آہوں اور مدد کی آوازوں سے باہر کھڑے بے بس اور مجبور لوگوں کے کلیجے منہ کو آ گئے۔ شاید کسی کو اپنی بے بسی، کم مائیگی اور مجبوری کا اتنا احساس بھی ہوا ہو!

یہ سچ ہے کہ کراچی کے ساحل سے لے کر گلگت کے پہاڑوں تک وہ لوگ جن کے دل دھڑکتے تھے، جو درد رکھتے تھے ان کی مدد کو دوڑ پڑے۔ مدتوں بعد کسی نے اس قوم میں جذبے کا سمندر موجزن دیکھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس وقت کانپ اٹھا، میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جب میرے ملک کے ارباب اختیار نے اس سارے سانحے کے بعد ایک لفظ بولا اور میرے دانشوروں نے ایک عجیب و غریب سا سوال کر دیا۔ میرے ملک کے صاحبان اختیار نے کہا: "یہ ہم سب کے لیے ایک چیلنج ہے۔"

اس لفظ کی گونج مجھے ہر اس شہر میں سنائی دیتی ہے، جہاں بار بار زلزلے آتے ہیں اور بار بار میرے رب کی تقدیر ان انسانوں کی تدبیروں کا مذاق اڑاتی ہے، دانشوروں کے قلم اور تبصرہ نگاروں کی گفتگو نے اس سے بھی خوفناک سوال کر دیا کہ ہم لوگ ایسے کون سے گنہگار تھے کہ ہم پر عذاب نازل ہوتا۔ یہ تو زمین کے نیچے چند ٹیک ٹونک (Tac Tonic) پلیٹیں ملی تھیں اور زلزلہ آ گیا تھا۔

میں ان گنہگاروں کی فہرست میں کیا جاؤں کہ شاید میں خود اس قدر گنہگار شخص ہوں کہ کسی اور کی جانب دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا، لیکن کیا ارباب اختیار، صاحبان طاقت انصاف سے کہہ سکتے ہیں اس بستی پر اللہ کے غضب کے ٹوٹنے، آرائشوں کے نازل ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مشکوٰۃ شریف کے باب التحن کی اس حدیث مبارکہ کو پڑھتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں استغفار کا موقع دینے کے لیے صرف چند سیکنڈ کے لیے جھنجھوڑا ہے ورنہ اس کے بس میں سب کچھ تھا۔

## چیلنج نہیں..... استغفار

(16 رمضان 1426ھ بمطابق 21 اکتوبر 2005ء)

"اس شہر کو دوبارہ اسی طرح آباد کرنا ہمارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہمیں اُسے دوبارہ ایسے بنانا ہے کہ پھر کوئی زلزلہ اس کا بال بھی بیک نہ کر سکے۔"

یہ الفاظ اُس تباہ شدہ شہر کے باسیوں کے تھے جو 1906ء میں زلزلے کی زد میں آ کر خاکستر ہو گیا تھا۔ شہر تھا "سان فرانسسکو"۔ اپنے لغزش کی وجہ سے پورے امریکا میں مشہور بحر الکابل کی ایک خلیج نما بندرگاہ پر آباد۔ دنیا بھر سے جہاز اس ساحل پر لگتے اور امریکا کے مغربی کنارے کو سامان بہم پہنچاتے۔

ان جہازوں پر سوار عملہ یہاں چند دن گزارتا اور پھر دوبارہ کسی اور منزل کی طرف روانہ ہو جاتا لیکن یہ چند دن ان کی زندگیوں میں اس شہر کی پریشانیوں یادیں بسا جاتے۔ دو سال بعد جب یہ شہر دوبارہ آباد ہوا تو اب کی بار انہوں نے پورا انتظام کر لیا تھا کہ عمارتیں ایسی بنیں کہ زمین کی بڑی سے بڑی جنبش بھی انہیں زمین بوس نہ کر سکے۔

اپنے آپ کو محفوظ اور مامون کر کے یہ لوگ بھول گئے وہ جسے چیلنج کر رہے ہیں اس کے دست تصرف میں زمین و آسمان کی ساری وسعتیں اور طاقتیں ہیں۔ یہ لوگ یوں مست ہوئے کہ انہوں نے 1908ء میں اپنے شہر میں دنیا کا پہلا ہم جنس پرستوں کا کلب کھولا اور پھر مدتوں بھول گئے کہ یہاں کوئی زلزلہ بھی آیا تھا۔

مہلت طویل ہوتی گئی اور ان لوگوں کی بے اعتنائی بڑھتی گئی۔ پھر ایک دن 1989ء میں زمین ایک بار پھر جنبش میں آئی اور وہ سارے کے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پہلے تو لوگ مکانات کے اندر موت کی آغوش میں گئے تھے۔ اب جو سڑکوں پر تھے ان کے نیچے سے زمین دھنس گئی اور وہ ان میں دفن ہو گئے۔ ان کو مہلت تک نہ ملی کہ ان گھروں کی طرف لوٹ سکیں جنہیں انہوں نے زلزلے سے محفوظ بنایا تھا۔

یہ صرف تاریخ کا ایک واقعہ نہیں، زلزلوں کی کہانی اٹھا کر دیکھیں تو انسانوں کی تمام تدبیریں اور سائنسی علم کی تمام کارگزاریاں اس آفت آسمانی کے سامنے بے بس نظر آتی ہیں۔ انسان نے گزشتہ ایک ہزار سال سے زلزلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے، اسے پڑھنے، اس کی وجہ جاننے پر صرف کیا۔ زمین میں سوراخ کیے گئے، بڑے بڑے آلات ایجاد کیے گئے۔ مشینیں نصب کی گئیں لیکن یہ تمام کی تمام صرف یہ بتا پائیں کہ اس زلزلے سے زمین میں حرکت کی رفتار کیا تھی۔

میں نے کئی سو کتابیں اور ہزاروں مجلوں میں زلزلے کے حوالے سے ایک سوال دریافت کرنے کی کوشش کی کہ کیا ہم زلزلے آنے کے بارے میں پیشگی کچھ بتا سکتے ہیں؟ لیکن حیرت کا عالم دیکھیے! کہ دنیا میں اس علم کی ہر کتاب،



## موت کو یاد کرنے کا وقت

(23 رمضان 1426ھ بمطابق 28 اکتوبر 2005ء)

یہ وہی مملکت خداداد پاکستان ہے جس کے قصبہ قصبہ، کوچہ کوچہ اور شہر شہر گزشتہ چند سالوں سے انسان بھوک، افلاس، بے روزگاری اور مایوسی کے ہاتھوں خودکشی کر رہے تھے۔ کہیں کوئی نو شادی شدہ نوجوان رسی پر جھول جاتا تھا کہ اپنے نئے بے ہوئے آشیانے کی کفالت نہیں کر سکتا۔

کسی جگہ باپ بازار سے زہر خرید کر لاتا، اپنے ہنستے مسکراتے بچوں کی خوراک میں ملاتا اور پھر ان کے ساتھ خود کھانا کھا کر اپنے کنبے سمیت موت کی آغوش میں چلا جاتا۔ کسی پل سے کوئی ماں اپنے بچوں سمیت نہر میں کود جاتی۔ گزشتہ چند سالوں میں ہر ڈھائی گھنٹے میں ایک شخص خودکشی کرتا رہا لیکن پورا معاشرہ اپنی دھن میں مگن زندگی کی خوشیاں لوٹا رہا۔ کسی کے ماتھے پر کوئی ٹشمن تک نہ آئی، کوئی دل نہ پیسجا، کسی شہر یا گلی کو بچے میں سوگاری نہ چھائی۔

منظرویسے کا ویسا ہی رہا۔ تجوریوں کے منہ کھلے اور نہ خیرات کے لیے ہاتھ بڑھے۔ وہ جو حکمران تھے وہ اپنے بیانون میں، انٹرویوز میں اس سارے مسئلے کو ایک نفسیاتی مسئلہ کہہ کر اس کی سائنسی توجیہات کرتے رہے۔ شاید اس لیے بہ حیثیت قوم کسی کو موت یاد نہیں تھی۔ وہ یوں سمجھتے تھے جیسے موت اسی گھر تک آئی ہے جہاں غریب لوگوں نے جان دی ہے۔ ان کے گھر کبھی موت کا فرشتہ نہیں اترے گا۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور ہم اپنی ترقی، اپنی ساکھ اور بینکوں میں موجود زرمبادلہ کے ذخائر پر فخر کرتے رہے۔

لیکن وہ جو اس کائنات کا خالق ہے۔ جسے اپنے بندوں کی یہ روش ناپسند ہے جس کے رسول برحق نے فرمایا کہ وہ مسلمانوں میں نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ جس نے مال میں قربت داروں، مسکینوں، یتیموں اور سوال کرنے والوں کا حق رکھ دیا ہے۔ جب اس نے لوگوں کو موت یاد دلانے، متنبہ کرنے اور وارننگ دینے کا فیصلہ کیا تو پھر چند سیکنڈوں میں پوری قوم موت کا منظر دیکھ کر ششدر، حیران اور پریشان ہو گئی۔

موت ایسے بھی آ سکتی ہے کہ بستیوں کی بستیاں کھنڈر بن جائیں۔ ہنستے مسکراتے چہرے اور کاروبار زندگی بھی غرق، لوگ آنہوں اور سسکیوں کا طوفان بن جائیں۔ اپنے بندوں کو غفلت کی نیند سے جگانے کا اس کا یہ فیصلہ آزمائش کی گھڑی تھی۔

جیسا کہ سورہ ملک کی آیت نمبر دو میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہم نے موت اور حیات کو تخلیق کیا کہ دیکھیں تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے؟“

ہمیں حیات کی رنگینیاں یاد تھیں لیکن موت کی سنگینوں سے بے خبر تھے۔ ہم تو مدتوں اپنی پالیسوں پر فخر کرتے

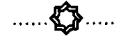
مجتہد صادق صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس وقت غنیمت کو ذاتی دولت ٹھہرایا جائے گا، امانت کو غنیمت سمجھا جائے گا، زکوٰۃ کو تادان سمجھا جائے گا، آدمی اپنی بیوی کی اطاعت کرے اور ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو نزدیک اور اپنے باپ کو دور رکھے، فاسق و فاجر شخص اپنے قبیلے کا سردار ہو، قوم کا سردار ذلیل اور کمینہ شخص ہو، آدمی کی عزت اس کے شرکی ذر سے کی جائے، گانے بجانے والیاں اور بابے ظاہر ہوں، شراب پی جائے اور امت کے لوگ اپنے پچھلوں پر لعنت بھیجیں تو پھر انتظار کرو اس وقت سرخ ہوا کا، زلزلوں کا، زمین کے دھنس جانے کا، پتھروں کے برسنے کا، شٹلوں کے بگڑنے کا اور پے در پے نشانہوں کا، جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جائے اور دانے پیہم گرنے لگیں۔“

کوئی ہے جو اپنے دامن میں جھانک کر دیکھے؟! اور سوچے کہ کیا یہ سب کچھ ہم میں موجود نہیں، کیا ہم اپنے رب کے غضب کو مدتوں سے نہیں پکار رہے!؟

میرے ملک کے دانشوروں نے ایک اور سوال کیا اور اس سوال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کہ ان عام لوگوں کا کیا تصور تھا؟ ان میں نیک اور پرہیزگار بھی تو ہوں گے، اللہ نے انہیں کس لیے آفت کا شکار کر دیا لیکن مسند احمد میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کی وجہ سے اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتے ہیں۔“

کیا چودہ کروڑ عوام اتنی طاقت نہیں رکھتے تھے کہ اپنے سامنے ہونے والی بے اعتدالیوں، اللہ کے قانون کا مذاق اور تسخر کو روک سکتے۔ اگر ایسا تھا تو پھر اللہ کے غضب سے بچنے کا راستہ صرف اور صرف استغفار ہے۔ ہماری زبانوں پر، ہمارے قلم پر، ہمارے ذہن میں ”چیلنج“ کا لفظ نہیں آنا چاہیے۔ ہم تو کمزور، بے بس اور بے مایہ ہیں، گنہگار ہیں۔

اے مالک کون و مکان! ہم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ ہم پر رحم کر، اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا تو ہم بڑے خسارے میں چلے جائیں گے۔ اے رحیم، اے کریم، اے غفار!



نے خبر پڑھی تو یوں لگا جیسا زلزلے تو ایک وارننگ تھی اور امتحان کی گھڑیاں شروع ہو چکی ہیں۔ امتحان اس رب کریم کے سامنے جس کی نظروں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم موت کو یاد کریں لیکن ہم وہ غافل ہیں کہ اس وارننگ کے باوجود اس رب کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔

شاید مہلت نہ مل سکے اور ہم لوٹ کا مال اپنے ہاتھوں میں دبائے موت کی آغوش میں چلے جائیں۔ اے پروردگار عالم! ہم پر رحم فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، ہم تیرے غضب کے متحمل نہیں ہو سکتے، ہمیں معاف فرما۔ اے رحمن! اے رحیم! تیرے سامنے ہماری طاقت ہی کیا ہے۔



رہے کہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو شاید ہمارا ملک تو راہور ابن جاتا۔ ہم تباہ و برباد ہو جاتے۔ ہمیں سالوں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں لگ جاتے، لیکن تدبیر کے تمام منصوبوں کے سامنے تقدیر کے چند سینکڑے ایسے آئے کہ ایک نہیں کئی تو راہور اس سرزمین پر بن گئے۔

پھر وہی لفظ زبانوں سے ادا ہونے لگے: ”یہ تباہی، یہ آفت اتنی بڑی ہے کہ ہمیں پاؤں پر کھڑے ہونے میں کئی سال لگ جائیں گے۔“

معصوم جانیں طبع تلے دفن ہو گئیں لیکن ان ہزاروں لوگوں کی موت میں چھپی قدرت کی اس وارننگ اور اس امتحان کو شاید پڑھنے والے پڑھیں تو خوف سے کانپ اٹھیں۔ مدتوں آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کے ساتھ جہدوں سے سر نہ اٹھائیں۔

لیکن وہ جن کے دلوں میں میرے اللہ کے خاص فضل سے یہ خوف پیدا ہوا وہ کراچی سے لے کر اسلام آباد تک یوں باہر آئے کہ جیسے کوئی مردہ قوم جاگ اٹھی ہے۔ ٹرکوں کی ایک قطار بندھ گئی جو سامان سے لادے ہوئے ان آفت زدہ لوگوں کی مدد کو پہنچا۔ کوئی ڈاکٹر تھا تو کوئی انجینئر، کوئی سماجی کارکن تھا تو کوئی اللہ کی راہ میں کار خیر کرنے والا۔ لوگوں کا ایک ہجوم مدد کرنے والا بھی موجود تھا اور سامان کا انبار بھی۔

لوگوں کے جذبہ خیر کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ ایسی آفتوں میں اس قوم کے لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے اسی طرح اپنی تجویروں کے منہ اسی طرح کھولے۔ ابھی چند سال پہلے جب بلوچستان کے بیشتر علاقے قحط کا شکار ہوئے تو ایسے ہی جوق در جوق لوگوں کا ہجوم خضدار سے لے کر چاغی تک ٹرکوں پر اپنا سامان لے کر مدد کو پہنچ گئے۔ کوئی لاہور سے کوئی کراچی سے، لیکن جب میں اپنے ماضی میں اس سامان کے ساتھ ہونے والے سلوک کی جانب دیکھتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔

کیا ہم نے 78ء میں آنے والے بشام کے زلزلے میں گھی کے ڈبوں، ماچسوں، کمبلوں، ٹینوں کی خرید و فروخت نہیں کی۔ سالوں تک یہ سامان ہماری دکانوں کی زینت بنا رہا۔ ہمارے ارباب اختیار نے ہر آفت میں ملنے والے سامان کے ساتھ اکثر یہی سلوک کیا۔ کہیں خوبصورت خیمے، شکار اور تفریح کے لیے استعمال ہوئے تو کہیں کمبل اور کپڑے ہتے بستے گھروں کی زینت بنے۔ ایسا بار بار ہوا اور میرے رب نے تنبیہ کے طور پر اس قوم کو جھجھوڑنے کی کوشش کی، لیکن اس آفت کے دوران پیش آنے والے ایک واقعہ نے مجھے حیران کر دیا۔

ایسے لگتا ہے کہ میرا رب شاید مزید رسی دراز نہیں کرنا چاہتا۔ وہ علیم وخبیر ہے، اسے انسانوں کا لوٹ کر آنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے شاید وہ اس دفعہ لوٹ کر آنے والوں کے خلوص سے مذاق برداشت نہیں کرنا چاہتا۔

واقعہ یوں ہے کہ مظفر آباد سے ایک شخص بٹل کے لیے بس پر سوار ہوا، شنکاری کے قریب بس کی بچھلی نشہ کے نیچے سے ایک سانپ نکل آیا جسے ایک مسافر نے پکڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ سانپ ساتھ جاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار کے بازو پر گرا اور ڈسنے کے بعد غائب ہو گیا۔ ڈرائیور نے اس موٹر سائیکل سوار کی مدد کے لیے بس روکی۔ مسافر آگے بڑھے لیکن وہ شخص ہلاک ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

لوگوں نے اس کی شناخت کے لیے ساتھ بندھا بکس کھولا تو اس میں ایک خاتون کا کٹنا ہوا بازو تھا جس پر لاتعداد سونے کی چوڑیاں تھیں تو بازو سوجھنے کی وجہ سے پھول گیا تھا، اس کے ساتھ گلو بند اور کانٹے وغیرہ تھے۔ جس

اور بے بسی رہ گئی کہ اس کنکریٹ کے بلے کے نیچے سے اپنے پیاروں کو کیسے نکالیں۔ یہ علاقہ میدان بھی نہ تھا کہ چل ایک دوسرے کی خبر لے لیں۔ پہاڑوں کی وادیوں میں گھرے انسانوں پر وہ قیامت ٹوٹی کہ ان کا کوئی پرسان حال ک دونوں تک ان کے پاس نہ پہنچ سکا۔

لحہ لمحہ موت ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دنیا سونامی کی طرح ایک ہزار ہیلی کاپٹر بھی یہاں نہ پہنچا سکی تھی جس کہ اس علاقے میں واحد ذریعہ امداد کا ہیلی کاپٹر تھے۔ ایسے میں یہ لاکھوں لوگ سونامی کی نسبت ایک اور آفت کا سام کرنے لگے اور یہ تھا سرد موسم، ٹھنڈی ہوائیں، جو چھت کے نیچے تھا وہ باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتا دم توڑ گیا اور ج باہر تھا اسے سردی نے آیا۔ ایسے میں ان لوگوں کو جس قدر امداد کی ضرورت تھی کیا انہیں میسر آ سکی؟

میں یہاں اس مدد کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو میرے وطن کے ان اللہ کے خوف رکھنے والے لوگوں نے کراچی سے پشاور تک ہر خطے سے ہم پہنچائی۔ میں تو اس عالمی برادری کا چہرہ سامنے لانا چاہتا ہوں جس کی نظروں میں ہمارا وقار بلند ہو ہے، جس کے لیے ہم نے اپنے اڈوں سے جہازوں کی 57 ہزار پرواز کروائیں تاکہ اپنے مسلمان بھائیوں پر ہم برسا سکیں، جن کے لیے ہم نے سو سے زیادہ مسلمانوں کو پکڑ کر دنیا کے سب سے بدنام قید خانے گوانتانامو بے کے حوالے کیا۔ اس عالمی برادری کا چہرہ دیکھیے! اقوام متحدہ نے پوری دنیا کے سامنے فوری طور پر مدد کی اپیل کی اور کہا کہ اگر اس میں جلدی نہ کی گئی تو انسانیت ایک بہت بڑے عالمی بحران اور اسیے کا شکار ہوگی۔ اقوام متحدہ کے اندازے کے مطابق مدد کے لیے فوری 95 ملین ڈالر درکار تھے جب کہ عالمی برادری نے اس خوداک کے علاوہ پروگرام کے 95 ملین ڈالر میں سے صرف دو فیصد یعنی 1.5 ملین ڈالر دینے کا اعلان کیا۔

اس سخاوت کی داد دینی چاہیے۔ خوراک کے لیے مانگے گئے 58 ملین ڈالر میں سے صرف 4 فیصد یعنی 2.5 ملین ڈالر مہیا کیے گئے۔ دواؤں کے لیے 62 ملین ڈالر چاہیے تھے لیکن 17 فیصد میسر آ سکے۔ دنیا بھر میں ساری کی ساری امداد مل کر بھی ارب ڈالر تک نہ پہنچ سکی اور اقوام متحدہ کے افران چیتنے رہ گئے۔ اس ساری بے حسی کے باوجود اگر کسی کو دلچسپی ہے تو کشمیر کے ان مظلوموں کے سر پر نیو کی فوج بھیجنے میں ہے۔ یہ فوج سونامی میں گئی، نہ ایران میں گئی، نہ ترکی میں گئی، نہ چین کے زلزلوں میں پہنچی اور نہ ہی جاپان کو بچانے گئی۔ یہ الگ موضوع ہے کہ یہاں کیوں آرہی ہے؟ لیکن اس عالمی برادری کا چہرہ ان پرستاروں کے سامنے یوں کھل آیا ہے..... لیکن حیرت یہ ہے کہ پرستاروں کے جذبے کا وہی عالم ہے۔ پوری دنیا اس بات پر چیخ رہی ہے لیکن ہم ہیں کہ ہماری ساری امیدیں انہی سے وابستہ ہیں۔ گزشتہ ہفتے ٹائم میگزین نے لکھا کہ ہمارے رپورٹروں کے مطابق اس زلزلے زدگان کی امداد کے لیے جو لوگ سب سے پہلے پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے پہنچے وہ وہی جہادی تھے جنہیں دنیا نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

اسی رپورٹ کے مطابق اس نے بالاکوٹ میں ایک شخص سے پوچھا: ”تمہیں یہاں بلے سے کس نے نکالا تو اس نے ایک جہادی تنظیم کے کارکن کی طرف اشارہ کیا اور بولا اگر یہ لوگ آج کہیں کہ ہم جہاد پر جائیں تو ہم جائیں گے۔“ اخبار نے اس سے بھی تلخ بات لکھی ہے، اگر یہاں لکھی دی جائے تو بڑے بڑوں کے نازک مزاج دماغ اہل پڑیں۔ لیکن حقیقت ہے کہ 40 میل دور حکومت مفتوں بعد آئی اور عالمی برادری آج تک نہیں آئی۔

جن اتحادوں کی بنیاد مطلب براری، ذاتی خواہشیں اور قوم کے جذبات سے غداری ہو ان کا انجام ایسے ہی ہوتا ہے۔



## مرے تھے جن کے لیے.....

(یکم شوال 1426ھ بمطابق 04 نومبر 2005ء)

کیا یہ سب وہی حکمران ہیں جن کی زبانوں پر ہماری تعریف کے جملے رواں تھے، جو ہمیں پوری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سب سے بڑا اتحادی سمجھتے تھے۔ جن کے لیے دی گئی قربانیوں کا اگر یہاں شمار کیا جائے تو شاید جتنے زخم اس قوم کو ان کا ساتھ دینے اور ان کی جنگیں لڑنے میں لگے اتنے تو شاید دنیا کی کسی قوم کو نہ لگے ہوں۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ جب میرے ملک پر ایک آفت آئی۔

ایک ایسی آفت جس میں 50 لاکھ سے زیادہ لوگ بے گھر اور اندازاً ایک لاکھ سے زیادہ جان بحق ہوئے ہیں۔ جسے دنیا بھر کے ادارے سونامی سے بڑا المیہ قرار دے رہے ہیں بلکہ یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ اگر بروقت امداد نہ دی جائے گی اور یہاں سردیاں آگئیں تو پھر یہ المیہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ بن جائے گا اور سب سے بڑی تباہی ریکارڈ ہو جائے گی..... لیکن جس لمحے سمندر نے اپنے غصے کا اظہار کیا اور ساحلوں پر چڑھ دوڑا تو پوری دنیا سے اس کے لیے امداد جمع ہو گئی۔

ان میں سے کوئی ملک ایسا نہ تھا جو یہ کہتا ہو کہ ہم ”دہشت گردی“ کے خلاف جنگ کے سب سے بڑے اتحادی ہیں۔ وہ تو اس پورے معاملے میں معمولی سا فریق بھی نہیں تھے لیکن عالمی برادری ان پر یوں فریفتہ ہوئی کہ چاروں جانب سے امداد کی ترسیل شروع ہوئی۔ پوری دنیا سے ایک ہزار ہیلی کاپٹران علاقوں میں پہنچے تاکہ انسانی جانوں کو بچایا جائے۔ پوری دنیا سے 12 ارب ڈالر کی امداد اکٹھی ہوئی جسے ان ملکوں کو دیا گیا جہاں تعمیر نو، ترقی اور دوبارہ آباد کاری کا کام ہونا تھا۔ میں یہاں دونوں آفتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد اس حقیر مدد کی کل اوقات بتاؤں گا جو ”دہشت گردی“ کی جنگ میں ہمارے ساتھیوں نے ہمیں بھیک میں اچھالی ہے۔ 26 دسمبر 2004ء کو آنے والے سونامی میں تقریباً 8 سے زیادہ ملکوں کے علاقے لپیٹ میں آئے تھے۔ ان ملکوں کے ساحلوں پر سیلاب اٹھا، لہروں نے چاروں طرف سے علاقوں کو گھیرا اور پانی کی نذر ہو گیا۔ 283186 افراد موت کی آغوش میں چلے گئے۔

زندہ بچنے کا سوال ہی بہت کم تھا۔ نہ ملے تھا نہ ڈھیر کہ ان میں تلاش ہوتی۔ بس پانی ہی پانی تھا۔ جب اتر اتویا تو لاشوں کو اکٹھا کرنے کا کام تھا یا پھر اس سب کو از سر نو تعمیر کرنا..... اب اس لحہ لمحہ بڑھتی اور وقت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی ہوئی آفت کا مطالعہ کیجیے اور پھر سوچیے کہ اس زلزلے کے بعد ہمیں کس قدر توبہ، مدد اور تکنیکی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ 7.5 کی اسکیل پر آنے والا یہ زلزلہ صرف ایک ملک پاکستان کے ایک محدود علاقے میں آیا ہے۔

یہاں مقابلہ کرنے کے لیے ایک ملک کی معیشت ہے جب کہ وہاں آٹھ ملکوں کی معیشت تھی۔ یہاں مکان بلے کا ڈھیر ہو کر انسانوں پر گرے اور پہاڑوں نے بکھر کر سڑکوں کو ہلاک کر دیا۔ اب پھاوڑے، ننھے ننھے ہاتھ

چھپا رکھی ہے۔ عذاب، آفتیں اور مصیبتیں اس انسان کا انتظار کر رہی ہیں لیکن سائنس کی دس ہزار سالہ تاریخ، دنیا بھر کی لیبارٹریاں، علم کی تحقیق گاہیں اور سائنس دانوں کی محنتیں اس سوال کا جواب بلکہ جواب کا سرا بھی تلاش نہیں کر سکیں کہ یہ آفت، یہ عذاب، یہ مصیبت کب، کہاں اور کس وقت نازل ہوگی؟ بس گم سم، بے بسی اور نامرادانے پر پڑا ہوتے دیکھتے رہتے ہیں۔

سائنس کی ترقی کے اس دور میں اسی بے بسی کا عالم صرف ان چند مہینوں میں اس قدر شدید تھا کہ دنیا بھر کے سائنس دان گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کے لیے سونامی ایک ایسا سائنس کا کرشمہ اور عجوبہ تھا کہ ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ کیسے اللہ تعالیٰ کئی سو میل دور سے ایک عذاب تخلیق کرتا ہے اور پھر اسے جس منزل پر تباہی پھیلانی ہوتی ہے وہاں پہنچاتا ہے اور یہ عذاب رستے میں کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ ایک سمندر کے علاقے سے ایک لہر اٹھتی ہے اور ایک خاص رفتار کے ساتھ ساحل کی طرف بڑھتی ہے۔

اس رفتار کو اور لہر کی اونچائی کو سمندر کی گہرائی کے تناسب سے ناپا جاسکتا ہے۔ یعنی کسی لہر کا اسراع (Acceleration) کو زمین کی کشش ثقل سے تناسب دے کر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کس جگہ لہر کتنی اسپید اور کتنی اونچی ہوگی۔ اس طرح یہ لہر ساحل تک پہنچ کر سست ہو جاتی ہے۔ یوں اپنی گہرائی کی وجہ سے سمندر کے درمیان جہازوں کو پیہ بھی نہیں چلتا اور بس چند انچ اوپر اٹھتے ہیں لیکن ساحل پر یہ لہر اپنی اونچائی خاصی بلند کرتی ہے، رفتار کم لیکن سائنس اس بات پر حیران رہ گئی کہ جب یہ لہر اس اپنے منزل مقصود یعنی جہاں یہ آفت نازل ہونا تھی وہاں پہنچی تو ان کی رفتار کم نہ ہوئی بلکہ مزید بڑھتی گئی اس لیے کہ میرے اللہ نے اس رفتار کی کمی کو پیچھے سے آنے والی لہروں کی لمبی قطار سے یوں ختم کیا کہ ساحل پر آباد شہر 50 سے 60 فٹ کی بلندی تک غرقاب ہو گئے۔ نہ سائنس لینے کا وقت ملا اور نہ بھاگنے کا موقع۔ یہ تباہ کن لہر رستے میں گزرتے ہوئے اس ترتیب سے آئیں کہ نہ جہاز ڈوبے نہ کشتیاں غرق ہوئیں بس جن شہروں پر عذاب آنا تھا آ گیا۔

وہ لوگ تو غرق ہو گئے لیکن سائنس دان حیرت میں پڑ گئے کہ اس کائنات کے اس مروجہ طبعی قوانین کو اس ترتیب اور انداز سے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؟ یقیناً یہ وہی کر سکتا ہے جس نے اس کائنات کو اس طرح تخلیق کیا ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میزائل ایک خاص رفتار اور انداز سے چلایا جاتا ہے تاکہ وہاں جا کر لگے جہاں مقصود ہو۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کا کنٹرول ہو اور یہ کنٹرول صرف اس واحد وقہار و جبار کے پاس ہے۔

یہ وہی بے بسی ہے جو کترینا اور ریٹا کے ہواؤں سے بھرے طوفان میں نظر آتی ہے۔ میلوں سفر کرتی ایک منزل پر آ کر شہر برباد کر دیتی ہیں اور یہی حکمت زلزلوں میں ہے کہ جس زمین کے نیچے یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہاں کچھ نہیں ہوتا بلکہ اس حرکت کی رفتار ایک خاص شہر تک پہنچنے کے قابل بن جاتی ہے جو میرے رب کی آفت کا ٹارگٹ ہوتا ہے۔ نہ سائنس وقت بتا سکتی ہے؟ نہ یہ بتا سکتی ہے کہ زمین بلی تو کون سا شہر تباہ ہوگا؟ نہ یہ خبر دے سکتی ہے کہ یہ سمندری لہر کس شہر تک پہنچ کر آفت نہیں گی؟ نہ ہوا پر اختیار نہ سمندر پر اور نہ ہی زمین پر۔

سارے قانون پڑھ لیے لیکن یہ علم حاصل نہ ہو۔ کا کہ کائنات تباہ کرنے، آفت لانے، عذاب نازل کرنے کی گھڑی کب، کس وقت اور کیسے آئے گی؟ سوال ازل کا ہے۔ سورہ ملک کی یہ آیت: ”کافر ازراہ مذاق پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو وہ وعدہ کب پورا ہوگا تو ان سے کہہ دو کہ علم تو اللہ کے پاس ہے میں تو واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔“

سائنس دان تو پوری دنیا میں اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہیں لیکن شاید لوگ ڈرانے والے کی باتوں پر یقین نہیں کر رہے کہ لوٹ آئیں اس رب کی طرف جو لوٹ آنے پر عذابوں کو نالتا ہے..... مصیبتوں کو روکتا ہے اور آفتوں سے بچاتا ہے۔

## سائنس کی بے بسی

(08 شوال 1426ھ بمطابق 11 نومبر 2005ء)

گزشتہ تیس سالوں سے ایک سائنس دان دنیا کے نقشے پر اپنا وجود انتہائی شہرت سے قائم رکھے ہوئے ہے۔ فزکس کے مضمون کا ماہر یہ شخص ایک ایسی بیماری کا شکار ہے جس کی وجہ سے اس کا وجود ایک معذور شخص کی صورت اختیار کر چکا ہے یہاں تک کہ وہ بول بھی نہیں سکتا اور اس نے ایک ایسا کمپیوٹر پروگرام ایجاد کیا ہے کہ اگر تقریر کرنا ہو یا سوالوں کا جواب دینا ہو تو وہ وہاں لفظ ٹائپ کرتا ہے اور جواب آواز کی صورت میں ادا ہونے لگتا ہے۔ اس کی شہرت کی وجہ اس کی وہ تھیوری ہے جس میں اس کائنات کے آغاز کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرتا ہے۔

ایک بہت بڑھ دھماکے سے اس کائنات کے وجود میں آنے کا نظریہ ان دنوں یوں مانا جا رہا ہے جیسے کوئی آسمانی مہینہ ہو۔ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے تحقیق اور جستجو کا رخ اس کی طرف موڑا اور پھر طرح طرح کے پتھروں، زمین پر بننے والی گیسوں، کیمیائی تبدیلیوں اور دیگر بے شمار شواہد سے کائنات کے آغاز کو بعینہ ہی ویسا ثابت کرنے کی کوشش کی جیسے یہ سائنس دان اسٹیفن کہتا ہے۔

یہ صرف اس فزکس کے سائنس دان تک ہی بات محدود نہیں ہے۔ بلکہ سائنس دانوں نے اس کائنات پر صدیوں تحقیق کے بعد کچھ کلیے، قانون اور قاعدے وضع کیے ہیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ زمین کی کشش ثقل کیا ہے اس کو کیسے ناپا جاتا ہے؟ آواز کی رفتار کتنی ہوتی ہے؟ روشنی کس رفتار سے زمین تک سفر کرتی ہے؟ کس ستارے کا فاصلہ زمین سے کتنے نوری سالوں کا ہے؟ حرارت کا بنیادی فلسفہ کیا ہے اور کن چیزوں سے حرارت پیدا ہوتی ہے؟ جج کے زمین میں جانے، چٹوں کے نکلنے، پھلوں اور سبزیوں کے لگنے تک ہر بات کی وجہ سائنس نے معلوم کر کے اپنی کتابوں میں فارمولوں کی صورت میں جمع کر رکھی ہے۔

ہر بات کی کوئی نہ کوئی سائنسی وجہ، کوئی نہ کوئی کلیہ اور کوئی نہ کوئی قاعدہ موجود ہے جس کی بنیاد پر کوئی تو ان تمام قاعدوں اور کلیوں کو ایک واحد تحقیق کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی کار سازی کا حیرت انگیز کرشمہ قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ اسے فطرت کے ایک اندرونی توازن Rhythm سے تعبیر کرتے رہتے ہیں، لیکن سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ساری کائنات ایک نظم، ترتیب اور حسن انتظام سے چل رہی ہے۔ جو کوئی سچائی کی تلاش میں سرگرداں اللہ کے کلام تک جا پہنچتا ہے اسے اشارے ملتے ہیں تو وہ ایمان کی وراثت سے مالا مال ہو جاتا ہے لیکن باقی اس کائنات کے اسرار و رموز کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔

لیکن سائنس دان اس کائنات کے رازوں کو جاننے، اس کی تلاش اور آغاز میں اس قدر منہمک رہے ہیں کہ آج تک وہ اس راز اور اس بھید کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ اسی کائنات اور اسی فطرت کے قانون میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تباہی



سامنے رکھ دی۔ یورپی یونین نے سائنس دانوں کے اس گروہ کو پیسے دیے تاکہ وہ تحقیق کریں یہ طاعون کیسے ہوتا ہے اور اسے کیسے روکا جاسکتا ہے اور انہوں نے گزشتہ دنوں اپنے نتائج بتاتے ہوئے یورپ کو خوفزدہ، حیران اور پریشان کر دیا۔ انہوں نے کہا آج وسطی ایشیا میں ویسے ہی موسمی حالات پیدا ہو رہے ہیں جیسے چودھویں صدی کے طاعون کے وقت ہوئے تھے۔

اس کانفرنس کے سربراہ نے کانفرنس کے اختتام پر اس پیدا ہونے والی کیفیت پر کہ ہم نے گزشتہ پچاس سال کی موسمی بیماریوں کے پھیلاؤ کی معلومات کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا یورپ میں تین دفعہ طاعون ایک خاص قسم کے موسم کے جنم لینے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ موسم یورپ میں نہیں بلکہ وسطی ایشیا میں ہوتا ہے۔ نہ زیادہ گرم اور نہ زیادہ سرد۔ سرد ہوتو جرثومے پیدا نہیں ہوتے اور اگر گرم ہوتو جرثومے پیدا ہو کر مر جاتے ہیں۔

اس طرح کا معمولی سا موسم 1855ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کے بعد یہاں معمول کا موسم ہے۔ لیکن آج کل وسطی ایشیا کے ملک قازقستان میں یکا یک موسم میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور اس تبدیلی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ نہ پہاڑوں سے برف غائب ہوئی ہے اور نہ ہی سائبیریا سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں آنا بند ہوئی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس علاقے میں موسم بغیر کسی وجہ سے بدل رہا ہے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں طاعون کے جرثومے پل رہے ہیں اور پھر مکیوں، پرندوں سے اڑ کر پوری دنیا کا رخ کر رہے ہیں۔

اب تک ان کی پہلی منزل مشرقی افریقہ کے ممالک ہوئے ہیں لیکن یہ بالکل آغاز ہے جوں جوں وہاں موسم کی گرمی سے جراثیم کثرت سے پھولیں گے تو یورپ کا رخ کریں گے۔ تو پھر ہوسکتا ہے کہ یورپ چودھویں صدی کا المیہ دوبارہ دیکھ لے۔ طاعون کے اس مرض کا حال یہ ہے کہ جب آغاز کرتا ہے تو کسی کو اس کا علم نہیں ہونے پاتا بس یہ ایک موت ہے جو خاموشی سے بڑھی چلی جاتی ہے۔

لیکن کانفرنس میں شریک تمام سائنس دان جو ناروے کے شہر اوسلو میں اکٹھے تھے ایک بات حیرت اور استعجاب سے بتا رہے تھے ہم اب تک یہ بات سمجھ نہیں سکے اور یہ ہماری عقل سے بالاتر ہے کہ اچانک وسطی ایشیا کا موسم گرم کیوں ہوتا ہے اور اتنا ہی گرم کیوں ہوتا ہے جتنا طاعون کے جراثیم پیدا کرنے کے لیے کافی ہے اور پھر ایسے لگتا ہے جیسے پرندوں، مکیوں اور چوہوں کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے کہ اس سب کو ایک خاص مقام پر پہنچانا ہے۔ جہاں طاعون جنم لیتا ہے وہاں کے رہنے والوں کو کچھ نہیں ہوتا اور یورپ میں تین چار کروڑ افراد قتل ہو جاتے ہیں۔

چھ سو سال پہلے تو ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ سب کہاں سے آ رہے ہیں، اب ہمیں علم ہے۔ لیکن نہ ہم اسے کنٹرول کر سکتے نہ روک لگانے پر قدرت رکھتے ہیں کیونکہ نہ موسم ہماری دسترس میں ہے اور نہ ہی پرندوں اور مکیوں کی پروازیں۔ ہم تو بس وارننگ دے رہے ہیں کہ ٹھیک صلیبی جنگوں کے 18 سال بعد جو کچھ ہم پر بیتی قدرت ویسی ہی ایک تباہی تمہارے لیے تیار کر رہی ہے۔

میرے اللہ کے بھی انتظام عجیب ہیں کبھی اپنی دھن میں مگن لوگوں پر موت مسلط کر دیتا ہے اور کبھی موت کی تیاریاں مکمل کر کے سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے اور لوگ کہتے رہ جاتے ہیں کہ ہم تو بے بس ہیں لاچار ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔



## وارننگ

(22 شوال 1426ھ بمطابق 26 نومبر 2005ء)

ٹھیک چھ سو سال بعد یہ سب کچھ پھر ہونے والا ہے۔ ہمیں ابھی تک کچھ اندازہ نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وسطی ایشیا کے میدانوں میں اچانک صدیوں بعد ایک خاص قسم کا موسم آ جاتا ہے۔ نہ اس موسم کے بننے کی کوئی ظاہری وجہ معلوم ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی سائنسی توجیہ اس سب کو بیان کرنے سمجھنے یا ادراک پیدا کرنے کے قابل ہے۔ بس موسم بدلتا ہے، اچانک اس سرد علاقے میں گرمی سی ہو جاتی ہے۔

پانی کے بخارات بنتے ہیں اور ایک جس کا ساں پیدا ہو جاتا ہے۔ عجیب و غریب قسم کی گیسوں ایک خاص قسم کے بیکٹیریا کو جنم دیتی ہیں جسے Yersinia Pestes کہتے ہیں۔ یہ بیکٹیریا جانوروں خصوصاً چوہوں کے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اس بیکٹیریا کو کھیاں اور پرندے لیے پھرتے ہیں۔ کبھی اس ملک اور کبھی اس ملک جس ملک میں اترتے ہیں وہاں کے لوگ طاعون کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی حالات چودھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ وسطی ایشیا کی وادیوں سے مکیوں اور پرندوں نے ان جرثیموں کے ساتھ اڑنا شروع کیا اور پھر یورپ میں تین کروڑ چالیس لاکھ افراد طاعون کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ ایک اندازے کے مطابق یورپ کی کل آبادی صرف نو کروڑ تھی اور ہر تین میں سے ایک شخص موت کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کئی دہائیوں بلکہ تقریباً پوری صدی صلیبی جنگوں میں اپنی توانائیاں صرف کر چکا تھا۔ بارہ سال کے بچے سے لے کر 80 سال کے بوڑھے تک تلواریں اٹھائے، تیر سنبھالے اور ہتھیاروں سے لیس اس ”مقدس“ جنگ میں حصہ لینے مسلمان علاقوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ میں اس ظلم و ستم کی تاریخ نہیں دہرانا چاہتا جو فلسطین پر قبضے کے بعد ان مقدس جنگ کے متوالوں نے ڈھائے بس اتنا ہی تذکرہ کافی ہے کہ بیت المقدس کی گلیوں میں گھنٹوں گھنٹوں خون بہہ رہا تھا اور جلی ہوئی عمارتوں سے مہینوں دھواں اٹھتا رہا تھا۔

یورپ ان جنگوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے علاقوں میں ابھی چین سے نہیں بیٹھا ہوگا کہ 1300 عیسوی میں طاعون نے اسے گھیر لیا اور ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا۔ اس وقت تو سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، نہ اتنی دوائیوں اور علاج کی سہولت کا آغاز ہوا تھا جسے لوگ پنسلین کی ایجاد کہتے ہیں۔ بس لوگ بستر سے لگ جاتے اور موت کی آغوش میں چلے جاتے لیکن آج تو انسانوں کے دعوے ہی عجیب ہیں۔ ہم نے ترقی کر لی ہے، متعدی اور مہلک امراض کو ختم کر سکتے ہیں۔

یہ طاعون وغیرہ تو برائے فیشن کی بیماریاں ہیں لیکن آج کے سائنس دانوں نے یہ عجیب بے بسی دنیا کے

لوگ ہیں جو اسلام کو اس مقصد کے لیے تھوڑا بہت تبدیل کرنے پر بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔

4..... سیکور: یہ وہ لوگ جن کا آخر ہدف مذہب کو ذاتی معاملہ بنانا اور اسے حکومت سے بے دخل کرنا ہے۔ رپورٹ میں ان گروہوں کی مکمل تفصیل دی گئی ہے اور ان کو گروہوں میں موجود دکھایا گیا ہے اور بتایا گیا کہ دراصل وہ تو فرتے ہیں اصل گروہ یہ ہیں جن کو سمجھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ ان کی خصوصیات بتانے کے بعد ان کو رام کرنے کے طریقے بھی بنائے گئے ہیں اور ان کی کمزوریوں سے بھی آشنا کیا گیا ہے۔ کئی سو صفحات کی اس رپورٹ میں آپ کو اس امت کا چہرہ یوں واضح نظر آئے گا جیسے کوئی ان کے دلوں میں جھانک کر گیا ہے۔ اب امریکی حکومت اور مغربی طاقتوں کو یہ لائحہ عمل دیا گیا ہے۔

1..... سب سے پہلے ”ماڈرن“ گروہ کو سپورٹ کیا جائے۔ ان کی چیزیں مفت یا کم لاگت پر چھاپی جائیں، انہیں عام لوگوں کے لیے لکھنے پر قائل کیا جائے۔ ان کے خیالات کو اسکولوں اور مدرسوں کے نصاب میں داخل کر دیا جائے۔ ان کے لیے کوئی پبلک پبلیٹ فارم کوئی این جی او یا کوئی بڑی تنظیم بنا کر دی جائے۔ اسلام کے بارے میں ان کی توضیحات کو اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں عام کیا جائے۔ ان سے نصاب میں شامل کرنے کے لیے اسلام سے پہلے کی تاریخ اور غیر اسلامی حکومتوں کی تاریخ لکھوائی جائے۔ انہیں سیاسی منظر نامے پر لانے کے لیے ہر وہ اقدام کیا جائے جو ممکن ہو۔

2..... دوسرے نمبر ماضی پرستوں کو بنیاد پرستوں کے خلاف ترجیحی طور پر سپورٹ کیا جائے۔ اس ضمن میں ایسے تاریخی مواد کو چھاپا جائے جو ماضی پرستوں اور بنیاد پرستوں کے درمیان لڑائی کا شواہد تھا۔ ایسی طاقتوں کو جو ماضی پرست ہیں انہیں بنیاد پرستوں سے ملنے سے روکا جائے۔ (یہاں پر اسلام کی طرف جھکاؤ رکھنے والی پارٹیوں کی مذہبی پارٹیوں سے ملنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) ان لوگوں کی صفوں میں ذرا سا آزاد خیال لوگوں کو بھیجا جائے تاکہ وہ بھی دیکھا دیکھی ان کی طرف مائل ہو سکیں۔ ایسے لوگوں کے مقالے عام کیے جائیں جو اپنے طور پر اجتہاد کرتے ہوں اور قدیم فقہاء کے مسلک کو فرسودہ خیال کرتے ہوں۔ خاص طور پر صوفی ازم کو رواج دیا جائے اور اس کی ترویج پر تمام وسائل لگائے جائیں۔

3..... اب تیسرے نمبر پر اپنے دشمن بنیاد پرستوں کے ساتھ کیا سلوک ہو؟ ہر طرح سے ان کی اسلام کی توجہ کو چیلنج کیا جائے۔ ان کے بارے میں اس تاثر کو پھیلا دیا جائے کہ ان کا غیر قانونی گروہوں سے تعلق ہے۔ ان کے مقصد قسم کے چھوٹے سے واقعہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ ان کی بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جائے کہ یہ لوگ حکومت چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں خاص طور پر نوجوان لوگوں میں پھیلائی جائیں۔ صحافیوں کو پیسے دیے جائیں کہ ان لوگوں کی اخلاقی، معاشی اور ذاتی خامیوں کو ڈھونڈیں اور اخباروں میں بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔ ان لوگوں کے اندر مختلف گروہوں یا تحریکوں کو ایک دوسرے کے مقابل لانے کے لیے کوشش کی جائے۔

4..... سب سے آخر میں سیکور لوگوں کو سپورٹ کیا جائے لیکن کھل کر نہیں بلکہ خاموشی سے ورنہ یہ تمام کی تمام منصوبہ بندی ناکام ہو کر رہ جائے گی۔

میں نے یہ تمام تفصیلی رپورٹ جو امریکا کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ ڈویژن کی خفیہ دستاویز کا حصہ ہے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ بس صرف ایک نظر دوڑائیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس ”مسلم امہ“ میں کفر و الحاد اور یہود و نصاریٰ کا دوست کون ہے اور دشمن کون؟ جب دوست، دشمن اور منافق کی پہچان ہو جائے تو اس بات کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ تیر کس جانب سے آئے گا؟ ریت کی بوریاں کہاں رکھنی ہیں اور کمان کس جانب سیدھی کرنی ہے۔

## دوست کون، دشمن کون؟

(29 شوال 1426ھ بمطابق 03 دسمبر 2005ء)

ایسا سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کون یہ سب کر رہا ہے؟ یہ سب اچانک ہو جاتا ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی منصوبہ بندی ہے؟ ایسی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ کون ہیں اور مسلم امہ سے ان کی کیا دشمنی ہے؟ ان کے اس سارے کھیل میں کیا مقاصد ہیں؟ یہ سب اور اس طرح کے اور کئی سوال آج کل ہر اس مسلمان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں جو اس امت کے لیے تھوڑا سا بھی درد رکھتا ہے۔ آخر ہم ہی کیوں نشانہ بن رہے ہیں؟ اس سے پہلے کہ میں اس طویل تحقیق اور عرق ریزی سے مرتب کی جانے والی ضخیم رپورٹ کا ذکر کروں تاریخ کا ایک سبق اور اس کی کہانی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہانی بہت پرانی نہیں ابھی صرف دو صدیاں قبل مسلمانوں کے اکثر علاقے مغرب کی حکومتوں کی لچکائی ہوئی نظروں میں تھے۔ پھر انہیں زیر نگین کیا گیا۔ ان پر اقتدار مسلط کیا، سالوں حکومت کی اور پھر مفلوک الحال، پسماندہ اور اخلاقی طور پر شرمندہ اور دیوالیہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔

لیکن سبق یہ ہے کہ یہ سب کرنے سے پہلے کئی سال تک ان کے محقق اور دانشور تحقیق کرتے رہے کہ اس امت میں کمزور پہلو کون سا ہے جس پر حملہ آور ہوا جائے؟ کون جلد خریدا جاسکتا ہے اور کس کا ایمان مضبوط ہے؟ پھر جس سے جس طرح کا کام لینا تھا اسے چن لیا گیا اور جنہیں معتب کرنا تھا انہیں علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ ان دونوں کی پہچان ان محقق لوگوں نے پہلے سے کرادی تھی۔

آج کے دور میں اس جنگ سے قبل اور اس جنگ کے دوران مختلف تحقیقات ہو رہی ہیں لیکن ان میں سب سے بڑی رپورٹ امریکا کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ ڈویژن کی رپورٹ ہے۔ یہ سالوں میں مرتب ہونے والی رپورٹ مغربی طاقتوں خصوصاً امریکا کی رہنمائی کے لیے بنائی گئی تاکہ موجودہ دور میں اسلام اور مسلمانوں سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے؟ رپورٹ میں پہلے مسلمانوں کے درمیان موجود مختلف طبقات کو شناخت کیا گیا ہے، ان کی تقسیم کی گئی ہے اور پھر راستہ بتایا گیا ہے کہ امریکا کیا کرے کہ یہ قوم مستقل طور پر غلام حیثیت اختیار کر جائے۔ مسلم امہ کی تقسیم یہ ہے:

1..... بنیاد پرست: یہ لوگ موجودہ مغربی اقدار کو ناپسند کرتے ہیں یہ لوگ ایک مکمل، با اختیار، مذہبی حکومت کا قیام چاہتے ہیں جو ان کی قدیم اور دقیقہ منوی اخلاقی اقدار نافذ کرے، لیکن یہ لوگ موجودہ ایجادات کو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

2..... ماضی پرست: یہ ایک روایتی معاشرہ چاہتے ہیں۔ انہیں اسلام بھی اسی گزرے زمانے سے محبت کے طور پر اچھا لگتا ہے۔

3..... ماڈرن: یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی دنیا کو مغربی دنیا کے شانہ بشانہ اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ

پڑی۔ جو مفلوک الحال تھے وہ کدال اور پھاڑے لے کر چل پڑے کہ جان بچانے میں ان کے جسم کی طاقت کام آئے۔ جو کوئی ہنر جانتے تھے وہ اپنا کل اثاثہ ہنر لے کر بیماروں، مریضوں، زنجیوں کو زندگی بخشے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس ملک کی ساری سڑکیں بس ایک سمت کو چلتی ہیں۔ دنیا بھر کے اخبار اٹھالیں، رسالے اور میگزین اکٹھے کر لیں آپ کو اس قوم کے جذبے ایثار کی کہانیاں ملیں گی۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہم پر تو پابندی لگ چکی ہے، ہم تو دہشت گرد کہے جاتے ہیں، ہم تو عالمی برادری کی گالیوں کا نشانہ ہیں..... لیکن کیا کریں؟ سوال تو قوم کا تھا مسلمانوں کا تھا۔

ان پہاڑی راستوں پر جانکے جوان کے شناسا تھا۔ کوئی اپنے جوان بچے دفن کر کام میں لگ گیا تو کوئی گھر بار چھوڑ کر وہاں جا بسا۔ کوئی ادارہ، کوئی گروہ، کوئی شخص کسی سے کم نہ تھا۔ نہ زبان یاد رہی نہ رنگ نہ نسل اور نہ سول غیر سول، بس انسان یاد رہے۔ ایسے میں دنیا بھر کا ضمیر خاموش تماشا بن گیا۔ کسی کو ہم اس طرح یاد نہ آئے جیسے سونامی پر لٹنے اجڑنے اور مرنے والے یاد آئے تھے۔

قوم اپنا سب کچھ قربان کر رہی تھی تو عالمی برادری کے لوگ قوموں کو ہمیں مدد دینے، بھیک پنجاہ کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ پتا نہیں اس ترغیب میں کیا جادو تھا کہ ہم مہینوں کی خاموشی اور سرد مہری کے بعد بھی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارا اس سال کا ترقیاتی پروگرام چار بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ ہم صرف آدھا بلین آفت زدہ علاقوں کے لیے وقف کر دیں تو ہمارے ہدف کے مطابق دس سال میں ”تعمیر نو“ مکمل کر سکتے ہیں۔

پتا نہیں کیوں ہم یہ نہ کہہ سکے کہ وہ پست ترین ہاتھ نہیں بننا چاہتے۔ ہم کسی انڈر پاس، کسی اور ہیڈ برج، کسی بجلی کے کھمبے، کسی پانی کے ٹیوب ویل، کسی ہیڈ کوارٹر کی عمارت، کسی نئے دفتر کی تعمیر یا کسی نئی سڑک کی اسکیم کو ختم کیا۔ ہمیں تو جیسے یقین تھا بس اب اس پھیلی ہوئی جھولی میں چھن چھن سکے گرنے شروع ہو جائیں گے۔ میں اس بد قسمتی کی داستان بھی نہیں دہرانا چاہتا کہ کتنا قرض ہے اور کتنی امداد؟ کتنی نسلوں کو یہ قرض ادا کرنا ہے اور امداد کس نوعیت کی ہے؟

میرا المیہ اور دکھ تو اور ہے، میرا خوف مجھے مضطرب کر دیتا ہے جب میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ بھی کس مٹی کے بنے ہیں کہ جس ہاتھ کو میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے کمتر اور ذلت والا ہاتھ کہا ہے اسے لہر الہرا کر ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں دکھاتے ہیں کہ آج اس پھیلے ہوئے ہاتھ کو اتنی بھیک ملی، اتنی امداد آئی۔

میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن ہے وسائل موجود ہونے کے باوجود امداد مانگنے والے کے لیے اللہ دنیا کو جنت بنا دے؟ اس کا تو قول ہے جو مانگنے کی عادت ڈالتا ہے میں اس کے لیے محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہوں۔



## محتاجی کا دروازہ

(06 ذیقعدہ 1426ھ بمطابق 10 دسمبر 2005ء)

ٹیلی ویژن کی رنگارنگ اسکرین پر کامیابی کے جھنڈے گاڑتی کانفرنس، تالیوں کی گونج، اناؤنسر کی کھنکھتی آواز میں اعلان..... آج اس ملک کی پھیلی ہوئی جھولی میں دنیا بھر کے صاحبان ثروت نے مقدور بھر حصہ ڈالا۔ کوئی امداد دے گیا اور کوئی قرض۔ ایسے میں ہر مانگنے والے کے منہ پر تشکر کے جملے ہوتے ہیں، سخاوت کی تعریفیں ہوتی ہیں اور دین و دنیا کی بھلائی کی دعائیں..... لیکن میرے جیسا دقیانوسی، مضحکہ خیز اور فرسودہ خیالات رکھنے والا شخص پتہ نہیں کیوں ماضی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ فوراً ایک نہیں ٹھیک چودہ سو سال پیچھے لوٹ جاتا ہے۔

گارے سے بنی ہوئی دیواروں اور کھجوروں کے تنوں اور جھال پر بنی چھت کے نیچے ایک ایسے لوگوں کے گروہ کے سامنے ہادی برحق کی آواز گونجتی ہے جسے صرف چند سالوں بعد دنیا کی دو سپر پاورز اپنے انجام تک پہنچانا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”ہاتھوں کے تین درجے ہیں: سب سے اول اور بالا ہاتھ خدا تعالیٰ کا ہے۔ دوسرا ہاتھ دینے والا ہاتھ جو اللہ کے ہاتھ کے پیچھے ہے اور تیسرا ہاتھ لینے والا ہاتھ ہے جو پست ترین ہے۔“

اس کے بعد فرمایا: ”سوال کے لیے ہاتھ پھیلا نا بدترین ذلت ہے خواہ باپ سے ہی کیوں نہ ہو۔“ میرے کمزور اور بے مایہ علم کے مطابق احادیث کی کتابوں میں کوئی ڈیڑھ سو ایسی روایت مجھے ملی ہیں جو دست سوال دراز کرنے کی ندامت کرتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مانگنے کی عادت ڈالتا ہے اللہ اس پر محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ پھر فرمایا ملعون ہے وہ شخص جو اللہ کا نام لے کر سوال کرے۔ آپ نے فرمایا: ”جس کے گھر میں ایک وقت کی خوراک موجود ہو اور وہ سوال کرے تو ایسا شخص کثرت سے دوزخ کی آگ طلب کرتا ہے۔“

جس ہادی برحق نے اپنی امت کے لیے غیرت و حمیت اور عزت و سرفرازی کا راستہ چنا تھا وہ جب تک مانگنے کی لعنت سے دور رہی، جن کے کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے تھے اور جن کے حکمرانوں کے دست خوانوں پر کبھی غریب آدمی کے گھر کپنے والے کھانے سے بہتر کھانا میسر نہ تھا، اپنے وقت کی دو سپر پاورز ایران اور روم سے ٹکرائے اور ان طاقتوں کا وجود صرف تاریخ کے صفحات تک باقی رہ گیا۔

اس دکھ اور مصیبت کی گھڑی میں میرے جیسے انسان کا المیہ بہت گہرا ہے۔ وہ شخص جو آٹھ اکتوبر کی صبح پڑمردہ، پریشان اور دکھ میں ڈوبا ہوا تھا صرف چوبیس گھنٹے کے اندر اس کے وجود میں یقین کی قوت اٹھ اٹھائی لے رہی تھی۔ کیوں نہ ایسا ہوتا، اس کی قوم نے اپنے پاس جو کچھ تھا اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے دوڑ

عورتوں میلوں سفر کر کے پانی لے کر آتی ہیں۔ یوں اس نے اس نیک کام کے لیے اپنے باپ اور دیگر محیر سہیلیوں سے مدد کی درخواست کی اور تین دیہات میں ٹیوب ویلوں کے ذریعے پانی کا بندوبست کر دیا۔ چوتھے گاؤں میں کام جاری تھا کہ گیارہ ستمبر آگیا اور پھر 8 اکتوبر کا دن جب افغانستان کے نہتے عوام پر ہم برسنے لگے۔

معظم جان بچتا بچاتا اپنے بیوی بچوں کو سنبھالتا اپنے آبا و اجداد کے ملک پاکستان آ گیا۔ وہ اس ملک کی ذہری شہریت بھی رکھتا تھا لیکن اسے اپنی بے ایمانی کا اندازہ نہیں تھا۔ فروری 2002ء کی ایک رات اس ملک کی پولیس دو امریکی سہیلیوں کے ساتھ آئی اور معظم بیگ کو اٹھا کر لے گئی۔ آخری فون اس نے اپنے موبائل سے اس وقت کیا جب اسے گرفتار کیا جا رہا تھا۔ یہ باپ کے ساتھ اس کا آخری رابطہ تھا۔ بیوی بچوں کے پاس 800 پونڈ رقم تھی، وہ بھی چھین لی گئی کہ کہیں یہ معمولی رقم دہشت گردی کی لیے بچا کر نہ رکھی گئی ہو اور یہ معصوم بچے اور بیوی اس مملکت خدا داد میں محض اللہ کے رحم و کرم پر رہ گئے۔

یہاں سے ایک المناک داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ بیٹے پر مصائب اور باپ کی تلاش کا سفر۔ بیٹا بگرام کی قید خانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اسے ایک ایسے کنٹینر میں رکھا گیا جس میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ اس اذیت ناک قید کے بعد اسے خطرناک قرار دے کر گوانتانامو بے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر بیٹے کی معصومیت پر یقین رکھنے والا باپ اس کا پتہ چلانے کی جنگ کا آغاز کرتا ہے۔ بیٹا قید تنہائی میں ہے لیکن وہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنا ایک خط باپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس میں تشدد، نفسیاتی دباؤ اور قید تنہائی کی اذیت کا ذکر ہوتا ہے۔

باپ اس خط کی بنیاد پر اسے رہا کروانے کی جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ یہاں مجھے شرمندگی اور خفت سے یہ بات لکھنا پڑ رہی ہے کہ اس باپ کی جدوجہد میں اس کے آبائی اور مسلمان ملک کا ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ نہ ہی اس ملک میں حقوق انسانی کے نام پر دوا دیا کرنے والی کوئی تنظیم یہ بات اٹھاتی ہے کہ ایک شخص بغیر کسی الزام کے قید میں اور وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن امریکا اور برطانیہ کے اخبارات کے صفحے اس باپ کے مضمون اور بیٹے کے خط کے پس منظر میں احتجاج سے سجنے لگتے ہیں۔ وہاں کے چند باضمیر لوگ اس کی رہائی کے لیے باہر نکلتے ہیں۔

اسے مسلمان نہیں بلکہ برطانیہ کا شہری کہہ کر پکارا جاتا ہے اور پھر بالآخر تین سال بعد اسے یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ ہم نے اسے غلطی سے پکڑا تھا، وہ تو بالکل بے قصور ہے اس پر تو کوئی فرد جرم ہی عائد نہیں ہوتی۔ بیٹا واپس برمنگھم لوٹا تو یوں لگتا تھا جیسے اس کی کائنات ہی لٹ چکی ہو۔

میں عظمت اللہ بیگ کے پاس جا بیٹھا، بیٹے کے بارے میں اس غمزدہ باپ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بیٹے کی نفسیاتی حالت بیان کرتے ہوئے رو پڑے۔ میں نے بیٹے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اگلے دن کا وقت طے ہوا لیکن پوری رات میں ایک کرناک تذبذب میں مبتلا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ میں ایسے ملک کا فرد ہوں جس نے اس جیسے کتنے بے گناہ لوگوں کو اذیت کا شکار کیا۔ میں اس کے چہرے پر لکھے ہوئے سوالات کا کیسے سامنا کر سکوں گا؟ کیا میں ان لوگوں میں شامل نہیں جب یہ سب کچھ ان کے قرب و جوار میں ہو رہا تھا وہ مصلحت کی چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔

میں تو مغرب کے ان لوگوں سے بھی کم حوصلہ تھا جو اس کے لیے سراپا احتجاج بن گئے۔ نہ خون کا رشتہ نہ مذہب..... لیکن میرے تو کئی رشتے تھے۔ ایک مذہب، ایک زبان، ایک نسل اور..... پھر صبح ہونے تک میں اپنی شرمندگی چھپائے برمنگھم سے نکل آیا کہ نہ اس چہرے کی اذیت دیکھنے کی مجھ میں تاب تھی اور نہ ہی اپنی بزدلی کا جواز دینے کا

## ڈرو اس وقت سے

(27 ذیقعدہ 1426ھ بمطابق 31 دسمبر 2005ء)

زلزلے سے ٹھیک تین دن پہلے میں اس شخص سے ملا۔ آنکھیں ایسی جیسے مدتوں رونے کے بعد بھیگی بھیگی رہنے لگی ہوں۔ یوں لگتا تھا بس ذرا سی بات پر آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگیں گے۔ برمنگھم کے ایک ریسٹورنٹ میں ایک مشاعرے کی نشست میں موجود اس شخص کو جب شعر کہنے کے لیے بلایا گیا تو یوں لگتا تھا کہ اس کا کرب، دکھ اور بیتی ہوئی اذیت ایک ایک شعر میں جاگ رہی ہو۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر نظریں چرا کر شعروں کو سننے لگا۔

مجھے ڈرتا تھا کہ کہیں ان آنکھوں سے ضبط کا بندھن ٹوٹے ہی آنسو بہہ نکلیں گے اور پھر شاید مجھ میں ایسے لمحے کو دیکھنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ شعر تھے کہ امت مرحوم کا نوحہ تھے۔ ملک و ملت کو غیروں کے ہاتھ بچ دینے کا المیہ تھے۔ مرزا عظمت اللہ بیگ پاکستان سے 1964ء میں ہجرت کر کے ایک قومی بینک کی برانچ میں لندن تعینات ہو کر آئے اور پھر نوکریاں بدلتے بدلتے بی سی سی آئی (BCCI) کے ڈیلینڈ برطانیہ کے زونل منیجر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

اس کنبہ کو اللہ تعالیٰ نے 1967ء میں ایک خوبصورت بچہ عطا کیا جس کا نام معظم بیگ رکھا گیا۔ ایسا گھر جس میں اللہ کا ذکر اور رزق حلال کی نعمت میسر ہو وہاں اولاد، مغرب کی چکا چوند میں بھی اللہ کی دی ہوئی ہدایت کے نور سے دور نہیں رہ سکتی۔ معظم بیگ بھی اس نعمت سے مالا مال تھا۔

اس کا مزاج بچپن ہی سے مفلوک الحال لوگوں کی مدد کرنا اور ان کو آسانیاں بہم پہنچانے کی طرف مائل تھا۔ وہ قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ”مکتبہ انصار“ کے نام سے برمنگھم میں کتابوں کی ایک دکان بھی چلاتا تھا۔ ایک دن معظم نے اپنے باپ سے کہا کہ اس ملک میں کسی نہ کسی طرح لوگوں میں مدد میسر آ ہی جاتی ہے لیکن میں ایسی جگہ جا کر کام کرنا چاہتا ہوں جہاں غریب اور مفلوک الحال مسلمان آباد ہوں، لیکن وہاں دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں رخ نہ کرتی ہوں اور وہ لوگ بے یار و مددگار ہوں۔

اس نے اپنے مقصد کے لیے افغانستان کو چنا۔ باپ کو اپنے بیٹے کے کردار اور نیک ارادے پر بھروسہ تھا، اس لیے اس نے اجازت دے دی۔ معظم بیگ اپنی بیوی اور تین بچوں کو لے کر افغانستان روانہ ہو گیا۔ اس کا مقصد افغانستان کے بچوں کو زور تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ پانچ لوگوں پر مشتمل یہ خاندان جون 2001ء میں افغانستان منتقل ہوا۔ معظم نے اسکول شروع کیا لیکن اسے جلد ہی یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں سب سے زیادہ ضرورت تو پینے کے پانی کی ہے۔



## ریت کی بوریاں

(05 ذی الحجہ 1426ھ بمطابق 07 جنوری 2006ء)

ایسا ہی ایک ملک تھا، سرسبز و شاداب..... اس ملک پر ایک مطلق العنان شخص حکومت کرتا تھا۔ ایسے لوگ دو باتوں کے نشے میں ہوتے ہیں ایک یہ کہ ان کی سپاہ بہت طاقتور اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس ملک کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بلند کر رہے ہیں اس لیے ملک کی خاموش اکثریت ان کی مداح ہے۔ ان پر جان چھڑکتی ہے، اس کی تقریروں، بیاناتوں، پریس کانفرنسوں میں اسی نشے کی کیفیت اور بہترین حکمرانی کا غرور جھلکتا تھا۔

وہ تقریر کرتا تو لوگوں کے سامنے وہ سارے اعداد و شمار گنواتا اور پھر سوال کرتا کہ کیا تم میری ان پالیسیوں کی وجہ سے خوشحال نہیں ہو گئے ہو۔ دیکھو 1970ء میں صرف سات ہزار ملین کلواٹ بجلی پیدا کرتے تھے اب 1900 ملین کلواٹ پیدا کرتے ہیں پہلے تیس لاکھ لوگوں کے پاس ریڈیو تھے اب اسی لاکھ لوگوں کے پاس ہیں۔ پہلے صرف دو لاکھ ٹی وی گھروں میں موجود تھے اب بیس لاکھ ہو گئے ہیں۔

مجھ سے پہلے اس ملک کی کل پیداوار آدھے بلین ڈالر سے بھی کم تھی اور اب دیکھو ہم سالانہ 20 بلین ڈالر کی آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ میں نے تمہاری تنخواہیں بھی تو بڑھائی ہیں۔ کم از کم تنخواہ 80 ریال سے 200 ریال کر دی ہے۔ ہمارا جی این پ 30 فیصد سے 42 فیصد شرح سے بڑھ رہا ہے۔

ایسے بادشاہوں اور مطلق العنان افراد میں ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی حکومتی زندگی میں صرف وہی کچھ سننا چاہتے ہیں جو انہیں پسند ہوتا ہے۔ ان کی مصاحبین ان کے سامنے اسی طرح رطب اللسان ہوتے ہیں جیسے اس شخص کو سننے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر 1977 میں جب اس بادشاہ نے آرمی افسران کی یونیورسٹی میں یونیفارم میں ملبوس تالیاں بجاتے افسران کے ہجوم کو ڈگریاں تقسیم کرنے کے بعد خطاب کیا اس کا لہجہ متکبرانہ تھا۔

اس نے کہا: ”دنیا کی کوئی طاقت مجھے اقتدار سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔ مجھے مزدوروں، کسانوں اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگوں کی حمایت حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوج کے سات لاکھ جوان میری پشت پر ہیں جو اس حکومت کے خلاف ہر سازش کا سرکچل کر رکھ دیں گے۔“

اسی ملک کو ایک اور طاقت پر بڑا بھروسہ اور ایمان تھا اور وہ تھی ریاست ہائے متحدہ امریکا۔ ٹھیک اسی دوران امریکی صدر جیمی کارٹر نے اپنی تقریر میں ایران میں اندرونی استحکام پر شاہ کو مبارکباد پیش کی۔ کیا امریکا بھی اتنا بے خبر تھا کہ اسے ایران میں اعلیٰ اور دہکتے ہوئے لاوے کا احساس تک نہ ہو سکا۔ اس وقت کی ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی اور سی آئی اے کی رپورٹیں سب یہ کہہ رہی تھیں کہ لوگ شاہ ایران کی پالیسیوں سے بہت خوش ہیں۔

حاصل۔ مجھے ذباپ کی آنکھوں میں نکلے ہوئے آنسو بھی آج تک چین سے سونے نہیں دیتے۔

ٹھیک دو دن بعد پاکستان لوٹا تو اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی سوچ میں پڑ گیا کہ اس دنیا کے نقشے پر کتنے ملک آباد ہیں لیکن شاید یہ اعزاز ہمارے ہی مقدر میں تھا کہ ہم نے ایسے کئی سو لوگوں کو پکڑ کر ایسے نذرانے کے طور پر پیش کر دیا جیسے مصر کے لوگ قرون کے سامنے اپنے بیٹوں کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ ہم کیسے لوگ تھے جنہیں نہ ایسے لوگوں کے چہرے کی مصدویت یاد رہی اور نہ ہی باپ کی آنکھوں کے آنسو..... ہمیں دنیا میں معتبر اور معزز ہونے کا ضبط سوار تھا۔

میں نہ تو اپنی خاموشی کا کوئی جواز دے سکتا تھا اور نہ ہی حکمرانوں کی سنگدلی کا۔ صرف تین دن پہلے میں ایسے باپ سے ملا تھا اور تین دن بعد اس سرزمین پر میرے چاروں جانب گرتے ہوئے گھر، چیخ و پکار کرتے مدد کے لیے پکارتے بچوں، عورتوں اور مردوں کی آوازیں تھیں اور مجھے سورہ انفال کی آیت یاد آ رہی تھی۔

”وَرَاں فَنَفَسَ سَے جَس کی شامت مَحْصُوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔“



## ایک مسلمان ملک سے دوسرے مسلمان ملک تک

(19 ذی الحجہ 1426ھ بمطابق 20 جنوری 2006ء)

جنگ عظیم دوم کے بعد جب اتحادی فوجوں کو امریکا کی مدد سے جرمنی، اٹلی اور جاپان پر فتح حاصل ہوئی تو اس وقت پورے یورپ کی اقتصادی کمرٹھ چکی تھی۔ شہر کے شہر برباد اور ویران ہو چکے تھے۔ آبادیاں بمباری کی نذر اور کارخانے جلے ہوئے طبع کا ڈھیر تھے۔ ایسے حالات میں امریکا اور ان ممالک نے ذراستوں پر عمل درآمد شروع کیا: ایک مارشل پلان آیا جس کے تحت پورے یورپ کی اقتصادی بحالی کے لیے امداد دینے اور اسے پاؤں پر کھڑا کرنے کا اعلان کیا گیا۔

دوسرا ان ممالک میں امریکا نے حفاظت اور سیکورٹی کے نام پر اپنی فوج تعینات کی جسے ”نیٹو“ کہا جاتا ہے۔ نیٹو 1949ء سے اس پورے علاقے میں سرگرم عمل ہے۔ ایک طویل زمانے تک یہ یورپ کے ملکوں کو کمیونسٹ روس کے حملوں سے بچانے اور اس کے خلاف مہم جوئی میں شریک رہی۔ اس تنظیم کی موجودگی تقریباً ہر اتحادی ملک میں موجود تھی اور آج بھی ہے لیکن 1949ء سے لے کر 1991ء تک یہ تنظیم مکمل طور پر ایک خاموش اور بے عمل طور پر صرف دوسروں کو خوف دلانے کے لیے موجود رہی تاکہ ان ممالک پر کمیونسٹ یلغار نہ ہو سکے۔

ادھر سوویت یونین ٹوٹا اور ادھر نیٹو کو براہ راست کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس فوج کا پہلا ٹھکانہ بلکہ پہلا نشانہ یوگوسلاویہ تھا۔ یہ ملک جو مارشل نیٹو کی سخت گیری کی وجہ سے مشہور تھا اپنے اندر مختلف تضادات رکھتا تھا۔ اس کی آبادی بوسنیا کے مسلمانوں، کرویشیا کے عیسائیوں اور نسل پرست سربوں پر مشتمل تھی۔ میں اس طویل تاریخ میں نہیں جانا چاہتا کہ کیسے یہ تینوں خطے آزاد ہوئے اور پھر عالمی برادری کی ملی بھگت سے اس خطے میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ گاؤں کے گاؤں قتل کر کے اجتماعی طور پر دفن دیے گئے۔

پوری دنیا کے اشتہارات اور میڈیا پر صرف ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی جانب ہجرت کرتے ہوئے لڑنے والے خاندان نظر آتے تھے یا پھر بھوک، گولوں اور بندقوں کے فائروں سے جلی ہوئی اور چھلنی چھلنی عمارتیں۔ مدتوں پوری دنیا خاموش تماشائی بنی رہی اور مسلمانوں کا اجتماعی قتل عام جاری رہا۔

جب ان کے دل اس خون آشام ڈرامے سے بھر گئے تو پھر یہ لوگ وہاں امن قائم کرنے کے نام پر داخل ہوئے اور 1949ء میں قائم ہونے والی نیٹو کی پہلی دفعہ امداد اور امن کی بحالی کا کام سونپا گیا یہ فوج (SFOR) یعنی Stabilization force in Bosnia and Herzegovina کے نام پر وہاں آئی اور اس نیٹو کو اقوام متحدہ کی

ملک میں خوشحالی ہے، نڈل کلاس کی زندگی آسان ہو چکی ہے اس لیے ایران انقلاب کے ابتدائی مرحلے میں بھی داخل نہیں ہوا چہ جائیکہ اس کے بارے میں گمان کیا جائے کہ یہاں انقلاب آ سکتا ہے لیکن ٹھیک ایک سال کے اندر یہ مطلق العنان بادشاہ روتے ہوئے؟ آباد کے ہوائی اڈے سے رخصت ہو رہا تھا اور اس کی وفادار افواج عوام کے اندر تے ہوئے سیلاب کے سامنے بس تھیں۔

بادشاہوں، آمروں، مطلق العنانوں کو اس بات کا ادراک کیوں نہیں ہوتا کہ لوگ ان سے مطمئن نہیں۔ یہ صرف ایران کی بات نہیں ہر اس ملک کی کہانی ہے جہاں شخصی حکومت ہو اور حکمران وہی سنتا ہو جو وہ چاہتا ہے۔ الطاف گوہر نے ایوب خان کے دور کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اس کے خلاف ہنگامے زور پکڑ گئے تو ہم نے سوچا کہ کہیں ایوب خان کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تو ہمارے کنٹرول میں تھے۔ وہاں سے ہم جیسے چاہتے خبر شائع کرواتے۔

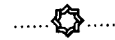
پورے ملک میں امن و امان، سکون و آشتی اور چین کی باتیں کرتے لیکن ہمیں اندازہ ہوا کہ ایوب خان پاکستان ٹائمز اخبار روزانہ پڑھتے ہیں۔ اس پر ہمارا کنٹرول بہت کم تھا اس لیے راولپنڈی میں ایک پریس حاصل کیا گیا اور وہاں خاص طور پر ایک علیحدہ پاکستان ٹائمز چھپتا جسے صرف ایوب خان پڑھا کرتے تھے اور یوں انہیں احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ملک میں لوگ ان سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔

دوسرا سوال عجیب ہے کہ ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے والے ملک امریکا کو بھی اس بات کا ادراک کیوں نہیں ہوتا کہ یہ لوگ عوام میں مقبول نہیں رہے۔ ایسے میں وہ انہیں پناہ کیوں نہیں دیتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب حکمران ریت کی بوریاں ہوتے ہیں جن کے پیچھے سے خلق خدا پروار کیا جاتا ہے۔ ان بوریوں کی خستہ حالی، تباہی و بربادی اور ٹوٹ پھوٹ کا احساس یا تو عوام کو ہونا ہے جو انہیں بکھرتا دیکھ رہی ہوتی ہے۔

جب اسے اس بات کا اندازہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ بوری اب اس قابل نہیں رہی کہ وہ حفاظت کا کام دے سکے تو وہ خاموشی سے اس کے پیچھے سے ہٹ جاتے ہیں اور لوگ اس بوری کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ اس پیچھے ہٹنے کے دوران وہ بوری کو یقین نہیں ہونے دیتے کہ وہ کمزور ہے، عوام اس پر حملہ آور ہونے والے ہیں، بس اسے وہیں کھڑے ہونے کا کہہ کر خود پیچھے سے نکل جاتے ہیں۔

یہ سراسر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اظہار رائے کی آزادی اور بات کہنے اور لکھنے کا موسم نہ پھلے دیا جائے۔ ایسا موسم دونوں کے لیے موت ہوتا ہے۔ یہی حال ایران کا تھا اور ان تمام ممالک کا خواہ اسپین کا فرانکو ہو یا چلی کا پینوشے۔

پتہ نہیں کیوں ”ضرب مومن“ پر پابندی لگی تو ماضی کے سارے بدلتے موسم یاد آ گئے۔ معلوم نہیں ریت کی بوری مضبوط ہے یا نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ جب صرف وہی خبر عام کی جائے جسے حکمران سننا چاہیں تو پھر عوام اپنی خبر ایسے سناتے ہیں کہ تاریخ مطلق العنانوں کے عبرتناک انجام پر آنسو بہانا بھی بھول جاتی ہے۔



اس ضمن میں بوسنیا کے ایک افسر کا بی بی سی کو انٹرویو قابل غور ہے۔ اس کے مطابق ان قبضہ خانوں میں 30 فیصد غیر ملکی گاہک آتے ہیں جب کہ مقامی افراد بھی اس طرف مائل ہو گئے ہیں اور ان کی تعداد 70 فیصد ہو گئی ہے۔ سراجیواس دھندے کا مرکزی شہر ہے۔ وہاں امن پولیس کے افراد ان اڈوں کی سرپرستی کرتے نظر آئیں گے۔

بی بی سی کی ایک اور رپورٹ میں مونیکا کی کہانی موجود ہے جسے اغوا کے بعد اپنے گھر واپس لوٹنے کے لیے بین الاقوامی فوج کے چار افسروں کے ساتھ گئی۔

کہانیاں المناک بھی ہیں اور دردناک بھی۔ تمام رپورٹیں اس فوج کی کارکردگی اور گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ آپ رپورٹ پڑھتے جائیں اور آنسوؤں سے اپنا دامن بھگوتے جائیں۔ شرمناک حد تک گرے ہوئے اس لیے میں آپ کو کبھی فلپائن یاد آئے گا اور کبھی بینکاک اور کبھی ویت نام جہاں امریکی فوج گئی اور قبضہ خانہ بنا کر واپس آئی لیکن نیٹو کی افواج کی یہ پہلی آزمائش تھی اور وہ بھی اپنے پیش رو امریکا سے پیچھے نہ رہی۔ حیرت کی بات ہے کہ 1949 میں نیٹو بنی اور سب سے پہلے ایک مسلمان ملک بھی گئی اور وہاں کا حشر پوری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ سب پڑھتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں خوف سے، شرم سے، انجام سے اور امت مسلمہ کی اس تذلیل سے۔



جھڑتی دے کر اسے International police task force (IPTF) بھی بنائی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ نیٹو کے سپاہی اور افسران United Nation Protection force میں بھی موجود تھے اور کثیر تعداد بلکہ غالب اکثریت میں تھے۔

دنیا کے کسی بھی ملک میں نیٹو کی فوج کی مداخلت کا یہ پہلا براہ راست موقع تھا۔ اس براہ راست کارروائی کے نتیجے میں بوسنیا کے عوام پر جو بیتی وہ ایک خونچکاں داستان ہے۔ ظلم و تشدد یا سیاسی طور پر روشن خیالی اور سیکولر ازم تو اپنی جگہ لیکن اس فوج کی موجودگی نے اس ملک کی اخلاقیات کو بگاڑنے اور اسے قبضہ خانہ بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا بدنام ترین باب ہے۔

یہاں صرف انٹرنیشنل اور بی بی سی کی رپورٹوں سے اس اخلاقی تباہی کی طرف اشارہ کروں گا جس کی ابتدا نیٹو کی افواج کے وہاں آنے کے بعد شروع ہوئی اور آج یہ خطہ پوری دنیا میں دھوکے، فریب اور دیگر ہتھکنڈوں سے عورتوں کو حکم دے کر بیرون ملک اسمگل کرنے کے لیے بدنام ہو چکا ہے۔

انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق اس وقت کو سوو میں جبری جسم فروشی ایک مافیا کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ رپورٹ کے مطابق چالیس ہزار نیٹو امن فورس نو عمر لڑکیوں کی بردہ فروشی میں ملوث ہے اور گیارہ برس تک کی لڑکیوں کی خرید و فروخت جہاں بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ کو سوو میں 1979ء میں جسم فروشی کے صرف 18 اڈے تھے لیکن جیسے ہی نیٹو افواج کے زیر اثر غیر ملکی کمپنیوں کو وہاں تعمیر و ترقی کا کام سونپا گیا تو صرف ایک سال کے اندر یعنی 2003ء میں ان اڈوں کی تعداد 200 سے بھی بڑھ گئی۔

یہ دھندہ نائٹ کلبوں، قبضہ خانوں، ریستورانس اور ہوٹلوں میں سرعام ہوتا ہے۔ یہ اڈے صرف کو سو کی سڑکوں تک محدود نہیں بلکہ ارد گرد کے ممالک مثلاً: بلغاریہ اور یوکرین وغیرہ سے بھی لڑکیوں کو ملازمت کا جھانسنہ دے کر لایا جاتا ہے اور پھر ان کی دستاویزات ضبط کر کے یہاں ماتحت رکھا جاتا ہے۔ یہاں اس کھیل کا مکروہ ترین حصہ یہ ہے کہ ان لڑکیوں کی عمر اور خوبصورتی کے حساب سے قیمت لگتی ہے اور پھر وہ لڑکی ان قبضہ خانوں کا حصہ بن جاتی ہے جس کی سرپرستی وہ پولیس فورس کرتی ہے جسے اقوام متحدہ اور نیٹو کی سرپرستی میں بنایا گیا ہے اور جس میں جرمنی اور فرانس اور دیگر یورپی ملکوں کے سپاہی شامل ہیں۔ 6 مئی 2004ء کو شائع ہونے والی اس رپورٹ میں سینکڑوں عورتوں کے انٹرویو ہیں۔

کوئی بتاتی ہے کہ اسے شدید مارا پیٹا جاتا ہے۔ کسی کے پاس سردی سے بچنے کے لیے صرف ایک باریک لباس ہے اور کسی کو بار بار قبضہ خانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے..... ان سب لڑکیوں کا فرض منصبی بین الاقوامی فوجیوں کا دل خوش کرنا ہے کیونکہ ان کی ناراضگی کسی بھی اڈے کے خاتمے کے لیے کافی ہے۔

ان لڑکیوں کی تمام آمدن وہ افراد اور ذمہ دار رکھ لیتے ہیں جو انہیں خریدتے ہیں اور ان کو محض کھانے پینے اور مختصر رہائش پر ترخا دیا جاتا ہے۔ جس لڑکی کو ڈھونڈتے ہوئے اس کے والدین وہاں آجائیں اور کسی ادارے یا اپنے ملک کی ایجنسی کی خدمات حاصل کر لیں تو لڑکی کو فوراً گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا جاتا ہے اور پھر اسے خاموشی سے اپنے ملک روانہ کر دیا جاتا ہے۔ البانیہ وہ ملک ہے جہاں سے لڑکیوں کو اغوا، ترغیب اور دھوکے سے بڑے پیمانے پر ان بین الاقوامی فوجیوں کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے جم مورن نے بتایا کہ ہم فوجیوں کو روک رہے ہیں لیکن ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔



جنرل اعظم روز ایک ٹیلی گرام ہیڈ کوارٹر میں ارسال کرتا ہے کہ ہم نے آج اتنے ”ملا“ مار دیئے۔ وہ اس ٹیلی گرام کی ایک نقل وزیر اعظم کو بھی بھیجتا ہے۔ ان ٹیلی گراموں کے انبار کو دیکھ کر ایک دن وزیر اعظم نے سکندر مرزا کو بلایا اور کہا: ”سیکرٹری دفاع دیکھو! میں رات بھر سو نہیں سکتا ہوں کہ فوج کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے مارے جا رہے ہیں۔“ اس کے بعد پاکستانی انتظامی سیاست کو ایک عجیب و غریب لفظ میسر آ جاتا ہے۔

سیکرٹری دفاع سکندر مرزا اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ میں نے واپس آ کر اعظم کو فون پر ڈالنے ہوئے کہا: ”بے وقوف“ جب تم ان ملاؤں کو گولی مارتے ہو تو اس کی تشہیر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جنرل اعظم نے پوچھا پھر میں انہیں کیا کہوں۔

سکندر مرزا نے جواب دیا: ”کہو اتنے ”شر پسند“ مار دیئے گئے۔“

یوں پاکستان بننے کے چھ سال کے اندر ”شر پسند“ اور ان کا قلع قمع کرنے کا آغاز ہو گیا۔ یہ لفظ حکومت کی فائلوں سے اخبارات کی سرخیوں اور نشریات کی لہروں میں گونجنے لگا۔ اب کیا تھا تحریک کتنی ہی حق پر ہو، لوگ کہتے ہی حکومت کے ظلم سے تنگ آئے ہوئے ہوں، ان کو پہلے ”شر پسند“ بناؤ پھر ان کو بدنام کر کے ان کے انجام تک پہنچا دو۔ صرف ایک لفظ ہی اس سارے قتل و غارت کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔

دوسرا لفظ جس سے حکمرانوں کے جذبہ حب الوطنی کو جلا اور قومی مفاد کو تحریک ملتی ہے، اقتدار کو طول دیا جاسکتا ہے، وہ چار حرف پر مشتمل لفظ ”غدار“ ہے۔ اس لفظ کے استعمال کے آغاز کی کہانی برصغیر میں 1857ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوتی ہے۔ جب انگریز کی فوج میں آدمی بھیجنے والے چودھری، وڈیرے اور جاگیردار محبت وطن تھے اور آزادی کی جنگ لڑنے والے ”غدار۔“

حیرت کی بات ہے کہ انگریز جو اس خطے پر مکمل طور پر حکمران بھی نہ تھا، اس نے اس ساری لڑائی کو جو یہاں کے عوام نے لڑی ”غدار“ کا نام دیا۔ یہ ”غدار“ پاکستان میں کیسے بنتے ہیں اور ان کی تعداد کیسے متعین ہوتی ہے؟ الطاف گوہر نے ایک کمال کا واقعہ بیان کیا ہے۔

ان کے مطابق وہی سکندر مرزا مشرقی پاکستان کا گورنر ہے اور بنگالیوں پر غدار کی ہتھیں سرکار کے میڈیا میں عام ہیں، انہیں غدار کہنے کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنی مادری زبان استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ گورنر ڈھاکہ پہنچا اور اپنے گھر میں چیف سیکرٹری این ایم خان اور ڈی آئی جی پولیس انوار الحق کو بلایا۔

نائٹ گاؤن میں ملبوس سکندر مرزا پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا اور صرف اتنا کہا: ”میں ان سب غداروں کی فوری طور پر گرفتاری چاہتا ہوں۔ کل صبح تک 1500 آدمی اندر کر دیے جائیں۔“

انوار الحق نے 1500 کو 17 اضلاع پر تقسیم کیا اور کہا باقی چار کا کیا کیا جائے۔ این ایم خان نے کہا مین سنگھ بڑا ضلع ہے وہاں سے چار لوگ اور پکڑ لو۔ اگلی صبح تک 1500 لوگ اور پکڑ لو، لیکن پکڑے جانے والوں میں سائیکل رکشے والا، خوائے والا، مسافر اور ریڑھی بان سب شامل تھے، جن پر عدالتیں غدار کی کے مقدمے چلا رہی تھیں۔

یہ لوگ جب جیل کی چکی میں پس کر واپس نکلے تو انہیں محبت وطن رکھنے کی کوئی ترغیب کارگر نہیں ہوتی۔ سکندر مرزا صرف تین ماہ گورنر رہا اور سرکار کے کاغذوں میں مشرق پاکستان کو غداروں سے پاک کر گیا، لیکن 17 سال بعد نو مہینے خون کی ہولی کھینے کے بعد بھی 1971ء میں غدار کہنے والے حکمران پلٹن میدان میں عبرت کا نشان بنا دیئے گئے۔

## شر پسند، غدار، دہشت گرد

(26 ذی الحجہ 1426ھ بمطابق 27 جنوری 2006ء)

پاکستان کو بننے ابھی چھ سال ہوئے تھے۔ لاہور اور پنجاب کے دیگر اضلاع ہنگاموں کی زد میں ہیں۔ تمام مکاتب فکر کے علماء اس تحریک میں شامل ہیں اور تین مطالبات سامنے رکھتے ہیں: قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا، سر فطر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے ہٹانا اور قادیانیوں کی کلیدی عہدوں پر تقرری پر پابندی۔ 21 جنوری 1953ء کو علماء کا وفد وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کرتا ہے اور مطالبات کی منظوری کے لیے ایک ماہ کا الٹی میٹم دیا جاتا ہے۔

ادھر وزارت دفاع کے سیکرٹری سکندر مرزا وزیر اعظم کو ایک خط تحریر کرتے ہیں جس میں ملک میں تیزی سے گہڑتی ہوئی حالت کا تذکرہ اور شدید خطرات کی بات کی گئی ہے۔ سکندر مرزا نے لکھا: ”آپ کے دشمن ملاؤں سے اگر سختی کے ساتھ فوراً نہ نمٹا گیا تو انتظامی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا اور ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔“ آخر میں کہا: ”خدا کے لیے جرأت مندیڈر بیٹے اور فیصلہ کن قدم اٹھائیے۔ مسلح افواج وزیر اعظم کے ہر حکم کی تعمیل کریں گی۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو تمام ملک سوائے ان چند ”بد معاشوں“ کے آپ کے ساتھ ہوگا۔“

وزیر اعظم پر اس خط کا کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر ایک دن کابینہ کے اجلاس کے دوران گورنر پنجاب کا فون آیا۔ سر! یا تو ان کے مطالبات تسلیم کر لیں ورنہ لاہور راہ کا ڈھیر بن جائے گا۔ وزیر اعظم یہ بات کابینہ کو سناتے ہیں۔ کابینہ کوئی ایکشن نہیں لینا چاہتی، لیکن اتنے میں وہی سیکرٹری دفاع خفیہ ایجنسیوں کی مرتب کی ہوئی ہولناک رپورٹیں پیش کرتا ہے اور ملک کے وسیع تر مفاد اور استحکام کے لیے سخت ایکشن کی درخواست کرتا ہے۔

وزیر اعظم کوئی جواب نہیں دیتا۔ سیکرٹری دفاع اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ گلتا ہے فوری کارروائی کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر سیدھا ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر جا پہنچتا ہے اور خاص فون طلب کر کے لاہور میں کمانڈنگ افسر جنرل اعظم سے کہتا ہے: ”اعظم! گلتا ہے لاہور کی انتظامیہ ناکام ہو چکی ہے۔ تم فوراً کنٹرول سنبھال لو اور مارشل لاء نافذ کرو، مزید احکامات کا انتظار نہ کرو۔ پوری ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ مارشل لاء نافذ کرو اور سارا معاملہ ختم کرو۔“

وہاں سے اٹھ کر سیکرٹری دفاع وزیر اعظم کے دفتر میں جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ میں نے مارشل لاء لگانے کا حکم دے دیا ہے۔ اس کے بعد ایک خونچکاں باب کا آغاز ہوتا ہے۔ لاہور کی سڑکیں ختم نبوت کے پروانوں کے خون سے رنگین ہونے لگتی ہیں، جلوس کچلے جاتے ہیں، کبھی آنسو گیس سے اور کبھی لاشیوں سے اور پھر گولیاں چلائی اور ٹینک چڑھائے جانے لگتے ہیں۔



لیکن جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا لفظوں کا کھیل بھی بدلتا گیا۔ ان دو لفظوں، شریک اور غدار کا مجموعہ ”دہشت گرد“ وجود میں آ گیا۔ پہلے دونوں لفظ حکمرانوں کے کثرت استعمال سے اپنی حیثیت گنوا بیٹھے تھے۔ اس نئے لفظ نے ان میں جان ڈال دی۔

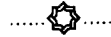
لفظ تو بدل گیا لیکن راہ چلتے راہ گیروں، خواجہ فروشوں، رکشے والوں، موٹر سائیکل سواروں، عام سیاسی کارکنوں اور بے یار و مددگار لوگوں کو دہشت گرد کا لقب دے کر گرفتار کرنے کا انداز نہ بدلا۔ جس گھر میں ایک مخصوص حلیے کے لوگ ہوں، مسجد میں جاتے ہوں، اللہ کا نام کثرت سے لیتے ہوں انہیں کتنی آسانی سے ”دہشت گرد“ بنایا جاسکتا ہے۔ آپ ان کے حلیے تو دیکھیں طالبان لگتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں دیکھیں، گھر میں ہوتے ہی نہیں، ان کو پکڑو اور بند کر دو خود بخود امن ہو جائے گا۔ کوئی بستی ایسے لوگوں پر مشتمل ہو تو گھبرا ڈال دو، راستے مسدود کر دو، فائرنگ کر کے لاشیں دکھا دو اور پھر کسی پر غیر ملکی کی پناہ کا الزام لگا دو یا پھر کسی کو دہشت گرد کہنے کی دیر ہے، سرکاری فائلوں، اخبار کی سرخیوں اور میڈیا کی لہروں پر تکرار انہیں خود لوگوں کی نظروں میں دہشت گرد ثابت کر دے گی۔ لیکن کوئی اس بات کا ادراک ہی نہیں کرتا کہ وہ جس شخص کو پکڑ کر لے جا رہے ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کی خاطر روٹی روزی کمانے والا محنت کش ہے جو اگر جیل سے لوٹا جہاں وہ بے قصور چلا گیا تھا تو پھر اسے کوئی بھی محبت وطن نہیں بنا سکے گا۔ اس کی نفرت بالکل اس بنگالی شخص کی طرح ہوگی جس کا قصہ ایک شخص نے سنایا تو مجھے لطیفے کے انداز میں لگا تھا لیکن میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

اس نے کہا میری ڈیوٹی ڈھاکہ میں تھی۔ ہم روز رات کو لوگوں کو پکڑنے نکلتے۔ ایک جھونپڑی پر دستک دی۔ دھوٹی بنیان میں ایک شخص باہر نکلا۔

ہم نے تھپڑ مار کر کہا: ”چلو! جئے بنگلہ والا، غدار، انڈیا ایجنٹ!“

اس نے روتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا صاحب! ہم جئے بنگلہ والا نہیں ہے، ہم غدار نہیں ہے، ہم انڈیا کا ایجنٹ نہیں ہے۔ ہم مسلمان ہے، ہم پاکستانی ہے، ہم پنجابی ہے۔

ایسا شخص جیل کی چکی پیس کر واپس فاقہ زدہ گھر میں لوٹے گا تو اس سے محبت کے پھولوں کی کون توقع رکھے گا؟؟؟



## قوموں کے زوال کا کارگر نسخہ

(03 محرم 1426ھ بمطابق 03 فروری 2006ء)

یہ تو وہی خطہ ہے جسے مشرق اقدار کی معراج تصور کیا جاتا تھا۔ جن کے ہاں خاندان، ماں باپ، بہن بھائی اور میاں بیوی کے رشتوں کی تقدیس پوری دنیا میں مثالی سمجھی جاتی تھی۔ ایسی ماں کہ پورے کنبے کو پہلے کھلاتی اور آخر میں خود کھاتی۔ گھروں کے درجوں میں محبتوں کے زمرے بہتے۔ پورے یورپ یا امریکا سے اگر کوئی شخص اس خطے کی لڑکی بیاہ لاتا تو لوگ اس پر رشک کرتے، اسے خوش قسمت سمجھتے۔ یہی باتیں ہوتیں کہ ایسی وفا شعار بیوی اس کھنڈر سے اور وفا تو قاتل ساتھی بدلنے والے شخص کے نصیب میں کیسے آگئی؟

مجھے چالیس کی دہائی کا ”نام“ رسالے کا وہ ٹائٹل نہیں بھولتا جس میں ایک امریکی خاوند اپنے گھر لوٹا ہے اور اس کی بیوی جو اس خطے سے تعلق رکھتی ہے نیچے بیٹھی اس کے جوتوں کے تے کھول رہی ہے۔ اس لمحے میں اس خاوند کی آنکھوں میں نچھاور ہو جانے والی جو محبت ہے اس سے یوں لگتا ہے کہ اگر یہ خاتون اعلان کر دے کہ یہ امریکی میرا زور خرید غلام ہے تو وہ پوری دنیا میں اس کا اعلان کرنے میں اپنا اعزاز سمجھے گا۔

وہ خطہ جس نے سب سے پہلے کاغذ ایجاد کیا۔ جو اسلامی دنیا کی آخری سرحدوں کا شجر کا امین ہے، جس کے بارے میں میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔“

جس نے پوری دنیا میں سب سے پہلے ایک مضبوط بیوروکریسی جیسے مینڈرینز (Mandrins) کہتے تھے کی بنیاد رکھی۔ یہ ملک مدتوں شہنشاہیت کے زیر تسلط رہا لیکن اس قوم کے غربت و افلاس کے مارے ہوئے لوگ اپنی اقدار اور شرم و حیا نہ بھولے۔ یورپ کے ہم جو کاروباریوں اور نیم فوجی بحری قزاقوں نے اس کو زیر نگین کرنا چاہا ممکن نہ ہو سکا۔ یہ لوگ بدھ اور کنفیوشیسن کے اصولوں کی رہنمائی میں زندگیاں گزارتے رہے۔

پھر وہ دور آیا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ”گراں بار چینی سنہلنے لگے۔“ پوری مغربی دنیا سے کٹا ہوا لیکن ان سب کے مقابلے میں سرخرو اور ڈٹا ہوا ملک جس کی مدد نے ویت نام سے امریکیوں کو جینیں مارتے ہوئے بھاگنے پر مجبور کیا۔ نظریہ، انقلاب، عام آدمی کی زندگی کی بہتری چینی قوم کو دنیا کے سامنے سرخرو کرنا سب ممکن ہو گیا۔ حالانکہ مغرب کی ٹیکنالوجی اور سائنس سب کے دروازے اس چین پر بند تھے لیکن ایک دن ایسا آیا کہ بیکی چین، سیکورٹی کونسل کے ان پانچ ممبروں میں شامل کر لیا گیا جنہیں ویتو کا حق تھا۔ یہ سب ہونے کے باوجود ان لوگوں نے اپنے دروازے مغربی اقدار اور کلچر کے لیے نہیں کھولے کہ انہیں اپنی حیثیت اور شرم حیا زیادہ عزیز تھی۔

یہ ملک آج بھی ان تمام طاقتوں کی آنکھوں میں کھلتا ہے جن کی ساری بنیادیں، سرمایہ، منافع، کارپوریٹ

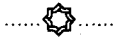
اس صحافی خاتون کو مغرب کے پریس اور انٹرنیٹ نے بہت ابھارا ہے۔

اس خاتون کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مرد ساتھیوں کا ریکارڈ نہیں رکھتی کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اسے یورپ میں رول ماڈل بنانے اور چین کے نوجوانوں کو ترغیب دینے کے لیے ایک ویب سائٹ پیرس ہلٹن نے پیش کیا جسے صرف 25 منٹ میں 50 ہزار لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کیا۔

اس کیفیت میں خاندان کے ادارے پر کیا بیتی؟ وہ چین جہاں طلاق کا لفظ بہت کم سننے کو ملتا تھا وہاں پر طلاق کا تناسب سب سے زیادہ ہے اور نوجوانوں میں ایڈز کی شرح بھی پورے ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی خاتون صحافی کے مطابق چین کے نوجوان نہ ترقی کی باتیں سنتے ہیں اور نہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر بحث کرتے ہیں نہ عالمی حالت پر، انہیں کارمیت سے ہی فرصت نہیں ہے۔

جب نوجوانوں پر یہ جنون چڑھتا ہے تو پھر انہیں کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی۔ وہ بے خبر ہو جاتے ہیں کہ ان پر کون حکومت کر رہا ہے؟ کس سے جنگ ہے؟ کون ترقی کر رہا ہے؟ کس کی عزت و تکریم کرنی چاہیے؟ کس کی لاش تڑپتی ہے؟ کون مرتا ہے؟ ایک دھن سوار ہوتی ہے، لذت اور آسودگی کی دھن اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عورت گھر کی چار دیواری میں ہے۔ اسے گھر کی چار دیواری سے آزاد کر دو پھر جیسے چاہے پاگل بنا دو۔

یہ صدیوں پرانا ہتھیار ہے قوموں کو زوال پذیر کرنے کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ لیکن پہلے لوگ اسے غدار کی تربیت سمجھتے تھے۔ ایسا کرنے والے کو ملعون کہتے تھے..... لیکن آج انہیں کہتے ہیں تم تو انسانی حقوق کی علمبردار ہو۔ آزادی کا مجسمہ ہو، یہ سب تو تمہارا حق ہے، تمہارا مرتبہ ہے، فن کی معراج ہے، انسانیت کی قدر و منزلت ہے۔ ایسا دھوکہ جو میٹھی گولیوں میں زہر بھر کر دیا جا رہا ہے۔



کچلر اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری پر استوار ہیں، لیکن اس راستے پر بھی چین کو شکست دینا ممکن نہ ہو سکا۔ ان کے ہاں تو طویل محنت اور مشقت کی ایسی عادت تھی کہ سو ڈالر کی قیمت والی چیز وہ ایک ڈالر میں مارکیٹ میں لے آئے۔ یورپ حیران تھا کہ کیسے لوگ ہیں جن میں منافع خوری اور امیر ترین لوگوں کا لائف اسٹائل نہ آسکا۔ یہ منافع کی دوڑ میں عام آدمی کی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہوئے۔

ان کی تمام مصنوعات ایسی ہوتی ہیں اور اتنی کم قیمت ہوتی ہیں کہ اسے عام آدمی خرید سکتا ہے۔ ایسا ہوا تو ایک دن یہ وہ سب کچھ غریب آدمی کی دہلیز پر لاسکتے ہیں جو صرف امیروں کی دسترس میں ہے۔ نہ ان سے صنعت کے میدان میں لڑا جاسکتا ہے اور نہ ہی انہیں مغرب کی بالادستی سے مرعوب کیا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ اپنی قدیم ترین زبان اور رسم الخط پر بھی فخر کرتے ہیں۔

جب تمام محاذ پر شکست لازمی ہو تو مضبوط قوموں کو تباہ کرنے کا ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ ان سے ان کی شرم و حیا اور خاندانی افراد چھین لو۔ حقوق نسواں کے نام پر، عورت کی آزادی کے نعرے پر مضبوط خاندانی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجائی جاسکتی ہے۔ جب یہ ادارہ ٹوٹتا ہے تو چاروں جانب۔ بے راہ روی کا سیلاب آ جاتا ہے۔ پھر مغرب کی جیبیں گرم کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری جو جنس کے کاروبار سے منسلک ہے اپنا راستہ خود بنالیتی ہے۔ یہ اس ٹوٹے ہوئے خاندان میں فیشن کے نام پر داخل ہوتی ہے اور ذلت کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے۔

یہی وہ چال تھی جس کے تحت 1995ء میں چین میں حقوق نسواں کی عالمی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اسے اس جال میں پھنسا دیا گیا کہ جیسے وہ دنیا کے لبرل ممالک کی راہ پر چل پڑا ہے۔ لالچ کی اسی رہگذار پر چلانے کی کوشش میں اس ملک کو اربوں ڈالر منافع والے مقابلہ حسن کروانے کی بھی پیشکش ہوئی۔ مقابلہ حسن تو ہو گیا لیکن چین پر آج جو بیت رہی ہے اس کا حال آنسو لانے کے لیے کافی ہے۔ جن کی ذاتی زندگیاں پرانے مذہبی اصولوں پر مبنی تھیں ان کی حالت گزشتہ سات بڑے شہروں میں کیے جانے والے سروے سے عیاں ہے۔ ایک خوفناک بحران ان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔

رپورٹ کے مطابق 14 سے 20 سال کی عمر کی بچیاں اب مردوں سے جسمانی تعلق رکھنے میں کوئی شرم و عار نہیں سمجھتی۔ صرف بیجنگ شہر کے 70 فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ شادی سے پہلے کئی خواتین اور مردوں سے جسمانی تعلقات رکھتے تھے۔ یعنی نہ خاندان کی حیا باقی رہی اور نہ ہی شرم کا دامن ہاتھ میں رہا۔ نئی نسل نے بتایا کہ ہمارے والدین تفریح کے طور پر انقلابی فلمیں دیکھتے تھے اور ہم یورپ میں بننے والی اخلاق کو خراب کرنے والی بلیو فلمیں دیکھتے ہیں۔ شنگھائی شہر میں اسقاط حمل کروانے والی عورتوں میں 65 فیصد غیر شادی شدہ کم سن بچیاں تھیں۔

وہ چین جہاں آج بھی اخلاقی اور معاشرتی طور پر بغیر شادی کے اولاد ایک طعنہ ہے وہاں ان بچیوں کو اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ملتا، لیکن مغرب کا لٹریچر اور فلمیں پہنچ رہی ہیں جہاں شادی کے بغیر پیدا ہونے والے بچوں کو عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

انسانی حقوق اور آزادی نسواں کے نام پر چین کو جہان نہ دے کر تعلیمی نصاب میں جنسی تعلیم کو شامل کیا گیا۔ رپورٹیں یہ ہیں کہ آج بھی بڑی عمر کی استانیاں اور استاد کتابوں سے یہ ورق پھاڑ دیتے ہیں لیکن اسکول سے باہر ان بچوں کو ایسا مواد وافر مقدار میں مہیا کر دیا جاتا ہے۔ پورے چین کے نوجوانوں کی رول ماڈل ایک صحافی خاتون ہے۔

ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم اعتماد کے ساتھ آزادی کے دشمنوں کا پیچھا کرتے رہیں یا پھر ایک آسان زندگی کی طلب میں اپنی ذمہ داریوں سے پیچھے ہٹ جائیں۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہمیں دنیا کی معیشت کا لیڈر بننا ہے یا پھر اپنے دروازے بند کر کے بیٹھ رہنا ہے۔

اس چیلنج کے مرحلے پر علیحدگی اور خول میں بند ہو کر سمٹنا اچھا لگتا ہے لیکن یہ دنیا خطرات اور موت سے بھری ہوئی ہے۔ اپنے لوگوں کے تحفظ، امن اور منزل مقصود کے حصول کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم دنیا کی قیادت اپنے ہاتھ میں رکھیں اور امریکہ ایسا کرتا رہے گا۔

بیرونی دنیا میں امریکہ ایک تاریخی اور طویل المیعاد مقصد کے حصول کی جنگ لڑ رہا ہے ہم اس دنیا سے وحشت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ اس مقصد کو ایک بھٹکا ہوا تخیل سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں امریکہ کی آئندہ سیکورٹی اسی جنگ پر منحصر ہے گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد ہم نے دیکھا، کیسے ایک ناکام اور جبر پر مبنی ریاست جو ہم سے سات ہزار میل دور تھی، ہم پر موت اور تباہی مسلط کر گئی۔

آمریت، دہشت گردی کو پناہ دیتی ہے، نفرت کو پروان چڑھاتی ہے اور تباہی کے ہتھیار حاصل کرتی ہے جبکہ جمہوریت نفرت کی جگہ امید پیدا کرتی ہے شہریوں کے حقوق کا تحفظ اور ہمسایوں کا احترام سکھاتی ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ آزادی کی طرف اٹھایا گیا ہر قدم ہمارے ملک کو محفوظ بنائے گا اور ہم علی الاعلان آزادی کے اس مقصد کے لیے لڑتے رہیں گے۔

2006ء کے آغاز میں آدھی سے زیادہ دنیا کی اقوام جمہوریت کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ شام، برما، زمبابوے، شمالی کوریا جیسے ممالک میں لوگ آزادی سے محروم ہیں۔ انصاف اور دنیا کے امن کا تقاضا ہے کہ ان لوگوں کو بھی آزادی دی جائے۔ کوئی بھی آزادی کی جیت سے انکار نہیں کرتا لیکن کچھ لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ ان میں ایک بنیادی اور اہم مخالفت کا ذریعہ شدت پسند اسلام ہے۔

چند لوگوں نے اس خوبصورت عقیدے کو موت اور دہشت گردی کی اکائی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اسامہ بن لادن جیسے دہشت گرد وسیع پیمانے پر موت میں سنجیدہ ہیں اور ہمیں بھی ان کی ان دھمکیوں کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ وہ اپنے اس بے رحم سسٹم کو پورے مشرق وسطیٰ میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی موت کے ہتھیاروں سے لیس کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عراق پر قبضہ حاصل کریں اور پھر اسے اپنی محفوظ پناہ گاہ بنا کر امریکہ اور پوری دنیا پر حملہ کریں۔

ان کے پاس فوجی طاقت نہیں ہے اس لیے وہ خوف کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ ہم کبھی بھی اپنی جنگ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور اپنے آپ کو اپنی سرحدوں تک محدود نہیں کریں گے۔ اگر ہم نے ان کے حملوں کو تنہا چھوڑ دیا تو وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑیں گے بلکہ وہ ہمارے ملک کو میدان جنگ بنالیں گے۔ پسپائی میں امن نہیں ہو سکتا اور پسپائی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ شدت پسند اسلام کو آگے بڑھنے اور دنیا کو خود اپنا دفاع کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تو یہ ایک اشارہ ہو گا کہ ہم اپنے آدرشوں اور جرأت پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ہمارے دوست اور دشمن سن لیں کہ ہم دنیا میں پسپائی اختیار نہیں کریں گے اور شیطانییت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

## خوف، دلا سے، دھمکیاں، الفاظ کی جادوگری

(11 محرم 1426ھ بمطابق 10 فروری 2006ء)

واشنگٹن شہر کے بچوں کا ایک ہی قطار میں چار اہم عمارتیں اور یادگاریں ہیں۔ ان یادگاروں کے ساتھ پنوک دریا بہتا ہے اور دریا کے کنارے ایک بہت بڑا قبرستان ہے جس میں امریکی فوجیوں کی بڑی تعداد دفن ہے جو دنیا کے مختلف خطوں پر غلبے کا خواب لے کر گئے اور زندہ واپس نہ لوٹ سکے۔ قبرستان سے دریا کے اس پار ابراہیم لنکن کی یادگار اور مجسمہ ہے جہاں پر کھڑے ہوں تو سامنے باقی تین عمارتیں نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے وہ دیوار ہے جس پر ان ساٹھ ہزار سپاہیوں کے نام درج ہیں جو دیت نام جنگ میں مارے گئے، پھر امریکہ دلت ورسوائی سے وہاں سے نکلا۔ اس کے بعد ایک طویل پارک میں واشنگٹن مانیومنٹ کا مینار ہے اور آخر میں ایک بہت بڑے گنبد والی کپیتل ہل کی عمارت ہے جس میں امریکی کانگریس کے ارکان بیٹھے ہیں۔ 31 جنوری 2006ء کی صبح اس عمارت میں طاقت، تکبر، غرور اور گھمنڈ کے نشے میں چور ایک شخص کی آواز گونج رہی تھی جو پوری دنیا میں اپنی بڑائی کا اظہار کر رہا تھا اور دنیا کا نقشہ اپنے ارادوں اور عزائم سے ترتیب دینے کا اعلان کر رہا تھا۔

گزشتہ 5 سال سے مسلمانوں کے خطوں پر وحشت و بربریت کا قصہ برپا کرنے والا جارج بوش..... اس کی تقریر میں تکبر بھی تھا اور طاقت کا نشہ بھی..... لیکن آپ کو اس میں ایک ایسے شخص کی گفتگو کی جھلک بھی نظر آئے گی جو اپنی دستک د کام ہوتی مہوں پر قربانی اور انسانی ہمدردی جیسے لفظوں کا پردہ ڈال رہا ہو جسے اپنے دفاع میں لفظ نہ ل رہے ہوں تو ہوشکے دعوؤں کی کہانی بیان کرنے لگے یہاں میں نے اس تقریر کے تمام حصوں کا ہوبو ترجمہ کر دیا ہے جو دنیا میں اس کی طاقت کے استعمال اور استعاریت کے خوابوں سے متعلق ہیں اس کے الفاظ امت مسلمہ کے لیے ایک لمحہ فکر یہ ہیں اور خوابیدہ امت کی بیداری کا نثار بھی۔

”آج ہم نے ایک محبوب، جرأت مند اور عظیم عورت کو کھو دیا ہے جو امریکہ کو اس کے آدرشوں اور خوبصورت خوابوں سے جڑا دیکھنا چاہتی تھی اور آج اس اسٹیٹ آف یونین کے ارکان کے ساتھ اس کا خاندان بھی موجود ہے۔ ہم اس خاتون کی ریٹائٹلنگ کی اچھی زندگی کے ممنون ہیں۔ (یہ عورت عراق کی زمین پر ہلاک ہوئی) ہر دفعہ جب بھی میں اس اسٹیج پر اس کپیتل ہال میں آیا مجھے اس اعزاز پر تشکر کا احساس رہا اور میں اس تاریخ کو بھی اپنے سامنے رکھتا رہا جو میں اور آپ مل کر دیکھ رہے ہیں۔ آج ہم یہاں ایک قومی سوگ اور قومی فتح کے لمحات میں جمع ہیں ہم نے امریکہ کی ان نتائج خیر لمحوں میں خدمت کی ہے اور یہ میرا اعزاز ہے کہ میں آپ کے ساتھ یہ خدمت انجام دے رہا ہوں۔

یہ سال ایک فیصلہ کن سال ہے۔ آج ہمیں مل کر اپنے ملک کے مستقبل اور اس کے کردار میں فیصلہ کرنا ہے

تاریخ کتابوں میں لکھی جائے اسے جراتوں سے لکھا جاتا ہے اور ہم اپنے پہلے والے امریکیوں کی طرح جرأت دکھائیں گے اور اختتام تک لے جائیں گے۔“

تقریر کے یہ حصے وہ ہیں جو جارج بش اور اس کے ساتھیوں کے عالمی منظر نامے کو تبدیل کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے سامنے دشمن صرف ایک ہے۔ وہ امت مرحوم جس کے دامن میں ابھی تک چنگاریاں سلگتی ہیں، جس کی امیدوں کی راکھ ابھی سرد نہیں ہوئی، جس کے وجود سے آج بھی ہدایت کی مشعل اور جانوں کا نذرانہ دینے والوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔ جب تک اس امت میں اشک سحرگاہی سے وضو کرنے والے، رضا الہی کے حصول کے لیے جان دینے والے موجود ہوں تو پھر دنیا پر بڑائی کا دعویٰ کرنے والا کوئی بھی شخص، اندر سے ایسے ہی خوفزدہ ہوتا ہے۔



امریکہ علیحدہ رہنے کی جھوٹی آسانشوں کو مسترد کرتا ہے۔ ہم وہ قوم ہیں جس نے یورپ کو آزادی دلائی اور جمہوریت کو پروان چڑھایا اور ایک شیطانییت والی سلطنت کو ختم کیا۔ ہم ایک بار پھر تاریخ کی اس پکار پر حاضر ہیں اور دنیا کو امن کے راستے پر ڈالیں گے۔ ہم دہشت گردی کے نیٹ ورک پر بڑھ چڑھ کر حملے کرتے رہیں گے۔ ہم نے ان کے بہت سے لیڈروں کو گرفتار اور قتل کیا ہے اور باقیوں کا دن بھی آجائے گا۔

ہم افغانستان میں بھی جارحانہ رویہ جاری رکھیں گے اور ہم عراق میں بھی اسی جارحانہ طریقے سے اپنی فتح پر گامزن ہوں گے۔ ہمارا کام عراق میں بہت مشکل ہے کیونکہ ہمارا دشمن وحشی ہے لیکن اس دہشت نے وہاں جمہوریت کی ترقی کو نہیں روکا۔ ان تین سالوں میں یہ قوم آمریت سے آزادی و حاکمیت، آئین اور قومی انتخاب تک آپہنچی ہے۔ اس دوران ہماری اتحادی افواج نے دہشت گردی کے مراکز ختم کیے، ان کی آمد روکی اور علاقے کو عراقی سکیورٹی فورسز کے حوالے کیا۔

فتح کا راستہ ہی ہمارے فوجی جوانوں کے گھروں کو واپسی کا راستہ ہے۔ جیسے ہی ہم نے فتح حاصل کر لی اور عراقی اس قابل ہونے لگے کہ عراقی افواج اپنا ملک خود سنبھال لیں تو ہم اپنے دستوں کی تعداد کم کر دیں گے لیکن خیال رہے کہ یہ فیصلہ ہمارے فوجی کمانڈر کریں گے، واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے سیاستدان نہیں۔

اگر ہم عراق سے فوراً نکل گئے تو اسامہ بن لادن اور زرقادی جیسے لوگ اس اہم ملک پر قبضہ کر لیں گے اور ہمارے اتحادی یا تو مارے جائیں گے یا جیل میں ہوں گے۔ ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے ہم اپنے وعدے کا پاب کر کریں، اپنے دشمنوں کو شکست دیں اور اپنی افواج کے ساتھ کھڑے ہوں۔ ہمارے فوجی جوان اور عورتیں قربانیاں دے رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ ہر طرف خوف ہے، گلی گلی اور گھر گھر جا کر لڑنا، صحرائی دھوپ میں موٹا لباس پہننا، اپنے ساتھی کو اپنے سامنے مرتے دیکھنا، جو اس کی قیمت جانتے ہیں وہی یہ بازی لگاتے ہیں۔

ایسا سب ایران کے لیے بھی ہے۔ یہ قوم چند لوگوں کے ہاتھوں میں ریغمال بنی ہوئی ہے جس نے لوگوں کو دکر رکھا ہوا ہے یہ حکومت فلسطین اور لبنان میں دہشت گردی کی پشت پناہی کرتی ہے اور اب اسے ختم ہونا چاہیے۔ پوری دنیا سے ایٹمی طاقت کے حصول کے معاملے میں انکار کر رہی ہے اور دنیا کو اسے ایٹمی ہتھیار حاصل کرنے سے روکنا چاہیے میں ایران کے عوام سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتا ہوں ہم تمہاری اور تمہارے ملک کی عزت کرتے ہیں اور تمہاری آزادی کی جدوجہد کی بھی عزت کرتے ہیں۔ ہماری قوم امید کرتی ہے کہ جب تم اپنی آزادی حاصل کر لو گے ایک آزاد جمہوری ایران کے ساتھ ہمارے دوست ہو گے۔

دہشت گردوں کے ہر علاقے سے نیٹ ورک ختم کرنے اور عراق میں فتح تک، ہمیں اپنے دوستوں اور اتحادیوں کی مدد چاہیے۔ ہماری ایک پوری نسل اس طویل المیعاد جنگ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ ہم نے اس جنگ میں لیڈر بننے کا کردار ادا کیا ہے کیونکہ یہ ہمارے آدرشوں میں شامل ہے۔ ہماری معیشت مضبوط ہے لیکن ہم اتنے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ آج کی بدلتی دنیا میں ہمیں چین اور بھارت جیسی ابھرتی ہوئی معاشی طاقتوں کا سامنا ہے جس سے ایک خطر ہمارے لوگوں کے دلوں میں ضرور اٹھتا ہے۔ آج اس معاشی جنگ کے لیے بہت ساری ریٹائرمنٹ کا اعلان کروں گا۔

میرے ہم وطنو! ہمیں اس نتائج خیز دور میں قیادت کے لیے پکارا گیا ہے ہم بڑے نظریات کی جنگ میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ ایک بہت اہم موڑ اور ایک نادریدہ ساحل کی طرف مڑ رہی ہے اس لیے کہ



سب کی مصنوعات ہمارے لیے ایک جیسی ہیں۔ سب سے تعلقات ہمارے جذبہ حب رسول ﷺ کے منافی ہیں۔ حیرت ہے کہ جو امت یہ دعویٰ کرتی ہو کہ مجھے سرکارِ سید الانبیاء ﷺ اپنے ماں باپ سے زیادہ عزیز ہیں ان کے

امریکہ نے ذرا ایران کے بارے میں یورپ کے ممالک کی مدد کی تو اسے ایران پر حملہ کرنے کے بارے

حکمرانوں سے ان کے مقتدر سیاستدانوں سے اہل ارباب بست و کشاد سے کوئی سوال کرے کہ اگر آپ کے ماں باپ کا کارٹون اس طرح مضحکہ خیز بنایا جائے تو کیا آپ ایسے شخص سے گفتگو کریں گے؟ اس کی دکان سے سودا خریدیں گے؟ اس سے دوستی کا رشتہ رکھیں گے؟

شاید اس کا جواب ہی یہ فیصلہ کر دے گا کہ ہمیں آپ ﷺ سے کتنی محبت ہے کہ آپ نے فرمادیا: ”اس میں ایمان نہیں جس میں میری محبت نہیں۔“

کوئی ہے.....؟

(25 محرم 1426ھ بمطابق 24 فروری 2006ء)



اور یہ سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ واضح طور پر کھل کر سامنے آ گئے۔ دنیا بھر میں مافیا کا ایک اصول ہے کہ کسی ایک فرد یا گروہ کے خلاف حملہ یا کریک ڈاؤن تمام گروہوں پر حملہ تصور ہوتا ہے۔ آپ جنوبی امریکہ کے ساحلوں سے تھائی لینڈ کے جنگلات تک جہاں کہیں بھی منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو دیکھیں، یوں تو وہ سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں لیکن کاروبار علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں..... مگر جیسے ہی کسی ایک خطے کے کاروبار پر زد پڑنے لگتی ہے یہ سب اپنی توانائیاں اور وسائل اس خطے میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے کاروبار کو بچانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

مخالفین کو قتل، آواز اٹھانے والوں پر تشدد اور حکومتوں کو گرانے کے لیے تحریکوں تک کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ دنیا اس طرح کی مافیا کارروائیوں سے آشنا ہے اور بار بار تجربہ کر چکی ہے لیکن اس دفعہ یہ کاروباری گروہ نہیں بلکہ حکومتیں اکٹھی ہوئیں، یورپی یونین کے ہیڈ کوارٹر برسلز میں۔ مسئلہ تھا ڈنمارک کے اخبار میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے توہین آمیز کارٹون پر امت مسلمہ کے رد عمل کا۔ سب نے بیک زبان ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا:

”ہم ڈنمارک کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی مذمت کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ڈنمارک کے خلاف کی گئی کوئی بھی کارروائی پورے یورپ کے خلاف تصور کی جائے گی۔“

ٹکڑوں، ٹکڑوں اور خانوں میں بنی امت مسلمہ کے کاسہ لیس حکمرانوں کے لیے شاید یہ مشترکہ اعلامیہ حیرت کا باعث ہو کہ وہ تو اپنے اپنے علیحدہ علیحدہ دوست اور الگ الگ آقا رکھتے ہیں۔ کسی کو کاروباری اور معاشی سطح پر کوئی پیارا ہے اور کسی کو کوئی اور عزیز..... لیکن میری حیرت اور مایوسی مجھے دسمبر میں ہونے والی اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں لے جاتی ہے جہاں تمام مسلم ممالک کے سربراہ ایک اللہ کے گھر میں جمع ہوئے۔ وہ سر زمین جس کی گلیوں سے اس پیغمبر برحق ﷺ نے پیغام توحید سنایا اور آج دنیا میں اس کی ذات ریکم حملوں کی زد میں تھی۔ یہ سارے حکمران جو اس رسول رحمت ﷺ کی امت میں سے ہونے کے دعوے دار تھے وہاں جمع تھے۔

کارٹون شائع ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ وہ مسلمان جو ڈنمارک میں رہتے تھے اس پر سراپا احتجاج تھے۔ ڈنمارک کا ایک 28 سالہ مسلمان نوجوان احمد آکادی ان کا ترجمان تھا۔ ڈنمارک میں موجود 27 مسلمان تنظیموں نے تحفظ ناموس رسول ﷺ کے نام پر ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ ان لوگوں نے ڈنمارک کے سترہ ہزار مسلمانوں کے دستخط سے ایک قرارداد وزیراعظم تک پہنچائی، وہاں کے وزیر ثقافت سے ملاقات کی، اخبار کے ایڈیٹر سے ملے لیکن ان سب نے انہیں ذرہ برابر بھی حیثیت نہ دی۔

## ہمارے مجرم..... ہمارے حوالے

(02 محرم 1426ھ بمطابق 03 مارچ 2006ء)

بالآخر اسے 11 نومبر 2005ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ یوں تو وہ برطانیہ کا شہری ہے لیکن آسٹریا کی ایک عدالت جو اس کے جنوبی صوبے سٹریا کے ایک شہر میں واقع ہے۔ اس نے 1989ء میں اس کے وارنٹ نکالے تھے۔ اسے ایک نامور تاریخ دان کی حیثیت سے وہاں بلایا گیا جہاں اس نے دو تقریروں کے دوران دنیا کے سب سے بڑے افسانے کے طور پر یہودیوں کے قتل عام کو پیش کیا۔

اس نے کہا کہ مجھے کہیں آشوٹز (Auschwitz) کے گیس چیمبر کے بارے میں کوئی شواہد نہیں مل سکے۔ اس نے کہا کہ میں دلیل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس گیس چیمبر میں اتنے بھی لوگ نہیں مرے جتنے ایڈورڈ کینڈی کی کارکی کچھلی سیٹ پر مرے تھے۔ دنیا بھر میں اس گیس چیمبر والے کمپ سے بچ نکلنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے نئی کہانیوں اور نئے افسانوں کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

میراجی چاہتا ہے کہ میں ایسے لوگوں کو جو یہودی قتل عام کے افسانے گھڑتے ہیں اور دنیا کے دیگر جھوٹوں کی تنظیم بناؤں جنہوں نے پوری دنیا کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔

یہ شخص ڈیوڈ ارونگ ہے جسے اس عدالت نے نفرت پھیلانے کے جرم میں تین سال کی سزا سنائی ہے۔ 20 فروری 2006ء کو اپنے فیصلے میں عدالت نے نہ تو اس کی تحقیق کی سچائی پر کوئی بحث کی اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے کیونکہ ایسا کرنا عدالت کے لیے ناممکن تھا۔ ارونگ دلائل و شواہد کے ساتھ موجود تھا اور سامنے صرف یہودی میڈیا میں پھیلا ہوا پروپیگنڈہ تھا۔ اس نے یہی کہا کہ یہ ایک نسل پرست نفرت پھیلانے والا شخص ہے اور یہ ہمارے قانون میں جرم ہے۔

یہ ارونگ کے لیے پہلا مقدمہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ پہلا ملک تھا جہاں اسے سزا سنائی گئی ہے۔ 1992ء میں جرمنی کے ایک جج نے اسے چھ ہزار ڈالر جرمانہ کر دیا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ عوام کے سامنے بحث کے دوران اس بات پر ڈٹا ہوا تھا کہ نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکت ایک من گھڑت کہانی ہے۔ اس نے امریکہ میں اپنے خلاف لکھے ہوئے ڈیبرالپ سٹیڈیٹ کے مضمون کے خلاف مقدمہ کر دیا۔

جج چارلس گرے نے وہاں پر بھی تاریخ کے شواہد پر کوئی بحث نہ کی۔ صرف دو لفظ دہرائے گئے ”وہ یہودیوں کے قتل عام کا منکر اور نفرت پھیلانے والا ہے۔“ اور اس کا مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ اس نے سارے معاملے پر تمیں سے زیادہ کتابیں تحریر کیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی کتابیں پہلے دن ہی دکانوں سے خرید لی جاتیں۔

یوں وہ دنیا میں زیادہ بکنے والا مورخ مشہور ہو گیا لیکن اس کی کتابیں سوائے اس کے کسی کو میسر نہ آئیں۔

یہ لوگ وہاں سے نکل کر ڈنمارک میں موجود تمام مسلمان سفارت خانوں میں گئے، تمام سفیروں سے ملے لیکن انہیں وہاں سے بھی مایوسی ہوئی لیکن یہ لوگ مایوس نہ تھے۔ ان کے سامنے مکہ کا او آئی سی کا اجلاس تھا۔ وہ اسی غلط فہمی میں تھے کہ امت مسلمہ کے حکمرانوں میں تحفظ ناموس رسالت ﷺ کا تھوڑا سا جذبہ ہی موجود ہوگا۔ کانفرنس بغیر کسی اعلامیہ بغیر کسی حکومت کے خلاف ناراضگی یا کسی بھی لائحہ عمل کے بغیر ختم ہو گئی۔

اب اس ”مافیہ“ کو یقین ہو گیا تھا کہ اس امت کے حکمران وہ بے حس ٹولہ ہے جس کے سامنے جیسا چاہے ویسا کر گزرو یہ کچھ نہیں کریں گے۔ اب ڈنمارک کے مسلمان یکا وتہا تھے لیکن انہوں نے پوری دنیا کی پچاس مسلمان تنظیموں کو خط لکھے اور انٹرنیٹ پر اس مہم کا آغاز کیا کہ وہ ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ اور سفارتی تعلقات منقطع کرنے کی ہم شروعات کریں۔

”مافیہ“ کو یقین تھا کہ کچھ نہیں ہونے والا۔ اب دس جنوری 2006ء کو ناروے کے اخبار نے سچجی کا اظہار کرنے کے لیے یہ کارٹون اپنے اخبار میں دوبارہ چھاپ دیے۔ حکمران اب بھی سوتے رہے لیکن امت کے غیور عوام جاگ چکے تھے۔ سعودی عرب، فلسطین، شام، لبنان میں غم و غصہ کا عالم عجیب تھا۔ عراق، افغانستان جیسے محکوم بھی سرکوں پر آچکے تھے۔ امت کی دہلی راکھ میں بھی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور آگ بھڑک اٹھی۔ طوفان اور سیلاب اپنا راستہ خود بنایا کرتے ہیں اور یہ راستہ بنتا چلا گیا۔ ایسے میں حکمرانوں کی زبانیں گنگ اور چہرے پر حیرت تھی۔

یہ کیسے ہو گیا، یہ تو مسور ہی تھی؟ سوال کرنے لگے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہ سب تو یورپ کا شاخسانہ ہے ہم بھی احتجاج کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔

تمہیں! یہ حکمرانوں کے احتجاج کا نہیں، شر کے مقابلے میں خیر کو اکٹھا کرنے کا وقت ہے۔ اظہار سچجی کا وقت ہے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ کیسے ہو؟ 2003ء اور 2004ء میں جب یورپ میں یہودیوں کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈے کے تھوڑے سے اشارے ملنے لگے تو پہلے تو انہوں نے یورپی ملکوں کو ڈانٹا۔ انہوں نے پریس کی آزادی کا بہانہ بنانے کی کوشش کی تو امریکہ سے انہیں خبردار کرنے کو کہا لیکن 19 جون 2004ء کو اسرائیل کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا کہ دنیا بھر میں یہودیوں کے خلاف نفرت پھیلانے والا اسرائیل کا مجرم ہے اور اسرائیلی حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اس ملک سے یہ مجرم حاصل کرے۔ اس وقت دو صحافی ارنسٹ زنڈل اور گرامر روڈلف امریکہ سے جرمن حکومت کے حوالے ہو چکے ہیں۔

جودہ نفرت پھیلانے (Hate Crime) کے تحت مقدمہ کا سامنا کریں گے اور پھر انہیں اسرائیل مانگے گا۔ کوئی ہے جو امت مسلمہ کی کسی پارلیمنٹ میں یہ بل پاس کروائے کہ توہین رسالت ﷺ کا مجرم ہمارا مجرم ہے، اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اس پر (Hate Crime) کے تحت مقدمہ چلائیں گے۔ کوئی ہے جو اسلامی سربراہی اجلاس میں شامل 39 اسلامی ملکوں میں کسی ایک سے یہ قانون پاس کروائے؟

ہے کوئی دعوے دار جو اسبلی کے فلور پر کھڑا ہو کر کہے: آؤ! آج ہم عشق رسول ﷺ کے دعوے کا اتنا ہی ثبوت دے دیں جتنا اسرائیل نے یہودیوں کے خلاف پروپیگنڈے کے مجرم کے بارے میں دیا ہے۔



## بتوں سے تجھ کو امیدیں

(09 صفر 1426ھ بمطابق 10 مارچ 2006ء)

تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے۔ یہ سرحد انگریزوں اور افغانوں کے درمیان گندک معاہدے کے بعد کھینچی گئی تھی۔ انگریز کو ایک جانب روس سے خطرہ تھا اور دوسری طرف اس کی افواج کو افغانستان کے غیور عوام کا سامنا تھا۔ اپنی پوری فوجی طاقت کے باوجود برطانیہ نہ تو وہاں قدم جماسکا تھا اور نہ ہی اسے پے درپے شکستوں سے نجات ملی تھی۔ اسی لیے بٹائے باہمی کے معاہدے کے طور پر ایک سرحد بنادی گئی جسے ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے۔ اس لائن کے دوسری جانب دشمن تھا اور اس طرف برطانیہ کے زیر نگیں ہندوستان جو کوئی انگریز کے خلاف لڑتا، بغاوت کرتا یا کسی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کرتا وہ ڈیورنڈ لائن کے اس پار جا کر پناہ حاصل کر لیتا۔

پھر ہندوستان تقسیم ہو گیا اور ایک جانب پاکستان اور دوسری جانب افغانستان آ گئے..... لیکن پوری ایک صدی کے قریب اس لائن کو صرف پرانے نقشوں ہی سے ناپا اور پرکھا جاتا رہا۔ پرانی فائلوں سے کام لیا جاتا رہا پھر ہوائی فوٹو گرافی سے اسے متعین کیا جاتا رہا۔ کسی بھی دور میں دونوں ملکوں میں محبت کا ایسا رشتہ ہی پیدا نہ ہو سکا کہ کوئی سروے ٹیم اس سرحد کی پیمائش کرے اور نقشوں کو از سر نو ترتیب دے لیکن صدی کے بالکل قریب 1996ء میں دوستی کا ایک ایسا رشتہ استوار ہوا کہ سروے آف پاکستان اس ڈیورنڈ لائن کی پیمائش اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کو نقشوں میں جگہ دینے کے لیے سرگرم ہو گئی۔

نئے دیہات، نئی آبادیاں، نئے چھوٹے چھوٹے ڈیم اور سڑکیں سب سروے کیے گئے اور نقشے مرتب ہوئے۔ یہ دور طالبان کا دور تھا۔ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کا کوئی مجرم، کارچور، قاتل یا مطلوبہ شخص افغان سرزمین پر پناہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا کرنا ان کے نزدیک ایک دوست ملک کے ساتھ غداری تھی۔

بڑے بڑے قوم پرستوں اور علیحدگی پسندوں کی پناہ گاہیں ختم ہو گئیں اور وہ بے نیل و مرام اور شرمندہ پاکستان میں لوٹ آئے۔ وہ سرحدیں جہاں سے روزانہ گاڑیاں چوری ہو کر افغانستان کے شہروں میں فروخت ہوتی تھیں، ایسے لوگوں کے لیے حرام ہو گئیں۔ جو کوئی اس جانب غلطی سے رخ کرتا پکڑا جاتا اور مسروقہ مال پاکستان میں اصل مالک کے حوالے کر دیا جاتا۔

لیکن اس دور اور دوستی کے اس ماحول پر دو طاقتوں کی نظر تھی۔ ایک مشرق میں بھارت اور مغرب میں امریکہ۔ وقت بدلا، گیارہ ستمبر کا واقعہ رونما ہوا۔ جنہیں ایک صدی کے بعد ملنے والی محبت کا پاس رکھنا تھا، عالمی طاقت اور اندرونی خوف سے ایسے بدلے کہ سارے تیر اپنے تراکش سے نکال کر دشمنوں کے حوالے کر دیے۔ میں ان لمبی کہانیوں

اس نے اس معاملے کو اپنی تحریروں میں اٹھایا کہ پریس اور آزادی اظہار کے سب سے بڑے دشمن خود یہودی ہیں لیکن جیسے ہی انٹرنیٹ وجود میں آیا اس کے خیالات اور اس کی تحریروں منظر عام پر آ گئیں اور دنیا بھر کے یہودی اس شخص کو سزا دلوانے اور اس حرکت کا مزا پکھانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے اور آج وہ آسٹریا کی ایک جیل میں نفرت پھیلانے کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے۔

ارونگ اکیلا نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے ہیں جو اس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں کہ انہوں نے یہودیوں کے اس جھوٹ کا پول کھولنے کی کوشش کی۔ گزشتہ پچاس سال سے دنیا بھر کے میڈیا، کتابیں، اخبارات، رسائل صرف ایک ہی کہانی بیان کرتے آئے ہیں کہ جنگ عظیم دوم میں جرمن افواج نے 60 لاکھ یہودیوں کا قتل عام کیا ہر نصاب کی کتاب اور تاریخ کے ماخذ میں ایسے درج کر دیا گیا ہے کہ اسے کھر چنا مشکل ہے۔

واشنگٹن شہر کے بچوں کا ایک عجائب گھر بنادیا گیا کہ لوگوں کے لیے ایک دستاویز موجود ہو۔ تمام ملک کے سکولوں کے بچے یا تو اسے آکر دیکھتے ہیں یا اس میوزیم کی فلمیں انہیں اسکولوں میں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اتنا شدید ہے کہ اس جھوٹ کو بچ بچھے والوں میں دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں کے ساتھ مسلمانوں کے رہنما بھی شامل ہیں۔ مہاتیر محمد جیسے مغرب سے نفرت کرنے والے نے بھی یہودیوں کے اس قتل عام کے بعد ان کے ابھرنے کو مثال کے طور پر پیش کیا۔

سالوں سے اس جھوٹ پر سے پردہ اٹھانے والے قید، سزاؤں، بدنامیوں، قتل کے حملوں اور پولیس کے تشدد سے گزر رہے ہیں وہ کسی ملک میں بستے ہوں، کسی ملک کے شہری ہوں اس سے کوئی غرض نہیں۔ کسی اور ملک کا یہودی ایک درخواست سے ان کے خلاف مقدمہ کر سکتا ہے کہ اس نے نفرت پھیلائی ہے۔

یہودیوں کے خلاف لوگوں کو ابھارا ہے اور پھر دنیا میں آزادی کا علمبردار برطانیہ اپنا شہری ڈیوڈ ارونگ ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ عالمی طاقت امریکہ اپنے ملک میں کینیڈا سے آئے ہوئے شخص ارنسٹ زینڈل کو جرمن عدالت کے سپرد کر دیتا ہے اور سب سے اہم یہ کہ اسرائیل میں ان لوگوں کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے کہ ایک دن ان کو وہاں کی عدالت میں بھی گھسیٹا جائے گا۔

یہ سب میں نے اس لیے بیان کیا کہ امت مسلمہ جس شخصیت سے عشق کرتی ہے، اپنی جان، مال، عزت، آبرو، ماں باپ، بیوی بچے سب قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہے، اس کے بارے میں توہین آمیز کارٹون چھاپنے والوں کو وہاں کی عدالت میں کون گھسیٹے گا؟

ہاں! ایک بات طے ہے کہ 57 مسلم ممالک جہاں جہاں انٹرنیٹ پر یہ کارٹون دیکھے گئے سب جگہ ایک مقدمہ درج ہو، نفرت پھیلانے کا اور پھر پوری مسلم امہ اسی طرح اپنے مجرم مانگے جیسے آسٹریا اور جرمنی کے یہودیوں نے مانگے تھے۔

وہ حکومتیں جو آج صرف معاشی بائیکاٹ سے اتنی خوفزدہ ہو چکی ہیں، جن کی معیشت تباہ و برباد ہونے کو آرہی ہے، صرف امت مسلمہ کی سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کی توہین کے مجرموں کو سزاوہ راستہ ہے جو دنیا بھر میں ثابت کر سکتا ہے کہ سوا ارب لوگ اکٹھے ہوں تو اس طوفان کا مقابلہ کتنا مشکل ہوتا ہے؟ یہ گھڑی ہے جب نیل سے تاجناک کا شفر مسلمانوں کے ایک ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔



لیکن معاہدے کے بعد ایک لاکھ میگا واٹ بجلی بنائے گا اور اس کے پاس موجود 130 ایٹم بم کسی بھی ایٹمی جنگ کے لیے کافی ہیں جو ہر معائنہ سے مستثنیٰ ہیں۔

وہ ملک جس نے ایک القاعدہ کارکن پکڑ کر نہ دیا، جس کی سرزمین سے کسی امریکی طیارے نے دوسرے ملک پر کوئی پرواز نہ کی نہ بم برسائے، جس کا ساتھ صرف اس لیے ہے کہ وہ ایک قدر مشترک رکھتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی، لیکن ہمارے ہاتھ کیا آیا؟ یہ شاید کوئی نہ بتائے نہ اظہار کرے، لیکن سب جانتے ہیں کہ جب تک ہم ایک کلمہ طیبہ کی لڑی میں پروئے ہیں، ایک امت کے نام نہاد شہری ہی سہی، مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں، ایسے میں ہم اپنوں سے غداری بھی کر لیں، اپنے قوانین، ماحول، اقدار، اخلاق سب کو ان کے سانچے میں ڈھال بھی لیں، ہمارا مقدر ایسی ہی ذلت، ایسی ہی رسوائی اور ایسی جگہ ہنسائی ہے اور رہے گی۔ جو معاہدہ بھی ہوگا ہمارے خلاف ہی ہوگا اور جو اتحاد بھی ہوگا ہمیں بچا دکھانے کے لیے ہوگا۔ ہم نے بتوں سے امیدیں لگا کیں تھیں ہمیں یہی کچھ ملنا تھا۔



کو دہرانا نہیں چاہتا کہ ہم نے چھ سو سے زیادہ لوگوں کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا، ہماری سرزمین سے 57 ہزار دفعہ جہاز اڑے اور انہوں نے نہتے افغانوں پر بمباری کی۔

ہم نے وہ تمام معلومات حوالے کر دیں جو ان کو زیر کرنے، نشانے لگانے اور تباہ و برباد کرنے کا کام آسانی سے کر سکتی تھیں۔ ہم خوش تھے کہ ہم بچ گئے ہمارا نام عالمی دنیا میں بلند ہو گیا۔ ہم دہشت گردی کی جنگ میں عالمی طاقت کے ساتھی بن گئے۔ دوسری جانب ہم نے عجیب و غریب توقعات وابستہ کر لیں۔ ہم نے سوچ لیا کہ اب ہم ایک بڑی طاقت کی پناہ میں آ گئے ہیں تو پھر وہ ہماری مشرقی سرحد کے دشمن بھارت کے مقابلے میں ہمیں اہمیت دے گا۔ ہماری دوست کا بھرم رکھے گا۔ اس عالمی قوت کو ہماری معلومات کی ضرورت تھی سو اس نے اپنی چکنی چڑی باتوں سے دوستی کی جتیاں استوار کرنے کی ترغیب دینی شروع کر دی۔ ہم بھی عجیب تھے ہم نے نہ صرف سرحد کھول دی بلکہ معاشرتی، اخلاقی، خاندانی اور مذہبی سرحدوں کو بھی روند ڈالا۔ طائفوں کا سفر شروع ہوا۔

ایک دھرتی، ایک گیت، ایک کلچر اور ایک تہذیب کی باتیں شروع ہوئیں۔ فلم ستاروں، فنکاروں، نغمہ نگاروں، شاعروں اور ادیبوں نے سرحدیں ٹوٹنے اور ایک دیو مالائی تہذیب میں ضم ہونے کے راگ الاپے۔ سالوں پرانے مندر اور اشرم کھول دیے گئے۔ پھولوں کی مالائیں پہنائی گئیں اور عنبریں پانی کے برتن بھر دیے گئے۔

یہاں تک کہ سب سے متعصب ہندو رہنما کے ہاتھوں ایک مندر کی از سر نو تعمیر کا سنگ بنیاد رکھوا دیا گیا اور یہ بھول گئے کہ اسی کے ہاتھوں بامری مسجد شہید ہوئی اور گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ہم تو اس دھن میں مگن تھے کہ ہمارے اپنے مسلمان بھائیوں سے بے وفائی رنگ لائے گی۔ ہماری جی حضور یوں کا بدلہ ہمیں دیا جائے گا۔ ہمیں برابری کی بنیاد پر بھارت سے تصفیہ کروا کر ہمارے مسائل کو حل کر دیا جائے گا۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جس نے اپنے بھائیوں سے غداری کی۔ اس نے کسی اور کے لیے خون بہایا اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اعتماد حاصل نہ ہو سکا۔ تاریخ ایسے ہزاروں کرداروں سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے اپنوں سے غداری کی اور پھر جن کے لیے انہوں نے غداری کی تھی انہوں نے اپنی تلواروں سے ان کی گردنیں اڑا دیں۔ وزیر طوسی سے لے کر میر جعفر اور میر صادق تک ایسی کئی مثالیں موجود ہیں اور تاریخ اب کی بار کیسے بدل سکتی تھی؟

ابھی ہم ڈیورنڈ لائن سے اس پار بلوچستان میں ہونے والی دراندازی پر بیان ہی دے رہے تھے۔ دبے دبے لفظوں میں اشارہ ہی کر رہے تھے، 1996ء کی محفوظ سرحد کو دشمنوں کی پناہ گاہ اور تربیت گاہ بنا ہی رہے تھے کہ دہشت گردی کی جنگ میں ہمارا سرپرست اعلیٰ جارج بش افغانستان آیا اور اس نے پاکستان کے بارے میں صرف ایک لفظ کہا کہ ڈیورنڈ لائن کی دوسری جانب سے افغانستان میں دراندازی ہو رہی ہے۔

ہم اپنے بلوچستان کے زخم کس کو دکھاتے؟ ہم تو اگلے چور تھے۔ ہم کس سے احتجاج کرتے کہ جس سے گلہ کرنا تھا وہ ہمیں ہی مورد الزام ٹھہرا رہا تھا لیکن اس کہانی کا انجام وہ طمانچہ ہے جو دو مارچ 2005ء کو ہمارے منہ پر مارا گیا۔ پوری دنیا کا پریس بولا کہ امریکہ نے اصولی طور پر ہندوستان کو فرانس، برطانیہ، چین اور روس کی طرح عالمی ایٹمی طاقت قبول کر لیا ہے۔

بھارت کے 14 ری ایکٹروں میں سے 8 فوج کے لیے ہوں گے جس پر کسی کی کوئی دسترس نہ ہوگی اور باقی توانائی کے لیے جس کے لیے ایندھن امریکہ فراہم کرے گا ابھی تک ہندوستان صرف 2000 میگا واٹ بجلی پیدا کرتا تھا

اس نے یہودی عبادت گاہ سینی گاگ بنائی جس میں ایسے طریقے سے عبادت کی جانے لگی کہ جس پر گمان ہی نہ ہو کہ یہ لوگ یہودی ہیں بلکہ ایسے لگے جیسے عیسائی مذہب کے پیرو کار کسی چرچ میں جمع ہیں۔ یہودی اپنی مقدس زبان عبرانی میں عبادت کرتے، وعظ سنتے اور گیت گاتے۔ اس کی دیکھا دیکھی 1815ء میں لوگوں نے کئی عبادت گاہیں قائم کر لیں جہاں اسی طرز کی یہودی عبادت ہوتی۔

1817ء میں ایڈورڈ کلمے نے ہمبرگ میں ایک مزید روشن خیال سینی گاگ بنایا جس میں یہودیوں کی مخصوص دعا ”صیہون کی طرف واپسی“ ختم کردی گئی اور انسانیت اور اخوت کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ فلسطین میں یہودی ریاست کی دعا صرف نجی محفلوں میں مانگی جاتی۔ پھر روشن خیالی کی وہ سرحد بھی آگئی جہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوتا ہے۔ صدیوں سے جدا جدا عبادت کرنے والے یہودی مرد اور عورتیں ساتھ ساتھ عبادت کرنے لگے۔

پرانے معبد اور عبادت گاہیں ترک کردی گئیں۔ ویانا، ڈنمارک اور ہمبرگ میں ایسی ہی روشن خیال عبادت کار وراج پڑ گیا۔ امریکہ میں یہ روشن خیالی مشہور ڈرامہ نگار آئزک ہربی نے شروع کی۔ اس نے چارلسٹن میں ویسا ہی ایک معبد قائم کیا اور یہودیوں کو امریکی معاشرہ میں ضم ہونے کی ترغیب دی جو بہت مقبول ہو گئی اور 1870ء تک اکثر سینی گاگ اس تحریک کا حصہ بن گئے۔ یوں اس روشن خیال منافقت کے بل بوتے پر یہودی ان تمام پالیسی ساز اداروں تک جا پہنچے جہاں جانے کے وہ صرف خواب دیکھا کرتے تھے لیکن اس ساری روشن خیالی کے باوجود ان کے دل فلسطینی ریاست کے قیام میں مگن اور صیہون کی واپسی کے گیت گاتے رہتے۔

وہ ان ہی لوگوں کی مخالفت کرتے جن کی زبان میں انہوں نے عبادتیں شروع کردی تھیں۔ یوں جنگ ہوتی تو وہ غیروں کا ساتھ دیتے اور اپنے ہی ہم قوم لوگوں سے غداری کرتے۔ اسی غداری کے صلے میں انہیں فی الفور معاہدے کے تحت فلسطین میں ایک قطعہ اراضی مل گیا جہاں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔

لیکن منافقت کبھی عوامی مقبولیت حاصل نہیں کیا کرتی۔ آج بھی دنیا کے ہر معاشرے میں خصوصاً یورپی اور امریکی معاشرہ میں یہودیوں پر بنے ہوئے لطیفے زبان زد عام ہیں۔ ان کے منافقانہ کردار پر شکیپیر کے ناول مرچنٹ آف وینس سے لے کر آج تک کہانیاں تحریر ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی سیاسی فورم پر ہوں، سینیٹ یا کانگریس میں یہودی بن کر یہودیوں کی حمایت نہیں کرتے بلکہ اپنا مذہب، دین، کلچر چھپا کر کبھی آزاد خیالی کبھی روشن خیال اور کبھی حقوق انسانی کے ترجمان بن کر ایسا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ خود سکھ کا سانس لیتے ہیں اور نہ ہی اس قوم کو لینے دیتے ہیں جس کا دور ہو۔

کبھی کبھی جب میں اپنے دانش وروں اور اہل اقتدار کو روشن خیالی کی گفتگو کرتے ہوئے سنتا ہوں تو سوچتا ہوں۔ یہ منافقت ہمارے لیے کیوں؟ کیا ہم کسی قوم سے مغلوب ہیں؟ ہمارا مقدر کسی اور کے ہاتھ میں ہے؟ ہم اقلیت میں ہیں؟ ہم تو وہ سیلاب بلا ہیں کہ اکٹھے ہو جائیں تو دنیا ہماری زبان بولنے لگے۔

جو مغرب اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے ہر ڈبے پر عربی زبان میں ہدایات لکھتا ہوا اسے اس بات کا خوف ہی کافی ہے کہ ہم تمہاری مصنوعات کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا داری کے لالچ میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے روشن خیالی کی منافقت نہیں اپنی روایت، کلچر اور مذہب پر افتخار کی دولت درکار ہوتی ہے۔

## روشن خیالی کی جڑیں

(16 صفر 1426ھ بمطابق 17 مارچ 2006ء)

29 جولائی 1806ء کو نپولین نے یہودی کاروباریوں، بینکاروں اور ان کے مذہبی رہنماؤں کو پیرس کے ہوٹل ڈی وائل میں بلایا اور انہیں ذلت اور مجبوری سے نکالنے کے لیے اپنے ساتھ چلنے کے عہد و پیمان کیے۔ یہودیوں کا معبد جب 70ء میں تباہ ہوا تو ان کی ایک قدیم کونسل Great Sandhedrin بھی بے عمل ہو گئی۔ نپولین نے 17 سو سال بعد اس ادارے کا دوبارہ اجرا کیا اور اس کی از سر نو تشکیل کردی۔

یہودیوں نے انقلاب فرانس کو کوہ سینا سے اترا ہوا دوسرا قانون قرار دے دیا۔ ادھر نپولین جس ملک کو فتح کرتا وہاں یہودیوں کے لیے اسی قسم کی مراعات کا اعلان کرتا اور قانون وضع کرتا لیکن مارچ 1808ء کی اسمبلی کے کشنر لوئی کانٹ نے عجیب و غریب انکشافات کر دیے۔ اس نے کہا کہ یہودی جو حکومت سے وفاداری کا عہد کر کے مراعات حاصل کرتے ہیں وہ دراصل اندرون خانہ حکومت کے خلاف کام کرتے ہیں۔

یہ لازمی فوجی بھرتی سے گریز کرتے ہیں، لوگوں کو سود اور ساہوکاری کے مکروہ دھندوں سے لوٹتے ہیں اور دولت کے ارتکاز سے لوگوں کی کمائی پر حملے کرتے ہیں جس سے خوشگوار فضا تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان پر معاشی پابندیاں لگادی گئیں اور واپس مخصوص آبادیوں میں دھکیل دیا گیا۔

ایک مدت کے بعد یہودیوں کو عام آبادیوں میں اثر و رسوخ کا موقع ملا تھا۔ یہ لوگ مرکزی دھارے میں آ گئے لیکن اپنی حرکتوں اور دھوکا دہی سے انہیں واپس جانا پڑا۔ ان پر کوئی یقین نہ کرتا تھا۔ ایسے وقت میں یہودی ربیوں اور رہنماؤں نے اضطراب کے عالم میں ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے پورے یورپ میں دو قسم کی تحریکوں کو جنم دیا۔

یہ دونوں تحریکیں منافقت کی بنیاد پر استوار روشن خیالی پر مبنی تھیں۔ سب سے پہلے بہت سے جرمن یہودیوں نے عیسائیت قبول کر لی تاکہ مرکزی دھارے اور کلچر میں گھل مل سکیں۔ یہ لوگ اگرچہ عیسائی نہ تھے لیکن ان کے اندر ضم ہو کر یہودیوں کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔

دوسری جانب ایک یہودی اسرائیل جیکسن نے ایک روشن خیال اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد یہودیوں میں ان تمام ظاہری خواص اور عادات کو ختم کرنا تھا جس سے وہ اپنے ہم قوم جرمنوں، فرانسیسیوں اور دیگر قوموں کو اجنبی نہ دکھائی دیں کیوں کہ وہ جتنے کم اجنبی دکھائی دیں گے انہیں اتنے ہی آزادی کے مواقع زیادہ ملیں گے۔ اس نے گارز پہاڑ کے دامن میں ایک سکول قائم کیا جہاں یہودی بچوں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ سیکولر مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

ہماری زرعی اجناس کی پیداوار میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ چاول اور گندم کی فصل گنی ہو گئی، کپاس تین گنا اور گنا دو گنا۔ جس ملک میں تخلیق کے وقت صرف چھ بڑے صنعتی یونٹ تھے اب ان کی تعداد چھ ہزار ہو چکی ہے اور پیداواری انڈکس 120 گنا زیادہ۔ جب یہ ملک بنا تھا تو صرف دھاگہ اور کپڑے بناتا تھا اور آج سٹیل، انجینئرنگ کا سامان، بجلی اور دیگر کئی چیزیں بنا رہا ہے۔

لائسنس، دیوں اور موم بتیوں والے گھروں میں بجلی کے تقصیروں کی تعداد 90 گنا زیادہ ہو چکی ہے۔ پانچ گنا سڑکیں زیادہ بن چکی ہیں۔ اگر اس وقت ایک ہزار افراد میں سے ایک شخص کو گاڑی میسر تھی تو آج ایسے افراد 35 ہیں اور اگر اس وقت ایک ہزار افراد میں ایک کے پاس ٹیلی فون موجود تھا تو آج ایسے افراد کی تعداد 72 ہو چکی ہے۔

جس ملک کے آغاز میں صرف چار سرکاری یونیورسٹیاں تھیں آج وہاں 25 سرکاری یونیورسٹیاں بن چکی ہیں اور اتنی ہی پرائیویٹ یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں اور دس فیصد شرح خواندگی اب 50 فیصد کے قریب قریب آ پہنچی ہے۔ میں صرف معاشی پینڈتوں کو یاد کرادوں کہ اس ملک کی فی کس شرح آمدن 1947ء میں 1465 روپے تھی اور آج 5,128 روپے ہو چکی ہے۔

کیا یہ سب کچھ کسی ناکام ریاست میں ہو سکتا تھا؟ کیا کسی بگڑتی اور موت کے منہ میں جاتی ہوئی معیشت ایسے ترقی کیا کرتی ہے؟ میں اس ملک کے سب سے پسماندہ صوبہ بلوچستان کے ضلع مستونگ میں ڈپٹی کمشنر تھا تو ملک کے مستقبل سے مایوس ایسے ہی افراد کے ایک وفد سے ملاقات ہوئی۔ میں نے جذباتی نوجوانوں سے صرف اتنا کہا کہ میں جس وقت سکول میں پڑھتا تھا اس وقت پورے سکول میں صرف ایک استاد کے ہاتھ پر گھڑی ہوتی تھی جس کے پاس ہمیں وقت پوچھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

آج تقریباً ہر طالب علم کے ہاتھ پر گھڑی بندھی دیکھتا ہوں۔ پورے شہر میں صرف فوٹو گرافر کے پاس کیمرہ ہوتا تھا جسے تقریبات پر بلایا جاتا تھا۔ اب میں اگر کسی سکول کی چھوٹی سی تقریب میں بھی جاتا ہوں تو چاروں طرف لڑکوں کے ہاتھوں میں پکڑے کیمرے سے فلش لائٹس نکل رہی ہوتی ہیں۔ کونڈے سے کراچی روانہ ہوتے تو قلات تک دو جگہ پانی میسر آتا تھا ایک ڈاکٹر چاہ اور دوسری پھرلی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں قبرستان بہت بڑا ہے اس لیے کہ یہاں پانی میسر ہے جبکہ آج آپ کو اس پورے راستے پر باغات، سبزہ، ہریالی، ٹیوب ویل اور بجلی کی روشنیاں نظر آئیں گی۔ جس پنجاب کے جی ٹی روڈ پر واقع دیہات میں بھی بجلی نہیں تھی وہاں اب ایسے گاؤں دور دراز کے علاقوں میں بھی کم ملیں گے۔ کیا اس سب کچھ کے باوجود بھی ہم ناکام ریاست ہیں؟

ایسا کہنے کا حق ان سب لوگوں کو نہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے لیکن ان 38 فیصد افراد کو ضرورت ہے جو غربت کی لکیر سے نیچے رہ رہے ہیں۔ ہمارا اکمال یہ ہے کہ ہم نے جہاں معاشی ترقی کی ہے، سڑکیں بچھائی ہیں، ٹیلی فون لگائے ہیں، بجلی لگائی ہے وہاں غربت میں بھی اس سے کئی گنا رفتار سے ترقی کی ہے۔ ہمارے کارخانوں کی آمدنی سے مزید کارخانے لگے لیکن اس میں کام کرنے والے مزدور کی حالت نہ بدل سکی۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے دروازے عام آدمی پر آہستہ آہستہ بند ہوتے گئے۔

ہمارے ہسپتالوں کی راہ داریوں میں خالی جیب غریب اپنے پیاروں کی بے گور و کفن اور علاج سے محرومی کی

## سوہنی دھرتی، اللہ رکھے

(23 صفر 1426ھ بمطابق 24 مارچ 2006ء)

ٹی ہاؤس لاہور میں سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے ماحول میں، چائے کی چسکی لیتے ہوئے پاکستان کے دو عظیم شاعر، ادیب اور دانشوروں کی ایک گفتگو زبان زد عام ہے۔ عالم حیرت میں ڈوبے ہوئے ایک شاعر نے دوسرے شاعر سے کہا: ”ستوا میرے پاس ایک بہت بری خبر ہے۔“

پہلے نے تعجب سے پوچھا: ”وہ کیا؟“

اس نے کہا: ”اب یہ ملک نہیں چل سکتا۔“

دوسرے نے کہا: ”لیکن میرے پاس اس سے بھی بری خبر ہے کہ یہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔“

اس طرح کے فقرے ہمارے ادیب، مفکر، سیاستدان، افسران اور وہ لوگ اکثر بولتے رہتے ہیں جن کے گھروں میں آرام و آسائش کی تمام اشیاء میسر ہیں۔ ان کے ہاں اگر چند منٹ کے لیے بجلی کا نظام منقطع ہو جائے تو انہیں ڈیپ فریزر میں پڑے مہینہ بھر کے گوشت کی فکر لگ جاتی ہے۔ سخت گرمی کے عالم میں ایسے چند سیکنڈ گزارنے مشکل ہو جاتے ہیں جن میں ایئر کنڈیشنڈ بند ہو جائے۔

ایک دن پانی کی ترسیل نہ ہو تو سرکاری محکموں کے ٹینکرز، ان کے قلم کے خوف یا عہدے کی ہیبت سے ان کو پانی پہنچا دیتے ہیں۔ شہر کے باقی علاقے بے شک صفائی، سٹریٹ لائٹ یا دیگر سہولیات سے محروم رہیں لیکن ان کا ماحول ضرور جگمگ اور چمکتا نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگلی کئی نسلوں کا سامان جمع کیے ہوئے یہ لوگ اس ملک کے مستقبل سے مایوس، پریشان اور ناامید رہتے ہیں۔

کیا ہم واقعی ناکام ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں؟ میں اگر گزشتہ 55 سالہ تاریخ کو مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ 14 اگست 1947ء میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والے اس نظریاتی ملک، جس کی تخلیق کی بنیاد اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والی ایک قوم تھی۔ اس کی غربت، کم مائیگی اور کمپرسی اس وقت کیا تھی اور آج کیا ہے؟ میں صرف چند لمحے کے لیے اس سفر میں آپ کو ساتھ لے چلتا ہوں۔

1947ء میں اس ملک میں سات لاکھ 25 ہزار افراد پر ایک ڈاکٹر میسر تھا اور صرف 13 سال بعد یعنی 1960ء میں یہ تعداد دس ہزار چھ سو رہ گئی اور آج 1500 لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال کے لیے ایک ڈاکٹر موجود ہے۔ یہ وہ ڈاکٹرز ہیں جو پاکستان میں موجود ہیں جبکہ وہ ڈاکٹرز جو یہاں سے تعلیم حاصل کر کے بیرون ملک چلے گئے ہیں ان کی تعداد کا کوئی شمار نہیں۔ صرف امریکہ میں اس وقت چالیس ہزار پاکستانی ڈاکٹرز کام کر رہے ہیں۔

وجہ سے لاشیں اٹھاتے رہے۔ ہمارے کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرنے والا کسان جس کی کپاس اور چاول سے زرمبادلہ آتا تھا، جہاز اڑتا اور کاریں چلتی تھیں، پوری زندگی ان کو خواب کی طرح ترستا رہا۔ ہمارے شہروں کی سڑکیں دروئیہ، سر روئیہ اور چار روئیہ ہوتی گئیں اور دیہات میں رہنے والے تارکول کے تصور سے دور رہے۔

لیکن حیرت ہے کہ ہسپتال میں مہنگے علاج کی طاقت نہ رکھنے والے خاندان کے کسی فرد نے یہ نہ کہا کہ یہ ملک اب نہیں چل سکتا۔ سال بھر کی فصل اونے پونے بیچنے والے کسان کے لب پر یہ لفظ نہیں آیا کہ ہم ناکام ہو چکے ہیں۔ بیش قیمت فیس کی وجہ سے اپنے ذہین بیٹے کو تعلیم سے محروم رکھنے والے باپ کی زبان پر یہ فقرہ نہ اترتا کہ ہمارا مستقبل مندوش ہے اس لیے کہ ان کا ٹھکانہ، ان کا آسرا اور سہارا یہ ملک ہے۔

حالات خراب ہونے پر وہ ملک چھوڑ کر نہیں جاتے اور حالات بہتر ہونے پر واپس نہیں آتے۔ ان کے لیے باہر ملک میں کوئی ذاتی پناہ گاہ، کوئی گھر، فلیٹ یا لندن کا اردو مرکز نہیں ہے۔ ان کا جینا ان کا مرنا اسی سرزمین سے وابستہ ہے اور انہی کی آنسوؤں سے لبریز دعاؤں کے صلے میں یہ ملک زندہ، سلامت اور آباد ہے۔



## سہا خوفزدہ شہر

(30 صفر 1426ھ بمطابق 31 مارچ 2006ء)

خونک کی بلندیوں پر کھڑے ہو کر اگر نیچے میدان کی طرف دیکھیں تو آپ کو چمن کا ایک بہت بڑا شہر نظر آئے گا جس کے بیچوں بیچ تارکول کی سیاہ سڑک گزرتی ہوئی دوڑتی میلوں تک جاتی ہوئی نظر آئے گی۔ شہر کی آبادی کے بعد یہ سڑک مزید واضح اور چمکیلی سی نظر آتی ہے لیکن سنسان اس سڑک پر کچھ میل کے بعد دو چھوٹی چھوٹی عمارتیں نظر آتی ہیں جن میں مدتوں سے ایک پر پاکستان اور دوسری پر افغانستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس کے بعد دوسری جانب ایک چھوٹا سا سرسبز شہر نظر آئے گا۔

یوں لگتا ہے جیسے چمن اور یہ شہر جڑواں ہیں اور ایک مختصر فاصلے کا روڈ انہیں ملاتا ہے۔ اس شہر کا نام پین بولدک ہے۔ یہ شہر سرحد سے دور اتنے ہی فاصلے پر ہے جتنے فاصلے پر پاکستان میں چمن کا شہر، سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں جانب کچھ مکانات سے بنی ہوئی آبادیاں ہیں جو میلوں آس پاس سر جوڑے نظر آتی ہیں۔ گھرایے کہ اگر سامنے کا دروازہ پاکستان میں کھلتا ہے تو پچھواڑے والا افغانستان میں۔ پین بولدک گزشتہ پچیس سال سے تاریخ کے ایک عظیم گواہ کی حیثیت سے موجود ہے۔ تاریخ کو اگر دو حصوں میں تقسیم کریں تو ایک حد فاصل یوں بنتی ہے، طالبان سے پہلے، طالبان کے بعد۔

80 کی دہائی میں اس شہر کے باسی جو زیادہ تر نورزئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ہجرت کر کے چمن کے پہاڑیوں کے دامن میں بوغہ کاریز کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ دوسری جانب پین بولدک کے علاقے پر روسی پشت پناہی سے بننے والی افغان ملیشیا نے قبضہ کر لیا۔ عصمت اللہ مسلم اس علاقے کا کمانڈر تھا۔ اس ملیشیا کی وجہ سے پورے چمن شہر میں خوف چھایا ہوا تھا۔

یہاں سے لوگ اٹھوائے جاتے اور پھر دور سے نظر آتے ہوئے کنٹینروں میں انہیں بند کیا جاتا پھر کبھی تاوان لے کر چھوڑ دیا جاتا اور کبھی صرف ان کی لاشیں ہی ملتیں۔ عصمت اللہ نے اپنے کمپ کا نام قرار گاہ رکھا ہوا تھا۔ جس پاکستان میں رہنے والے شخص کے ساتھ اس کے تعلقات ہوتے وہ بازار میں دندناتا ہوا پھرتا اور کہتا میرے ساتھ صحیح ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں قرار گاہ کی سیر کراؤں گا۔ اس زمانے میں چمن کی راتیں بھی عجیب ہوتیں۔ بوغہ کاریز میں رہنے والے نورزئی قبائل پر عصمت کے ملیشیا کی طرف سے گولہ باری ہوتی اور پھر جواب میں اس طرف سے جواب دیا جاتا اور چمن کے شہری پوری رات اپنے کمروں میں دیکے پڑے رہتے۔

یوں تو یہ لوگ سرحد کے پار آتے جاتے تھے لیکن ایک خوف اور ایک دھڑکاں ان کو لگا رہتا تھا کہ کب کوئی ملیشیا



افسردہ و پڑ مردہ چہروں کے ساتھ ایک قبرستان میں جمع تھے۔ گیارہ لوگ جو سالوں سے منعقد ہونے والے جشن نوروز کے جلے میں شرکت کے لیے گئے، انہیں اسی طرح پاکستان کی طرف سے درانداز قرار دیا گیا۔

ان کی آنکھیں بند اور ہاتھ پاؤں باندھ کر قتل کیا گیا اور پھر ان کی لاشیں پاکستان کے حوالے کر دی گئیں۔ ایک بار پھر چین شہر خوفزدہ، ڈراؤرا اور سہا سہا لگنے لگا۔ میں جنازے دفن کرنے والوں کے چہرے دیکھ رہا تھا اور ان پر لکھے ہوئے سوالات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محبت کا بیج بونے والوں سے غداری کر کے، بے گناہ لوگوں کو امریکہ کے حوالے کر کے اور اپنی سرزمین پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا اڈہ بنانے کے بعد آج ہم واپس کیسے لوٹ آئے؟ ہم پھر خوف کی ہوا دی میں کیسے آگئے؟ لیکن شاید انہیں علم ہونا چاہیے کہ پالیسیاں اور منصوبے جب اس طرح کی بنیادوں پر استوار کیے جاتے ہیں تو پھر ایسی پالیسیوں کی کوکھ سے پھول نہیں کانٹے ہی اگا کرتے ہیں۔

ایسے فیصلوں کے نتائج بے امن ہوتے ہیں، سکون و اطمینان تو میرے رب کی پناہ میں جانے سے ملتا ہے۔ یہ میرے رب کا فیصلہ بھی ہے اور تاریخ بھی اس پر شاہد ہے ورنہ فرعون، نمرود، سیزر اور سائرس کا ساتھ دینے والے خوف کی دلدل میں نہ رہتے۔



کا بندہ ان کو برغمال بنا کر اس کے وارثوں سے تاوان نہ طلب کرے۔ سرکاری اہلکار بھی بارڈ کے ساتھ ساتھ آباد دیہاتوں میں قدم نہ رکھتے کہ ایک دفعہ واپڈا کے اہلکاروں کو اٹھوا کر قرار گاہ لے جایا گیا اور پھر واپسی کے لیے سیاسی گفت و شنید اور حکومتی کارروائی کے بعد آخر کار تاوان سے کام بنا۔

جو بھی اس راستے سے یہاں آتا اور یہاں سے وہاں جاتا اسے مشکوک سمجھا جاتا۔ خوف کے سائے اتنے مہیب تھے اور لوگوں کے تجربات اتنے تلخ کہ بیان کرنے پر زبان لرز اٹھتی ہے اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔

دو واقعات ایسے ہیں جو آج کے بدلے ہوئے حالات کے تناظر میں یاد رہے ہیں۔ ایک قبائلی تنازعہ تھا۔ دونوں جانب کے لوگ ملوث تھے، تنازعے کے حل کے لیے لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر جاتے اور مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر دوسری جانب کے لوگوں نے عصمت ملیشیا کے افراد سے گٹھ جوڑ کیا۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں اور مجاہدین کی پناہ کے قصے سنائے اور ایک دن وہ تنازعہ کے حل کے لیے ایک جگہ کھانے پر جمع تھے۔

اس قبیلے کا سردار اپنے بچپن کے ساتھ موجود تھا۔ ملیشیا کے لوگ آئے ان سب کو گولیوں سے بھون دیا اور انہیں پاکستان کی طرف سے درانداز قرار دے کر ان کی لاشیں ایک کنویں میں پھینک دی گئیں۔ یہ لاشیں ان کے قبیلے کے افراد نے بڑی مشکل سے حاصل کیں۔

جنوری 88ء میں ایسے ہی چند افراد معمول کے طور پر سرحد کے پار گئے ہوئے تھے، شاید کاروباری رقابت تھی یا پھر قبائلی تنازعہ کہ انہیں وہاں عصمت ملیشیا کے لوگوں نے قتل کیا، ان پر دراندازی کا الزام لگایا اور ان کی لاشیں بارڈر پر اکر پھینک دی گئیں۔ کشت و خون اور ظلم و جارحیت کی یہ داستانیں عام تھیں۔ ایک ڈرا اور سہا ہوا شہر تھا جسے چمن کہتے ہیں۔ لوگ راتوں کو گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔

کسی سے جان بوجھ کر بھی لڑائی مول نہ لیتے کہ کہیں وہ درون خانہ عصمت سے نہ ملا ہو اور اس کی شامت اعمال آجائے۔ یوں دن کٹے اور روس افغانستان سے نکل گیا۔ عصمت کا قرار گاہ مجاہدین کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہو گیا۔ کنٹینروں میں بند سالوں سے پڑے ہوئے قیدیوں کو رہائی ملی لیکن سرحد پار اب بھی لوگوں کے لیے امن قائم نہ ہو سکا۔ نہ آمد و رفت میں وہ آزادی میسر آئی اور نہ ہی سرحد کے آر پار رہنے والے قبائل اس اطمینان سے ایک دوسرے سے رابطے قائم رکھ سکے۔ یوں لگتا تھا چمن کے بارڈر سے قندھار تک ہر دس میل پر ایک تاوان وصول کرنے والی چیک پوسٹ ہے جہاں سے بھتہ دیے بغیر گزر نہیں جاسکتا۔ لوگ بدل گئے لیکن نہ سرحد پر اطمینان ہوا اور نہ سفر بے خطر۔ اب تاریخ کا وہ دور آتا ہے جو حد فاصل ہے، طالبان کا دور۔ چمن کی اس سڑک پر چلتے ہوئے عین بارڈر کے اس پار پتین بولدک کے قریب ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی جس میں دونوں جانب کے لوگ کاروبار کرنے آتے۔ اس مارکیٹ میں اربوں روپے کا سامان موجود تھا لیکن امن و امان قائم کرنے کے لیے صرف سات سپاہی موجود تھے وہ بھی صرف ٹریفک کا نظام درست کرنے کے لیے۔ لوگ نماز پڑھنے کھلی دکانیں چھوڑ کر جاتے۔

نہ ادھر سے جانے والے کسی خوف کا شکار ہوتے اور نہ ہی ادھر سے آنے والے۔ بیس سالوں میں چمن کے شہریوں نے اطمینان اور سکھ کو دروازوں پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔

یہ سب آج پھر اس لیے یاد آ گیا کہ ایک بار پھر چمن کے شہری اپنے پیاروں کی لاشیں دفن کرنے کے لیے

ہر الزام اور کرپشن سے پاک ہے۔ جس کی تاریخ لوگوں کی خدمت سے شروع ہوتی ہے اور وطن کی آزادی تک جا پہنچتی ہے۔ اس نے کہا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشی دباؤ حکومت کو گرانے اور ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے تو وہ یقیناً فلسطینی عوام کے غیر متزلزل ایمان کا اندازہ نہیں کر رہے، وہ یقیناً غلطی پر ہیں۔

یہ بیان کسی آزاد اور خود مختار ریاست کے سربراہ کا نہیں ہے جس کے اپنے ذرائع ہوں، اپنے مواصلات کے نظام ہوں، اپنی آزاد سرحدیں ہوں بلکہ یہ ایک محکوم ملک میں موجود ایک محدود حکومت کے سربراہ کا بیان ہے جس کی مملکت کی تمام سرحدوں پر اسرائیلی فوج موجود ہے جو باہر سے ایک روٹی کا ٹکڑا، امداد کا ایک روپیہ یا دوا کی ایک خوراک بھی اندر نہیں آنے دے سکتی۔ ایسی کمپری میں دیا گیا بیان تو کل کی وہ مثال ہے جو صرف ایمان کی حرارت سے جنم لیتی ہے۔

شاید یورپ کو بھی اس کا اندازہ ہے کہ ان کی پابندیاں ایسے افراد کا ایمان متزلزل نہیں کر سکتیں اس لیے کہ آج سے بیس سال پہلے جو حماس نے فلسطین کے مظلوم عوام کی مدد کا عہد کیا تھا تو کوئی ان کے ساتھ نہ تھا۔ کسی بڑی عالمی طاقت کا سہارا انہیں حاصل نہ تھا لیکن انہوں نے اسی بے سروسامانی میں پورے فلسطین میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا جس کی رواں دواں ایسبولینس سروس ہر اس موقع پر مستعدی سے پہنچ جاتی جہاں اسرائیلی طیاروں کی بمباری سے لوگ زخموں سے تڑپ رہے ہوتے یا ان کے بلند وزروں سے گھر سمار ہو رہے ہوتے۔

گھروں کی تعمیر نو سے لے کر یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی مالی اور اخلاقی امداد تک حماس نے وہ سب کچھ کیا جو شاید کہ آج کی آزاد اور خود مختار حکومتیں تک نہیں کر پاتیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے پورے فلسطین میں تعلیمی اداروں کا ایک جال بچھا دیا۔ جہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ نوجوان تیار ہوئے جو آج پوری دنیا میں اپنی قابلیت کی بنیاد پر اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حماس کی اسی کوشش کی وجہ سے امریکہ میں فلسطین کی حمایت میں مضبوط لابی وجود میں آ چکی ہے۔

یورپ میں موجود انسانی حقوق کی تنظیموں میں حماس کے ارکان آج کے ماہرین یعنی Expert کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں اور ان کی رائے صائب سمجھی جاتی ہے۔ یہ وہ سب کارکردگی ہے جو حماس کا بنیادی محور ہے لیکن اس سب کے ساتھ ساتھ اس کم مائیگی، کمپری اور وسائل کی کمی کے باوجود حماس نے جہاد کو اپنی زندگی کی معراج بنایا ہے۔ آزادی کو اپنی منزل مقصود اور رضائے الہی کے حصول کو اپنا معیار مقرر کیا ہے۔

ایسے لوگ صرف چند روپوں کی بندش سے ہار نہیں مانتا کرتے اور مغرب کو بھی علم ہے لیکن کیا کیا جائے ایسی تمام باتوں کا علم اس سرزمین کے قرب و جوار میں جنم لینے والے فرعون کو بھی تھا۔ اس سے بھی اپنے پالنے والا ہونے کا دعویٰ تھا۔ وہ بھی یہی تصور کرتا تھا کہ معاشی پابندی لوگوں کو جھکنے پر مجبور کرتی ہے لیکن تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھوکے، تنگ، مجبور، مقہور اور مظلوم لوگ صرف اور صرف ایک رب ذوالجلال پر ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں تو پھر فرعون کا مقدر غرق ہونا ہی ہوتا ہے اور حماس تو صرف دولت سے مالا مال ہے تو کل کی دولت، ایک رازق پر ایمان کی دولت، دنیا کے خداؤں سے انکار کی دولت۔

## توکل کی دولت

(07 ربيع الاول 1426ھ بمطابق 07 اپریل 2006ء)

”خبردار! تم میں سے کوئی شخص ان وزراء، اراکین پارلیمنٹ یا کسی بھی رہنما سے رابطہ نہ رکھے۔ ایسا ملازم جو ہمارے دفتر خارجہ میں کام کرتا ہے اگر ان لوگوں سے رابطہ میں پایا گیا تو اسے سخت نتائج بھگتنا پڑیں گے۔“

یہ اس ای میل کے الفاظ ہیں جو حماس کی حکومت کے حلف اٹھانے سے صرف چند منٹ پہلے امریکی اور کینیڈا کی وزارت خارجہ نے اپنے ملازمین کو جاری کی۔ اس ترک تعلقات کی تین وجوہ بیان کی گئی ہیں: حماس نے ابھی تک اسرائیل کو تسلیم کرنے، پرانے معاہدات کو قبول کرنے اور دہشت گردی ترک کرنے کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی۔

اسی لیے حکومت کینیڈا جو امداد انسانی بنیادوں پر فلسطین کی حکومت کو دیتی تھی اسے بند کرتی ہے۔ امریکہ کے احکام مزید سخت ہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں سے بھی رابطہ نہ رکھا جائے جو وزیروں کے ساتھ کام کرتے ہیں جن میں ان کا عملہ بھی شامل ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حماس کو اکیلا اور دنیا بھر میں تنہا کر کے اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمارے تینوں مطالبات تسلیم کر لے۔ ہم صرف صدر محمود عباس سے رابطہ رکھیں گے اور اسی سے معاملات کو آگے بڑھائیں گے۔

اس بیان سے پہلے ان لوگوں کی فہرست پر غور کر لیا جائے جو حماس کی حکومت میں وزیر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ دنیا بھر کی حکومتیں، میڈیا کے ادارے اور فلسطین کے معاملات پر تحقیق کرنے والی انجمنیں ان لوگوں کو انسانیت کی خدمت کرنے والے، بشرقی و سٹی کے معاملے پر زیرک نظر رکھنے والے ماہرین اور امن پسند افراد تصور کرتی ہیں۔

حیرت اس بات پر ہے کہ ان افراد کی کابینہ کا اعلان کرنے سے قبل حماس نے ان تمام گروہوں کو ساتھ ملا کر حکومت بنانے کی کوشش کی جنہیں مغرب اعتدال پسند سمجھتا ہے لیکن امریکہ اور اسرائیل نے ان گروہوں کو مجبور کیا کہ وہ کسی طور بھی حماس کی حکومت کا ساتھ نہ دیں اور اسے بالکل اکیلا کر دیں تاکہ وہ فلسطین کے مظلوم اور مجبور عوام کی صحیح نمائندہ کے طور پر نہ گردانی جاسکے بلکہ ایک خاص طبقے کی نمائندہ ہو جسے امریکہ دہشت گرد سمجھتا ہے اور وہ اس کی دہشت گرد تنظیموں کی لسٹ میں موجود ہے۔

اس سارے پس منظر میں اسماعیل ہانیہ کا وہ بیان اس رزاق واحد اور مالک کائنات پر توکل کا مظہر ہے جو پوری کائنات کا پالنے والا ہے۔ جب امریکہ اور یورپی یونین نے اس بنیاد پر فلسطینی عوام کی امداد بند کی کہ انہوں نے حماس کو ووٹوں کی اکثریت سے جتوایا ہے اور مطالبہ رکھ دیا کہ حماس اس اسرائیل کو تسلیم کرے جس کے جرائم کی تاریخ اور بربریت کی داستان موجودہ دور کی سب سے خونچکاں داستان ہے۔

ایسے میں اسماعیل نے کہا کہ فلسطین کے عوام کو اس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ انہوں نے ایک بے ایمان اور مغرب کے ہاتھوں میں کھیتی ہوئی تنظیم کے مقابلے میں حق و صداقت پر یقین رکھنے والی تنظیم کا ساتھ دیا جس کا دامن

کرنا ہوگی۔ چونکہ دنیا بھر میں گلوبلائزیشن ہو رہی ہوگی اس لیے ٹیکنالوجی اور سائنس پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہے گی بلکہ چین، ہندوستان اور دیگر غریب ممالک بھی اس پر قابض ہو جائیں گے اور سستی اشیاء بنا کر مارکیٹوں پر قبضہ کر لیں گے لیکن سب حالات جیسے بھی ہوں، معیشت جیسی بھی ترقی کرے 2020ء تک اور اس کے بعد بھی امریکہ کی طاقت، حیثیت اور فوجی اقتدار کو زیادہ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تمام ملک اپنے مخصوص حالات اور طرز زندگی کی وجہ سے اس کے لیے چیلنج نہیں بنیں گے بلکہ اس کے مدد و معاون ہوں گے۔

لیکن ان 25 سالوں میں دنیا میں جس خطرے اور جس چیلنج کا سامنا امریکہ کو ہوگا اور جو اسے ہر وقت پریشان رکھے گا اور اس کی دنیا میں غالب ہونے کی خواہش میں رکاوٹ بنے گا وہ ”اسلام“ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس رفتار سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے وہ حیران کن ہے۔

صرف یورپی ممالک میں 1985ء میں ان کی تعداد صرف پچاس لاکھ کے قریب تھی اور 2005ء میں یہ تعداد دو کروڑ تک جا پہنچی اور تمام تر جائزوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ 2020ء میں یہ تعداد چار کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ پوری دنیا میں 2020ء تک مسلمان دو ارب کے قریب ہو جائیں گے کیونکہ عیسائیوں کی آبادی ایک فیصد کے حساب سے بڑھ رہی ہے اور مسلمانوں کی آبادی 2.5 فیصد کے حساب سے بڑھ رہی ہے جبکہ باقی مذاہب کی آبادیاں بھی ایک فیصد کے ارد گرد ہی آگے بڑھ رہی ہیں۔

ان میں سب سے ”خطرناک“ وہ لوگ ہیں جو سوچ سمجھ کر اور پڑھ لکھ کر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہ اسلام سے محبت میں زیادہ شدید اور عقیدے کے لحاظ سے زیادہ مضبوط ہیں۔ وہ اپنی تمام تر توانائیاں اسلام کی ترویج کے لیے صرف کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے مختلف ہیں جو صدیوں سے ایسے خاندانوں میں پیدا ہوتے چلے آئے ہیں جو مسلمان تھا۔

اس امت کے اکثر ممالک میں حکمران ان کے آئیڈیل اور خواہشات کے برعکس ہیں بلکہ جبر کی وجہ سے ان پر مسلط ہیں۔ ان کا نہ تو عوام سے کوئی رابطہ ہے اور نہ ہی وہ ان کی ترجیحات پر اپنی حکومت چلاتے ہیں ایسے میں وہ مقامات جہاں مسلمان مجبور اور مقہور ہیں وہ لوگوں کی اکثریت میں تبدیلی لانے کے لیے تیار ہو رہی ہے اور کسی بھی وقت وہ یہ تبدیلی لا سکتے ہیں۔

ان میں فلسطین، کشمیر، چین، عراق اور افغانستان شامل ہیں۔ دوسرے نمبر پر الجزائر، مصر، لیبیا، پاکستان اور ایتھوپیا جیسے ممالک ہیں جہاں تبدیلی کا سفر مزید بہتر ہو رہا ہے۔ ایسے میں کسی ایک ملک میں بھی مسلمانوں کے قرون وسطیٰ کے معیار کے مطابق خلافت قائم ہو سکتی ہے جس کا نعرہ بلند ہو چکا ہے۔ ایسا ہوا تو اس کی خوشبو پوری امہ میں پھیلے گی اور چونکہ دنیا واپس بلا کوں میں تقسیم ہو رہی ہے تو کسی بھی وقت مسلمان یورپی یونین کی طرح ایک بلاک بن سکتے ہیں اور ان میں ایک مرکزیت آ سکتی ہے۔

اگر ایسا ہو گیا تو یہ دنیا کے 70 فیصد وسائل پر واحد قابض لوگ ہوں گے اور کسی بھی وقت دنیا کی توانائی کی ضرورت روک کر اسے مفلوج کر دیں گے۔ ایسے میں امریکہ و یورپ اور نئی طاقتیں چین اور بھارت کو مل کر انہیں روکنا ہوگا۔ انہیں علاقائی بلا کوں جیسے سارک وغیرہ اور عرب لیگ میں تقسیم کرنا ہوں ورنہ امریکہ اس طاقت کا مقابلہ کر سکے گا اور نہ ہی نئی ایشیائی طاقتیں۔ یہی وہ راستہ ہے کہ جس پر چلتے ہوئے چین کے بعد ہندوستان کو امریکہ نے ایشیائی ٹیکنالوجی

## دنیا کے نئے رخ

(15 ربیع الاول 1426ھ بمطابق 14 اپریل 2006ء)

ہم امت مسلمہ کے جس خطے میں بھی گئے، عام آدمی سے ملے، اس سے کسی ایسی حکومت کے بارے میں دریافت کیا جو اس کے خوابوں میں بہتی ہے، جسے وہ اپنے دکھوں کا مداوا اور آئیڈیل سمجھتا ہے تو اکثریت کا ایک ہی جواب تھا: ”خلافت“۔

مسلمانوں کے قرون اولیٰ کی وہ حکومت جو ان کے نبی ﷺ کے ساتھیوں نے قائم کی تھی، جس میں انصاف کی عملداری تھی اور انسانوں کی فلاح بھی۔ یہ الفاظ امریکہ کی نیشنل انٹیلی جنس کونسل کی رپورٹ ”مستقبل کی نقشہ بندی“ کے ہیں۔

یہ کونسل دنیا بھر کے ماہرین اور کارپردازوں پر مشتمل ہے۔ رپورٹ نے دنیا کا وہ نقشہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو 2020ء میں ہوگا۔ اس سے پہلے یہ کونسل 2010ء اور 2015ء کے نام پر بھی ایسی نقشہ بندی سامنے لا چکی ہے لیکن یہ رپورٹ اس حساب سے مختلف ہے کہ اس میں آئندہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسے رجحان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں نشاۃ ثانیہ کی بات کی گئی ہے اور ماضی کے درخشاں دنوں کو دہرانے کا عزم شامل ہے۔

رپورٹ کے ماہرین نے دنیا بھر کا سروے کیا، ہر خطے اور علاقے سے معلومات حاصل کیں اور بتایا کہ 1949ء میں بننے والا امریکہ اور یورپ کا اتحاد اب اگلے پچیس سالوں میں دنیا پر حکومت کرنے والا واحد اتحاد نہ رہ جائے۔ اس لیے معاشی آزادی کے راستے پر چلتے ہوئے چین اور ہندوستان دو ایسی طاقتیں ہیں جو معاشی اور فوجی سطح پر آگے بڑھیں گی اور اکیلے چین کا GDP کسی بھی یورپی ملک سے خواہ وہ کتنا ہی ترقی یافتہ ہو، زیادہ ہوگا۔ ان دونوں کی آبادیاں 1.4 اور 1.3 ارب کے قریب ہو جائیں گی اور ان کے معیار زندگی میں بھی فرق آئے گا لیکن یہ دونوں ملک مل کر مغرب کے سامنے آکھڑے ہوں تو دنیا میں ایک بہت بڑی بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

برازیل کی معیشت یورپ کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ روس اپنے گیس اور تیل کے ذخائر اور اپنی مخصوص جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے دوبارہ ایک اہم ملک کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ دنیا کی معیشت 80 فیصد زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ سب نئی ابھرتی ہوئی طاقتیں دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنے اور مارکیٹوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھیں گی۔

امریکہ کی حیثیت معاشی میدان میں کم ہونے لگے گی اور اس کو دنیا میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کی جدوجہد

## دنیا جنون اور پاگل پن کے نرغے میں

(06 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 05 مئی 2006ء)

تہران کے بچوں سچ ایک بہت بڑے چوراہے میں ایک یادگار تعمیر ہے۔ یہ یادگار اس شہر کا نشان بن چکی ہے اور جہاں کہیں اس شہر کے حوالے سے کوئی خبر چھپے، ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام نشر کیا جائے اس شاندار اور کئی پہلو یادگار کو نمایاں طور پر دکھایا جاتا۔ یہ یادگار ایران کے ہزاروں سالہ ماضی سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ ایران کے موجودہ انقلاب کی تاریخ اس چوراہے پر رقم ہوئی تھی۔ اس چوراہے کو میدان آزادی کہا جاتا ہے۔ یہاں صدیوں کے قائم ظالم بادشاہی نظام کے خلاف ایرانی عوام نے قربانیاں دی تھیں۔

یہ قربانیاں صرف بادشاہی نظام کے خلاف ہی نہیں تھیں بلکہ دنیا کی سب سے بڑی استبدادی طاقت امریکہ اور سب سے بڑے سازشی ملک اسرائیل کے خلاف بھی تھیں۔ اسی لیے آج بھی لاکھوں لوگ جب اس علاقے میں جمع ہوتے ہیں، جب چاروں جانب کی سڑکیں دور دور تک انسانوں کے جم غفیر سے بھری ہوتی ہیں تو صرف دو نعرے سب کی زبان پر ہوتے ہیں: ”مرگ برا امریکہ، مرگ بر اسرائیل“ یہ نعرے عوام ہی نہیں لگاتے بلکہ جس وقت ان فلک شکاف نعروں کی گونج سنائی دے رہی ہوتی ہے تو پوری ایرانی قیادت اپنے رہبر، اپنے صدر، وزیر اعظم اور دیگر رہنماؤں سمیت وہاں موجود ہوتی ہے۔

ایک ایسی قوم جس نے امریکہ کے غلبے اور طاقت کو قربانیاں دے کر ختم کیا ہو، سازش کے ساتھ مسلط کی جانے والی آٹھ سالہ عراق جنگ میں مردانگی کا مظاہرہ کیا ہو، آج پھر پوری دنیا میں میڈیا اور عالمی منظر نامے پر نظر آرہی ہے۔ یوں تو ایران کے خلاف دھمکیوں کا سلسلہ اس وقت سے چل رہا ہے جب سے امریکہ اپنے زخم چاٹتا ہوا وہاں سے نکلا تھا لیکن میرے سامنے اس وقت ایک ایسے شخص کا مضمون ہے جسے امریکی محکمہ دفاع کا راز داں کہا جاتا ہے۔

یہ شخص اگرچہ ایک یہودی ہے لیکن ان یہودیوں میں شامل ہے جس نے اپنا عقیدہ اور تعلق چھپا کر اپنے آپ کو ایک غیر جانبدار مبصر کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن اس کی تحریریں اس کے حبش باطن کو چھپا نہیں پاتیں۔

سیمور لیش، نیویارکر کا مشہور صحافی جسے امریکہ میں اپنے رابطوں کی وجہ سے سب سے معتبر تصور کیا جاتا ہے۔

اس نے سب سے پہلے جنوری 2005ء میں اپنے مضمون میں ایران پر فضائی حملے کی منصوبہ بندی کا ذکر کیا تھا لیکن گزشتہ دنوں اس نے اس مضمون کا دوسرا حصہ شائع کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ٹھیک 67 سال کے بعد امریکہ کا ایٹمی جنون پھر بھڑک اٹھا ہے اور وہ ایران کی تنصیبات پر ہیر و شیمہ اور ناگاساکی کی طرح ایٹمی حملہ کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ پینٹاگون نے صدر بوش کو رپورٹ دی ہے کہ ایران پر حملے کو سو فیصد یقینی بنانے کے لیے اس پر ایٹم بم برسائے

اور ایندھن فراہم کرنے کا معاہدہ کیا ہے اس لیے کہ مراکش سے لے کر پاکستان تک یہ وہ واحد ملک ہے جس کی تاریخ اور پالیسیاں مسلمان دشمنی کی بنیاد پر مبنی ہیں۔

صرف ایک ہی راستہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو اس آئیڈیل پر جمع مت ہونے دو۔ کبھی جمہوریت لانے کا نعرہ بلند کرو اور رائیکشن کروادو اور کہیں دہشت گردوں کو ختم کرنے کے لیے ملک پر حملہ کر دو۔

اگر ایسا بار بار نہ کیا گیا تو 2020ء میں دنیا اس خلافت کے دروازے پر دستک دے گی جس کا مقابلہ اپنے وقت کی دوہر طاقتیں ایران اور روم نہ کر سکیں تھیں اور نہ ہی آج کی طاقتیں کر سکیں گی۔





ایک ہی مطالبہ ہوگا اپنی جنوبی سرحدیں بند کرو۔ وہاں غیر ملکی دہشت گرد ہیں۔ سرحدیں بند ہوں گی،، پھرے بٹھائے جائیں گے اور پھر ایک اور وزیرستان جنم لے گا۔

ایسے میں ایک ہی راستہ بچتا ہے، پاگل اور خبی انسان سے مقابلے کا راستہ۔ جب دیوانہ اینٹ اٹھاتا ہے تو پھر خاموش تماشائی نہیں بنا جاسکتا اس کا مل کر ہاتھ روکا جاتا ہے کیونکہ جنون میں ہمیشہ نشانہ خطا ہونے کا ڈر ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک اینٹ دو لوگوں کا بھی سر پھاڑ دیتی ہے۔



جائیں ورنہ کسی دوسری صورت میں امریکہ عراق کی طرح بری طرح پھنس جائے گا۔ امریکہ میں یہ جنون اور پاگل پن کس وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے لیے ذرا تین سال ماضی کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صدر بوش کی صدارت کے عہدے میں صرف ایک سال باقی تھا۔ اس وقت موجودہ امریکی حکومت کے پس پردہ کام کرنے والے گروہ NEO CONS نے امریکی حکومت کے سامنے ایک حکمت عملی رکھی تھی۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ امریکی صدر بوش شاید اس بار اپنی عدم مقبولیت کی وجہ سے جیت نہ سکیں اس لیے کم مدت میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اہداف کو حاصل کیا جائے اور اس کے لیے انہوں نے باقی ماندہ گیارہ مہینوں کی روزانہ کی حکمت عملی بنائی اور اہداف منتخب کر کے دیے اور اس جنگ کو بوش کے اگلے انتخاب سے پہلے ختم کرنے کے لیے کہا گیا لیکن پھر جب اس کا گراف بہتر ہونے لگا تو دوسری پالیسی کا اعلان شروع ہو گیا لیکن ان دونوں میں ایران پر حملہ اور اس کی سرکوبی سرفہرست تھی۔

عراق پر حملہ تو صرف اس لیے کیا گیا کہ وہ نزدیک ہونے کی وجہ سے ساتھ نہ دے اور دوسری یہ غلط فہمی کہ وہاں کے عوام امریکہ کے ساتھ ہیں۔ ایران ان ممالک میں سے ہے جس سے زخم خوردہ امریکہ تو پہلے ہی ہے لیکن اسرائیل کا خوف سب سے زیادہ ہے کیونکہ اسی کی مدد سے چلنے والی تنظیم، جس نے اسرائیل کو شکست دے کر علاقے خالی کرائے اور وہاں پر اپنا قبضہ قائم کرتے ہوئے اپنی حکومت مستحکم کی اور یہ تنظیم ایران کی مدد سے چل رہی ہے۔ اس لیے پہلا ہدف ایران بھی تھا لیکن جب عراق کی جنگ کے دوران پوری دنیا میں امریکہ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑی تو امریکہ نہیں بلکہ اسرائیل کا جنون دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنے بیانات کا رخ ایران کی طرف کیے ہوئے تھا۔ امریکہ میں یہودی لابی کو یہ خطرہ بھی تھا کہ عراق میں امریکیوں کی ہلاکتوں کے بعد امریکہ اپنا حملہ ایران ملتوی یا ختم نہ کر دے۔

ایسے میں اسرائیل کی طرف سے یہ بیان آنے لگے کہ ہم خود ایران پر حملہ کر دیں گے یہ ایسے ہی ہے جیسے باپ لڑنے سے ڈرتا ہو اور بچہ جا کر دشمن کو زخمی کر آئے اور اب خواہ مخواہ لڑنا پڑ جائے۔

ادھر یورپ کو اندازہ تھا کہ اگر ایران پر حملہ ہوتا ہے تو خلیج بند ہو جائے اور تیل کی سپلائی کی کمی ہونے کی وجہ سے قیمتیں تین گنا بڑھ جائیں گی۔ ایسے میں یورپ کی پوری معیشت تباہ ہو جائے گی۔ امریکہ کو فرق نہیں پڑتا وہ تو اپنا تیل ویزو ویلا سے منگواتا ہے۔ یہ سب ممالک امریکہ سے مہلتیں مانگنے لگے۔

ایران کو منانے لگے اور امریکہ کا جنون مزید بڑھتا گیا۔ NEO CONS کو اب جارج بوش کے دوسرے دور کا بھی خاتمہ نظر آیا اور امریکی آئین کے مطابق وہ تیسری بار صدر نہیں بن سکتے اور اب کے باران طاقتوں کے نمائندہ کے جیتنے کی امید بھی کم ہے۔ سو ایسے میں وہ ملک جواب تک اسرائیل کو 170 ملین ڈالر امداد دے چکا ہو، اس کے خلاف سلامتی کونسل کی 32 قراردادیں وینو کر چکا ہو، اس کا جنون اور پاگل پن عروج پر ہے۔

اس پاگل پن میں آج دنیا ایک بار پھر ایٹمی حملے کو دہانے پر آکھڑی ہوئی ہے۔ حملہ ایٹمی ہو یا روایتی ایران کو ڈٹ کر مقابلہ کرنا پڑے گا۔

ایسے میں جب میں اپنے کاسرلیسوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک عجیب و غریب صورت نظر آتی ہے۔ ایران کا چار سویل کا بارڈر، امریکہ کا حکم، مسلمانوں کی جہاد کے لیے تڑپ اور پھر جب لوگ یہاں سے ان کی مدد کو نکلیں گے تو پھر

ہو اور جس کی معیشت اور حکومت کا بچ کے ٹکڑوں کی طرح ٹوٹ کر نہ بکھری ہو۔

آج سے پانچ سال قبل جب ہم امریکہ سے اپنے تازہ ترین رومان کی داغ بیل ڈال رہے تھے تو تاریخ پر نظر رکھنے والے لوگ اسی خوف سے کانپ رہے تھے کہ کہیں ہمارا انجام اور حشر ویسا نہ ہو جیسے ان تمام ممالک کا ہوا تھا۔ اخلاقی غیرت و حمیت پر بار بار جنازہ لگتا رہا۔

ہندوستان لاہور میں میچ جیتا تو پاکستان آئے ہوئے ایک بھارتی صحافی نے لاہوریوں کے رقص و سرور پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اخبار میں یہاں تک لکھ دیا: ”لاہوریوں لگتا تھا جیسے ایک کتیا جو بن پر آئی ہو۔“

ہم خاموش رہے۔ یوں لگتا تھا گنگ ہو گئے ہوں اور ابھی چند دن قبل اسی بھارت سے آنے والے ایک اداکار نے ایک روشن خیال مجمع کے رویہ و ایسی زبان استعمال کی کہ قلم لکھنے سے قاصر ہے لیکن اس بھرے ہوئے مجمع میں سے ایک شخص بھی آواز بلند نہ کر سکا کہ شاید ایسا کرنے سے اس غیرت کا اظہار ہوتا تھا جسے پسند نہیں کیا جاتا۔

خیر یہ تو اخلاق کی بد حالی تھی کہ اس کے قصے اب گلی گلی اور محلے محلے عام ہونے لگ گئے ہیں لیکن ہم بھی ان ملکوں کی طرح فخر کرتے تھے کہ امریکہ سے ہماری دوستی ہے، ہماری معیشت مستحکم ہو گئی ہے، ہم خوشحال ہو گئے ہیں۔ اس پانچ سالہ تازہ رومان کے بعد ہمیں جو اعزاز حاصل ہوا ہے وہ امریکہ کی خارجہ پالیسی سے متعلق ایک رسالے ”Foreign policy“ میں انتہائی اہم ادارے ”Fund for peace“ کی ایک رپورٹ ہے جس میں اس نے ناکام ریاستوں کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ ان میں دنیا کے سوما لک میں دس کو ناکام ترین ریاستیں کہا گیا ہے جن کی بنیاد تین وجوہ ہیں:

(1) وہاں حکومت اپنی معیشت سنبھال نہیں سکتی۔

(2) وہاں عوام کو بنیادی سہولیات تک میسر نہیں۔

(3) وہاں عوام حکومت کو جائز تصور نہیں کرتے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر پاکستان نوین نمبر پر ہے یعنی ہم سے

زیادہ برے صرف 8 ممالک ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بنگلہ دیش 19 ویں نمبر پر، نیپال میسویں اور سری لنکا 25 ویں نمبر پر ہیں۔ اسی رپورٹ میں ایران 99 نمبر پر ہے۔ یعنی اس سے 96 ممالک زیادہ برے ہیں یا وہ 96 ممالک سے بہتر ہے۔ ہم نے یہ حیرت انگیز ترقی اتنی تیزی سے کی ہے کہ گزشتہ سال ہم 34 نمبر پر تھے اور آج 25 نمبر اور نیچے چلے گئے ہیں۔

تیسرا تحفہ جو امریکہ نے ہر اس ملک کو دیا جو اس کی وفاداری کے زنجیرے میں آیا وہ خانہ جنگی اور مستقل خلفشار ہے۔ ہمارے شمال میں وزیرستان اور جنوب میں بلوچستان اسی طرح سلگ رہے ہیں جیسے ان ممالک میں بد امنی کا بیج بویا گیا تھا لیکن اس سارے منظر نامے کا ایک اور خطرناک پہلو بھی ہے کہ جب امریکہ کسی ملک کو اس حالت تک پہنچا دیتا ہے تو پھر وہ اس سے دور جا بیٹھتا ہے۔ اس کے خلاف ہو جاتا ہے، اپنے ہی پیاروں کے تحفے لیتا ہے۔ شاہ ایران کو ذلیل و رسوا کرتا ہے۔

مارکوس کو دربار کی ٹھوکریں ملتی ہیں اور پونٹے کو 90 سال کی عمر قید۔ ایسے ہی لوگ اگر جہنم رسید ہو بھی جائیں تو کیا اس قوم میں لٹی ہوئی غیرت و حمیت، تباہ ہوئی معیشت اور بے سکون زندگی کے زخم بھرے جاسکتے ہیں۔

بس ایک نسل باقی رہ جاتی ہے جو اس دکھ پر غمزدہ رہتی ہے اور کہتی پھرتی ہے کہ کاش! ہم کف افسوس ملنے کی بجائے حکمرانوں کا دامن دھجیاں کر دینے جو وفاداری کی بنیادیں رکھ رہے تھے تاکہ ہماری بنیادیں کھوکھلی نہ ہوتیں۔

## اللہ ہمیں اس انجام سے بچائے

(13 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 12 مئی 2006ء)

میں جب تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے ایسے ملکوں کی داستانیں دیکھتا ہوں جنہوں نے امریکہ سے محبت، دوستی، وفاداری اور مفادات میں شراکت کی زندگی شروع کی۔ اپنی سرزمین، حکومت اور دیگر ادارے اس کے راستوں میں بچھا دیے تو مجھے وہ داستانیں عبرت کی دلدوز کہانیاں نظر آتی ہیں۔

ایسے لگتا ہے کہ بھوکے بھیڑیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بکریوں کے غلے پر ٹوٹ پڑا ہو اور جاتے ہوئے کہیں لاشوں کے انبار اور کہیں زنجیروں کی چیخ و پکار کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ یہ منظر مسلمان ملکوں تک محدود نہیں بلکہ جس کسی نے اس مملکت سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اس نے تین نتائج اپنی دھرتی پر ضرور دیکھے: غیرت و حمیت، شرم و حیا اور اخلاق کا جنازہ۔ معاشی بد حالی، بے یقینی اور ناکام انتظام سلطنت..... تاریخ اس انجام پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔

فلپائن وہ ملک تھا جس میں امریکی مداخلت کا آغاز 1890ء کے قریب سب سے پہلے ہوا۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ ہم وہاں کے عوام کو اسپین کے ظالمانہ اور جاہلانہ قبضے اور نظام سے آزادی دلانا چاہتے ہیں اور ان آزادی کے متوالوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں جو اس غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ یوں اسپین وہاں سے روانہ ہوا لیکن اس ملک کے عوام ایک ایسی خوفناک فوج کے پنجے میں آگئے جنہوں نے سب سے پہلے اپنی تعیش اور عشرت کدوں کو آباد کرنے کے لیے اس قوم کی کسن بچیوں کو بازار میں لا بیٹھایا۔ حالت یہ تھی کہ اس کاروبار کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک یونٹ جو ایک کرل کے ماتحت تھی وہ متعین کی گئی جس کا اور کوئی کام نہ تھا۔

پوری معیشت کو اپنے دست نگیروں بنایا کہ صرف چھاونیوں کے کرایے اور بیرون ملک گھریلو خواتین ملازموں کی آمدنی کے سوا اس ملک کی گزر اوقات کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ چند ناؤ کے مسلمانوں کے خلاف حکومت سے کارروائیاں کرا دی گئیں اور یوں وہاں مستقل طور پر ایک ایسی بد امنی کا راج قائم ہوا کہ یہ ملک آج تک اس دوستی اور وفاداری کے زخم چاٹ رہا ہے۔

اس ملک کے قرب و جوار میں تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا اور ویت نام جیسے ممالک نظر آئیں گے جہاں امریکی کہیں تو پڑوسی ملک پر حملے کرنے کے لیے داخل ہوئے تو کہیں اسٹریٹیجک امداد کے طور پر تو کسی جگہ معلومات کے تبادلے اور بھگڑوں کے خلاف کارروائی کے لیے لیکن یہ سب کے سب امریکیوں کے جانے کے بعد ٹھیک انہی تین مسائل کا شکار نظر آئے۔ ان کے بڑے بڑے شہر عیاشی کے اڈے بن گئے۔ ان کے لوگ بے روزگار اور ان کی حکومتیں ناکام۔

ایسی ہی کیفیات لاطینی امریکہ کے ممالک کے ساتھ پیش آئی۔ چلی سے لے کر گرینیڈا تک اور میکسیکو سے لے کر نکاراگوا تک کون سا ایسا ملک ہے جس نے اس عالمی طاقت کا ظلم و ستم نہیں دیکھا۔ اس کی اخلاقی باخستگی نہ ملاحظہ کی

قابو میں نہ رکھ سکا، اس کا کام تمام کر دیا۔

یہاں مقدمہ کے دوران ایک دوسرا کردار سامنے آتا ہے۔ سر میاں محمد شفیع، انگریز سے سر کا خطاب حاصل کیا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کے درجے تک پہنچے۔ مغربی تعلیم سے آراستہ۔ خانساں کا دفاع کرنے والے وکیل کی حیثیت سے عدالت پہنچے تو بحث کے دوران مسلسل آنسو جاری رہے۔ بھری عدالت میں ہائی کورٹ کے انگریز جج نے حیرت سے سوال کر دیا۔

سرفیض! کیا آپ جیسا ٹھنڈے دل و دماغ کا حامل روشن خیال اور بلند پایہ وکیل بھی اس طرح جذباتی ہو سکتا ہے؟ سرفیض نے بہتے آنسوؤں کے بیچ ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: ”می لارڈ! آپ کو معلوم نہیں کہ ایک مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کتنی عقیدت اور محبت رکھتا ہے۔ اگر اس خانساں کی جگہ سرفیض بھی ہوتا تو خدا کی قسم وہی کرتا جو اس نے کیا ہے۔“

حیدر آباد سندھ کی سڑکوں پر تانگہ چلانے والا عبدالقیوم دن رات اپنے گھوڑے کی دیکھ بھال کرتا اور سواریاں اٹھا کر رزق کا سامان مہیا کرتا، سادہ سا مسلمان، آریہ سماج لیڈر نتھو رام نے اپنی کتاب ہسٹری آف اسلام میں سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ مقدمہ عدالت میں چلا، مسلمانوں کے دل زخمی تھے۔ اسے معمولی سا جرم قرار دے کر چند ماہ کی سزا سنائی گئی۔ اس نے اس سزا پر اپیل کی تو اپنا تانگہ گھوڑا کسی کے سپرد کر کے عدالت جا پہنچا اور بھری عدالت میں نتھو رام کو جہنم واصل کر دیا۔

مقدمہ چلا، عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تو تشکر کے آنسو آنکھوں میں لیے کہنے لگا: ”جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے موت کی سزا سنائی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے؟ اگر میرے پاس لاکھ جانیں بھی ہوئیں تو ناموس رسالت ﷺ پر بچھاؤ کر دیتا۔“

اس شیخ کے پروانوں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔ یہ اپنے جرم کو اپنی آخرت کا سرمایہ تصور کرتے ہیں۔ یہ جرم سے انکار نہیں کرتے، خودکشی ان کے دستور و فامیں حرام ہے۔ یہ اس لمحے کا انتظار کرتے ہیں جب ساقی کوثر کے دربار میں سرخرو ہو کر جانے والے ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ آج اس لیے یاد آ رہے ہیں کہ اس فہرست میں آج پھر ایک ایسے شخص کا اضافہ ہوا ہے جو مغربی تعلیم سے آراستہ اور اس دلیں میں تحصیل علم کے لیے گیا تھا۔ عامر چیمہ..... لیکن رسالت مآب ﷺ سے عشق کی چنگاری تو نصیب کی بات ہوتی ہے۔

یہ تو وہ منصب ہے کہ جس پر رشک کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا: ہم تو باتیں کرتے رہ گئے اور ترکھانوں کا لڑکا بازی لے گیا۔ اس بازی جیتنے کی سند میرے آقا نے خود عطا کی ہے۔

آپ نے فرمایا: تم اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک میں تمہیں اپنے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب اور عزیز نہ ہو جاؤں۔ مشرق کے پروردہ ہوں یا مغرب کے ماں باپ سے تمسخر کوئی برداشت نہیں کر سکتا اور یہاں تو ان سے زیادہ محبت کا سوال ہے۔ محبت جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ جس کے جذباتوں کی مہک اور قربانی سے پھول کھلتے ہیں۔ دریدہ دہنوں کی زبانوں پر قفل لگتے ہیں۔

## ان شہیدوں کی دیت، اہل کلیسا سے نہ مانگ

(20 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 19 مئی 2006ء)

شہر لاہور نے اس سے بڑا جنازہ نہیں دیکھا تھا۔ آنکھیں عشق رسالت ﷺ کے جذبے سے اشکبار تھیں اور بازو اس جنازے کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بے تاب۔ پچپن سالہ علامہ اقبال بھی اس سعادت کو حاصل کیے ہوئے تھے اور کہتے جاتے ”اسی گلاں کر دے رہے تہ تر کھاناں دامند بازی لے گیا۔“ ہم باتیں کرتے رہے اور ترکھانوں کا بیٹا بازی لے گیا۔ وہ مقدمہ جسے لڑنے کا اعزاز محمد علی جناح، تصدق حسین خالد، خواجہ فیروز الدین اور خواجہ نیاز احمد جیسے لوگوں کو حاصل رہا۔ بڑھئی کا بیٹا غازی علم الدین شہید جسے علامہ اقبال نے لحد میں اتارا اور اس فضا میں یہ شعر پڑھا۔

ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ

قدرو قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

عاشقان رسول ﷺ کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اتنی ہی طویل ہے جتنی گستاخان رسول ﷺ کی۔ میں اس تاریخ میں نہیں جانا چاہتا کہ بعثت نبوی ﷺ کی پہلی صدی میں ہی مسیحی یورپ نے اسلام نہیں بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت کو اپنا ہدف بنایا۔ سینیٹ جان آف ویشن نے 753ء میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ میں وہ الفاظ یہاں درج کر کے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس آغاز سے لے کر آج تک کتابوں، رسالوں، اخباروں اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانوں کے اس عشق کا امتحان لیا جاتا رہا جو سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کرتے ہیں۔

تاریخ اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ اس عشق اور وارفتگی کا تعلق علم دین، شرع پر عمل، ظاہری وضع قطع یا علمی پس منظر تک محدود نہیں بلکہ گناہ گار سے گناہ گار شخص بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہے اور آخرت میں شفاعت کا ذریعہ۔ مجھے اس خانساں کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ سے عشق کے دو کردار یاد آ رہے ہیں۔

خانساں جو رزق کی خاطر انگریز فوج میں ملازم تھا اور ایک انگریز فوجی میجر کے گھر میں خانساں کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ اسی فوج کا حصہ جس نے انگریزوں کے حکم پر خانہ کعبہ میں گولیاں برسائیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے خون سے انور کمال پاشا کی فوج سے مقابلے کے دوران ہاتھ رنگے۔ 1932ء میں اس میجر کی بیوی نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو وہ خانساں جسے مدتوں آرڈر آف آرڈر (حکم، حکم ہوتا ہے) کا درس ملا تھا اپنے جذبات

1961ء کی اس سالانہ کتاب میں یہ حیرت انگیز انکشاف ملتا ہے کہ امریکہ کے جرائم میں گزشتہ پوری دہائی یعنی 1950ء سے 1960ء تک کے مقابلے میں 68 فیصد اضافہ ہوا اور یہ اضافہ اتنا اچانک تھا کہ سب طرف محسوس کیا گیا۔ یہی کچھ اس سال کی ایف بی آئی کی رپورٹ میں تھا کہ اس سال آبادی 4 فیصد کی بجائے ایک فیصد بڑھی لیکن جرم میں اضافہ گیارہ فیصد ہوا۔

1961ء میں سالانہ کتاب کے مطابق یہ اضافہ 100 فیصد ہو گیا اور 1963ء میں جرم کی دنیا کو جیسے آگ لگ گئی۔ اس کتاب کے 185 صفحے پر وہ تفصیل درج ہے جس میں ذکر ہے کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد سکول کے نوجوان طلبہ ہی وہ لوگ تھے جو جرائم کی دنیا میں سب سے آگے آگئے تھے۔ چوری میں 24 فیصد اضافہ ہوا اور ڈکیتی میں 29 فیصد اور اس 3 سال کے عرصے میں کسی جرم میں کوئی کمی نہ آئی۔ یہاں تک کہ ان کے بے راہ رونو جوانوں نے 1963ء میں 13 ہزار 190 پولیس اہلکاروں پر قاتلانہ حملے کیے اور یہ حملے آج تک بڑھ ہی رہے ہیں۔ یہ سب حملے نوجوانوں کے باغی قسم کے گروہوں نے کیے جو چوری، ڈکیتی اور جبری زنا کے چکر میں اپنے شکار کی تلاش میں تھے اور پولیس والے وہاں ڈپٹی دے رہے تھے۔

1958ء میں 2 لاکھ 80 ہزار کس مجرم گرفتار ہوئے تھے جبکہ 1962ء میں یہ تعداد 8 لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سال کی کتاب کے صفحہ 203 سکولوں میں ڈپلن کے بارے میں بھی ایک تفصیل درج ہے۔ سکولوں میں 80 فیصد طلبہ ایسے پائے گئے جو اساتذہ سے بدتمیزی کرتے ہیں۔

اسکول سے بھاگتے ہیں یا کمزور طلبہ کی پٹائی کر کے انہیں زخمی کرتے ہیں۔ گلبرٹ ریسرچ سروے نے طلبہ کے اس رویے کا اسی سال جائزہ لیا تو انہوں نے بتایا کہ ان میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ ان میں اپنے سے بڑوں کا ادب ختم ہو گیا اور وہ نہ ماں باپ کی عزت کرتے ہیں نہ استاد کی۔

جب سکولوں کے نصاب سے خدا کو رخصت کیا گیا تو جنس بھی تیار ہوئی اس کے گھر کس عذاب کا شکار ہوئے اس میں صرف ایک معاملے میں اعداد و شمار پیش کرنا ہی خاندانی نظام کی تباہی بتانے کے لیے کافی ہے۔ وہ اعداد و شمار طلاق کی شرح سے متعلق ہیں۔

1960ء سے لے کر 1975ء تک کی طلاق کی شرحوں کا جائزہ لیا گیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ وہ معاشرہ جس میں 1960ء میں صرف 33 ہزار طلاقیں ہوئی تھیں لیکن جیسے ہی 1960ء میں اس لاد مذہب نصاب تعلیم میں پلنے والی نسل جوان ہو کر باہر آئی تو 1975ء یعنی ٹھیک 15 سال بعد امریکہ میں 10 لاکھ 36 ہزار طلاقیں ہوئی اور ان کی شرح 50 فیصد بنتی ہے یعنی ہر 2 شادیوں میں ایک شادی ناکام ہوئی۔

یہ سب اعداد و شمار آج سے 30 سال پرانے ہیں اس زمانے کے ہیں جب اس گاڑی کا جسے نصاب تعلیم کہتے ہیں، رخ لاد مذہبیت کی طرف جوڑا جا رہا تھا۔ اور اس کے معاشرے پر حیران کن اور دردناک نتائج سامنے آگئے تھے۔ آج تو جو کچھ اس ”مذہب“ ملک میں انسان پر بیت رہی ہے اس کا بیان رونگٹے کھڑا کر دیتا ہے۔

جہاں ہر سال 10 لاکھ کس بچیاں ناجائز بچے پیدا کرتی ہوں اور اتنی ہی اسقاط حمل کرواتی ہوں۔ جس ملک میں ہر دوسرے منٹ ایک عورت کے ساتھ جنسی زیادتی ہوتی ہو ایسے معاشرے کا 1960ء سے پہلے تصور بھی نہیں تھا۔

## صرف نصاب تعلیم بدلنے سے

(27 ربیع الثانی 1426ھ بمطابق 26 مئی 2006ء)

بڑے بڑے ستونوں اور لمبے لمبے برآمدوں میں آراستہ منصوبوں کی تصاویر والی عمارت میں 1960ء میں امریکہ کے ایک ایسے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی جس نے اس معاشرے کا رخ مکمل طور پر تبدیل کرنا تھا۔ سپریم کورٹ کے ججوں کے سامنے یورپ کی مثالیں دی جا رہی تھیں۔

دیکھیں! فرانس میں انقلاب فرانس کے فوراً بعد ”مہذب“ لوگوں نے اپنے سکولوں، نصابوں اور اساتذہ کی گفتگو سے مذہب کو خدا حافظ کہہ دیا تھا اور وہ آج کیسے امن اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ ان کی نسلیں کسی خوف اور ڈر کے بغیر اپنی زندگی جیسی چاہے گزارتی ہیں۔ یورپ کے ایک ایک ملک کے مثال دی گئی:

انگلینڈ سے لے کر جرمنی تک اور ناروے سے لے کر اسپین تک، کلیسا کے ظلم کی داستانیں سنائی گئیں اور مقدمہ لڑنے والے وکیلوں نے نصاب تعلیم سے ”خدا“ کو نکالنے کی جنگ زور و شور سے لڑی اور پھر سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ججوں نے کمال مہربانی کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ سے سکولوں میں مذہب صرف تاریخ کے ایک حصے کے طور پر پڑھایا جائے یا پھر ثقافت کی ایک شاخ کے طور پر نصاب میں شامل کیا جائے اور اس کے وہ عناصر جن میں آخرت کا دن اور حساب و کتاب کا خوف اور مصیبت میں کی جانے والی دعاؤں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ مذہب کے وہ ہیرو جو امریکہ کی سرزمین سے تعلق نہیں رکھتے ان کا تذکرہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

یوں 1960ء کے بعد امریکہ کے سکولوں سے وہ سب کچھ رخصت ہو گیا جس میں مذہب کی بنیاد پر قائم اخلاقیات کا وجود پایا جاسکتا تھا۔ نہ اسمبلی میں پڑھی جانے والی دعائیں باقی رہیں اور نہ ہی نصاب میں اخلاقی جرائم پر آخرت کی پکڑ اور جوابدہی کا تذکرہ ہوتا۔ بس امریکہ کے کرنسی نوٹوں پر ایک عبارت باقی رہ گئی: ”In GOD we trust“ (ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں) اور پوری نسل اس خدا کے بتائے ہوئے اصول و قواعد سے بے بہرہ ہونے لگی۔

صرف نصاب تعلیم سے خدا کو ”خدا حافظ“ کہنے سے امریکی معاشرے پر جو قیامت ٹوٹی اور تعلیمی اداروں میں جو ابتری آئی اس کا ذکر دردناک بھی ہے اور خونچکاں بھی۔ امریکہ میں ہر سال ایک year hour چھپتی ہے جسے Collier کہہ کر شائع کرتی ہے۔ اس میں امریکہ کے اس سال کے بارے میں تمام معلومات درج ہوتی ہیں جن میں سکولوں کی حالت سے لے کر جرائم کے تذکروں تک سب کچھ درج ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایف بی آئی کی رپورٹیں بھی یہ تمام احوال بتاتی ہیں۔



یہ سب اس خوف کے عالم میں یاد آرہا ہے آج ویسا ہی المیہ میرے ملک میں جنم لینے کو ہے۔ ویسی ہی بحث جاری ہے۔ اسی طرح مذہب کو سکولوں سے نکالنے کے حق میں دلائل دیے جا رہے ہیں۔  
اسے ترقی کے راستے میں رکاوٹ سمجھا جا رہا ہے۔ ایسے میں اس قوم کا حال اس لیے بیان کر دیا ہے کہ شاید اجڑی بستیوں اور بے سکون انسانوں کی حالت دیکھ کر کسی کو غیرت آئے، کوئی عقل سکھے، کسی کو خدا یاد آجائے۔



## انجام کی دستک ہو رہی ہے

(12 جمادی الاول 1426ھ بمطابق 09 جون 2006ء)

بالکل ویسا ہی منظر بنتا ہوا نظر آرہا ہے۔ یوں لگتا ہے تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہرا رہی ہے۔ اس سرزمین پر ہمیشہ سے بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ان کے کاسرہ لیس حکمرانوں کے انجام سے بھی دنیا واقف ہے۔ لاہور شہر میں پناہ حاصل کرنے کے لیے شاہ شجاع افغانستان میں اپنے تخت سے محروم ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ یہاں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی وہ اس کی پناہ میں زندگی کے ایام گزار رہا تھا جہاں وہ اپنی دولت وہاں سے سمیٹ کر یہاں آیا تھا وہیں اس نے اپنی پگڑی کے پتھروں میں مشہور زمانہ کوہ نور کا ہیرا بھی چھپا رکھا تھا جس کے لالچ میں اسے یہاں پناہ دی گئی تھی۔

یہ قصہ طویل بھی ہے اور عبرتناک بھی کہ کیسے رنجیت سنگھ نے اس سے وہ ہیرا چھینا اور اپنے تاج میں سجا کر حضوری باغ کی بارہ دری میں اپنی ازسرنو تاج پوشی کروائی۔ لیکن اس لوٹ کھسوٹ کے عالم میں شاہ شجاع کو انگریزوں سے وفاداری کی راہ و رسم پیدا کرنے کا موقع ملا اور وہ تمام معاملات طے ہو گئے جس کے بعد اسے افغانستان میں ایک کاسرہ لیس کی صورت میں دوبارہ تخت پر سرفرازی کے لیے جانا تھا۔

ایک مرعوب ”نمک حلال“ اور کاسرہ لیس شخص ہاتھ آیا تو انگریزوں نے افغانستان پر چڑھائی کر دی اور 1839ء میں اسے کابل کے تخت پر بٹھا دیا۔ فوری مقابلے کی سکت نہ رکھتے ہوئے دوست محمد جو اس وقت افغانستان کا حکمران تھا پسپا ہو کر بامیان صوبے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس کے بیٹے اکبر خان نے افغان قبائل کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور وطن سے انگریزوں کے ناپاک قدم اکھاڑنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس وقت افغانستان میں ساڑھے چار ہزار انگریز سپاہی اور بارہ ہزار خدمت گار موجود تھے جنوری 1842ء کی سرد ہواؤں اور برف پوش وادیوں کے جلو میں افغان قبائل نے ان پر حملے شروع کیے اور وہ لوگ جو صرف دو سال پہلے فتح کے نشے میں سرشار تھے پسپا ہونے لگے اور انجام یہ تھا کہ ان میں سے صرف ایک ڈاکٹر ڈبلیو براعدان زندہ حالت میں واپس جاسکا۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اسے اس لیے زندہ جانے دیا گیا تا کہ وہ جا کر اپنے انگریز ہم قوم آقاؤں کو افغانوں کی حریت اور آزادی کی کہانی سناسکے۔

تاریخ کا یہ سبق شاید امریکی افواج نے نہ پڑھا ہو لیکن افغان قوم کا بچہ بچہ اس داستان سے باخبر ہے۔ انہیں اپنی غیرت و حمیت کی کہانیاں ازبر ہیں۔ افغان جنگوں کے اوپر برطانیہ میں مرتب کردہ رپورٹوں کا انچوڑ British battles نامی اس ویب سائٹ میں یوں سامنے آتا ہے لیکن اس ملک پر قبضہ کرنا اور ان پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت مسلط کرنا ایک ناممکن اور قطعی طور پر ناقابل عمل بات ہے جس نے بھی ایسا کرنے کی کوشش کی اس نے خفت،

شرمندگی اور بے انتہا جانی اور مالی نقصان اٹھایا۔“

اب ذرا افغانستان کی تاریخ سے بے بہرہ امریکی فوج اور اس کٹھ پتلی حکومت کا حشران کی اپنی زبان میں ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ اب کس کی موت اور انجام کا میدان سجنے والا ہے۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق جب امریکی فوج کا کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ایکن بیری جنوبی علاقوں کی طرف اپنے زعم میں روانہ تھا اس کی تمام تر فوج اور حفاظتی بندوبست کے باوجود چھوٹے سے قصبے کے ایک دکاندار نے روک کر کہا تمہیں علم ہے کہ تمہارے چاروں جانب طالبان ہی طالبان ہیں۔

اپنے تمام تر لاؤ لشکر کے باوجود خوفزدہ جنرل واپس پلٹ گیا کیونکہ اس سے پہلے صرف چند ہفتوں میں وہ طالبان کے ہاتھوں چار سو لاشیں اٹھا چکے تھے۔ ان میں ان کے ہم وطن بھی تھے اور ان کا ساتھ دینے والے غداران وطن بھی۔ ایسے میں جہاں قدم قدم پر موت کھڑی ہو، راستے طالبان کی عقابنی نگاہوں کی زد میں ہوں تو پھر دور فضاؤں سے بم برسا کر ہی انتقام لیا جاتا ہے۔ جم لوب کی رپورٹوں کے مطابق گزشتہ مہینے میں صرف ہوائی بمباری کے ذریعے معصوم شہریوں کے مرنے کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ خواتین، بچے، مسجدوں کے نمازی سب کو یا تو یہ کہا گیا کہ طالبان ہیں یا پھر طالبان کے دوست اور فضا سے بم برسا کر شہید کر دیا گیا۔ لیکن اس سے سب امن کہاں ہوتا تھا۔

وہ شہر جسے وہ پورے افغانستان میں محفوظ تصور کرتے تھے اس کے درو دیوار اور گلی کو پچے غصے سے پھرے ہوئے لوگوں کی آوازوں سے گونج اٹھے۔ تاریخ نے وہی منظر دیکھا جو سالوں سے فلسطین میں دیکھتے آرہے ہیں۔ غاصب فوج کے نینک اور نبتے عوام ان پر پتھروں کی بارش کرتے ہوئے یہ سب کیسے ہو گیا؟ مارک شنڈر نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں کہا جو ICG انٹرنیشنل کرائس گروپ نے چھاپی۔

اس نے کہا کہ 2001ء سے افغان غربت کی انتہائی گہرائیوں میں چلے گئے ہیں۔ پورے کا پورا افغانستان غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ چند لوگ پوست اگا کر لاکھوں ڈالر کماتے ہیں۔ ان اسمگلروں کے جھتے کے جھتے جدید اسلحے کے ساتھ ملک میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یوں خوفزدہ افغان اس بلی کی صورت میں جو دیوار سے لگ چکی ہو اور منہ نوچنے کو تیار ہو۔ ان حالات میں 23 ہزار نیٹو فوجی وہ تر نوالہ ہیں جو افغان غصے کا شکار ہونے کو ہیں لیکن اب اتحادی ممالک میں سے تو کوئی ایک بھی اپنی فوج بھیج کر موت کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔ گزشتہ دنوں ہندوستان کو لالچ دیا گیا لیکن محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور احمد شاہ ابدالی کی چوٹ کھائے ہوئے ہندوؤں نے انجام کے خوف سے انکار کر دیا۔

انجام قریب ہے اور پوری دنیا کے اخبار، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور سیاسی رہنما اس کی چاپ ستار ہے ہیں۔ ایسے میں کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایک عجیب شرمندگی گھیر لیتی ہے..... ہم کس ماضی اور کس حال پر فخر کریں؟ ہم وہی تھے جو انگریزوں کے ساتھ شاہ شجاع کی حکومت قائم کرنے گئے اور انگریز فوجیوں کے ساتھ ہمارے برصغیر کے مسلمان فوجیوں کے مقبرے بھی دیں بنے اور تاریخ کے دوسرے شاہ شجاع کو قائم کرنے، اسے حکومت دلانے کے لیے ہمارے ہوائی اڈوں سے امریکی افواج نے نبتے افغان پر 57 ہزار حملے کیے۔

تاریخ اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا پہیہ گھومتا ہے، کچھ کے حصے میں غیرت و حمیت سے جینے کا تاج آتا اور کوئی میر جعفر اور میر صادق کی طرح نفرت کا طوق پہن لیتا ہے۔ جیسے جس کی قسمت اور جیسے جس کے اعمال۔

## اعزاز

(19 جمادی الاول 1426ھ بمطابق 16 جون 2006ء)

جنگ عظیم اول کے بعد جب مسلمانوں میں نسلی عصبیت اور علاقائی تفاخر کی آگ بھڑکا کر انہیں ایک مرکز سے علیحدہ کر کے چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بانٹا گیا تو ان پر اپنی مرضی کے کاسہ لیس حکمرانوں کو مسلط کر دیا گیا۔ یہ حکمران یوں تو کہیں حجاز، کہیں فلسطین اور کہیں عراق عجم کا نعرہ لے کر اٹھے..... لیکن ان کے دل اپنے مغربی آقاؤں کے لیے دھڑکتے رہے اور ان کی دفاؤں کا مرکز بھی امریکہ یا مغرب ہی رہا۔

ایسے ہی ایک ملک اردن پر غداری کے صلے میں شریف مکہ کی اولاد کو حکمران بنایا گیا۔ یوں اس ملک پر جو بھی حکمران رہا اسے یہاں بسنے والوں کے خیالات، خواب، امنگوں اور آرزوؤں سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ لوگوں کے دل امت مسلمہ کے لیے دھڑکتے تھے لیکن حکمرانوں کی مصیحتیں ان کے آوازوں کو دبانے پر مجبور تھیں۔

اسی ملک کے چھوٹے سے قصبے زرقا میں 1967ء کے سال ایک بچے نے جنم لیا۔ عرب قوم اسرائیل سے جنگ میں شکست سے دو چار ہو چکی تھی، میں نے عرب قوم اس لیے کہا کہ اس جنگ کے آغاز میں جمال عبدالناصر نے تقریر کرتے ہوئے مصریوں کو ”آل فرعون“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

شکست تو آل فرعون اور آل قریش کی تھی لیکن امت مسلمہ کے دل غمزدہ تھے جیسے دکھوں کا پہاڑ ان نسلی تفاخر والے حاکموں پر نہیں بلکہ امت مسلمہ پر ٹوٹا ہو۔ ایسے تناظر اور افسردگی کے عالم میں یہ بچہ زرقا کے ایک کارخانے میں کام کرنے والے صوم و صلوة کے پابند شخص کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس قصبے کے لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ بچہ ارد گرد کے آزاد خیال ماحول سے بالکل مختلف تھا۔

اس پر شروع ہی سے مذہبی رنگ غالب تھا۔ اسے ان تمام معاملات سے قطعاً دلچسپی نہ تھی جو شاہی خاندان کے اقتدار کو طول دینے کے لیے لہو لعل اور عیش و عشرت کے جال بنے ہوتے ہیں۔ یوں تو یہ بچہ ایک سکول میں زیر تعلیم تھا اور مسجد میں نماز بھی ادا کرتا تھا لیکن اس کے بچپن کے ساتھی اس کے جذبہ جہاد کی تڑپ کا ذکر اس والہانہ انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس کے نزدیک امت مسلمہ کے زوال کا سبب مرکزیت کا خاتمہ اور کاسہ لیس حکمران تھے۔ یوں اس نے اپنے اس جذبے کی تسکین کی راہیں ڈھونڈنا شروع کیں.....

اس زمانے میں افغانستان کے عوام روس کے غاصبانہ قبضے کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ بچہ جواب جوانی کی حدود میں داخل ہی ہوا تھا اپنا گھر بار، وطن اور اپنے پیارے چھوڑ کر افغانستان جا پہنچا اور افغان جہاد میں سرگرم ہو گیا۔ وہ کچھ دیر پشاور کے علاقے ”حیات آباد“ میں بھی مقیم رہا جہاں سے اس نے جہاد نام کا ایک رسالہ بھی

## نہ رات سکھ نہ دن چین

(26 جمادی الاول 1427ھ بمطابق 23 جون 2006ء)

یہ قوم اس رہگور پر آباد ہے جو یورپ کے سمندر کو ایشیا اور افریقہ کی سرزمین سے نہر سوز کے ذریعے ملاتی ہے۔ عرب کے خطے عدن کے بالکل مد مقابل نجاشی کے دیس حبشہ کی یہ آبادیاں جنہیں اقتدار اور وسائل پر قبضے کی جنگ میں یوں تقسیم کیا گیا جیسے میز پر کیک رکھ کر کاٹا جاتا ہے۔ حصوں، بجزوں میں بانٹ دیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کی سرحدیں بنادی گئیں تاکہ یہ لوگ انہیں سرحدوں کی حفاظت میں خون بہاتے رہیں۔

پوری مغربی دنیا کو خوف تھا کہ اگر سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی یہ قوم ایک دفعہ متحد ہوگئی تو مغربی استعمار کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے انہیں وسائل لوٹنے سے روکنے کے لیے ایک اور مہدی سوڈانی پیدا ہو سکتا ہے۔ ان منقسم ممالک میں ایک صومالیہ ہے۔ جب مغربی ممالک کے جہاز عدن کی بندرگاہ سے تجارتی قافلوں کی صورت گزرا کرتے تھے تو انہیں ان صومالی مسلمانوں سے ہمیشہ ایک خوف رہتا کہ کہیں ہماری تمام منفعت ان کے حملوں کی نذر نہ ہو جائے۔ یوں انہوں نے اس علاقے پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

1869ء میں نہر سوز کھلی تو یہ ملک ان افواج کا گڑھ بن گیا اور 1885ء میں اسے برطانوی کالونی کی حیثیت دے دی گئی۔ اسے صومالی لینڈ کہتے تھے لیکن یہاں کے منہ زور مسلمان قبائلی لوگ برطانیہ کے ساتھ مسلسل نبرد آزما رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے 1910ء میں اسے اپنے ملک سے نکال باہر کیا مگر وہ 1920ء دوبارہ یہاں پر قابض ہو گئے۔

جنگ عظیم دوم میں یہ ایک اٹلی اور برطانیہ کی افواج کے درمیان میدان جنگ رہا اور اتحادی افواج کی فتح ہوئی لیکن یہ واحد ملک تھا جس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کیونکہ چاروں اتحادی چاہتے تھے کہ اس گزرگاہ پر آباد ملک پر ان کا قبضہ ہو۔ یوں اس ملک کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں دے دیا گیا اور اس کا نام صومالیہ رکھ دیا گیا۔ یوں یکم جولائی 1960ء کو اسے آزادی دے دی گئی۔

اس کے بعد کی کہانی بہت الناک ہے۔ حریت اور آزادی کے علمبردار اس ملک پر ارد گرد کے ممالک اور قبائل سے حملے کروائے گئے۔ ان میں قبائلی سرداروں کو اسلحہ دے کر آپس میں لڑوایا گیا۔ ایک حکومت کا تختہ الٹا تو دوسری قائم ہوئی مگر امن اس خطے سے اٹھا۔ 1991ء میں پچاس ہزار لوگ لڑائی میں مرے تو تین لاکھ قحط سے مر گئے۔ انسانی امداد وہاں جان بوجھ کر پہنچنے نہ دی گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب جنرل فرح عدیدہ ایک ایسا ہیرو بن کر سامنے آیا جس نے امریکی افواج کو چند ہفتوں میں اپنی لاشیں اٹھا کر بھاگنے پر مجبور کیا کیونکہ اس کے مطابق یہ لوگ خوراک دینے کے بہانے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ایسے شخص کو امریکی کہاں برداشت کر سکتے تھے، اسے ایک مقامی قبائلی کو پیسے دے کر مراد دیا گیا۔

نکال لیت جیسے ہی روسی افغانستان سے نکلے یہ نو جوان واپس اپنے ملک جا پہنچا۔ اب اس کے دل میں ایک ہی تڑپ اور ایک ہی لگن تھی۔

یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت کا قیام۔ اس کے گرد وہ کو تو حید کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایسے لوگ شاہی خاندان کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔ یوں اس نو جوان کو اردن میں اسلامی خلافت قائم کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ سزا کاٹ کر نکالا تو اسے چین سے جینے نہ دیا گیا۔

اس نو جوان مجاہد کا نام ابو مصعب الزرقادی تھا جسے جام شہاد نوش کرنے کا اعلیٰ اعزاز نصیب ہوا۔ زرقادی کی سوچ اور اس کی فکر اس کے عمل کے ساتھ یوں ہم آہنگ تھی کہ دنیا کے جس خطے میں مسلم امہ پر تشدد، بربریت اور غاصبت کا غلبہ ہوتا یہ شخص اپنی جان لے کر وہاں پہنچ جاتا کہ نذرانے میں دینے کے لیے اسے یہی تو اپنے رب کا نجات کی طرف سے ملا تھا۔

دنیا بھر کے ممالک میں چھپتا چھپاتا اور لڑتا بھڑتا یہ مجاہد بالآخر اس میدان کارزار میں جا اتر ا جو دلہ و فرات کے کنارے امریکہ کی فوج نے آباد کیا تھا۔ وہ ملک جس میں امریکی ایک خواب لے کر داخل ہوئے تھے۔ گلے میں پڑنے والے ہاروں کا خواب، ایک طویل اور کامیاب حکومت کا خواب، تیل کی دولت پر قبضے کا خواب۔ اس خواب کو ٹوٹنے میں جہاں عراقی عوام کی غیرت و حمیت کا دخل ہے وہاں زرقادی کے جذبہ جہاد اور جوش ایمانی کا بھی حصہ ہے۔ وہ شخص جس نے 2001ء میں امریکہ کے افغانستان میں ایک بڑے کمپ پر حملہ کر کے بہت سے امریکیوں کو مارا تھا یہ آج ان کے لیے ایک بے نیام تلوار تھا۔ ادھر عراق میں 2003ء تک آتے آتے اس کا نام خوف کی علامت بن گیا تھا۔

امریکی جریڈوں کے مطابق جس شہر میں اس کی موجودگی کی اطلاع ملتی وہاں پر امریکی افواج گشت کرنے سے انکار کر دیتیں۔ 2006ء تک پہنچتے پہنچتے روزانہ امریکی سپاہیوں کے مرنے کی اوسط 4 سپاہیوں تک جا پہنچی اور ان کے ساتھ رہنے والے غداروں کا تو حساب مشکل ہو گیا۔

اس مجاہد کی آخری آواز اس کی ویڈیو کیسٹ پر 5 مئی 2006ء کو پوری دنیا نے سنی۔ ایک آواز جس میں جذبہ تھا، تڑپ تھی، بے خوفی تھی، جوراتوں کی نیندیں حرام کر سکتی تھی اور پھر 8 جون کو یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی گئی۔

اپنے حصے کا خون دے کر مالک کائنات کے حضور سرودھو ہونا تو ایک ”اعزاز“ کی بات ہے لیکن کچھ قوموں کے حصے میں شرمساری کے آنسو ہی آتے ہیں۔ جب دفتر خواجہ کی ترجمان کی طرف سے اسے دہشت گردی کے خلاف ایک بڑی فتح قرار دے رہی تھی تو پتا نہیں کیوں میرا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

میں ان لوگوں میں تھا جن کو رب کائنات کی طرف سے اعزاز میسر ہونے پر فخر کا موقع ملا تھا اور وہ اس قوم سے تھا جسے اس کی وقعت اور حیثیت سے آشنائی ہی میسر نہیں۔ یہ تو میرے رب کا فضل ہے کسی کو قوت ایمانی سے ہجرت اور شہادت تک سب منازل سے گزرتا ہے اور کسی کے دامن میں ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ نہیں آتا۔



## محو حیرت ہوں!

(03 جمادی الثانی 1427ھ بمطابق 30 جون 2006ء)

یہ کرہ ارض جہاں چھ ارب سے زیادہ انسان بستے ہیں۔ وہ مخلوق جو صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلتی ہے، تعلیم کی جستجو میں مصروف ہوتی ہے یا اپنے پیارے محبت برسانے والے گھر کے کام کاج میں جت جاتی ہے اس زمین پر سانس لینے والے اسے ہنستا مسکراتا اور خوبصورت بنائے رکھتے ہیں۔

یہی زمین ہے جس کے کونے کونے سے مالک کائنات کو پکارنے کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور والہانہ عبادوں سے زمین کروڑوں جبینوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ یہ سب لوگ اس زمین کا حسن ہیں، مالک ارض و سما کی خوبصورت تخلیق ہیں جسے وہ احسن تقویم کہہ کر پکارتا ہے۔

اس حسین اور خوبصورت تخلیق کے وجود پر جو اس کائنات کا رنگ ہے، کیا آپ جبر اور کرب، ظلم و وحشت اور جبر و تشدد کا منظر دیکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جنگیں ہوتی تھیں۔ لاکھوں لوگ مولی گاجر کی طرح کاٹ دیے جاتے تھے لیکن جرمی میں ہونے والی لڑائی کی بس اثری اثری باتیں دنیا کے کونوں تک پہنچتی تھیں۔ کہیں ہٹلر جیتا تو کہیں اتحادی، کہیں سکندر فتح حاصل کرتا تو کہیں چنگیز خان..... لیکن ان ظلم کی روداد کو کوئی لکھنے بیٹھتا تو بتاتا کہ ایسا ہوا تھا۔

یہ تو کل کی بات ہے کہ دیت نام پر امریکی مظالم کی داستانیں خبروں، نظموں یا بیانوں کے توسط سے لوگوں تک پہنچیں۔ وہ بھی جب ظلم ہوئے ایک عرصہ بیت جاتا تھا تو لوگ اس حقیقت سے آشکارا ہوتے کہ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی گئیں۔

کہیں سالوں بعد تصویروں کی نمائش میں کسی فوٹو گرافر کی ظلم و ستم دکھائی تصاویر نظر آ جاتیں اور لوگ انسانوں پر ہونے والے تشدد اور ظلم کی حالت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے..... لیکن آج منظر مختلف ہے۔ برستے ہوئے بموں سے لے کر اجڑتے ہوئے گھروں، زخموں سے تڑپتے ہوئے انسانوں اور بے گھر قافلوں کو آپ ٹھیک اس وقت دیکھ سکتے ہیں جب یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا تھا۔

گزشتہ بیس سالوں سے انسانوں پر ہونے والے اس ظلم کی تصویریں، فلمیں، ڈاکو منٹریاں دنیا کے کونے کونے میں دیکھی گئی ہیں۔ لوگوں نے مدتوں بوسنیا کے مسلمانوں کو روتے، چیختے چلاتے، زخموں سے نڈھال اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے دیکھا۔ چوچینا میں مسلمان عورتوں کو اپنے ہزاروں معصوم بچوں کے قتل پر نوحہ کناں دیکھا فلسطین کے چالیس لاکھ مہاجرین کو کیمپ تو پوری دنیا کے چہرے پر بد نما داغ ہیں۔ روز شہید ہوتے فلسطینی اس کے علاوہ ہیں۔ دنیا بھر میں مشرق سے سفر کرنا شروع کریں تو فلپائن کے ملک میں منڈاناؤ میں مسلمانوں کے قتل و غارت

اب پڑوس کے ملک کے شہر نیروبی میں سی آئی اے نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا اور وہاں سے الزام لگانا شروع کیا کہ صومالیہ کے مسلمان قبائلی رہنما القاعدہ کے ایجنٹ ہیں۔ ان پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا اور اس ملک کے عداروں کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سیکولر ذہن کے سردار تلاش کیے اور ہر سردار کو ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر سالانہ دیے گئے۔

امریکیوں کے لیے فکر کی بات یہ تھی کہ 1991ء کے بعد جب ملک انار کی کا شکار ہوا تو قبائلی سرداروں نے کنٹرول حاصل کر لیا۔ انہوں نے کمال یہ کیا کہ اسلامی شرعی عدالتیں قائم کیں، انصاف دیا اور وہاں کے لوگ کافی حد تک امن سے رہنے لگے۔ اب گزشتہ چند سالوں سے یہ قبائلی سردار اس بات کا اعلان کرنے لگے تھے کہ ایسا عدالتی شرعی نظام پورے ملک میں رائج ہونا چاہیے اور ملک کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا چاہیے۔ یہ تھی فکر کی بات نیروبی میں بیٹھی ہوئی سی آئی اے کے لیے۔ یہاں سرداروں کو پیسہ اور اسلحہ فراہم کیا گیا، سیکولر سرداروں کو ملک کا کنٹرول حاصل کرنے کے قابل بنایا گیا۔

ادھر اسلام سے محبت اور اس کے عدالتی نظام کے ثمرات سامنے آنے لگے تھے۔ ایسے لوگ جو اسلامی ریاست چاہتے تھے وہ ان قاضیوں اور ججوں کے ہمراہ شیخ حسن ظاہر اویس کی سربراہی میں جمع ہو گئے۔ امریکہ نے کہا یہ القاعدہ کا ایجنٹ ہے اور عالمی دہشت گرد ہے۔

امریکہ وہاں خود اپنی افواج بھیجنا چاہتا تھا لیکن اسے فرح عید کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک یاد تھے۔ بیٹھا گون میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ ہوا۔ محکمہ خارجہ نے کہا کہ وہاں ترقی اور امداد لے کر جاؤ لیکن بیٹھا گون نے فوری نتیجے کی بات کی: ”سردار خریدو“ آپس میں لڑاؤ اور ملک پر قبضہ کر لو۔“

دونوں اب مد مقابل تھے۔ امریکی امداد پر پلنے والے سیکولر قبائل سردار، قاضیوں، ججوں اور اسلامی شرعی عدالت کے رہنما جو شیخ شریف احمد کی سربراہی میں اس عفریت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ دس سال پہلے امریکی فوج اس ملک سے یوں بھاگی تھی کہ آج اگر بیٹھا گون کسی امریکی کو صومالیہ بھیجنے کی بات کرتا تو وہ فوراً خاموش ہو جاتا۔ امریکہ کے کاہن لیس سیکولر سردار اس امریکی اسلحے، پیسے اور پروپیگنڈے کے باوجود یوں فرار ہوئے کہ انہیں اپنے ملک میں پناہ دینے والا کوئی نہ تھا۔

فکست کے بعد امریکیوں کے منہ پر وہی الفاظ ہیں۔ یہ سب طالبان ہیں، القاعدہ ہیں، دہشت گرد ہیں..... لیکن صومالیہ وہ ملک ہے جس میں لوگوں کے گروہ در گروہ اور جھوم در جھوم بازاروں میں ایک ہی مطالبہ کرتے ہیں: ”اسلامی عدالتیں، اسلامی انصاف اور اسلامی حکومت کا امن۔“

کس مشکل میں ہے امریکہ؟ اس علاقے میں فوج بھیج نہیں سکتا کہ سب خوفزدہ ہیں، عدار خرید نہیں سکتا کہ سب کو مار بھاگ دیا گیا اور دو عجیب خطرات سامنے۔ ایک یہ کہ اس ملک میں اسلامی نظام کی برکتیں نازل نہ ہو جائیں اور پھر وہ خطرہ کہ ان کی دیکھا دیکھی باقی افریقہ کے مسلمان بھی اس طرف مائل نہ ہوں اور دوسرا خطرہ یہ کہ نہر سوئز کی گزرگاہ پر یہ لوگ آکر بیٹھ گئے۔

یہ سوچ کر تو امریکی کاروباری طبقے کی رات کی نیندیں حرام ہو جاتی ہوگی۔ کروٹ بدلتے رات گزرتی ہوں گی اور بے چین دن۔



سے شروع ہو کر تھائی لینڈ، کشمیر، افغانستان، عراق، فلسطین، چین، موناڈیشو سے مغرب کی سمت امریکی کیمپ گوانتانامو میں اذیتیں سہتے لوگ اور امریکی حکام کے ہاتھوں جیلوں میں پڑے مسلمان۔ یہ سب اس دنیا کے گلوب کا چہرہ ہے جسے انسانوں نے آباد کیا اور وہی اس کا حسن ہیں۔

یہ سب اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ انسانوں کی اس حالت زار اور کسمپرسی کے باوجود گزشتہ دنوں پوری دنیا میں Earth Day (زمین کا دن) منایا گیا۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے اس زمین پر کتنے والے درختوں، آسمان پر پھیلی ہوئی محفوظ تہہ اوزون کی لیر میں سوراخ، ختم ہوتے ہوئے پانی کے ذخائر اور آلودہ ہوتی ہوئی فضاء کا تذکرہ کیا۔ سب کو اس زمین کے اجڑنے کا بہت دکھ تھا۔

ڈونز کی امداد پر چلنے والی این جی اوز نے واک منعقد کروائیں، تقریبات ہوئیں، درکشاپ ہوئے، سیمینار ہوئے، حکومتوں نے وعدے کیے کہ ہم فضا کو پاک صاف رکھیں گے، درخت نہیں کاٹیں گے، پانی کا بے دریغ استعمال نہیں کریں گے..... لیکن ان سب داستانوں میں ان لاکھوں انسانوں کا کہیں ذکر نہ تھا جو اس سال قلمہ اجل بن گئے۔ جن کے جسموں کے پر نچے ہموں نے اڑا دیے۔ جن کے معصوم وجود کو زندگی کی بہاریں تک دیکھنا نصیب نہ ہو سکیں۔ میرا دکھ اس سے بھی زیادہ تھا اس لیے کہ عین اس ارتھ ڈے پر اس خوبصورت دنیا جس کے گیت گائے جاتے ہیں اس کے بدنام ترین قید خانے گوانتانامو میں ایک ساتھ تین قیدی اذیتیں برداشت کرتے کرتے اپنی جان دے بیٹھے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ریڈ ایڈمرل ہیری نے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا: ”بھیڑیوں کو مر جانے دو۔ یہ سب ہماری ترقی کے دشمن بھیڑیے ہیں۔“

ریڈ ایڈمرل ہیری کی نظروں میں اسرائیل کے مظالم سے جنگ کرنے والے حماس کے مظلوم، بھیڑیے ہیں۔ عراق میں امریکی فوج سے لڑ کر اپنی جانیں دینے والے بھیڑیے ہیں۔ افغانستان کے پہاڑوں میں لڑنے والے، فلپائن کے مورو، تھائی لینڈ کے پتانی، مصر کی اخوان المسلمون، لبنان کی حزب اللہ سب بھیڑیے ہیں۔ وہ بھی جوابو غریب میں قید ہیں اور جو گوانتانامو بے میں سارے بے کس، مجبور اور مقہور ہیں اور جابر اور ظالم ”امن پسند“ ہیں۔

پتانیوں کیوں مجھے دو سو سال پہلے کا وہ امریکہ یاد آ رہا ہے جب یورپ کے غنڈوں نے اس پر قبضہ کرنا شروع کیا تو وہاں پر موجود رہائش پذیر ریڈ انڈین کے ساتھ لڑائیاں شروع ہوئیں۔

نہتے یا تیرتوار سے لیس ریڈ انڈین کیا مقابلے کرتے توپ کے دہانے کھل گئے اور انسانوں کے جسموں کے پر نچے اڑنے لگے۔ ایسے میں امریکہ کے بچے بچے کی زبان پر فقرہ تھا: ”ایک بہترین ریڈ انڈین مردہ ریڈ انڈین ہوتا ہے۔“ یہی فقرہ آج مسلمانوں کے لیے دہرایا جا رہا ہے۔ میری حیرت عجیب ہے کہ میں اس دنیا میں رہتا ہوں جو درخت اور پرندوں کے مرنے پر روتی ہے اور انسانوں کے قتل پر خوشی کے شادیاں بجاتی ہے۔

## سیلاب

(10 جمادی الثانی 1427ھ بمطابق 07 جولائی 2006ء)

میرے بچپن کا ایک دوست جسے ہم کلاس میں اس کے ذیل ڈول اور بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے پہلوان جی کہتے تھے، ہمیشہ سے خواہش دل میں رکھتا تھا کہ وہ یورپ چلا جائے اور وہاں سے خوب پیسہ بنا کر واپس آئے۔ اپنے محلے کے اس گھر میں جہاں اس کے والد سارا دن گول گھومتے پیسے پر مٹی کے برتن بناتے تھے، وہاں تین منزلہ مکان تعمیر کرے، میم سے شادی کرے اور چھٹیوں میں اپنے گورے گورے بچوں کو پاکستان کی سیر کے لیے لے کر آئے۔

پڑھنے لکھنے سے اسے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابھی تک اس نے بمشکل تمام دسویں کلاس میں داخلہ لیا ہی تھا کہ میر پور کے رہنے والے ایک لڑکے سے اس کی دوستی ہو گئی جس کے آدھے سے زیادہ خاندان والے بریڈ فورڈ میں آباد تھے۔ پھر ایک دن پہلوان برطانیہ جا پہنچا اور پھر اس کی ساری خواہش، سارے خواب اور ساری امیدیں پوری ہو گئیں۔ اس کا پرانا گھر بلند و بالا عمارت میں بدل گیا۔ جنگ عظیم میں بلجیم سے بھاگ کر آنے والی ایک بچی جو اس وقت عمر میں اس سے خاصی بڑی تھی اس سے اس کی شادی بھی ہو گئی اور گورے گورے بچے بھی جو پٹ پٹ انگریزی بولتے، وہ انہیں لے کر اپنے چھوٹے شہر آتا۔

ابلا ہوا پانی پلاتا، چھتر دانیوں میں سلاتا، ان کی صحت کے لیے طرح طرح کی دوائیاں کھلاتا اور پھر واپس انگلستان چلا جاتا۔ بچے جب برطانیہ جاتے تو پاکستان کے بارے میں ایسی گفتگو کرتے کہ وہاں نالیاں کھلی ہوتی ہیں، گنداپانی بہتا رہتا ہے، کوڑے کے ڈھیر ہیں، نلکے کو ہاتھ سے چلا کر پانی نکالنا پڑتا ہے، بجلی چلی جائے تو چھت پر رات گزارنی ہوتی ہے اور ہاتھ سے پٹکھا جھلنا پڑتا ہے..... لیکن کچھ عرصہ قبل وہ پاکستان آیا تو اسے جانے کیا سوچھی، وہ ایک ہفتے کے لیے بچوں کو اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کے گھر اسلام آباد لے گیا جو وہاں ایک اعلیٰ انسر بن چکا تھا۔

بچے خوشی خوشی وہاں رہ رہے تھے، اس ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک دن وہ ان کو اس خوبصورت شہر کی سڑکوں پر گھمراہا تھا کہ اس کی چھوٹی بیٹی نے سوال کر دیا۔ عجیب سوال تھا۔ بچی نے کہا: ”پاپا! ہم پاکستان کب واپس جائیں گے؟“

اس نے یہ بتانے کی لاکھ کوشش کی وہ پاکستان ہی میں گھوم رہی ہے۔ یہاں کا لباس، زبان، لوگ دیکھو لیکن بچی کا جواب اور سوال یہی تھا: ”پاکستان تو بریڈ فورڈ میں بھی ہے۔ ہم اصل پاکستان کب جائیں گے؟“

اصل پاکستان..... چودہ کروڑ جیتے جاگتے دکھ سہتے لوگوں کا پاکستان ہے جسے پہچانا کتنا آسان ہے۔ جہاں دور دیہ سڑکیں اور روشن روشن اسٹریٹ لائٹ ختم ہو جائیں۔ جہاں بند سیوریج لائن کی بجائے بدبو سے بھری نالیاں اور

یہ شہر اور یہ علاقے دور سے پہچانے جاتے ہیں الگ تھلگ چیک پوسٹوں کے دوسری طرف۔ کنٹرولوں، ناظموں، ڈیویشن اور پولوشن یعنی ہر قسم کی آلودگی سے پاک۔

لیکن شاید یہ لوگ تاریخ سے نا آشنا ہیں جس ملک کی سرحد پر اتنے زیادہ بھوکے ننگے لوگوں کا ہجوم بڑھ جائے وہاں کوئی انٹری پاس، کوئی ویزہ، کوئی ریت کی بوریاں والی چیک پوسٹ راستہ نہیں روک سکتی۔ سیلاب آتا ہے تو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے اور سب سے پہلے وہ گھر زد میں ہوتے ہیں جو عین بند کے ساتھ بنے ہوتے ہیں۔



تغصن سے پر کچرہ دان نظر آنا شروع ہوں۔ جہاں اکا دکا گاڑیوں اور آرام سے چلتی ہوئی ٹریفک کی بجائے شور مچاتی، دھواں چھوڑتی گاڑیاں اور گھنٹوں تک جام ٹریفک نظر آنے لگے۔

ریڑھیوں، گدھا گاڑیوں، تانگوں اور رکشوں میں پھنسی اور جتی ہوئی مخلوق اپنے رزق کی تلاش میں نکلی ہو۔ جہاں ٹریفک سنگنز پر موٹر سائیکل پر مہذب سارجنٹ کی بجائے ہاتھ میں بید پکڑے ڈرائیوروں، تانگے والوں اور رکشے والوں کو ہانکتا ہوا ہوا ہی نظر آئے۔ ایسا پاکستان جسے ایک بچی بھی پہچان لیتی ہے اور پھر اسے لاکھ سمجھاؤ وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔

اس پاکستان کی حد بندی میرے پورے ملک کے ہر بڑے شہر میں نظر آتی ہے۔ پہلے صرف پیرو دہائی کے اڈے سے ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف اسلام آباد شروع ہوتا تھا اب یہ حدود پاکستان کے ہر بڑے شہر میں نظر آئے گی اور وہ لوگ فخر سے اسے بیان کریں گے کہ ہم عام لوگوں کے پاکستان میں نہیں رہتے۔

ٹی وی کے نیوز ناٹ کے ایک پروگرام میں ٹیلی فون پر سوال کرنے والی ایک خاتون سے جب پوچھا گیا کہ وہ کہاں سے بول رہی ہے تو اس نے کہا: میں ڈیفنس سے بول رہی ہوں۔ کمپیر نے کہا تو آپ لاہور سے بول رہی ہیں۔ آپ کسی شہر کے باسیوں سے سوال کریں، وہ آپ کو کہیں بھی ملیں گے تو کوئی یہی بتائے گا کہ میں کراچی میں، کوئٹہ میں یا لاہور میں رہتا ہوں اس لیے کہ وہ پاکستان میں رہ رہا ہوتا ہے۔

اس کی غربت اور اس کے دکھ سہہ رہا ہوتا ہے لیکن ایک دوسرا طبقہ کہے گا: میں کراچی ڈیفنس میں رہتا ہوں، لاہور کینٹ میں یا پھر کوئٹہ کینٹ کا باسی ہوں اس لیے کہ یہ لوگ جن علاقوں میں رہتے ہیں۔ جہاں ان کی حدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے میرے پاکستان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

میں نے یہاں اس پاکستان کی صرف ظاہری حالتوں کے درمیان فرق کا ذکر کیا ہے۔ ہسپتالوں میں لمبی قطاروں، تھانوں میں بند بے قصور نوجوانوں، غربت کے ہاتھوں خودکشی کرنے والے بے روزگاروں، ٹاٹ کے اسکولوں میں بٹھ کر بیٹھے ہوئے بچوں اور رات بھر مجھروں، بکھیروں اور بدبو سے لڑتے ہوئے انسانوں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی یہ انسان خوش تھے کہ ان کے حکمران ان کو برابر سمجھتے ہیں۔

کم از کم ایک ہی قانون ہے جو کتاہوں کی حد تک یکساں لاگو ہے۔ ایک ہی طرح کی کچھری ہے، پولیس ہے، افسران ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہوتی ہے اور یہاں ان کے چہروں پر غیظ غضب۔ لیکن گزشتہ سالوں میں ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ.....

اے چودہ کروڑ مقہور و مجبور انسانو! ذلتوں کے مارے محنت کشو! زمین پر بسنے والو! تم ہم سے الگ ہو۔ پورے ملک میں اختیارات کی تقسیم کا نظام نافذ ہو گیا، ناظم آگئے اور لوگ درخواستیں لے کر ڈھونڈتے پھرے کہ ہم اس مسئلے کے لیے کہاں جائیں؟ لیکن اس پاکستان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر اسلام آباد میں آج بھی ڈپٹی کمشنر کا دفتر قائم ہے۔

وہاں آج بھی کنٹونمنٹ ایگزیکٹو افسر اور اسٹیشن کمانڈر ہیں اس لیے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ سکون چاہتے ہیں، تبدیلی نہیں چاہتے۔ اگر اسلام آباد سے ڈپٹی کمشنر کو ہٹا دیا گیا تو امن و امان کون سنبھالے گا؟ ڈیفنس میں یا کنٹونمنٹ بورڈ میں اگر ناظم آگیا تو اسٹیشن کمانڈر کی جگہ کون سنبھالے گا تو پتا نہیں کیسے کیسے لوگوں کو یہاں آباد کر دے گا؟

کیا عجیب ملک ہے جس میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے اور ان میں 80 لاکھ ایسے ہیں جو اپنے وزن سے قحط زدہ لگتے ہیں۔ ہر دس میں سے چھ انسان ایسے ہیں جو صاف پانی کی نعمت سے بھی محروم ہیں۔ کچے کمروں، بدبودار نالیوں اور آلودہ فضا میں سانس لینے والے مفلوک الحال لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ صاف شفاف آبادیاں وہاں صرف اور صرف دور سے ایک نخلستان کی طرح نظر آتی ہیں جو غربت کے لقی دق صحرا میں آباد ہوں۔

## ایک تھا بادشاہ

(17 جمادی الثانی 1427ھ بمطابق 14 جولائی 2006ء)

اس ملک کے کسی گوشے، شہر، چوراہے یا مجلس میں پہنچ جائیں تو صرف ایک ہی گفتگو کا موضوع ہے۔ ایک ہی دکھ ہے جو سب کے دل میں درد بن کر رہتا ہے اور ایک ہی المیہ جس سے ہر شخص کی آنکھیں اشکبار ہیں۔ ”ہم اتنے ذلیل و رسوا کیوں ہیں؟ ہم پر چاروں جانب سے ذلت و پستی اور ناکامی و نامرادی کیوں مسلط ہو چکی ہے؟ ہمارا خون ارزاں کیوں ہے؟

ہماری دعائیں عرش اعظم سے ناکام و نامراد لوٹ آتی ہیں؟“ یوں تو نظر رکھنے والی آنکھ اور اللہ کے خوف سے کانپتا ہوا دل اس ناکامی و نامرادی کی وجہ خوب جانتا ہے اور ایسے بندگان خدا کے ہونٹوں پر صرف استغفار کے اور کوئی کلمہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کو علم ہے کہ ہم سے اللہ کی رحمتیں اور برکتیں کیوں روٹھ گئی ہیں۔ لیکن آئیے! صرف اور صرف دنیا دار کے نقطہ نظر سے اصول حکمرانی کے زاویے سے اور معاشی منصوبہ بندی کے پس منظر میں جائزہ لیں کہ کیا ہم واقعی اس قابل نہیں ہیں کہ ہمارا یہ حال ہو؟ ہم پر لوگ ہنسیں ذلت و رسوائی میسر آئے۔ دنیا کی پانچ ہزار سال کی تحقیق کردہ تاریخ کے صفحات الٹ کر دیکھیے۔

آپ کو بدترین بادشاہ کے بارے میں جو فقرے ملیں گے اس کا نچوڑ یہ ہوگا: ”اس بدترین بادشاہ کا خزانہ بھرا ہوا تھا لیکن لوگ بھوکے تھے۔ بادشاہ کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ لوگوں کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ وہ تو اپنے اللوں تللوں میں مصروف تھا۔“

صرف یہی نہیں تاریخ ان بادشاہوں کے اوصاف بتاتی ہے بلکہ ان کے عبرتناک انجام سے بھی بھری پڑی ہے۔ سب یا تو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچے یا پھر جب ان پر کوئی حملہ آور ہوا تو مظلوم لوگ خاموش تماشائی بنے اس عبرتناک منظر کو دیکھتے رہے۔

اب اپنے مملکت خداداد پاکستان پر لوٹ آئیے اور اس دعویٰ کو حق و سچ تسلیم کر لیجیے کہ ہمارا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ غربت کی کہانی کے لیے کسی اعداد و شمار کی ضرورت نہیں کہ یہاں 45 فیصد خط غربت سے نیچے رہتے ہیں یا 40 فیصد۔ صرف اتنا کافی ہے کہ اس ملک میں ہر ڈیڑھ گھنٹے میں ایک شخص خودکشی کرتا ہے لیکن دنیا بھر کے معاشی ماہرین اس ملک کے بارے میں ایک رائے اتفاق سے رکھتے ہیں کہ یہاں ساڑھے چھ کروڑ لوگ رہتے ہیں جن کی زندگیاں اذیت ناک حد تک بری ہیں۔ جو شاید اپنی آمدنی سے دنوں کے فاقے دور نہیں کر سکتے اور راتوں کو سکون کی نیند نہیں سو سکتے۔

یہ دو صفات یعنی خزانہ بھرا ہوا اور رعایا مفلوک الحال دیکھنے کے بعد تاریخ بدترین بادشاہوں کے تعیش کی داستانیں بھی سناتی ہے۔ میں سوچتا تھا کہ شاید ہم اس مسئلے میں بری الذمہ ہوں لیکن حیرت کا عالم ہے کہ ایوان صدر کے صرف باغات کی رکھوالی پر 74 لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں جبکہ اس کا کل سالانہ خرچہ 29 کروڑ روپیہ ہے۔ یہ وہ ایوان صدر ہے جس میں صدر صرف تقریبات کے دوران تشریف لاتا ہے۔ دوسرے گھر کا خرچہ معلوم کرنا کسی کی دسترس میں نہیں۔

وزیر اعظم ہاؤس کا سالانہ خرچہ تقریباً 54 کروڑ روپے ہے۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں سارا وقت نہیں رہتے۔ ان کے مصارف بہت ہیں۔ صرف ایک سال کے سرکاری دوروں پر خرچ ہونے والی کل رقم چار ارب روپے ہے اور جس جہاز پر یہ حضرات سفر کرتے ہیں، اس پر اس سال 57 کروڑ 80 لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ میں اس تفصیلی بجٹ میں نہیں جانا چاہتا کہ 2 ارب روپے کی گاڑیاں منگوائی گئیں اور پھر کس کس کے زیر استعمال رہیں..... لیکن اس مفلوک الحال ملک کے بادشاہ صفت حکمرانوں کی ایک اور خوبی ایسی ہے جو مجھے رلاتی ہے۔

ہم اپنے محسنوں کو جہاں لاشوں کے نذرانے پیش کرتے رہے۔ قیدیوں کے تحفے دیتے رہے ہیں۔ وہاں ہم قیمتی بے جان تحفوں میں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ صدر بش کو 1400 ڈالر کی گلیٹنوں والی میز اور لارابش کو سونے اور بیروں کے بندے پیش کیے گئے اور خوبصورت قیمتی ٹیکس بھی۔ ان تحفوں پر ہم تو کیا امریکی اخبارات بھی حیران تھے۔ وہ حیران ہیں کہ جو کوئی امریکہ سے وہاں جاتا ہے اسے مجاہدین کی لاشوں کا تحفہ تو ملتا ہی ہے لیکن ان کے ذاتی استعمال کے لیے اشیاء سے بھی گھروں میں رونق آتی ہے۔

ایسے حالات میں ایسی صفات کے طرز حکمرانی کے بعد ہم سوال کرتے ہیں کہ ہم پر رحمتیں کیوں نازل نہیں ہوتیں؟ ہمیں ذلیل و رسوا کیوں کیا جاتا ہے؟ رحمتیں نازل جہاں ہوتی تھیں صرف ایک جھلک دیکھ لیں۔ مدائن سے داؤ گورنر کو منتقل ہوا تو سپہ سالار نے اپنے گھر کے آگے ایک ڈیوڑھی بنالی۔ سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو حکم دیا اسے فوراً مسمار کر دو کیونکہ یہ تمہارے اور شہریوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔

بحرین سے مشک نافہ آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کوئی ہے جو اسے تول کر برابر بانٹ دے۔ ان کی بیوی نے فرمایا: میں یہ کام کر دیتی ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم مشک کو اپنے ہاتھوں میں لوگی۔ کچھ تمہارے ہاتھوں کو لگے گا۔ تم اپنے منہ پر سوگھوگی اور خوشبو سے لطف حاصل کروگی لیکن اس میں تمہارا اتنا بھی حصہ نہیں اس لیے یہ کام کوئی اور کرے گا۔ میں تحریر کرنے پر آؤں تو شاید مدتوں ایسے قصے لکھتا رہوں لیکن کوئی ایک واقعہ ہی یاد کرتا ہوں تو دل بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے اور سوچتا ہوں کہ ہم کس نسب و نامہ اور اُمت کے وارث ہیں جن

کے نام آج تک تاریخ میں روشنی کے مینار کے طور پر موجود ہیں لیکن شاید کل کا مورخ جب تاریخ لکھے گا تو شاید اس فقرے سے شروع کرے۔

”ایک قبا حناہ اس کا خزانہ بھرا ہوا تھا۔ بہت مال و دولت تھی لیکن اس کی رعایا غربت سے بے حال تھی اور بادشاہ کے عیش و عشرت کی کوئی حد نہ تھی.....“

## تماشا گاہ

(24 جمادی الثانی 1427ھ بمطابق 21 جولائی 2006ء)

دنیا بھر سے ایک دفعہ پھر فوٹو گرافروں، کیمرہ مینوں اور صحافیوں کے قافلے قتل گاہ میں پہنچنے شروع ہو گئے ہیں۔ عمارتوں پر بڑے بڑے انیٹا نصب کر دیے گئے ہیں۔ طاقت ور کیمرے دور سے گرنے والے بموں اور ہونے والی تباہی کو فلمارہے ہیں۔ گلیوں میں کندھوں پر کیمرے اٹھائے فوٹو گرافر کسی یادگار منظر کی تلاش میں ہیں۔ جتنا ہولناک اور درد انگیز منظر ہو گا اتنا ہی زیادہ جاذب نظر ٹھہرے گا اور اخبار میں بہتر جگہ کی زینت پائے گا۔ یہ تماشا گاہ روز بجاتی ہے اور روز لوگ اخباروں اور ٹیلی ویژن اسکرینوں پر یہ منظر دیکھ کر کچھ دیر گم سم رہتے ہیں۔ ہلکا سا تبصرہ کرتے ہیں اور پھر چین کی نیند سو جاتے ہیں۔

گزشتہ تیس سالوں کی اس تصویری نمائش میں بڑی نادر روزگار تصاویر ملیں گی۔ آگ اگلنے ٹینکوں کی تصویریں، گلیوں میں بھاگتے نوجوان اور بچوں کی تصویریں جو ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ان ٹینکوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ تصویروں کی ایک قطار تو سب کے ذہن میں ہوگی جس میں ایک بچہ اپنے باپ کی گود میں سہا ہوا ہے۔ اسرائیلی سپاہی گولیوں کی بو چھاڑ کر رہے ہیں۔ بچہ خوف سے باپ کی گود میں مزید سمٹ گیا ہے۔ بچہ گولی سے زخمی ہے اور آخر میں بچے کی لاش باپ کی گود میں پڑی ہے۔

1947ء میں لبنان کے مسلمانوں پر فاسفورس اور نیپام حملوں میں اذیت ناک موت مرنے والوں کی تصاویر آج بھی اخبارات کی فائلوں میں موجود ہوں گی۔ انہی سالوں میں دو لاکھ پچاس ہزار مسلمانوں کو اپنا بچا کھچا سامان کندھوں پر اٹھائے مہاجر کیپوں کی طرف ہجرت کرتے ہوئے انہیں کیمروں کی آنکھوں نے دیکھا اور محفوظ کیا ہے اور پھر سب سے پہلے 1975ء میں ان کیپوں پر ایک ساتھ 30 اسرائیلی طیاروں نے مشترکہ حملہ کیا۔ آسمان تاریک ہو گیا اور لوگ خاک و خون میں تڑپنے لگے۔

یہ مناظر بھی دنیا بھر کے اخبارات کے فوٹو گرافروں کے لیے ایک ایڈ وچر کا ذریعہ بنے۔ 16 سے 18 دسمبر 1982ء کے صابرہ اور شتیلہ کیپوں پر حملے تو تاریخ کا وہ سیاہ ترین باب ہے جس پر صحافیوں نے مضامین تحریر کیے۔ ان دو سومرد، عورتوں اور بچوں کی تصویریں بنائیں جیسے وہ ایک مذبح میں پڑے ہوں اور پھر کئی فوٹو گرافر حضرات اور صحافیوں نے اس کے صلے میں انعام و اکرام بھی حاصل کیے۔

یوں لگتا ہے فلسطین ایک تماشا گاہ ہے جس میں مختلف وقتوں کے بعد ایک کھیل اسٹیج ہوتا ہے۔ اس میں ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم لیکن ظالم کو اس دنیا کی سپر پاور اس ”کھیل“ کا خرچہ فراہم کرتی ہے اور اس کھیل میں اس کے



زخمی ہو کر کسی شخص کے ہاتھ ہی آجائے تو سارے کوڑے آسمان، زمین اور چھتوں پر جمع ہو کر کانیں کانیں کر کے آسمان سر پر اٹھالیتے ہیں ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں.....

لیکن کیا کریں جن آنکھوں پر ڈالروں کی پٹیاں اور منہ میں سکوں کی تھیلیاں بھری ہوں وہ ایسے ہی تماشا گاہ کے سامنے کھڑے تماشا دیکھتے ہیں، داد دیتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب خود تماشا بن جاتے ہیں۔



اندر کام کرنے والوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کرتی ہے، ان کا تحفظ کرتی ہے۔ کبھی کسی نے سوچا کہ اس کرپہہ المنظر معاشرے میں بننے والے کھیل کا جس میں مرنے والے حقیقی طور پر اپنی جان سے جاتے ہیں، اس کا پروڈیوسر کون ہے؟ جو پروڈے کے پیچھے بیٹھا ہے۔ آئیے! پروڈے کے پیچھے بیٹھے جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار ملک کا چہرہ دیکھیں اور اس سارے تماشے میں معاشی، سیاسی، اخلاقی اور فوجی مدد کی نوعیت کا اندازہ لگائیں۔

اکتوبر 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد جب مسلمانوں کو اسرائیل پر تھوڑی سی برتری حاصل ہوئی تھی۔ امریکانے اس تماشا گاہ کو سجانے اور آباد کرنے کا ذمہ اٹھالیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک امریکا اسرائیل کو 140 ارب روپے کی فوجی امداد دے چکا ہے۔ اسرائیل کو ہر سال 13 ارب ڈالر براہ راست امداد دی جاتی ہے جو پانچ سو ڈالر فی اسرائیلی فی سال ہے جس میں کبھی کبھتی نہیں ہوتی۔ پوری دنیا میں امریکی امداد سہ ماہی اقساط میں ہوتی ہے۔ جب اسرائیل کو سال کے آغاز میں ہی پوری رقم دے دی جاتی ہے جسے وہ امریکا ہی کے بینکوں میں رکھ کر کماتا ہے اور اسی امداد کو دگنی کر لیتا ہے۔ دنیا میں جس کو بھی فوجی امداد دی گئی اسے اسلحہ خریدنے کے لیے امریکہ کی مارکیٹ کی پابندی ہے جبکہ اسرائیل اس میں خود مختار ہے۔ چاہے تو اس سے اپنی دفاعی صنعت کو مضبوط بنالے۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس سے امداد کا حساب نہیں مانگا جاتا۔

اسرائیل کو امریکانے 3 ارب ڈالر دیے تاکہ وہ اپنا ہتھیاروں کا ایک سسٹم بنالے اور اسے بلیک ہاک ہیلی کاپٹر اور F-16 کی ٹیکنالوجی منتقل کی۔ دنیا بھر میں نیٹو (NATO) اتحادیوں کا بڑا تذکرہ کیا جاتا ہے، ان کو ہر میدان میں ساتھ قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے لیکن ان تمام ممالک کو امریکا کے جاسوسی نظام تک رسائی نہیں۔ دنیا کا واحد ملک اسرائیل ہے جسے امریکا کے دفاعی جاسوسی نظام اور اس کی ایجنسیوں تک رسائی ہے۔

اب ذرا عالمی سطح پر اس تماشا گاہ کے بڑے ظالم (اسرائیل) کی پشت پناہی کا عالم دیکھیے۔ 1982ء سے لے کر آج تک جب کبھی اسرائیل کی جارحیت کی دنیا کے ممالک نے سکیورٹی کونسل میں آواز اٹھائی تو امریکانے ان ممالک کی 32 قراردادوں کو مختلف اوقات میں ویٹو کر دیا تاکہ کوئی ملک برستی گولیوں اور بموں کی بوچھاڑ میں مظلوموں کی مدد کو نہ جاسکے۔ جب بھی کبھی امریکا کو اس علاقے میں اپنی جنگ لڑنا پڑی اس کے لیے اسرائیل کی زمین استعمال نہ کی گئی تاکہ یہ تماشا گاہ سلامت رہے۔

پہلی عراقی جنگ میں بھی مسلمانوں کے ملک اپنی غیرت و حمیت بچ کر اڑے دینے لگے اور دوسری عراق جنگ میں انہیں ننگ ملک و ملت ممالک نے امریکی سپاہیوں کو اپنی سرزمین سے مسلمانوں کا خون بہانے کا لائسنس دیا۔ یہ تماشا گاہ پھر سج گئی ہے۔ پھر نئے مظفرئی وی کی اسکرین اور اخبارات کی زینت بنیں گے۔ لوگ صحافیوں کی کاوشوں سے متاثر ہوں گے۔ انہیں دادیں گے..... لیکن کوئی اس کش مکش میں یہ سوال نہیں کرتا کہ ہمارے بچے ہمارے سامنے قتل کر کے ہمیں دکھاتے ہو اور ہم سے داد بھی چاہتے ہو..... لیکن کیا کریں آج بھی شاید ایسا ہی ہو۔ پروڈیوسر نے پروڈیوسر کو خرید لیا ہے جو اس تماشا گاہ کو قریب سے بر باد کر سکتے تھے۔

مصر اور اردن امن کی باتیں کر رہے ہیں اور فلسطین میں حماس اور لبنان میں حزب اللہ اپنے پیاروں کی اشیاء اٹھا رہی ہیں اور ہم کتنے بے حس، مردہ روح لوگ ہیں؟ روز مرنے والوں کی تصویریں دیکھتے ہیں۔ فلمیں ملاحظہ کرتے ہیں، تبصرہ کرتے ہیں۔ بیان دیتے ہیں اور چین کی نیند سو جاتے ہیں۔ ایسا تو پرندے بھی نہیں کرتے۔ کوئی کو

رہا کر رہا ہے۔ اسرائیل مکمل طور پر لبنان سے کوچ کر چکا ہے اور مجاہدین کی مرضی سے وہاں سے امن قائم کرنے کے لیے ایک مسلمان ملک کی فوج آتی ہے یعنی شام کی فوج اور وہ پورے علاقے میں تمام تر سکیورٹی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ 1989ء کا طائف کا وہ معاہدہ اس برتری کا اعلان تھا کہ کسی مسلمان ملک میں صرف کسی دوسرے مسلمان ملک کی فوج ہی وہاں حالات بہتر بنانے کے لیے آسکتی ہے۔ یہ وہ فتح تھی جو تمام عرب مل کر بھی حاصل نہ کر سکے جسے مجاہدین نے اپنے جذبہ جہاد سے حاصل کیا۔

پندرہ سال کے بعد اس ملک کے امن کو تباہ کرنے کے لیے امریکی اور اسرائیلی یہودیوں نے ایک منصوبہ بنایا جسے امریکا کے new-cores جو صدر بش کے علمی اتحادی ہیں ان کی مدد حاصل تھی۔ یہ لوگ نوے فیصد یہودی ہیں۔ ایک سازش کے تحت رفیق الحریری کو قتل کروایا گیا اور اس کا الزام شام پر لگایا گیا۔ پوری عالمی برادری کو مجبور کیا گیا کہ وہ شام پر لبنان سے فوجیں نکالنے کے لیے دباؤ ڈالے۔ لبنان سے فوجیں نکلیں تو مجاہدین کے خلاف دنیا بھر کے پریس میں دہشت گردی کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔

امریکا کی نظر میں لبنان کے مسلمان اور مجاہدین اب اکیلے ہو چکے تھے اور کیوں نہ ہوتے چودہ جولائی 2006ء کو صدر بش نے اردن، مصر اور سعودی عرب کے حکمرانوں کو فون کیا کہ مجاہدین کی بڑھتی ہوئی طاقت عرب کے امن کے لیے خطرہ ہے۔ کاسرہ لیس حکمران حسنی مبارک اور اردن کے شاہ عبداللہ نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا کہ یہ عرب مفادات کے خلاف چل رہی ہے۔ اس کے فوراً بعد سعودی ترجمان نے بھی ان کو خود کشی کی طرف مائل Adventure کرنے کا الزام دے دیا اور ایسا کرنے سے تمام عرب ممالک کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

لیکن دوسری جانب سے پہلے ہفتے کی لڑائی میں 24 اسرائیلی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ ایک اسرائیلی جہاز غرق ہو چکا تھا۔ ایک ایف 16 طیارہ گرایا جا چکا تھا۔ یہ وہ لوگ کر رہے تھے جن کی نہ کوئی فوج ہے نہ ٹینک اور توپ خانہ۔ نہ ایئر فورس ہے اور نہ ہی بحری فوج۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت اسرائیل کے طیارے لبنان کے شہروں پر بمباری کر رہے ہیں۔ معصوم لوگوں پر بم برسا رہے ہیں۔ مغربی طاقتیں ایک دفعہ پھر وہاں امن فوج بھیجنے کے چکر میں ہیں جیسے 80ء کی دہائی میں بھیجی گئی تھی۔

سارا منظر نامہ وہی ہے۔ ویسے ہی امریکا کی حمایت ہے بلکہ اب تو صدر بش نے مجاہدین کو سرعام گالی بھی دے دی۔ ویسے ہی اسرائیل کی جارحیت اور اسی طرح مغربی ملکوں کا امن فوج بھیجنے کا منصوبہ اور اسی طرح امت مسلمہ کے رہنماؤں اور حکومتوں کی بے حسی لیکن اب کی دفعہ شاید ایک خطرے کی بو ہے جو سب محسوس کر رہے ہیں۔ مصر سے لے کر پاکستان تک کوئی ایسا ملک نہیں جس میں وہاں پر موجود حکومتوں کے کاسرہ لیس اور منافق موقف کے خلاف عوام غصے سے تلملا نہ رہے ہوں۔ ان کا دل نہ کڑھتا ہو۔ ان کا خون نہ کھولتا ہو۔

ایک عیسائی جریدے کے چیف سائنس مانیٹر نے ان تمام ملکوں کے لوگوں اور اہم رہنماؤں کا یہ رویہ سروے کے دوران محسوس کیا اور اس نے کہا کہ اگرچہ سب کچھ 80ء کی دہائی کی طرح ہے لیکن اگر یہ جنگ طول پکڑ گئی تو شاید سوڈان سے پاکستان تک کوئی بھی حکمران اپنے لوگوں کو اس جہاد میں حصہ لینے سے نہ روک سکے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو شاید سب سے پہلے اس کی گردن زد میں آئے گی۔

## دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش

(یکم رجب 1427ھ بمطابق 28 جولائی 2006ء)

یہ 1985ء ہے۔ لبنان کے درودیوار پر ایک خط چسپاں ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں اس خط کی ایک نقل تھا دی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ”مجاہدین کی جانب سے ایک کھلا خط۔“ یہ خط ایک ایسے ماحول میں رکھا گیا تھا جب تین سال سے لبنان میں کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ اس خط میں مجاہدین نے اپنے چار اہداف مقرر کیے:

- (1) لبنان سے امریکی اور فرانسیسی اثر و رسوخ کا مکمل خاتمہ۔
- (2) اسرائیل کو لبنان کی سرحدوں سے باہر دھکیلنا اور یہ اس کے خاتمے کا آغاز ہو گا یہاں تک کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔
- (3) لبنان کے ان اشتراکی ملحدوں کو ان کے ظلم و ستم کی سزا کے لیے قانون کے سامنے لانا۔
- (4) لوگوں کو اس بات کا موقع فراہم کرنا کہ وہ اپنی مرضی کا طرز حکومت چن سکیں لیکن یاد رہے کہ مجاہدین صرف اور صرف اسلامی قوانین پر مبنی حکومت چاہتے ہیں۔

اس اعلان کے بعد اسلامی جہاد کے لوگ مسجدوں اور مدرسوں میں پھیل گئے اور اپنے دست و بازو اکٹھے کرنے لگے۔ کچھ لوگ دن بھر عوام میں جلسوں میں شامل ہوئے اور باقی جنوبی لبنان میں موجود اسرائیلی فوجیوں پر حملے کرتے۔ ایسا گروہ بھی تھا جس کے ذمے ہر اس امریکی اور فرانسیسی کی ہلاکت تھی جو اسرائیلی کی بالادستی کو لبنان میں منظم کرنے کے لیے آیا تھا۔

ایک جانب اسرائیلی افواج نقصان اٹھا رہی تھیں تو دوسری جانب امریکی اور یورپی اتحادی۔ امریکا کو اپنی اس بیرک کا حملہ تو آج بھی زخم کی طرح یاد ہو گا جس میں اس کے 241 سپاہی ایک ساتھ جہنم رسید ہوئے تھے۔ 1983ء اور 1984ء میں امریکی سفارت خانے اور اس کے رہائشی علاقے پر حملے بھی آج تک امریکا کے سینے پر لگنے والا وہ انگارہ ہیں جسے ان کے مصنف مدت گزارنے کے بعد بھی نہیں بھولتے۔ صبح کے وقت یہ حملے بیک وقت ہوئے اور شام تک امریکی اور فرانسیسی فوجوں نے وہاں سے دم دبا کر بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب بڑی طاقتوں کی یہ ذلت سامنے آئی تو اسرائیل نے بھی جنوبی لبنان سے اپنی فوجوں کو دھکیلنا شروع کیا اور وہ جنوبی لبنان میں ایک چھوٹے سے سکیورٹی زون تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ پسپائی بڑے زخم لیے ہوئے تھی ہر کوئی واپس مجاہدین پر حملے کی تاک میں تھا لیکن جیالے مجاہدین اب اس حیثیت میں تھے کہ اپنی دی گئی شرائط پر امن قائم کر سکیں۔ وہ عرب دنیا جس نے پچاس سال ایک تماشا دیکھا تھا اسرائیل کی جارحیت کا، اس کا ظلم و تشدد گوارا کیا تھا۔ آج اس کے سامنے یہ حیرت انگیز منظر تھا کہ مجاہدین کے تمام قیدی رہا ہو رہے ہیں اور وہ بدلے میں اسرائیلی قیدیوں کو

انہوں نے دہشت گردی کے طریقے ایجاد کیے؟

چالیس کے عشرے میں یہودی دہشت گردوں نے جن جن کر 338 برطانوی شہریوں کو ہلاک کیا کیونکہ وہ یہاں صرف اور صرف یہودیوں کو آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ دنیا بھر میں ٹارگٹ کلنگ (Traget Killing) کی پہلی شکل تھی جو وجود میں آئی۔ اسرائیل کے قیام سے قبل ان دہشت گردوں نے چالیس ایسے یہودیوں کو بھی قتل کیا جو اس کے قیام کے مخالف تھے اور وہ عربوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

دسمبر 1954ء تک دنیا کو طیاروں کے اغوا کے طریقہ کار کے تصور تک کا علم بھی نہ تھا لیکن انہوں نے شام کا طیارہ اغوا کیا تاکہ لوگوں کو یہ خیال بنا کر اسرائیلی سپاہیوں کو آزاد کرایا جاسکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ طیارہ اغوا کرنے کی یہ واردات فلسطینیوں کے طیارہ اغوا کرنے سے بیس سال پہلے وقوع پذیر ہوئی۔ پارسل بم کا تصور سب سے پہلے یہودیوں نے ایجاد کیا اور وہ اپنے مخالفین کو اس طرح ٹھکانے لگاتے تھے۔

1938ء کا 17 سالہ لڑکا ہرشل تو یاد ہو گا جو پولینڈ کے یہودی کا بیٹا تھا۔ یہ لڑکا پیرس میں موجود تھا جب پولینڈ سے غداری کے جرم پر یہودیوں کو نکالا جانے لگا۔ ہرشل نے ایک پستول خریدا اور جرمنی کے سفارت خانے جا پہنچا۔ اس کی سفیر سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن اس نے نائب سفیر کو قتل کر دیا۔

لیکن آج جس دہشت گردی کا تذکرہ مجھے کرنا ہے وہ یہودی ایما پر اور پس پردہ رہ کر ایک ایسے گروہ کو تخلیق دیتا ہے جس سے وہاں کا امن غارت ہو جائے۔ یہ لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مرجائیں اور دنیا ان کا تماشا دیکھے۔ خریدے ہوئے دہشت گردوں سے کاروائی آج دنیا بھر کا معمول بن چکا ہے لیکن اس کا آغاز لبنان سے ہوا۔

1955ء میں جب اسرائیل پر موشے دایان کی حکومت تھی۔ اس وقت بن گوریان نے ایک تجویز پیش کی جنونی لبنان ہمارا سکیورٹی زون ہے اور اس علاقے کو بد امن اور منتشر رکھنے کے لیے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خانہ جنگی ہی اسرائیل کے مفاد میں ہے۔

16 مئی 1955ء کو بن گوریان نے ٹھوس تجاویز پیش کیں اور ایسے لوگوں کا نام بھی لیا جو اس کام کے لیے آمادہ ہیں اور یوں لبنان میں 20 سالہ خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ اس ساری خانہ جنگی کے لیے لبنانی فوج کے لیے ایک افسر میجر حداد کو خریدا گیا اور اس کے ذریعے SLA (South Lebanon Army) بنائی گئی۔ میجر حداد کو اسلحہ کی باقاعدہ سپلائی جاری رہی اور امریکا کی جانب سے مہلک ترین ہتھیار جن میں چھوٹے چھوٹے ٹکسٹر بم بھی شامل تھے، اسے ملتے رہے۔ اس مدد کے تحت اس نے ہزاروں لبنانی عیسائیوں اور فلسطینیوں کا قتل عام کیا۔ وہ اسرائیل اور امریکا دونوں کا منظور نظر رہا۔

آج ایک بار پھر امریکا اور اسرائیل لبنان میں ایک اور میجر حداد کی تلاش میں ہیں۔ یہ تلاش پندرہ سال سے جاری ہے۔ ناکامی کے بعد وہ حملے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اب نہ تو حزب اللہ اور نہ ہی حماس اس جال میں پھنستے ہیں اور لبنانی عوام کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ان کا دشمن کون ہے؟ اب تو شاید کوئی میجر حداد بننے کی کوشش بھی کرے تو لوگ اسے پتھر مار مار کر ماریں۔

وہ قوم جس نے پندرہ سال زخم کھائے، قتل ہوئے، قربانیاں دیں اور دنیا کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ اب ہمارے درمیان سے دہشت گرد خرید کر نہیں بنائے جاسکتے۔ اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے دہشت

## دہشت گردی کے بانی

(08 رجب 1427ھ بمطابق 14 اگست 2006ء)

جنگ عظیم دوم کے بعد مغرب کی مگر وہ سازشوں کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ایک ناجائز بیچ نے جنم لیا۔ ایک زرخیز خطے میں قائم کیا گیا یہ ملک صدیوں سے فلسطینیوں کی سر زمین تھا جس پر دنیا بھر سے یہودی لاکر آباد کیے گئے۔ اگرچہ یہ سلسلہ جنگ عظیم اول کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا جب ان تمام ممالک نے مل کر مسلمانوں کی آخری خلافت سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کیا تھا۔ مسلمانوں کو رنگ، نسل، قوم اور زبان کی بنیاد پر بانٹ دیا گیا اور اس سلطنت کو یوں تقسیم کیا گیا جیسے میز پر یک کورکھ کر تقسیم کیا جاتا ہے۔

1900ء سے لے کر 1939ء تک کا عرصہ اس علاقے میں دنیا بھر سے خاموشی سے یہودیوں کو لاکر آباد کرنے کا زمانہ تھا۔ ان کی کالونیوں کی تعداد 22 سے شروع ہو کر 200 تک جا پہنچی۔ یہ یہودی چھ ہزار کی کل تعداد سے بڑھ کر چار لاکھ 29 ہزار چھ سو پانچ (429,605) ہو گئی۔

یوں نومبر 1947ء میں امریکا کی حکومت اقوام متحدہ نے جنرل اسمبلی کی سفارش پر فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک عرب ریاست اور دوسری یہودی ریاست۔ یوں یہودی آبادیاں جو صرف 7 فیصد حصے پر موجود تھیں انہیں عالمی ”ضمیر“ نے 55 فیصد زمین تحفے میں دے دی اور اپریل 1948ء میں اس ملک کے قیام سے ذرا پہلے دہشت گردی کا آغاز ہوا۔

یہودی دہشت گرد اسکوارد ”ارگن“ ڈیرہ یلین کے علاقے میں گھس گیا اور 254 فلسطینی مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ بے رحمی کی انتہا یہ تھی کہ ہلاک شدہ ماؤں کے پیٹوں میں جنم لینے والے بچوں کو بھی مرنے کے بعد سنگین گھونپیں لگائیں۔ مکانات کو ڈانٹا مایٹ لگایا۔ عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ساری لاشوں کو اٹھا کر کنوئوں میں پھینکا گیا اور پھر کنوئیں پاٹ دیے گئے۔

یہ دہشت گردی کا ایک بے خوف ناک آغاز تھا کہ چند روز کے اندر اندر پانچ لاکھ مسلمان خوفزدہ حالت میں فلسطین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سارے قتل کی مگرانی اسرائیل کے دوبارہ منتخب ہونے والے وزیر اعظم مناخم بیگن کے ہاتھ میں تھی جو اس وقت صیہونی دہشت گرد گروہ کی قیادت کر رہا تھا۔ آج اس گاؤں کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے اور وہاں پر ایک یہودی ہستی گیوراث مشوبیت کے نام سے آباد ہے۔

یہ وہ واحد ملک ہے جس کی بنیاد دہشت گردی پر رکھی گئی۔ میں یہاں چند ایک حقائق رکھنا چاہتا ہوں کہ اس بُر امن دنیا میں دہشت گردی کا آغاز کرنے والے کون تھے؟ کون تھے کہ جب دنیا کو ان جھکنڈوں کا علم تک نہ تھا،

گرد کو کیسے نیست و نابود کیا جائے؟ کیسے اس دہشت گردی کے بانی کو اس کے انجام تک پہنچایا جائے.....؟ لیکن معلوم نہیں ہم مسلمان کب تک اس رزم گاہ کے باہر کھڑے رہے گے۔  
ہمیں تماشا گاہ دیکھنے کی عادت ہو گئی ہے لیکن تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جو قومیں تماشا دیکھنے کی عادی ہو جائیں ایک روزہ خود تماشا ضرور بنتی ہیں۔

## اب دفاع کون کرے گا؟

(15 رجب 1427ھ بمطابق 11 اگست 2006ء)

”اگر یہ لوگ لبنان کی فوج میں شامل ہو کر اس کا باقاعدہ حصہ ہو جائیں تو ہمارا ان سے جھگڑا ختم“ یہ الفاظ دہشت گرد ریاست کے وزیر اعظم ایہود المرت کے..... جس کے ملک اسرائیل نے تین ہفتوں سے لبنان کے معصوم شہریوں پر بمباری، تباہی و بربادی اور ظلم و ستم کا آغاز کر رکھا ہے۔ ایسے حالات میں جب دوسو کے قریب معصوم بچے اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہوں۔

شہر کے شہر کھنڈر بن چکے ہوں۔ چھ لاکھ سے زیادہ لوگ بے گھر ہو چکے ہوں۔ دنیا کے اس بڑے منتقل میں انسانوں کی زندگی بے قیمت اور بے حیثیت بن چکی ہو وہاں اسی عالم میں ایک اور بیان سامنے آیا۔ اگر ہماری فوج بھی مضبوط نہ ہوتی تو ہمارا حال بھی لبنان جیسا ہوتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ اگر ہم نے مضبوط گھر نہ بنایا ہوتا تو ہمارا حال بھی سیلاب کی زد میں آنے والے کچے گھروں جیسا ہوتا۔ بے یار و مددگار اور بے آسرا لڑنے والوں کا اس سے بہتر تمسخر نہیں اڑایا جاسکتا۔

لیکن جب میں ان دونوں بیانون کو اکٹھا کر کے پڑھتا ہوں تو مجھے صرف حیرت ہوتی ہے کہ اسرائیل جیسا غاصب ملک اور امریکا جیسی تشدد پسند طاقت کسی بھی ملک کی ریاستی فوج کو اتنا کیوں پسند کرتی ہے۔ اس سے خائف کیوں نہیں۔ وہ اسے اپنے امن اور اپنی بقا کی ذمہ دار کیوں گردانتی ہے لیکن جب میں گزشتہ چالیس سال کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک عالم حیرت میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان چالیس سالوں میں امریکا ہویا روس، اسرائیل ہویا کوئی اور جارح.....

اسے کسی بھی ریاستی فوج نے شکست نہیں دی بلکہ اکثر اوقات وہ ان غاصب قوتوں کی ہمنوا بنی رہی۔ جبکہ ذلت آمیز شکست دینے والے وہ مٹھی بھر سرفروش تھے جو اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے دیوانوں اور فرزانوں کی طرح ان غاصبوں پر حملہ آور ہوئے اور انہیں ذلت کے انجام سے دو چار کیا۔

آئیے! ذرا اس چالیس سالہ تاریخ کی سچائی اور شجاعت سے پر داستان پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ ویت نام ہے۔ حکومتی فون امریکا کی کاسہ لیس ہے۔ اس سے اسلحہ لے کر اپنے ہی شہریوں کو موت تحفے میں دے رہی ہے۔ خود امریکا کی فوج، اس کے جہاز، اس کے ٹینک اس فوج کے ساتھ مل کر ان آزادی کے متوالوں کا خون بہا رہے ہیں۔ کون سا ایسا ہتھیار ہے جو یہاں استعمال نہ کیا گیا۔

ڈیزی کٹر بموں سے نیپام بموں تک، کھیتوں اور کھلیانوں میں دن رات برستے یہ موت کے پروانے ویت



سروں میں صرف شہادت کا سودا سلیا ہوا ہے۔

یہاں مجھے امریکی وزارتِ دفاع کا وہ تبصرہ یاد آتا ہے کہ امریکا یا اسرائیل کو ریاستی فوج سے کوئی خوف نہیں خواہ وہ کسی حکومت کی فوج کیوں نہ ہو۔ ہمیں تو خوف ان گروہوں سے ہے اس لیے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنا میدان جنگ خود منتخب کرتے ہیں۔ اپنا ہدف خود طے کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کر کے خود ایک ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔

انہیں اپنے دشمن کا علم ہوتا ہے اور اسے انجام تک پہنچانے کا فن جانتے ہیں۔ انہیں کسی مفاد، کسی عالمی رائے عامہ، کسی سیاہی بیان بازی اور ایجنج کی پروا نہیں ہوتی۔ ان کا کوئی جرنیل کا سر لیس ہو جائے، بک جائے، امریکی یا اسرائیلی مفاد کا حامی ہو جائے تو انہیں اس ڈسپلن کا محتاج نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ڈسپلن اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کا محتاج ہے۔ ایسے میں ایہود المرت کہتا ہے کہ یہ لوگ سرکاری فوج کا حصہ بن جائیں تو ٹھیک کہتا ہے اس لیے گزشتہ چالیس سال میں ان افواج نے نہ اپنے ملک کا دفاع کیا اور نہ ہی چھپ چھپ کر غاصبوں سے جنگ کی۔ اب دفاع کا ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا جو مجاہدین نے کیا کہ سب لبنانی شہریوں کو اسلحہ تقسیم کر دیا۔ سب سپاہی، سب محافظ..... نہ کسی جرنیل کے بکنے کا خطرہ نہ اس امریکا کی غلامی میں جانے کا خوف۔



نام کے شہریوں پر آگ برساتے رہے۔ ایسے میں ریاستی فوج کے کسی شخص کو بھی اپنے ہم وطنوں سے، مادرِ وطن سے یا صرف انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ یاد نہ آیا لیکن واشنگٹن کے میشر کے درمیان، کیپل بل کے سامنے ایک دیوار ہے جس پر ان ساتھ ہزار امریکی ظالم فوجیوں کے نام درج ہیں جنہیں ویت نام کے ان جانبازوں نے موت کی آغوش میں بھیج دیا جو کسی ریاستی فوج کا حصہ نہ تھے بلکہ وطن سے ان کا مفاد اور اس کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ ان کی متاع تھی۔ یوں 1969ء میں ایک عالمی طاقت ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کے ملک سے نکلے۔

80ء کی دہائی میں ایک دوسری عالمی طاقت کو اپنے زور بازو پر بھروسہ اور اپنی طاقت پر گھمنڈ ہونے لگا۔ وہ افغانستان کے ملک میں داخل ہو گئی۔ وہاں بھی حکومتی فوج اس کے شانہ بشانہ تھی۔ اسے اپنے وطن کی مٹی سے محبت اور اس کی حرمت کی حفاظت یاد نہ تھی۔ بس مفادات تھے جو روس کی فوج اور اس کی حکومت سے وابستہ تھے۔

ایسے ہی اس ملک کے چپے چپے کی حفاظت اور اسے غیر ملکیوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنے کی ذمہ داری ان مجاہدین نے اٹھائی جو کسی باقاعدہ فوج کا حصہ نہ تھے۔ جن کی سرفروشی اور فرزانگی صرف جذبہ ایمان کی بنا پر ہوتی تھی۔ مجھے وہ آخری سپاہی یاد آ رہا ہے جو روس کی فوج کے رخصت کے وقت اپنی ذلت اور رسوائی پر آنسو بہا رہا تھا اور اپنے پیاروں کی موت کا ماتم کر رہا تھا۔

یہ دو مثالیں تو ذرا دور کی تاریخ کی ہیں۔ آئیے عراق چلتے ہیں۔ صدام حسین روز اپنی فوجی طاقت کے قصیدے پڑھ رہا ہے۔ دنیا اس کی فوج کو ایک طاقت ور فوج سمجھتی ہے۔ کون سا بڑا ملک ہے جس سے اس نے اسلحہ نہیں خریدا۔ امریکا کی فیکٹریاں اسے کئی سال تک خطرناک اسلحے سے لیس کرتی رہیں۔

پوری دنیا اس توقع میں تھی کہ جب امریکی فوج زمینی حملہ کرے گی تو عراق کی فوج ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی لیکن عالمِ حیرت میں دیکھنے والوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک بھی فوجی ان امریکی گاڑیوں اور ٹینکوں کے مقابلے میں آکر کھڑا نہ ہوا بلکہ اس چھ لاکھ فوج نے یا تو اپنی وردیاں جلا ڈالیں یا زمین میں دفن کر دیں اور آج اس عراق کے شہروں سے امریکی فوجیوں کے تابوت وہ لوگ بھیج رہے ہیں جو کسی بھی ریاستی فوج کا حصہ نہیں ہیں۔ جن کی زندگیاں اپنے وطن کے دفاع کے لیے قربان ہونے کو تیار ہیں۔ جن کا ایمان اللہ کے دعوؤں اور شہادت کی لذت پر ہے۔ ایسے میں امریکا کو لڑتے ہوئے مجاہدوں کے مقابلے میں ریاستی فوج کیوں محبوب نہ ہوگی۔

ادھر حزب اللہ کی سرفروشی اور جانبازی کے نتیجے میں فتح کا عالم دیکھیے۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے عرب ممالک نے افواج منظم کیں تاکہ اسرائیل کو شکست دے سکیں لیکن ذلت آمیز شکست سے دو چار ہوئیں۔ اس پورے عرصے میں صرف ایک فتح ہے جو حزب اللہ کے نصیب میں آئی۔ ایک ذلت آمیز شکست ہے جو اسرائیل کا مقدر ہوئی۔ حزب اللہ نے اپنا جنوبی لبنان کا علاقہ خالہ کر دیا۔

اپنے شہری واپس لیے اور اسرائیل کو بھاگنے پر مجبور کیا۔ ایسے میں نہ مصر کی فوج ساتھ تھی، نہ لبنان کی اور نہ ہی اردن کی۔ یہ مجاہدین کوئی لاکھوں پر مشتمل افراد کا گروہ نہیں صرف اور صرف تین ہزار لوگ ہیں۔ یہ نہ خواہ کے لالچ میں بھرتی ہوئے اور نہ ہی پروموشن اور کیریئر کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ تو شہادت کی آرزو اور رضائے الہی کے حصول کے دیوانے ہیں۔ ایسے دیوانوں سے کون خوف نہیں کھائے گا۔ آج بھی وہ اسرائیل کو اپنی سرحدوں سے باہر روکے ہوئے ہیں۔ آج بھی ان کے راکٹ اسرائیل کے علاقوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ آج بھی وہ بے خوف ہیں۔ ان کے

مرنے والے 63 افراد کی باقیات بھی اسی یادگار میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ایک دوسری یادگار ہے۔ ایک دوسرا عجائب گھر ہے جو امریکا کے دارالحکومت واشنگٹن میں بنایا گیا ہے۔ اسے Holocaust میوزیم کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں نازی افواج کے ہاتھوں ساٹھ لاکھ یہودی مارے گئے۔ یوں تو اس سارے افسانے کا راز فاش کرنے والے بہت سے لوگ ہیں لیکن جس نے بھی اس کے خلاف لکھا اسے جیل بھیج دیا گیا سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ الگ کہانی ہے لیکن اس میوزیم میں وہ تمام شواہد بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں پر یورپ میں ظلم عظیم کیا گیا۔ تصاویر، مرنے والوں کی لٹیں، ان کے خون آلود کپڑے اور دستاویز رکھے گئے ہیں..... لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہودی یورپ میں مارے گئے۔ ظلم وہاں ہوا اور میوزیم امریکا میں بنایا گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس پوری قوم اور حکومت کو یہودیوں کے بارے میں ایک احساس جرم میں مبتلا رکھا جائے اور وہ ان کا ساتھ دیں۔ دوسرا یہودیوں کے مظالم کے مقابلے میں اپنی مظلومیت کا چرچا زیادہ کیا جائے۔

پہلا میوزیم جو شمالی کیرولینا میں ہے وہ حزب اللہ کے آغاز کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس طاقت کا اظہار ہے جو مظلوموں کے اکٹھا ہونے سے نفی ہے لیکن آج ٹھیک 18 سال بعد یہ مظلوم ایک اور کہانی مرتب کر رہے ہیں۔ ایک ایسی کہانی کہ دنیا کی چار بڑی طاقت ورفوجوں میں سے ایک فوج کو چار ہزار افراد پر مشتمل ایک گروہ جو صرف دینی نظریے کی پاسداری اور وطن کی حفاظت کے لیے سرگرداں ہے منہ توڑ جواب دے رہا ہے۔

اس وقت اسرائیلی یہودی روزانہ اپنی لاشیں اٹھا رہے ہیں۔ ان کا شہر حیفہ خالی ہو چکا ہے۔ یہودی یروشلم اور تل ابیب کے ہوٹل میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ امریکا اس دفعہ خود نہیں بلکہ اس کا اسلحہ یہاں پہنچ رہا ہے کیونکہ امریکا کی وزارت دفاع کے مطابق عراق اور افغانستان کے بعد امریکا کے پاس ایک فالتو سپاہی نہیں جو باہر بھیج سکے ورنہ امریکا کی اپنی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ایسے میں ایک جانب بیروت اور لبنان کے معصوم شہریوں کی لاشیں اور کھنڈر ہوتے ہوئے مکان ہیں اور دوسری جانب طاقت ور مگر خوف زدہ اسرائیل کے جلے ہوئے ٹینک اور کٹی ہوئی لاشیں..... لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اس جنگ کے بعد شاید اب اسرائیل کسی یادگار بنانے کا تحمل نہ ہو سکے اس لیے کہ اس وقت اسرائیل کے اخبار اور میڈیا جس خوف کے عالم میں اپنی شکست اور اپنی حکمت عملی کی ناکامی بتا رہا ہے، اپنے لوگوں کا خوف اور اپنی اموات کا تذکرہ کر رہا ہے، ایسے میں یادگاریں تعمیر نہیں ہوا کرتیں۔ اب تو اگر مسلمہ اُمہ کے یہ نوجوان کفن باندھ کر اٹھ جائیں تو اسرائیل خود ایک یادگار بن جائے۔

شاید اس شکست کے بعد جواب نظر آرہی ہے، میڈیا اس جنگ کا تذکرہ بھی نہ کرے کیونکہ یادگاریں عالم شکست میں تعمیر نہیں ہوتیں..... لیکن اکثر سوچتا ہوں کہ کیا مسلم اُمہ کے 50 سے زیادہ ملکوں میں کوئی ایک نہیں جو ایک اسرائیل کے مظالم پر مبنی ایک یادگار تعمیر کرے جسے دیکھ کر اُمت مسلمہ اپنی غیرت، حمیت اور حریت کا سبق یاد کرے.....

لیکن جہاں حکمران اسی غیرت، حمیت اور حریت سے عاری ہوں وہاں یادگاریں نہیں، مزار ہی بنتے ہیں اور وہ مزار حزب اللہ کے گوریلوں جیسے جان فروش ہی بنایا کرتے ہیں۔



## یادگار نہیں مزار

(22 رجب 1427ھ بمطابق 18 اگست 2006ء)

امریکا کی ریاست شمالی کیرولینا کے شہر جیکسونویل میں ایک یادگار ہے۔ یہ شہر ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس لیے اسے یادگار کا حق دار ٹھہرایا گیا ہے کیونکہ مرنے والوں کی اکثریت اس شہر سے تھی۔ اسے بیروت یادگار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں ان امریکی سپاہیوں کے حوالے سے اشیاء رکھی گئی ہیں جو 80ء کی دہائی میں اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی ملی بھگت سے پیدا ہونے والی خانہ جنگی میں وہاں گئے تھے۔

وہ لوگ جو اس دور میں اس امریکی فوج میں بھرتی ہو کر بیروت گئے۔ ان میں سے زندہ واپس آنے والوں میں سے صرف چند ایک ایسے ہیں جو فوج میں نوکری کر رہے ہیں۔ یہ یادگار جسے بیروت میموریل کہا جاتا ہے، 1986ء میں مکمل ہوئی۔

گزشتہ دنوں ایک ہی ایسے فوجی نے جو بیروت میں بھیجا گیا تھا وہاں کا دورہ کیا اور اپنے زخم بیان کرتے ہوئے اخبار میں ایک مضمون لکھا۔ اس کے ساتھ People میگزین کا فوٹو گرافر بھی تھا جو اس کی لمحہ بہ لمحہ تصاویر بنا رہا تھا۔ اس فوٹو گرافر گیڈولن کینس کا کہنا ہے کہ جوں جوں یہ شخص ان کی تصاویر کو دیکھتا تھا، ان فوجی وردیوں کی طرف توجہ کرتا تھا تو اس کے چہرے پر خوف سے پسینہ آ جاتا تھا۔

اس یادگار کو دیکھنے کے بعد وہ سپاہی کہنے لگا کہ امریکیوں نے وہ خوف اور وہ درد دیکھا ہی نہیں جو ہم نے وہاں دیکھا ہے۔ گیارہ ستمبر جس کا بہت بڑا شہرہ ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے امریکی میڈیا کے لوگ تھکتے نہیں وہ تو 18 سال پہلے بیروت میں واقع ہوا تھا اور وہ اس گیارہ ستمبر سے زیادہ خوفناک اور ہشت زدہ کرنے والا تھا۔

123 اکتوبر 1983ء کی صبح اکثر امریکی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ کوئی رات کی گزری یادوں میں مست تھا اور کوئی خوف کے عالم میں نیند کی گولیاں لے کر سویا ہوا تھا۔ ایسے میں ایک ٹرک امریکی بیروں کے پاس آیا اور زور سے ٹکرا گیا۔ یہ ٹرک بارود سے بھرا ہوا تھا اور اس کا چلانے والا شخص عرب تھا جس کے پورے خاندان کو اس فساد نے بموں سے اڑا دیا تھا اور ہم امریکی اس کی کسی نہ کسی طور پر پشت پناہی کر رہے تھے۔

ٹرک ٹکرایا تو پھر جو کھلبلی مچی اس کا عالم بیان سے باہر ہے۔ کوئی کسی کو پہنچاتا نہ تھا۔ سپاہیوں کی جلی ہوئی لاشیں اور ٹکڑے چاروں جانب بکھرے تھے اور زخمیوں کی چیخوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو چند لمحے پہلے تک لبنان میں بلند ہونے والی معصوم شہریوں اور عام نہتے عوام کی چیخوں سے بے نیاز تھے۔ 241 سپاہی چند سیکنڈ میں لقمہ اجل بن گئے۔ ان کی تصویریں اور دیگر سامان اس یادگار میں موجود ہے۔ امریکی سفارت خانے میں

رہا تھا: ”ہم ذلیل و رسوا ہو گئے، دنیا کے سامنے ہماری کمزوری عیاں ہو گئی۔“

انہوں نے جان لیا کہ ہم کوئی ایسی طاقتور اور مضبوط قوم نہیں ہیں۔ ہمارے ساڑھے تین لاکھ یہودی حریف اور دیگر علاقوں سے خوف کے عالم میں کوچ کر کے تل ابیب اور یروشلم آ گئے۔ اور جب وہاں بھی انہوں نے حزب اللہ کی دھمکیاں سنیں کہ ہم ان شہروں کا بھی نشانہ لے سکتے ہیں تو پلٹ کر بے چینی کے عالم میں اپنے لیڈروں کو گالیاں دینے لگے۔

آج دنیا کی طاقتور ترین فوج کے سپہ سالار سے استغنے مانگا جا رہا ہے۔ وزیراعظم کو معزول کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ ان تمام یہودیوں کو گولیاں دی جا رہی ہیں جو یورپ کے دیگر ملکوں سے آ کر آباد ہوئے تھے جو صرف عیش و عشرت و آرام کے طلب گار تھے۔ جو فوجی شکست سے واپس آئے وہ بتاتے ہیں کہ حزب اللہ نے ہماری سپلائی لائن تک کاٹ دی تھی۔ ہم کئی دنوں تک کھانے سے محروم رہے۔ ایک اخبار نویس نے لکھا کہ بہت سے اسرائیلی سپاہی پانی کی کمی کا شکار ہو کر بستر مرگ پر واپس لائے گئے۔

یہ سب صرف چند ہزار مجاہدوں کے ہاتھوں ہو گیا۔ پجاریوں کو اس پر یقین نہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ وہ تو ایسی باتوں کو چودہ سو سال پرانی کہانیاں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک میدان بدر تو ایک افسانہ ہے کہ فرشتے نصرت کو اترتے ہوں گے۔ وہ اس کی بہت تاویلیں بتاتے تھے مگر آج دنیا نے ان کے سامنے تمام بھرے، تمام جائزے غلط قرار دے دیے۔ اقبال یاد آتے ہیں۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو  
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

## یہ دن بھی آنا تھا

(30 رجب 1427ھ بمطابق 25 اگست 2006ء)

طاقت کے پجاریوں اور اسلحہ و بارود پر تکیہ کرنے والوں کی زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا، انہوں نے سوچا تک نہیں ہو گا۔ یہ لوگ آپ کو دنیا کے ہر خطے اور ہر علاقے میں مل جائیں گے اور ان کی اکثریت ان لوگوں میں ہوتی ہے جو کسی قسم کا عینا لوجی پر مبنی عسکری کورس کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ ہر زمانے میں تھے۔

ہر بادشاہ اور حکمران کے کا سر لیس تھے۔ جب مفلوک الحال مسلمانوں کی فوج جس کے پاس نہ اسلحہ تھا نہ ساز و سامان، نہ گھوڑے صحیح تعداد میں میسر تھے نہ تلواریں تو طاقتور ایرانی شہنشاہ کے غرور کا یہ عالم تھا کہ اس نے مسلمان قاصدوں کو اپنے وطن کی مٹی تحقیر کے ساتھ پکڑا دی تھی۔ وہ لوگ جنہیں دنیاوی جاہ و جلال سے کوئی نسبت نہ تھی اور اللہ کی طاقت پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے اسے ایک فال جانا اور پھر تاریخ نے وہ منظر دیکھا کہ کسریٰ کی سپر پاور ان نہتے مسلمانوں کے ہاتھوں زیر ہو گئی۔

ایسے واقعات کی مثالیں جب ان پجاریوں کو دی جاتیں تو وہ طرح طرح کی تاویلیں کرتے۔ دیکھو وہ چودہ سو سال پرانی باتیں ہیں۔ اس وقت ایک طرح کے ہتھیار ہوتے تھے۔ نیزے تھے، تلواریں تھیں، باقی سب کچھ تو قوت بازو سے ہوتا تھا۔ آج کل تو تین ہزار فٹ کی بلندی سے جہاز بم برساتا ہے اور سارے کا سارا قوت بازو ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔

سائنس نے وہ سسٹم ایجاد کر لیے ہیں کہ آپ کی طرف سے چلائی جانے والی گولی، بم یا میزائل مڑ کر واپس آپ کی طرف لوٹ آئے۔ اسے کہتے ہیں ایئر ڈیفنس سسٹم۔ اس پر کوئی میزائل، کوئی راکٹ، کوئی گولی اثر نہیں کرتی۔ یہ پجاری لوگ سیٹلائٹ سے لڑی جانے والی جنگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ تمہاری گاڑیوں تک کے نمبر ان کے پاس موجود ہیں۔ تم جدھر بھی جاتے ہو یہ تمہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور پھر تاک کر نشانہ بناتے ہیں۔

ان پجاریوں میں وہ دفاعی تبرہ نگاہ بھی شامل ہیں جو گزشتہ 40 سالوں سے اسرائیل کی طاقت اور ایئر ڈیفنس سسٹم کے گن گار ہے تھے۔ ارد گرد کی تمام عرب حکومتوں کو سمجھا رہے تھے کہ دیکھو اس طرف منہ مت کرنا ورنہ ذلت آمیز شکست تمہارا مقدر بن جائے گی۔ امریکا کے اپنے دفاعی ماہرین رشک سے اس سسٹم کی طرف دیکھتے اور کہتے کہ کاش ہم پورے امریکا پر ایسا ہی ایئر ڈیفنس سسٹم بنا سکتے جیسے اسرائیل نے اپنے ملک پر بنایا ہے۔ ایک جال بن دیا ہے جس میں سے تو ہم بھی اندر نہیں داخل ہو سکتا۔

لیکن طاقت کے پجاریوں کی آنکھوں کے سامنے اسرائیل کی پارلیمنٹ میں ایہود المرت تقریر کر رہا تھا اور کہہ

بڑے ڈونر بھی شامل تھے جو کئی ملکوں کے اتحاد سے بنے تھے۔

اب طریقہ واردات یہ ٹھہرا کہ چند لوگوں کو اکٹھا کرو، ایک انجمن بناؤ۔ اس کے اغراض و مقاصد میں ایک فقرہ رکھ دو کہ خواتین کے حقوق، ان کے خلاف امتیازی قوانین کے خاتمے اور معاشرے میں برابری کے لیے جدوجہد کریں گے، بس پھر آپ پر دولت کی بارش ہو جائے گی۔ یوں ان تمام انجمنوں کو دفاتر، کمپیوٹر، کیمرے اور ملٹی میڈیا سے لے کر گاڑی تک فراہم کی گئی۔

یہاں تک کہ ان کو بار بار درکشاپ کرانے، کانفرنسیں کرنے اور احتجاج کرنے کے لیے پیسے دیے گئے۔ کئی سال یہ سب تماشا ہوتا رہا اور اس کا نشانہ صرف اور صرف حدود قوانین بنتے رہے کہ ایسے ہی اللہ اور اس کے رسول کے قوانین کا تسخیر اڑایا جاسکتا تھا۔ یوں ڈونرز کی مدد پر پلنے والا ایک گروہ تخلیق ہو گیا جسے آج کے اہل اقتدار ”سول سوسائٹی“ کہتے ہیں۔ یہی افراد ہیں جن کے بارے میں وہ پوری دنیا کو بتاتے پھرتے ہیں کہ یہ ہمارے ملک کی رائے عامہ ہے اور ہم اس رائے عامہ کا احترام کرتے ہیں۔

لیکن ان گزشتہ سالوں میں اس قانون کی آڑ لے کر جس طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین کا تسخیر اڑایا گیا اور اس کی آڑ لے کر معاشرے میں مذہب، اسلام اور اللہ سے بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اس کی مثال پاکستان کی 59 سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

میں گزشتہ سات سالوں کے اقدامات کی بات نہیں کرنا چاہتا، میں تو بس ان چند ماہ کے داویلا کی طرف آپ کی توجہ لے کر آنا چاہتا ہوں جو اچانک شروع نہیں ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس بحث کو چھیڑنے والے جو لبادہ لیے ہوئے ہیں وہ بھی مذہبی تاویلات کا ہے۔ تاویلات کی یہی بحث ہے جو انسان کو متغیر کرتی ہے اور فرار کا راستہ دیتی ہے۔ یہ سب خود بخود شروع نہیں ہوا، اس کا ایک پس منظر ہے۔

امریکا کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ جسے عرف عام میں RAND کارپوریشن کہتے ہیں، اس نے 2003ء میں مسلمانوں بلکہ پوری مسلم اُمہ کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے ایک جامع منصوبہ بنایا جس کی بنیاد پر ایک رپورٹ مرتب کی گئی جس کا نام ہے Civil Democratic Islam: Partners, Resources and Strategies (مہذب جمہوری اسلام: وسائل اور طریق کار) اس رپورٹ نے طریق کار میں بتایا کہ ہمیں سیکولر ذہن کے افراد اداروں کی مدد کرنی چاہیے اور ان کے اسلام کے بارے میں خیالات کو وسیع کر کے تبدیل کرنا چاہیے اور شدت پسند اسلامی نظریات رکھنے والے افراد کی کمزوریوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جیسے کہ وہ سفاک ہیں، بے ایمان ہیں، جاہل ہیں، متعصب ہیں اور قیادت کے قابل نہیں ہیں اور سب سے خطرناک بات کہ اسلام کی تشریح کے لیے جو اس کے علما کی اجارہ داری ہے اس کو توڑا جائے اور ایسے اسکالرز کو سامنے لایا جائے جو ماڈرن ہوں اور اسلام کی ماڈرن طریقے سے تعبیر کر سکیں۔ ان کو ویب سائٹس پر، چینلوں پر اور نشریاتی اداروں پر آگے لایا جائے۔ ان کے لیے میڈیا کے راستے آسان کیے جائیں اور ایسے میڈیا کو مدد فراہم کی جائے۔

اس کے بعد یہودی اور اسلام دشمن لابی کی دولت RAND کارپوریشن کے دروازے پر دستک دینے لگی اور پھر اخبار اور ٹیلی ویژن چینلوں کا انتخاب کیا جانے لگا جہاں ایسے افراد کو پیش کیا جائے، جن کی تعبیر اسلام کی صدیوں پرانی مروجہ تعبیر سے ہٹ کر ہو۔ صرف ایک نظر اس گزشتہ ایک سال کے میڈیا پڑ ڈالی جائے تو یہ بتانے کی ضرورت ہی

## ستیزہ کار رہا ہے ازل سے

(07 شعبان 1427ھ بمطابق یکم ستمبر 2006ء)

چاروں جانب شور مچا ہے، میڈیا چیخ رہا ہے، چینل دن رات اس موضوع پر مذاکرے نشر کر رہے ہیں۔ اخبارات کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی طوفان آیا ہو اسے۔ لوگوں کی زندگیاں، جان و مال اور آبرو خطرے میں ہے۔

شاید ہی اس ملک کی تاریخ میں کسی مسئلہ پر اتنا دواویلا مچایا گیا ہو جتنا حدود آرڈی نینس کے حوالے سے چھایا گیا۔ ایسا کیوں ہے؟ کب سے اس کا آغاز ہوا اور کس کی دولت، وسائل اور آشیر باد اس سب کے پیچھے ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ آئیے ازل تاریخ کے ایک سفر پر روزانہ ہوتے ہیں۔

1979ء میں جب حدود آرڈی نینس آیا تو اول اول خاموشی رہی اور پھر اگلے ہی سال جہاد افغانستان شروع ہو گیا۔ عالمی طاقتوں کی اس مڈ بھیڑ میں ان کو وہ مقاصد پس پشت ڈالنا پڑے جو اُمتِ مسلمہ کے خلاف ان کا خاصہ ہے لیکن اس کے باوجود بھی بہت مختصر بیانیے پر اس آرڈی نینس کے خلاف رائے نامہ کو ابھارنے اور ایسے لوگوں کی مدد کرنے کا کام جاری رہا۔

سب سے پہلے اتحاد اس کے خلاف وین ائیکشن فورم کے نام پر بنوایا گیا جس کی اراکین مختصر تعداد میں پوسٹر اٹھا کر بڑے بڑے شہروں میں کبھی کبھار نکل آئیں لیکن جیسے ہی افغانستان سے روس کا آخری سپاہی رخصت ہوا، پاکستان میں چند نام بڑی تیزی سے گردش کرنے لگے۔ انسانی حقوق، حقوق نسواں، جینڈر بیلنس (Gender Balance) اور خواتین کے خلاف امتیازی قوانین کا خاتمہ۔ یہ وہ نعرے تھے جو مغرب سے برآمد کیے گئے اور ملک کے کونے کونے میں چھوٹی چھوٹی انجمنیں بنوائی گئیں۔ ان کو این جی اوز کہا جاتا تھا۔

1995ء میں خواتین کے حقوق پر بیجنگ کانفرنس ہوئی تو پاکستان میں بے نظیر کی حکومت تھی۔ اس دوران پاکستان اس ڈیمکریٹک لیشن کو پیش کرنے والے ممالک میں سے تھا جسے CEDAW کہتے ہیں۔ اب تو امداد کے دروازے کھل گئے۔ جس کسی کے پاس چند ارکان کے نام میسر آئے اس نے ایک درخواست تیار کی اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے سفارت خانوں سے امداد لینے کے لیے پہنچ گیا۔

148 ایسے سفارت خانے تھے جنہوں نے ایک دفتر اپنے سفارت خانوں میں کھولا جہاں سے امداد دی جاتی تھی۔ آغا خان کی این جی او اور ریسورس سینٹر نے ان کی ایک فہرست بنائی جسے Donors کی ڈائریکٹری کہتے ہیں اور پورے ملک میں ان افراد میں تقسیم کردی جو فنڈ لینا چاہتے تھے۔ اس ڈائریکٹری میں سفارت خانوں کے علاوہ وہ بڑے



## وطن کی فکر کرنا داں

(21 شعبان 1427ھ بمطابق 15 ستمبر 2006ء)

پورے ملک میں اگر تلہ سازش کیس کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، ایوب خان کا جرنیلی اقتدار مستحکم تھا اور اس کی مخالفت کرنے والا ہر شخص غدار اور شر پسند۔ دہشت گرد کا لفظ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں تحریک پاکستان کے دوران سائیکل پر گاؤں گاؤں پھر کر پاکستان کی مہم چلانے والے مجیب الرحمن کو اس سازش کے سرغنہ کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا۔ مغربی پاکستان کی اکثریت اس حکومتی پروپیگنڈے کی زد میں تھی اور اسے واقعی غدار سمجھتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان والے اسے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے والا ہیرو۔ یہاں پر کسی نے ان کی آواز سنی اور نہ ان حقائق کو پرکھ کر دیکھا جو وہ اپنے ان مغربی پاکستان کے بھائیوں کو پیش کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے 19 وفاقی سیکریٹریوں میں بھی ایک بھی مشرقی پاکستان سے نہیں۔ 41 جوائنٹ سیکریٹریوں میں سے صرف تین مشرقی پاکستان سے۔ 133 ڈپٹی سیکریٹریوں میں سے صرف دس اور 548 انڈر سیکریٹریوں میں سے 38 مشرقی پاکستان سے۔ فوج میں تین لیفٹیننٹ جنرل تھے، سارے مغربی پاکستان سے۔ 21 میجر جنرلوں میں سے صرف ایک۔

35 بریگیڈیئروں میں سے صرف ایک۔ 51 کرنلوں میں سے صرف دو۔ 218 لیفٹیننٹ کرنلوں میں سے صرف دس مشرقی پاکستان سے۔ انفرورس کے 640 افسروں میں 9 کا تعلق اس صوبے سے تھا جو آج بنگلہ دیش ہے اور 593 نیوی کے افسران میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس 55 فیصد آبادی کے لیے پہلے 5 سالہ منصوبے میں 26 فیصد رقم، دوسرے میں 32 فیصد اور تیسرے منصوبے میں صرف 36 فیصد رکھی گئی جس کے بعد وہ ہم سے الگ ہو گئے۔ وہ یہ سب کچھ کہتے رہے اور ہم یہ آواز اٹھانے والوں کو ایجنٹ، غدار، شر پسند اور ملک دشمن قرار دے کر کیس بناتے رہے۔

لیکن جس وقت اگر تلہ سازش کیس میں مجیب گرفتار ہوا تھا تو دنیا کے میڈیا پر بڑے بڑے تھنک ٹینک جو امریکا اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں اسکا لڑتے تھے، ان کی توجہ کسی اور جانب تھی۔ وہ اس نا انصافی اور حکومتی جبر سے ایک سازش کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ 1967ء میں ان تھنک ٹینکس نے بنگلہ دیش کا ایک نقشہ شائع کیا اور پھر اس پر عرق ریزی ہونے لگی اور ٹھیک چار سال بعد میرا ملک دولخت ہو گیا اور دنیا کے نقشے پر وہ ملک معرض وجود میں آ گیا جسے ”بنگلہ دیش“ کہتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے اور دکھ کا لمحہ ہے کہ جس دن یعنی 26 اگست کو مری کے علاقے بھنجھور کی پہاڑیوں میں نواب اکبر بگٹی کی آواز کو خاموش کیا گیا اسی دن امریکا کے آرمی کے جرنل جسے (Armed formal journal) کہتے ہیں اس میں ایک نقشہ شائع ہوا جس پر فری بلوچستان لکھا ہوا تھا۔

یہ نقشہ رالف پیئررز (الف مصنف) کے مضمون ”Blood Border“ کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ مصنف

باقی نہیں رہتی۔ کس کس نے RAND کارڈ پولیشن سے پیسہ لیا اور میرے دین کو، اس کے اصولوں کو، اس کی اقدار کو تسخیر کا نشانہ بنایا۔

ایسے لوگ ہر صدی میں پیدا ہوئے لیکن ہمارے اسلاف کی تاریخ میں ہر دور میں امام احمد بن حنبل جیسے افراد ضرور پیدا ہوتے رہے جو ان کے مقابل آکھڑے ہوں۔ لیکن میرا دکھ یہ ہے کہ یہ سب ضمیر فروش میرے ملک سے کیوں ملے؟ یہ داغ میرے وطن کے ماتھے پر کیوں سجا؟ شاید میرے وطن کی سادہ لوح عوام کو علم ہی نہیں کہ یہ بظاہر مخلص نظر آنے والے کس کی دولت کی جھلک پر رقص پیش کر رہے ہیں؟



## صرف اللہ پر ایمان سے

(28 شعبان 1427ھ بمطابق 22 ستمبر 2006ء)

ہم تو حیران ہیں کہ یہ دو سو ملین ڈالر کہاں سے آگئے؟ اتنی امداد تو آج تک اقوام متحدہ نے کسی جنگ سے متاثرہ علاقے میں خرچ نہیں کی ہوگی۔ کسی ملک نے اتنی امداد ایک ساتھ کسی علاقے کو فراہم نہ کی ہوگی۔ یہ چند ہزار لوگ جو ابھی چند دن پہلے ایک شدید قسم کی جارحیت کا مقابلہ کر چکے ہوں اور دنیا کی ایک غاصب طاقت کو ذلت آمیز شکست سے دو چار کر چکے ہوں۔

پھر بھی ان کی ہمت اور حوصلے کی داد تو دی جاسکتی ہے مگر یہ پیسے کہاں سے آگئے؟ ایسی حیرانی کا اظہار لبنان میں بہت سے دوسرے کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے سامنے مجاہدین کا ایک چہرہ سامنے آیا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک ذیلی تنظیم بنائی ہے جسے ”جہاد للبناء (جہاد برائے تعمیر)“ کہتے ہیں۔ یہ تنظیم جنگ سے متاثرہ لبنان کی تعمیر نو کی ذمہ دار ہے۔ اس تنظیم میں انجینئرز، آرکیٹیکٹ، کنسٹرکٹرز اور دیگر ماہرین شامل ہیں جو حیران کن طریقے سے یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اس وقت لبنان کی تعمیر نو کے اس کام میں حزب اللہ کے دو ہزار انجینئرز کام کر رہے ہیں۔

حیرانی تو سب کو ہے حیرانی اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے اور خوف اس بات کا کہ بقول امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر جوڈتھ سودان، ہیرک کہ حزب اللہ کا یہ ادارہ جہاد للبناء اب بیروت میں لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو مسخر کر رہا ہے۔ ان کے انجینئرز اس کام کے ماہر ہیں اور پوری ایمان داری سے یہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ امریکا اور یورپ سے اپنی ملازمتیں چھوڑ کر واپس لبنان میں کم تنخواہ پر آئے تاکہ اپنے ملک کی خدمت کر سکیں۔

جنگ جیتنے کے بعد انہوں نے جنوبی لبنان، جنوبی بیروت اور شمال مشرقی شہروں میں تباہ حال عمارتوں، سڑکوں اور پلوں کو از سر نو تعمیر کرنا شروع کیا۔ حیرت کی ایک اور بات کہ ان کی مدد کرنے کے لیے پورے لبنان کے ہزاروں رضا کار شامل ہو گئے جو حزب اللہ کے ممبر نہیں تھے بلکہ اس کے جذبہ تعمیر سے متاثر ہو کر میدان میں نکلے تھے۔ اگست کی چودہ تاریخ کو جنگ بند ہوئی اور اسی دن جہاد للبناء کے سربراہ نسیم الحق کو معلوم تھا اور مکمل آگاہی تھی کہ اس جنگ کے دوران کتنے گھر تباہ ہوئے۔

کون سے مکمل طور پر تباہ ہوئے اور کون سے تھوڑی حد تک اور انہیں کس قسم کی مدد درکار ہے اور پھر ستمبر کے پہلے ہفتے میں ان کے پاس ایک ایک گھر میں تباہی کی مکمل تفصیل موجود تھی۔ یہ کام تو جتنی قسم کا ہے۔ سرکاری ادارے بھی ایسا کام مہینوں میں کرتے ہیں۔ انہوں نے صابرہ کے قریب ساویہ المہدی اسکول میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا اور دن

آزاد یا فری لانس نہیں فوج کا ملازم ہے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہے اس لیے یہ مضمون کسی طور پر ایک آزاد رائے یا زاویہ نظر تصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ امریکا کی مسلح افواج کی رائے، خواب، خواہش اور آرزو کا نمائندہ تصور ہوگا۔ اس مضمون میں پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان علاقوں کو جس طرح تقسیم کیا گیا اور ان میں رنگ و نسل اور عقیدے کی بنیاد پر ایسی ملکیتیں وجود میں لائی گئیں کہ امت مسلمہ کبھی بھی متحدہ نہ ہو سکے۔

خلافت عثمانیہ کو توڑ کر چھوٹی چھوٹی علاقائی ریاستوں میں تقسیم کیا گیا۔ مغلوں کے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے بعد ایک طویل عرصہ حکمرانی میں یہاں نفرتوں کے بیج بوئے گئے اور ایک مسلم حکمرانی والے خطے سے ہندو ریاست علیحدہ کی گئی۔ مصنف نے کہا کہ یہ تمام تقسیم اور یہ تمام بارڈر خون تھوکتے ہیں اور انہیں انگریزوں کے اپنے مشہور عام ”تقسیم کرو اور حکومت کرو“ کے اصولوں پر بنایا تھا۔ اس لیے ان حکومتوں میں بھانت بھانت کی آبادیاں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی ہیں۔ اس نے ایک نقشہ ترتیب دیا ہے کہ کیسے ان خون تھوکنے والے بارڈر کو پر امن سرحدوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

ان میں ہر ملک کے بارے میں بتایا گیا کہ کتنا رقبہ اس سے نکلے گا اور کتنا شامل ہوگا؟ ایک لسٹ ہے کھونے والے۔ دوسری لسٹ پانے والے۔ اس سارے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں سب سے بڑا کھونے والا ملک پاکستان ہے۔ نقشے کے مطابق اس کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کا پشتون علاقہ افغانستان میں ضم ہے اور بقیہ بلوچستان ”فری بلوچستان“ کے طور پر ابھرے گا۔

پاکستان سندھ اور پنجاب پر مشتمل رہ جائے گا۔ نقشے کے مطابق بحیثیت ملک ختم ہو جائے گا اس سے کردستان، شیعہ عرب ریاست اور سنی عرب ریاست نکلے گی۔ افغانستان کے فارسی بولنے والے ایران میں اور اس کے بلوچی بولنے والے قریبی بلوچستان میں شامل ہوں گے۔ تیل کے ذخائر جو سعودی عرب میں ہیں انہیں یمن اور شیعہ عرب ریاست میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ مکہ اور مدینہ کو مسلمانوں کی مقدس ریاست کا درجہ ہوگا جہاں تمام فرقوں کی ایک کونسل حکومت کرے گی۔ یوں تو یہ نقشہ ایک مضحکہ خیز اور دیوانے کی بڑ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب میں اس کا ماخذ دیکھتا ہوں اور اپنے ملک اور ارد گرد کے حالات دیکھتا ہوں تو ایک خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پہلے جہاں ممکن ہو اپنی مرضی کے حکمران لے آؤ، پھر جس ملک کو مکمل تقسیم کرنا مقصود ہوا اسے ختم کر لو اور جہاں سازش کے تانے بانے بننے ہوں ان ملکوں کی حکومتوں کو اپنا غلام بنا لو۔

ایسے میں 1971ء میں نکسن کی زندگی کی یادداشتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہمارا مقصد صرف اور صرف مغربی پاکستان کو بچانا تھا، وہ ہم نے بھارت بھیج کر حاصل کر لیا۔ رہا بنگلہ دیش کا قیام تو وہ فیصلہ ہو ہی چکا ہے۔ ممکن ہے اب بھی فیصلہ ہو چکا ہو اور میرے بلوچستان کے بھائی ویسے ہی فرد جرم ہاتھ میں لیے گھومتے رہیں، کہتے رہیں: ہم آپ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے یہ حق دے دو اور آپ ایک دن اس خبر سے چونک پڑیں کہ وہ ہم سے الگ ہو گئے۔

ایسے میں کون ہے جو اس فرد جرم کو پنجاب، سندھ اور سرحد کے اوپر عائد کرے کہ ایسا نہ ہو کہ ایک اور نقشہ وجود میں آجائے گا۔ ایک اور خواب پورا ہو جائے گا۔ ایک اور سازش کامیاب ہو جائے گی۔

راست لبنان کی تباہی کا نقشہ مرتب کیا۔

یہ تو تعمیر نو کا کام تھا جو حزب اللہ نے اپنے ذمہ لیا لیکن ایک اور کام جو اکثر عالمی ادارے کیا کرتے ہیں۔ جس طرح کے کاموں کے لیے بڑے بڑے ملکوں کی امداد شامل ہوتی ہے جسے اقوام متحدہ کے مہاجرین جیسے بڑے اداروں کی تنظیم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ کام تھا جنگ کے دوران اپنے گھروں سے نکل کر ہجرت کرنے والے افراد کو پناہ فراہم کرنا۔ اس سارے عرصے میں انہوں نے ایسے افراد کو زور اور دیا اور مکان کے کرایہ بھی کہ جہاں کہیں بھی انہیں جگہ میسر آ سکے وہ رہ لیں۔ پورے لبنان میں پُر امن علاقوں میں بلا امتیاز رنگ نسل و عقیدہ لوگوں کے اپنے دیدہ و دل فروش راہ کیے ان مہاجرین کے لیے جو اپنا علاقہ جنگ کی وجہ سے چھوڑ کر آئے۔ لوگوں کو ان کے مکان کی تعمیر نو کے لیے جو پیسے دیے گئے۔ پوری دنیا کا میڈیا سوال کرنے پہنچ گیا کہ کیا یہ روپے یا رقم ان کے نقصان کے برابر ہے تو انہیں ایک بھی ایسا نڈل سکا جو یہ کہہ سکے کہ یہ رقم اس کے نقصان سے کم ہے۔

دلوں اور ذہنوں کو مضمحل کرنے کی یہ جنگ جاری ہے اور پورا مغربی میڈیا اس طرف لگا ہوا ہے کہ کوئی سراغ ملے۔ کہیں سے کوئی خبر ہاتھ آئے کہ یہ لوگ کہاں سے مدد حاصل کر رہے ہیں؟ کہاں سے یہ سب ڈالر آرہے ہیں؟ ان کے کام میں خرابی یا بے ایمانی کہاں کہاں پر ہے؟ لیکن نہ تو بیروت کا کوئی شہری ان کی حرکت پر گواہ بننے کو تیار ہے اور نہ ہی لبنان کی حکومت..... سب اس حقیقت کو جان گئے ہیں کہ ہمارا دفاع اور ہماری ویلفیئر کے لیے بے تاب حزب اللہ کے سرفروش ہیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ اور پڑھ رہا تھا تو اپنے کشمیر اور سرحد میں آئے ہوئے زلزلے کی کہانیاں یاد آرہی تھیں۔ الرشید ٹرسٹ، الاخر ٹرسٹ، الخدمت، جماعت الدعوة اور ایسے ہی لوگ جو اس وقت وہاں جا پہنچے، جس لمحے کسی سرکاری اہلکار کو ہمت نہ ہو سکی۔ عالمی برادری ہو یا عالمی ادارے کسی نے اس کارِ خیر میں آغاز کی جرات نہ کی۔ اس سے بھی لوگ حیران تھے۔ ان لوگوں میں یہ جنتی طور پر کام کرنے کا جذبہ کہاں سے آتا ہے۔

ان کا دامن تو ہر بے ایمانی اور کرپشن سے پاک ہے۔ ان کے ساتھ لوگ جوق در جوق رضا کار کے طور پر کام کرنے لگتے ہیں۔ لوگ انہیں کو عطیات کیوں دیتے ہیں؟ ایسی ہی حیرانی اس وقت بھی تھی اور خوف یہ کہ کہیں یہ ایک اللہ پر ایمان رکھنے والی تنظیمیں دلوں اور ذہنوں کی جنگ جیت نہ جائیں لیکن ہم ایک لحاظ سے بد قسمت تھے۔

لبنان کا وزیر اعظم بھی امریکی آشیر باد سے آیا تھا لیکن اس میں جرات تھی۔ اس نے اعتراف کر لیا، ہم خاموش رہے۔ دنیا کا پریس آج بھی یہ سوال کرتا ہے کہ لوگ ایسی تنظیموں کی مالی امداد کیوں کرتے ہیں؟ تو جواب ایک ہی ملتا ہے۔ ان میں ایمان داری ہے، خلوص ہے، جذبہ ہے اور جو بے دینی کا احساس ہے.....

لیکن میرے ہاں صرف ایک جواب ہے اور وہ ہے اللہ پر ایمان اور اس کے سامنے پیش ہو کر جواب دہی۔ یہی حاصل ہے اور یہی اصل ہے۔

## دو خود نوشت سوانح عمریاں

(12 رمضان 1427ھ بمطابق 106 اکتوبر 2006ء)

میں نے اس شخص کو کئی بار ٹیلی ویژن پر صحافیوں سے گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ ان کے تند و تیز حملوں اور سوالوں کے جواب میں اس کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ ہوتی۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ ہو چکا تھا اور اب اس بات پر فیصلہ ہونا باقی تھا کہ کون غیرت مند زندگی کو ترجیح دیتا ہے خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو اور کون ہے جو ذلت و رسوائی اور کاسہ لیس کی عمر کی طلب میں ہے خواہ وہ طویل ہو۔

جنہوں نے ذلت و رسوائی کا سودا کر لیا وہ اس شخص کے ملک میں سمجھانے بجھانے کے لیے جانے لگے۔ ترغیبات، خوف، دلا سے اور دھمکیاں سب کچھ ہوا لیکن اس شخص کے ملک کے لوگ تو جیسے لوہے کے پختے تھے۔ ان پر لالچ اثر کرتی تھی اور نہ ہی کسی دھمکی کا خوف تھا۔ ذلت و رسوائی کا طوق گلے میں ڈالنے والے بیان باز یوں سے بھی باز نہ آتے تھے۔ کہتے یہ لوگ بے وقوف ہیں، کم عقل ہیں۔

کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے اور اپنے ملک کو بچایا لیا جائے لیکن ان با اصول اور غیرت مند لوگوں کا جواب تو بس ایک ہی تھا۔ ہم خود تو کٹ سکتے ہیں، مر سکتے ہیں لیکن مہمان کسی کے حوالے نہیں کرتے۔ یہ سب تماشا جاری تھا۔ کوسید، پشاور اور اسلام آباد کے ہوٹلوں میں دنیا بھر کے صحافیوں کا ایک جرم غیر موجود تھا اور یہ شخص ان سب کے سوالوں کے نشانے پر تھا۔ گیارہ ستمبر کے حملے کے بعد پاکستان میں افغانستان کا سفیر ملا عبدالسلام ضعیف۔

میں نے جہاز پر سوار ہونے کے لیے جانے والی بس میں اُسے پہچان لیا۔ میرے ساتھ اُس وقت بی بی سی کا نمائندہ ڈیوئل لیگ بھی تھا۔ ہم کوسید سے اسلام آباد کی فلائٹ پر سوار ہونے جا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ ملایا تو وہ انتہائی نرم اور مختصر سا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی خطا یا مصدور کا ہاتھ ہو۔ اس کے بائیں ہاتھ میں آذر باجیان پر انگریزی میں لکھا ہوا سفر نامہ تھا جسے اس نے جہاز میں بیٹھتے ہی کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ گفتگو سے وہ ایک وسیع المطالعہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کوئی سیاسی یا عالمی تناظر کا سوال نہیں کیا اس لیے بھی کہ ایسے سوال تو اس سے ہر کوئی کرتا پھر رہا تھا۔ میرا تجسس تو اس کے ذوق مطالعہ پر تھا۔ کوسید سے اسلام آباد تک ایک گھنٹے کے سفر میں اس کی شخصیت کا ایک تاثر یوں ابھرتا تھا جیسے ایک پڑھا لکھا، نفیس الطبع نازک خیال اور حساس شخص۔ اگرچہ ہماری گفتگو پشتو میں تھی لیکن اکثر میں انگریزی میں بھی گفتگو کا آغاز کر دیتا جس کا وہ اسی روانی سے جواب دے دیتا۔

## جھوٹ کی اپنے گھر کو واپسی

(19 رمضان 1427ھ بمطابق 13 اکتوبر 2006ء)

جنگِ عظیم دوم میں ایک کردار بہت زیادہ مقبول ہوا۔ یہ شخص ہر روز اپنی قوم کو ایک نئی فتح کی خوشخبری سناتا اور پھر ایسے ہزاروں لوگوں کو جنگ کے شعلوں میں جھونکنے پر تیار کرتا جنہیں اس بات پر کامل یقین ہو جاتا کہ اب فتح ہمارا مقدر ہے اور پھر ہم مالی غنیمت لوٹیں گے۔ عیش و عشرت اور ہوس کاری کے باب کھلیں گے۔ دشمن کی زمینیں، مال اور عورتیں ہماری دستریں میں ہوں گی۔ اس شخص کا نام تھا گوبلز۔ یہ ہٹلر کے اہم ترین ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اس کا ایک مقولہ تاریخ کے صفحات پر مغربی دنیا کے اصولوں کی یوں ترجمانی کرتا کہ آج بھی ویسا ہی سچ معلوم ہوتا ہے۔

اس نے کہا: ”اتنا جھوٹ بولو کہ لوگوں کو سچ محسوس ہونے لگے۔“

یہ اصول صرف ہٹلر یا اس کے ساتھیوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اور جس قوم کے ساتھ مغرب نے جنگ کی، مخالفت کی یا اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی اسی جھوٹ کو اپنا بہترین ہتھیار سمجھا اور استعمال کیا۔ جنگ کی بات تو ایک طرف جب جنگِ عظیم دوم کے بعد امن قائم ہوا۔ اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ تباہ حال دنیا کو از سر نو تعمیر کرنے کا مارشل پلان امریکا کی جانب سے پیش کیا گیا۔

یہ پلان کسی ملک کے خلاف جنگ یا جارحیت نہیں بلکہ ترقی کے نام پر بنایا گیا تھا لیکن اس کا سب سے اہم حصہ آبادی کو کثرت دل کرنے اور انہیں ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔ یہ ایک طویل بحث ہے کہ اس پروگرام کو سی آئی اے کی کس طرح آشیر باد حاصل رہی بلکہ یہ پروگرام سارے کا سارا سی آئی اے کی ان رپورٹوں پر ترتیب دیا گیا تھا کہ ہمیں افریقہ، ایشیا اور مڈل ایسٹ کے ممالک کی آبادی کو روکنا ہے کیونکہ افریقہ پھر کسی مہدی سوڈانی کی تلاش شروع کر دے گا۔ باقی ملک اگر کثیر آبادی کے حامل ہو گئے تو ہمارے ملکوں پر چڑھ دوڑیں گے۔

ایسے میں یہودی امریکی اسکالر اور وزیرِ ہنری کسنجر کا وہ فقرہ آج ایک Doctrine کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے کہا تھا: ”ہمیں مسلمانوں کی آبادی کو کم کرنا ہے اگر یہ منصوبہ بندی سے ہو جائے تو بہتر ورنہ فوج کے استعمال سے یہ کام کیا جائے گا۔“ یہ بہت لمبی کہانی ہے لیکن اس پروگرام کے لیے جھوٹ کی ایک فیکٹری لگائی گئی جسے John Hopkins Institute کہتے ہیں۔

اس نے دنیا بھر کے ممالک کے بارے میں اعداد و شمار چھاپنے شروع کیے اور ایسے خوف ناک اعداد و شمار کہ جیسے ان ملکوں پر بلائیں ٹوٹنے والی ہیں۔ اگر تم نے آبادی کم نہ کی تو فلاں سن میں تمہارا انانج ختم ہو جائے گا۔ فلاں میں

لیکن آج اس نفیس الطبع شخص کا چہرہ ایک بالکل مختلف تناظر میں یاد آ رہا ہے۔ آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے کی اس حساس شخص کی عینک سے پیچھے بولتی آنکھیں یاد آ رہی ہیں اور جوں جوں میں اس کی سرگزشت کے مندرجات اور اس پر گزری واردات پڑھتا جاتا ہوں تو پشیمانی، شرمندگی اور خجالت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں ابھی تک اس حالتِ حیرت سے باہر ہی نہیں آسکا۔ کیا عجیب دن ہوگا جب ایک مسلمان سفیر، ایک مسلمان ملک کی سرزمین پر چند مسلمانوں کے ہاتھوں امریکی حکام کو فروخت کر دیا گیا تھا۔

جب اس نفیس انسان کو ٹھڈے، مکے، گھونسے اور لاتیں پڑ رہی تھیں، اس کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے تو یہ سب مسلمان، اسلامی جمہوریہ کے کارپردازان خاموش تماشا شائی بنے دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں پر بندھی پٹی ذرا سر کی تو عبدالسلام ضعیف کو نظر آیا کہ ان کے چہروں پر کوئی ملال تک نہ تھا بلکہ ان کے ذرا دور ایک گاڑی کھڑی تھی جس پر مملکتِ خداداد پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

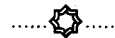
اس خودنوشت میں ظلم و جبر کی اور بہت سی کہانیاں ہیں۔ یہ قصے اور یہ دستاویز بار بار بیان ہوتی رہی ہیں جو ان عظیم مسلمانوں پر بلگرام اور گوانتانامو کے قید خانوں میں بیتی، وہ تاریخ کا حصہ ہے لیکن میرے لیے شرمندگی، ذلت اور رسوائی کا باب وہی تھا جب اسے غیر کے ہاتھوں میں فروخت کر دیا گیا۔

یہ خودنوشت ابھی چند دنوں کی طفولیت میں تھی کہ بیچنے والوں میں سے بھی خودنوشت آگئی۔ کیا عجیب و غریب دعویٰ تھا اس خودنوشت میں ”کون لوگ ہیں جو ہمیں کہتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا، دہشت گردی کی جنگ میں، انہیں پوچھیں اگر یہی بات ہے تو ہم نے جو چار سو کے قریب القاعدہ اور طالبان کے لوگ پکڑ کر دیے۔ اس کے بدلے میں ہمیں اتنی خطیر رقم انعام میں کیوں دی گئی؟“

یہی وہ اعتراف ہے جو مجھے چین سے سونے نہیں دیتا۔ یہی وہ ملت فروشی ہے جو میری راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ دنیا بھر میں سفیروں کو عزیمت و توقیر سے رکھا جاتا ہے۔ ان کے سفارت خانوں میں امان حاصل کرنے والوں کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جاتا اور ہم تو اس اُمت کے وارث ہیں۔ اس سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کے امین ہیں جو ایک سفیر کی جان کے بدلے اپنی تاریخ کی وہ بیعت لیتے ہیں جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے جن بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر اللہ نے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

یہ دو سوانحِ عمریاں دراصل دو چارج شیٹیں ہیں۔ ایک میں باغیرت، باہمت اور سرفروش کی مظلومیت ہے اور ایک میں مفاد پرستی، کاسر لیس ہے۔ تاریخ دونوں کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا دے گی اور اس کا فیصلہ ان دونوں خود نوشتوں کے بارے میں وہی ہوگا جو ٹیپو سلطان اور میر صادق کے درمیان یا سراج الدولہ اور میر جعفر کے درمیان ہوا اور آج تک ہمارے محاورے میں ہے۔

یہ بھی ہو سکتا کہ ”گیڈر کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔“ کا تاج ملا عبدالسلام ضعیف کے سر سے اُتار کر خوف کے عالم میں جھکنے والے کے سر پر رکھ دیا جائے۔





سچ بتایا گیا لیکن اس دفعہ شکست اتنی شدید تھی کہ اس کی اتنی زیادہ ہے کہ اب اپنے کھریں بھی نہیں بولتا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار میں جھوٹ، تقریروں میں جھوٹ، بیانات میں جھوٹ، ٹیلی ویژن اور ریڈیو بلکہ اخباروں میں جھوٹ..... شاید جھوٹ اب اپنی منزل تک واپس پہنچ گیا ہے۔ جہاں سے چلا تھا اب وہیں غروب ہو رہا ہے اور اس غروب کا منظر ایسا ہے کہ امریکا کو کی نیو کون Neocon یہودی دانش ور دیکھنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے تو ایسا سوچا تک نہ تھا۔



قسط آئے گا۔ فلاں میں زیر زمین پانی نہیں ہوگا۔ بیماری آئے گی۔ ہسپتال نہیں ہوں گے۔ موت آئے گی دفن کرنے کے لیے لوگ نہیں ہوں گے۔ ان اعداد و شمار میں جھوٹ کو ایک لائحہ عمل کے طور پر لیا گیا۔

خود اس کے بانی نے آغاز میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ”آپ چند ایک رپورٹیں سچی دو اور پھر اگر اپنے مقصد سے بھرپور جھوٹ سے بھری ہوئی رپورٹ لوگوں کے سامنے رکھو گے تو وہ من و عن یقین کر لیں گے لیکن اس جھوٹ کی نیکشری کو جو شکست ہوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اربوں ڈالر جھوٹ دے دیے گئے، مانع حمل ادویہ کی بارش کی گئی۔ ترغیبات، لالچ، خوبصورت اور خوشحال خاندان کے چمکے سب کچھ ہوا مگر اس پورے خطے میں جہاں مسلمان بستے ہیں وہاں مارشل پلان، ہنری کسنجر اور جان ہاکنز انسٹی ٹیوٹ کی خواہشات کے مطابق آبادی میں کمی تو ایک طرف اس میں جو اضافہ ہوا اس نے ان کو خوف زدہ کر دیا۔ نہ روپیہ کام آیا اور نہ جھوٹ۔

اب ہنری کسنجر کی دوسری بات پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ عالم خوف میں اور کیا ہو سکتا تھا۔ سر جوڑے گئے اور یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے اختلاف، تنازعات اور جھگڑوں کا سلسلہ ملکوں میں شروع کیا جائے۔ جو جھگڑے دبے ہوئے تھے، انہیں از سر نو سہارا دیا جائے اور جو زندہ تھے ان پر مزید تیل چھڑکا جائے۔

70ء کی دہائی میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام میں ناکامی کے بعد آپ دنیا میں دیکھ لیں۔ اگر کہیں جھگڑوں، لڑائی اور جنگ کا میدان سجا تو وہ مسلمان ممالک ہی تھے۔ بنگلہ دیش بننے اور قتل عام سے لے کر افغانستان میں روسی فوج، جہاد، ایران عراق جنگ، لبنان کی سول وار، بوسنیا، چچنیا، صومالیہ، سوڈان غرض آپ نقشے پر نظر دوڑائیں تو حیران رہ جائیں گے۔

ایسے لگتا ہے کہ تمام مسلم ممالک میں بارود بچھا کر ایک فیتے سے منسلک کر دیا گیا ہے اور جہاں جہاں آگ پہنچتی ہے وہاں دھماکا ہوتا ہے، جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں جانوروں کا ضیاع اور املاک کی تباہی بھی وہ مقاصد حاصل نہ کر سکے جو کسنجر پالیسی کا ہدف تھے۔ اب تو خود میدان جنگ میں اترتا تھا۔ ننگی جارحیت کے لیے جواز چاہیے ہوتا ہے۔ جواز بنالیا گیا اور پھر ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ کا اعلان ہو گیا۔

ابھی صرف دو ممالک، افغانستان اور عراق ہی نشانہ بنے تھے کہ تابوتوں کی لمبی قطاریں امریکا اور یورپ کے ہوائی اڈوں پر اترتے لگیں۔ نہ ان دونوں ملکوں میں آزادی سے گھوم سکتے تھے اور نہ ہی اپنے ملک عزت سے سوالوں کا جواب دے سکتے تھے۔ ایسے میں جب شکست دونوں ملکوں کا مقدر ہو چکی تو پھر وہی جھوٹ اور اسی کا سہارا۔ اس ہفتے امریکا کے سب سے مشہور مصنف نے اس جھوٹ کو اپنی کتاب State of Denial یعنی ”انکار کی حالت“ میں بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اس نے ان لاشوں کی تعداد بتائی ہے جو امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان سے اٹھائی ہیں۔

اس اسلحے اور دولت کا حساب دیا ہے اور ان سالوں میں یہاں خرچ ہوئی ہے اور جس نے امریکا کی معیشت کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے۔ یہ اعداد و شمار بہت طویل ہیں لیکن ان میں امریکا اور ہنری کسنجر کی اس مسلمان آبادی کم کرنے کی پالیسی کی جو ناکام تصویر نظر آتی ہے وہ مقام عبرت ہے لیکن کتاب کے مصنف نے جو اصل بات کہی ہے وہ یہ کہ پہلے امریکا کا صدر پوری دنیا میں جھوٹ بولتا تھا، پروپیگنڈہ کرتا تھا لیکن اپنے عوام کو سچ ضرور بتاتا تھا خواہ وہیت نام کی جنگ ہو یا کوریا کی، فلپائن ہو یا کیوبا.....

اس نے اس امریکی نوجوان کو اس طرح بدل دیا کہ وہ منزل منزل بھٹکتا اپنے ملک سے دور کسی انجان علاقے میں جا نکلا جہاں سے اس نے صرف ایک کام کیا۔ اپنی کمپیوٹر اور میڈیا کی مہارت کو امریکی پالیسیوں اور ظلم و تشدد کی تشہیر کے لیے استعمال کیا۔ اس نے انٹرنیٹ پر بار بار ویڈیو ٹیپ جاری کیں جن میں امریکی فوجیوں کے مظالم کی تصویریں تھیں اور پھر اس نے امریکیوں کو ان کے انجام سے بھی ڈرایا۔ اس کی سب سے طویل ٹیپ 2004ء اکتوبر میں انٹرنیٹ پر آئی جو 75 منٹ پر مشتمل تھی۔ پچھلے سال ستمبر میں اس کی ٹیپ بھی ان لوگوں کی شاباش پر مشتمل تھی جنہوں نے گیارہ ستمبر کے حملے کیے۔

لیکن گزشتہ ماہ اس کی جس ٹیپ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا جس کے بعد امریکا کا وہ قانون حرکت میں آ گیا جو گزشتہ 65 سال سے مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس قانون کا استعمال صرف جنگ عظیم دوم کے زمانے میں ہوا۔ اسے ملک سے غداری کا قانون کہتے ہیں۔ اس قانون کے تحت جنگ میں اپنے ملک سے غداری سے مقدمہ چلایا جاتا ہے اور پھر اس کی بڑی سے بڑی سزا موت ہے۔ گزشتہ 65 سال سے امریکا کی دھرتی پر یوں لگتا ہے جیسے کسی غداری نے جنم نہیں لیا تھا لیکن اب اس نے جنم لے لیا تھا۔ عظام الامریکی پر اس قانون کے تحت امریکا کے گرینڈ جیوری نے غداری کا مقدمہ درج کیا۔ اس نے گزشتہ ماہ اپنی ٹیپ میں کہا ہے کہ امریکی فوج کے سپاہیوں کو شکست در شکست ہو رہی ہے اس لیے میں ان سے ہمدردی کے طور پر درخواست کرتا ہوں کہ وہ اب فوراً جیتنے والے گروہ میں شامل ہو جائیں اور یوں اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی تابوتوں، امریکی فوجیوں کی لاشوں، ان کی ذلت و رسوائی سے بھاگنے، جان بچا کر چھپنے کی تصویریں اور کہانیاں ہیں۔ اس گرینڈ جیوری کے سامنے امریکا کا ڈپٹی انٹرنی جنرل خود پیش ہوا اور اس نے غداری کے اس مقدمے کی پیروی کی۔

وہ ملک جسے اپنی قوت، اپنی طاقت، اپنے اسلحے اور اپنی برتری پر ناز تھا، جسے اپنے میڈیا پر گھمنڈ تھا، جو پوری دنیا بدلنے لگتا تھا، آج ذلت و رسوائی کا عالم یہ ہے کہ ایک 20 سالہ بچے پر جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں، بس ایک کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ویب سائٹ ہے اس پر غداری کا مقدمہ بناتا ہے۔ سب سے بڑی عدالت میں پیش کرتا ہے۔ انٹرنی جنرل کو بحث کے لیے بھیجتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ایک کتے اور کبھی کی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کبھی جب کتے کو اذیت دیتی ہے تو کبھی ناک پر بیٹھتی ہے، وہ وہاں پر نشان ہوتا ہے تو دم پر، پھر اڑ کر کرپر اور یوں کتا اپنے آپ کو کاٹ کاٹ کر ہلاک کر لیتا ہے۔ جس عالمی طاقت کو 20 سالہ بچے پر بغاوت کا مقدمہ قائم کرنے کی ضرورت پڑ جائے اس کے دن گنے جا چکے ہوتے ہیں۔



## دن گنے جا چکے

(26 رمضان 1427ھ بمطابق 20 اکتوبر 2006ء)

جنوبی کیلی فورنیا میں اس کا باپ ایک یہودی نسل امریکی ہے جسے زندگی بھر گانے بجانے کا شوق رہا۔ وہ اپنے اس شوق کی تکمیل کلبوں، ڈنرز اور پارٹیوں میں گا کر کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی اطلاع ہے کہ وہ آزاد خیالی کی وجہ سے عیسائیت کا مذہب اپنا کر عیسائی ہو گیا۔

بس مذہب بدلنے کا اعلان ہوا لیکن نام بدلانا کام۔ امریکا کے اس شہری کے گھر 28 سال قبل ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے نام ”ایڈم گران“ رکھا۔ ”ایڈم“ جو ہمارے آدم علیہ السلام کا انگریزی لب و لہجہ میں بگڑا ہوا نام ہے۔ یہ بچہ بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا رسیا تھا اور اپنے باپ کی طرز پر علاقے کا مشہور گلوکار بننا چاہتا تھا۔ اسے اکثر ایسی ہی محفلوں میں لطف ملتا لیکن اسی دوران اس کی ملاقات دو ایسے نوجوانوں سے ہو گئی جو اس کی زندگی بدلنے اور اسے ہدایت کی روشنی سے متاثر کرنے میں مددگار بن گئے۔

اس وقت ایڈم کی عمر صرف 17 سال تھی۔ ایسی عمر میں تو امریکی بچے لہو و لعب کی بھول بھیلوں سے باہر ہی نہیں نکلے ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ جسے ہدایت دے اور جب اس کے دل کو موسیقی کے شور سے نماز کے سکون کی طرف پھیر دے۔

ایڈم نے مسلمان ہوتے ہی اپنا نام ”عظام الامریکی“ رکھا اور جنوبی کیلی فورنیا کے اسلامک سینٹر جانے لگا۔ وہ ایک انتہائی عبادت گزار اور مذہب پر پابندی کرنے والا نوجوان تھا جو اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ایک ویب سائٹ بنائی جس کے اوپر لکھا: ”میں نے ایک اس مذہب اسلام کو اس لیے قبول کیا کیونکہ یہ انسان کی تمام تر تحقیق اور منطق پر پورا اُترتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے روحانی اور فنی اطمینان دیتا ہے۔

اسلام قبول کرنے، لوگوں کو بحث کر کے قائل کرنے اور عبادات میں مشغول ہونے تک کسی امریکی کو ”عظام الامریکی“ کے خطرناک، مشتبہ اور دہشت گرد ہونے کا شک اور شبہ تک نہیں تھا لیکن اسی نظام الامریکی کے بقول میں نے ابھی شباب کی منزلیں طے نہیں کی تھیں کہ امریکا کے شہر نیویارک میں ستمبر گیارہ کا واقعہ ہو گیا میں اس سے پہلے دنیا بھر میں امریکی پالیسیوں، اسرائیل کے ساتھ اس کی دوستی سے بڑھ کر ظلم و زیادتی میں ساتھ دینے، فلسطینیوں پر ظلم و تشدد پر خاموشی بلکہ شرکت کی وجہ سے امریکا سے متنفر تھا لیکن گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد جو موت کا کھیل اس دنیا میں کھلا گیا۔

جب اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ یہ مکڑی اس تمام عرصہ میں روزے سے رہتی ہے۔ جب وہ انڈے دے رہی ہو اور پھر اسے سینت رہی ہو۔ اس پورے عرصہ میں وہ جال بنتی ہے۔ انڈے دیتی ہے، سینکتی ہے، انہیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ جوان ہوں۔

اپنے جسم سے کچھ رطوبتیں بھی خارج کرتی ہے جو اس دوران بچوں کی خوراک بنتی ہیں پھر وہ جال کو توڑ کر آزاد کر دیتی ہے اور اپنا روزہ بھی توڑتی ہے اور اپنے رب کی طرف سے لازم کردہ اعتکاف بھی۔

گھری، جو زمین کی تہوں میں اپنا گھر بناتی ہے اور سرد موسموں میں رہتی ہے۔ گرمیوں میں اپنی خوراک جمع کرتی ہے اور پھر ایک جگہ جا کر چھپا دیتی ہے۔ پھر سردی کے آتے ہی زمین میں چھپ جاتی ہے اور پھر احکام الہی نے اس کے روزوں کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا ایک روزہ پانچ دن کا ہوتا ہے۔ پانچ دن بعد وہ اس جگہ پہنچتی ہے جہاں خوراک ہو، کھاتی ہے اور واپس لوٹ جاتی ہے۔ یہ روزہ اسے اس زندگی کی طرف لوٹنے کی اساس ہے ورنہ اگر وہ قانونِ قدرت کے مخالف ہے تو سرد موسم میں جان دیدے۔

سرخ سالمن مچھلی دریاؤں کے قریب پانی کے کنارے ایک مقام پر انڈے دیتی ہے اور پھر مرد مچھلی اسے حفاظت سے ڈھانکتا ہے۔ مٹی کی تہہ میں چھپاتا ہے اور جب وہ ایک خاص شکل میں بدل جاتے ہیں تو پھر سمندر کے کھارے پانی کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیتے ہیں۔ اپنی طویل زندگی اس کھارے پانی میں گزار کر جب وہی وقت اور موسم آتا ہے جب انڈے دینے ہوں تو دریا کی طرف الٹا سفر کرتے ہیں۔

یہ کئی سو میلوں کا سفر وہ روزہ سے کرتے ہیں پھر تخلیقی عمل کے ہر مرحلے پر روزے سے ہوتے ہیں اور جب بچے ذرا جوان ہوتے ہیں تو اپنا روزہ کھول کر واپس زندگی میں لوٹ جاتے ہیں۔ یہ حالت صوم کی مہینوں پر مشتمل ہوتی ہے لیکن مجال ہے کسی کے لب پر کوئی حرف شکایت آئے۔

سیپ جس کے دامن میں اللہ نے موتیوں کے خزانے رکھ دیتے ہیں۔ اپنی ست روی سے چلتا ہوا سردیوں میں کسی ایسی جگہ اپنے آپ کو دفن کر لیتا ہے جہاں اس پر ارد گرد کے حالات کا کوئی اثر نہ ہو اور پھر اس دوران وہ اپنا طویل روزہ شروع کر دیتا ہے۔ اس روزے کے عرصے میں قدرت اس کے بدن پر ایک لحاف سا اوڑھ دیتی ہے تاکہ وہ خشک ہو کر مر نہ جائے۔

یہ روزہ اس کے لیے ایک ایسی ڈھال بن جاتا ہے جو اسے بے وقت موت، موسم کے ظلم اور آفات سے بچاتا رہتا ہے۔ روزہ توڑنے کے بعد وہ واپس اسی طرح تنومند ہو جاتا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر وہ روزہ نہ رکھے تو اپنے اوپر چڑھنے والی چربی سے مہینوں میں موت کی آغوش میں چلا جائے۔

آسٹریلیا میں پایا جانے والا ایکڈا، جس کے جسم پر بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کی غاروں میں اپنا گھر بناتا ہے۔ اس جانور میں اللہ نے کھانے کی حرص اور طبع بہت رکھی ہے اور جب وہ ایک حد سے زیادہ کھا لیتا ہے۔ اس کا وجود اس کے لیے بوجھ بنے لگتا ہے تو وہ پھر اللہ کے حکم سے پورے ایک ماہ کا روزہ رکھتا ہے۔ یہ روزہ اس کے بدن سے ان تمام آلائشوں کو پاک کر دیتا ہے جو خوراک کی حرص سے پیدا ہوئی تھیں اور وہ پھر چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کے چکور سے مشابہ پرندہ پلو در امریکا اور آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا اور مخصوص موسموں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اس کا شیوہ ہے۔ وہ ہزاروں میل سمندر کی اڑان اڑ کر دوسرے

## خدائے رحیم و کریم کی نشانیاں

(11 شوال 1427ھ بمطابق 03 نومبر 2006ء)

کائنات کی وسعت، گہرائی اور اس پر پائے جانے والی زندگی اس مالک دو جہاں کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی طرف وہ بار بار غور کرنے کو کہتا آیا ہے۔ تخلیق آدم سے لے کر آخری سرچشمہ ہدایت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ قرآن بار بار انسان کو اس کائنات اور اس کے اسرار پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ زمین کی تہوں اور آسمان کی وسعتوں میں زندگی بسر کرتی مخلوق، شجر، پتھر، بادل، اور ہوائیں سب اس کے مقرر کردہ نظام کا حصہ ہیں اور اس کی ترتیب دی ہوئی فطرت پر بلا چون چر اعمل کرتے ہیں۔ وہ خود فرماتا ہے کہ اس کائنات میں ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے لیکن اس تسبیح و تہلیل کی آواز سننے کا ادراک اسی کو ہو سکتا ہے جو اس مالک کل کے کلام میں بتائے ہوئے اشاروں پر غور کرے۔

پھر یوں لگتا ہے کہ تمام مخلوق بلا چون و چرا اس کے حکم پر یوں عمل کر رہی ہوتی ہے کہ انکار میں نہ سر ہلتا ہے اور نہ دلوں میں ملال۔ یہ انکار، دلوں میں ملال اور حکم کی مصلحت جاننے کا شوق صرف انسان کو ہے جو اسی سوال کی عادت سے گمراہی کی وادیوں میں جا لگتا ہے لیکن اگر اسے مالک کائنات جان کر اس کی کائنات پر غور کریں تو عقدے پوں کھلتے ہیں جیسے کوئی روشن چراغ لے کر رہنمائی کرنے جا رہا ہو۔

آئیے! اس روشن چراغ میں صرف ایک حکم کی نشانیاں اس کائنات میں تلاش کریں۔ مسلمان ابھی چند روز پہلے ماہ رمضان کے روزوں کی فضیلت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو اس میں مصلحت تلاش کرتے ہوں گے۔ کچھ کو جواب مل جاتا ہوگا، کچھ کی تسلی ہوگی اور کئی ایسے بھی ہوں گے جو اس یقین کی نعمت سے محروم رہتے ہوں گے لیکن اس کائنات میں بسنے والی مخلوقات میں سے اکثر ایسی ہیں جنہیں اپنے مالک نے مخصوص کاموں کے لیے ذمہ داریاں دی ہیں۔

وہ اپنے عین وقت اور سال کے مقرر کردہ حصے میں روزہ رکھتی ہیں اور پھر پورے سال کے لیے اپنے آپ کو ایک نئے معرکے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ میں یہاں چند ایک مثالیں دوں گا کہ اس کائنات کی وسعت اس قدر ہے کہ جاننے اور لکھنے کے لیے عمریں درکار ہوں گی۔

مکڑی جس کا ذکر قرآن میں سورۃ العنکبوت میں یوں آیا: ”جو لوگ اللہ کے رستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں ان کا بھروسہ مکڑی کے گھر کی طرح ہے اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔“

یہی مکڑی جس نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے دوران غارِ ثور کے سامنے جالاتن دیا تھا۔

## ایسا تاریخ میں پہلی بار ہوا

(18 شوال 1427ھ بمطابق 10 نومبر 2006ء)

معصوم شہریوں، عورتوں اور بچوں پر بم گرانا، ان کے گھروں، اداروں اور کانوں کو ملیا میٹ کرنا جنگِ عظیم دوم کے بعد امریکا کی بدترین عادتوں میں سے ایک ہے۔ دنیا 1945ء میں جنگ ختم کر چکی تھی، سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اب اتنی بڑی تباہی کے بعد چند سال آرام و سکون کے مل سکیں گے لیکن کسے خبر تھی کہ جاپان کے دوشہروں پر ایٹم بم برسا کر لاکھوں لوگوں کو لقمہ اجل بنانے والا امریکا وہ آدم خور شیر بن چکا ہے جسے زندہ رہنے کے لیے ہر لمحے انسانوں کا خون چاہیے۔

معصوم بچوں کی چیخیں ضروری ہیں اور عورتوں کی سسکیاں اور آہیں اُسے سکون دیتی ہیں، دنیا میں جنگ نہ تھی لیکن کسی نہ کسی بہانے بم برسائے جاتے رہے۔ 1945-46ء میں چین پر 1950ء سے 1953ء تک کو ریابا پر، 1953ء میں گوئٹے مالا پر، 1958ء میں انڈونیشیا پر، 1959ء سے 1961ء تک کیوبا پر، 1960ء میں گوئٹے مالا پر دوبارہ، 1964ء میں کنگو پر، 1965ء میں پیرو پر، 1964ء سے 1973ء تک لاؤس پر، 1961ء سے 1973ء تک ویت نام پر، 1969-70ء میں کمبوڈیا پر، 1967ء سے 1989ء تک پھر گوئٹے مالا پر، 1983ء میں گریناڈا پر، 1980ء کی پوری دہائی میں ایل سیلاؤڈر اور نکاراگوا پر میزائل برستے رہے۔

1987ء میں ایران پر، 1989ء میں پانامہ پر، 1993ء میں صومالیہ پر، 1994-95ء میں بوسنیا، 1998ء میں سوڈان اور 1999ء میں یوگوسلاویہ پر جہازوں کے ذریعے بم برسائے گئے، میزائل داغے گئے اور سلاٹ کی مدد سے بمباری کی گئی۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ سارے کے سارے ممالک کبھی بھی امریکا کے ساتھ حالتِ جنگ میں نہ تھے۔ لیکن اس آدم خود بھیڑیے کو معصوم لوگوں کی جانیں لینے کے لیے کسی نہ کسی بہانے کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی اشتراکی گواہیوں کے نام پر تو کبھی بین الاقوامی سازش کو روکنے کے لیے، کبھی کسی پھنکو بچانے کے لیے اور کبھی صرف اپنا رعب اور دبدبہ قائم رکھنے کے لیے معصوم لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی عادت ایسی ہے کہ اس کے لیے امریکا اپنے شہریوں کی جان لینے سے بھی باز نہیں آتا۔

13 مئی 1985ء کو پنسلونیا شہر کے ایک سرسبز اور گنجان آباد علاقے پر پہلی کا پٹر پرواز کرنے لگے اور پھر ایک دم ان سے آگ کے شعلوں کی طرح بم نکل کر مکانات، ہوٹلوں اور بازاروں میں گرنے لگے، 60 گھر جل کر تباہ ہو گئے اور ان کے مکین ہلاک، ایف بی آئی کی اس کارروائی کا مقصد سیاہ فام تنظیم ”موڈ“ کو ان کے ٹھکانوں سے بے دخل کرنا تھا۔ یہ سارے حملے آزاد ملکوں کی سر زمین پر ہوئے، وہاں کے لوگ سراپا احتجاج بنے اور حکومتوں نے امریکا کو

ماصل پر اترتا ہے۔ یہ سب موسم کی تبدیلی کی فطرت اور اللہ کے حکم سے ہوتا ہے لیکن جیسے ہی وہ سفر کا آغاز کرتا ہے تو پھر روزہ رکھ لیتا ہے اور منزل پر پہنچ کر افطار کرتا ہے۔ اگر وہ اس روزے میں استقامت نہ دکھائے تو نیچے سمندر میں جاگرے اور کسی جانور کی خوراک بن جائے۔ یہ راستے میں نہ رکتے ہیں اور نہ کسی خوراک کی تلاش میں راستہ بدلتے ہیں۔

پینگوئن جو قطب شمالی کا خوبصورت جانور ہے۔ گرمیوں میں سفر کا آغاز کرتا ہے۔ میلوں کے سفر کے بعد پتھروں سے اپنا گھر بناتا ہے۔ تین ہفتے اس کام میں لگتے ہیں۔ یہاں مادہ پینگوئن دوانڈے دیتی ہے جو نیلے اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ زپینگوئن اس کی حفاظت کرتا ہے اور پھر بچوں کی پیدائش تک یہ دونوں مسلسل روزے میں ہوتے ہیں۔ یہ روزہ ان دنوں ماں باپ میں موسم کی شدت کو برداشت کرنے، اپنے بچوں کے لیے قربانی اور اپنے بدن پر فاضل گوشت کو ختم کرنے کی اہلیت دیتا ہے۔ یوں وہ ایک ایسے وقت کے لیے پھر سے چاق و چوبند ہو جاتے ہیں جب انہیں نئی نسل کو اگلی منزلوں کی جانب لے جانا ہوتا ہے۔

ریشم کا کیڑا جو انسان کے لیے خوبصورت اور نرم لباس پیدا کرتا ہے۔ جو خود پتے اور وہ بھی نرم پتے یعنی شہتوت کے پتے کھاتا ہے لیکن وہ سب کچھ کھانا پینا چھوڑ کر روزے کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ جبکہ وہ ابھی چند دن کا ہوتا ہے۔ یہ روزہ دو دن کا ہوتا ہے جبکہ پہلے دنوں کی خوراک سے جسم بننے میں مدد ملتی ہے۔

جب وہ تھوڑا مزید بڑا ہوتا ہے تو اس کا چھ روز کا روزہ شروع ہوتا ہے۔ جس دوران اُسے اپنے جسم کے ارد گرد ریشم بننے کا عمل مکمل کرنا ہوتا ہے اور یہ صرف ایک ہی دھاگے سے اپنے آپ کو لپیٹتا ہے جو ایک ہزار میٹر لمبا ہوتا ہے۔ اس کے روزے میں اللہ کی جو حکمت ہے شاید یہی انسان کی شکرگزاری کے لیے کافی ہے۔

میں نے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں ورنہ سائنس کی کتابیں اور کائنات کے راز افشا کرنے والی داستانیں پکار پکار کر اس خدائے واحد و قدوس و رحیم کی حکمتوں کی نشانیوں کو طشت از بام کرتی ہیں۔ ہاں! سوال صرف انسان کرتا ہے۔ اس کے حکم میں فلسفہ ڈھونڈتا ہے یا پھر فلسفے کے دلائل سے رد کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن کائنات کی ہر چیز واضح طور پر پکار رہی ہوتی ہے کہ وہ خالق ہے، مصور ہے، باری ہے، رحیم ہے، پروردگار ہے اور بڑی حکمت اور دانائی والا ہے۔





## اب نشانے پر کون ہوگا

(25 شوال 1427ھ بمطابق 17 نومبر 2006ء)

دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے، اپنے ارادوں اور اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے اور لوگوں کو اسی طریقے پر سوچنے، سمجھنے اور زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کی تمنائی نہیں۔ یہ تمنا اُس غرور سے جنم لیتی ہے جو کسی بڑی طاقت کے دماغ میں بس جائے یا پھر کسی فاحش یا طاقتور حکمران کی عقل پر چھا جائے۔ یہ غرور قوموں کی زندگی میں بھی اور حکمرانوں کی لمبی قطاروں میں بھی نظر آتا ہے۔

ایک زمانے میں عالمی طاقتیں اس لیے ملک فتح کرتی تھیں کہ وہاں سے غلاموں کی کھپ، زمینوں سے غلہ اور ہنرمندوں کے ہاتھ کی اشیاء قبضے میں لے لیں گے۔ کبھی لڑائی کسی مقدس مقام کی بازیابی کے لیے ہوتی، کسی خاص شہر کا حصول مقصد ہوتا تھا۔ کبھی بادشاہ صرف اس لیے لاکھوں گردنیں کاٹ دیتے کہ ایک خوبصورت عورت کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ لیکن صرف جنون، دہشت، بربریت اور پاگل پن کی جنگ صرف منگولوں نے لڑی، چنگیز خان سے ہلاک اور ہلاکو سے تیمور۔ آخری دور کے تیمور کی خودنوشت پرچھیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھیڑیا بھوک مٹانے کے لیے نہیں بلکہ موت کا رقص دیکھنے کے لیے جانیں لے رہا ہے۔ وہ خودتخریر کرتا ہے کہ جب میں نے سبزوار فتح کیا تو یہ میری پہلی فتح تھی۔ میں دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اس شہر کو تسخیر کر لیا ہے۔ نہ اخبار تھے نہ ریڈیو اور نہ ٹیلی ویژن۔ دور دور تک خبر کیسے پھیلتی۔ اُس نے وہاں موجود وہاں لاکھ لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ پھر ان کے سروں سے دو بڑے بڑے مینار بنائے اور ان پر جسموں سے ملنے والی چربی لپ کر کے انہیں آگ دکھائی تاکہ لوگ دور دور سے اس بات کا نظارہ کریں اور یقین کر لیں کہ تیمور نے سبزوار فتح کر لیا ہے۔ انسانی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی شبیہ امریکا اور امریکی فوج کی ہے۔ جنگ عظیم اول سے پہلے یہ فلپائن میں گئی۔ وہاں ماؤزے تنگ کے خلاف جنگ لڑی۔ کوریا پر انسانوں کی لاشیں گرائیں۔ ویت نام میں 30 لاکھ لوگ مارے گئے۔ افغانستان اور اب عراق میں ساڑھے چھ لاکھ عراقی لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ سب محاذوں پر اس ”طاقتور“ فوج نے ذلت آمیز شکست کھائی لیکن انسانوں کے قتل عام کا جنون ختم نہ ہو سکا۔

کیا یہ صرف تیمور کی طرح ایک جنون ہے۔ اگر یہ جنون ہے تو پھر ہر حکمران کے سروں پر کیوں سما جاتا ہے۔ اگر حکمران نہیں تو پھر کیا پوری قوم اس نفسیاتی ہیجان کا شکار ہے۔ تاریخ دوسرے نظریے پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ یورپ کے ملکوں سے بھاگے ہوئے جرائم پیشہ قاتل، ڈاکو لیڈر اور بد معاش امریکا کی دریافت کے بعد اس کے ساحل پر جا کر آباد ہونے لگے۔ یہ مشرقی ساحل تھا جو سرسبز بھی تھا اور آباد بھی۔ انہوں نے وہاں موجود ریڈ انڈین افراد سے جنگ شروع کی، شکست کے قریب ہوئے تو سمجھوتا کر لیا۔ پھر تھوڑے عرصے کے بعد ذرا قوت پکڑی تو معاہدے کو توڑا، انہیں نہ تنق کیا، علاقے سے نکالا اور قبضہ کر لیا۔ امریکی تاریخ میں ریڈ انڈین لوگوں کے ساتھ پچاس ہزار معاہدوں کا ذکر ملتا ہے جو ان لوگوں نے توڑے اور انہیں بے آب و گیاہ علاقوں میں دھکیل دیا۔

مورد الزام ٹھہرایا۔ سرکار سے لے کر عوام تک کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو معصوم لوگوں کے اس قتل کو جائز سمجھتا ہو، جو سمجھتا تھا وہ بھی اس بات پر ضرور غصے میں تھا کہ امریکا نے اس کے ملک پر حملہ کر کے نہتے لوگوں کو مار کر زیادتی کی۔

لیکن گزشتہ 60 سالوں کی امریکی ظلم و بریت کی تاریخ میں چند روز پہلے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ایسا بدترین دور غلامی میں ہوا کرتا تھا جب آقاؤں کے جرم غلام قبول کر لیا کرتے تھے، قتل کر دیے جاتے تھے، پھانسی چڑھائے جاتے تھے یا پھر جیل کی کالی کوٹھری میں عمر گزار دیتے تھے۔

125 اکتوبر 2006ء سے امریکا کی ری پبلکن پارٹی کے حلقوں، وائٹ ہاؤس اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں ایک بہت بڑی خبر کا انتظار تھا۔ اس لیے گزشتہ ہفتے کے سروے کے مطابق آئینہ کانگریس الیکشن میں صدر بش کی مقبولیت صرف 36 فیصد رہ گئی تھی اور اگر حالت برقرار رہتی تو آئینہ انتخاب جو سات نومبر کو ہونے ہیں بری طرح ہارے جاتے۔ اس لیے ساری جدوجہد اس بات پر مرکوز تھی کہ کسی بڑے مجرم کا سر کاٹ کر لوگوں کو دکھایا جائے اور پھر فتح کے نعروں میں دوٹ حاصل کیے جائیں۔

یوں ایک دن علی الصبح، تہجد کی نماز کے وقت اور صبح کی نماز کی تیاری میں مصروف حفاظ قرآن اور طالب علم بچوں پر امریکی ڈرائون طیارے کے ذریعے بمباری کی گئی اور پھر غلاموں کے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوئے تاکہ آقا کا جرم اپنے دامن پر لے لیں۔ اس کی کالک اپنے منہ پر مل لیں۔ آقا کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہاں اب کیا ہوتا ہے کیونکہ کوئی بڑا مجرم یعنی ایمن المظواہری نہیں ملا تھا۔ اب تو ہارنا مقدر ہو چکا تھا۔ اس لیے نہ کسی نے اس کا رنامے کی تعریف کی اور نہ ہی کوئی انعامی رقم میسر آئی ماسوائے بدنامی اور ذلت و رسوائی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ہمارا اور امریکا کا تعلق اس مالک اور ڈرائیو کا ہے جو مالک کا ایک سیڈنٹ اپنے کھاتے میں لے لیتا ہے۔ سپاہی اور ایس پی کا ہے جو ایس پی کے آڈر پر قتل کرتا ہے اور پھر انکو آڑی میں صاحب کو بچانے کے لیے جرم اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ پتا نہیں ہم کسی مٹی کے بنے ہیں کہ جو ہمارے بچوں کو قتل کرتا ہے، ہمارے معصوموں کی جان لیتا ہے، ہمارے گھر ویران کرتا ہے اس سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اس کا جرم بھی اپنے سر لے لیتے ہیں، ایسا تو جنگل کے جانور بھی نہیں کرتے۔ جس بکری کے بچے بھیڑیا کھا جائے وہ بھیڑیے سے نفرت ضرور کرتی ہے۔ ایسا تو جاہل، گنوارہ، اجڈ اور خونخوار قبیلوں کے انسانوں میں بھی نہیں ہوتا۔

سانپ اپنے بچے کھا جاتا ہے اور دنیا بھر میں الزام بھی اسی پر آتا ہے۔ لیکن ہم عجیب ہیں بچے کوئی اور کھاتا ہے اور ہم سانپ کی کینچی پہن کر دنیا بھر سے کہتے ہیں ہمیں سانپ کہو، ہمیں مورد الزام ٹھہراؤ اور ہمارے منہ پر سیاہی تھوپو۔

## تحفظ حقوق نسواں ”خصوصی“ بل

(03 ذیقعدہ 1427ھ بمطابق 24 نومبر 2006ء)

میں ایک ایسے محلے، آبادی یا علاقے کا تصور کر کے کانپ رہا ہوں جہاں شرفاء کی اکثریت رہتی ہو۔ سب اپنے گھروں میں سکون و اطمینان سے زندگی گزار رہے ہوں۔ ان کی بچیوں کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے سکون اور بے خوفی کا ماحول میسر ہو۔ گھروں میں آمدورفت کے وقت بھی کسی انجانے ڈر کا دھڑکانہ لگا رہے۔ ایسے میں اس محلے میں ایک ایسی خاتون اپنا گھر بنا لیتی ہے، خرید لیتی ہے یا کرائے پر آباد ہو جاتی ہے جس کی عشوہ طرازیوں کے اسیر اعلیٰ شخصیات ہوتی ہیں۔ پھر ان کی طویل و عریض گاڑیوں کی آمدورفت وہاں شروع ہو جائے۔

ان کے گاڑی گارڈ علاقے کو گھیرے رہیں۔ اوباشوں کی طرح دندناتے لوگ محلے میں داخل ہوں اور شرفاء اپنے گھروں میں دیکے بیٹھے اپنی اپنی عزتیں سنبھالے دروازے مقفل کیے ہوں۔ کوئی زبان نہ کھول سکے، حرف شکایت لب پر نہ لاسکے۔ بس آہستہ آہستہ سب کڑھتے رہیں۔

یہ تصور اس وقت میرے ذہن میں آیا جب میں نے حدود قوانین میں ترامیم کا قانون پڑھا جسے تحفظ حقوق نسواں کا نام دیا گیا۔ یہ دنیا بھر کے ممالک میں پہلا قانون ہے جس میں کسی ایسی عورت کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے، اس کے خلاف درخواست دینے یا اسے ایسی حرکات و سکنات سے روکنے کے لیے آپ پولیس کا دروازہ نہیں کھٹکھا سکتے اس لیے کہ یہ سب اس کا ذاتی فعل ہے۔

وہ نئے قانون کے سیکشن 496 الف تعریرات پاکستان کے تحت کسی عورت کو مجرمانہ نیت سے ورغلا نہیں رہی۔ کسی کو فریب نہیں دے رہی کہ 493 الف کے تحت جرم بن سکے۔ ہاں البتہ آپ اس عورت کی زنا کاری کے خلاف سیشن جج کے پاس درخواست لے کر جائیں گے اور وہ اگر اس درخواست کے بارے میں تصور کر لیتا ہے یا سمجھ لیتا ہے کہ یہ مقدمہ چلنے کے قابل نہیں تو سیشن 203 ضابطہ فوجداری کے تحت اسے فوراً خارج کر سکتا ہے اور آپ اپنی عزت و ناموس کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے واپس اُسی محلے میں لوٹ آئیں گے۔

اب ایک ایسے شریف انسان کا تصور کیجیے جو اس طرح کے ایک محلے میں آباد ہے اور وہاں ایسی ہی ایک عورت آکر بس جاتی ہے۔ وہ شریف انسان اُسے ایسے محلے میں اس طرح کے کام کرنے سے روکتا ہے اور جواب میں عورت تعریرات پاکستان کی نئی دفعہ 496 الف کے تحت پولیس میں یہ رپورٹ درج کراتی ہے کہ جب میں اس محلے سے گذرتی ہوں تو یہ ”شریف انسان“ جو اندر سے شیطان ہے مجھے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔ بس پھر کیا ہوگا پولیس بغیر وارنٹ اس دشمن کو گرفتار کرے گی۔ اس کا یہ جرم ناقابل ضمانت ہے۔ وہ اس وقت تک جیل میں سڑتا رہے گا جب

وہاں اپنی بستیاں اور شہر آباد کر لیے۔ شہر بنے اور امن و امان کا مسئلہ، ان غنڈوں اور بد معاشوں سے کون نئے۔ یوں ہر شہر میں جو سب سے بڑا بد معاش اور غنڈہ تھا اسے ”شیرف“ یعنی ایس پی بنا دیا۔

دنیا کی تاریخ میں غلاموں کی سب سے کریہہ المنظر تجارت اور ان پر ظلم کی داستانیں اس قوم کے خمیر میں ہیں۔ لیکن ایک نفسیات اس قوم کی عجیب ہے۔ بد معاش کی نفسیات جو جرم کر کے، کسی کا خون بہا کر بھاگتا ہے تو پھر خوف کے عالم اپنی جان بچانے کے لیے پھر اس کا خون کرنے پر تیار ہوتا ہے جس سے اسے ذرا سا بھی خوف ہے۔ امریکی قوم بھی اسی سلسل خوف کے عالم میں مبتلا ہوئی قوم ہے۔ اسے اس خوف کے عالم میں کون لایا؟

جب دنیا بھر سے یہودیوں نے اپنے ملکوں کو دھوکہ دے کر سازشیں کر کے اور پھر بے نقاب ہونے کے بعد بھاگنے کا قصد کیا تو انہوں نے امریکا کو اس لیے چنا کہ یہاں وسائل لا محدود اور سر زمین دنیا سے الگ تھلک تھی۔ یہاں کوئی ایک قوم نہیں تھی جس کی کوئی روایات ہوتیں۔ ایک ہجوم اور وہ بھی بے ہنگم۔ ایسے میں ان یہودیوں نے امریکا کی تین اہم چیزوں پر آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا۔

ایک میڈیا، دوسرا کاروبار اور بینکنگ اور تیسرا تعلیمی ادارے۔ قبضے کا عالم یہاں تک آیا کہ امریکا کا کوئی صدر یہودی سرمائے اور یہودی میڈیا کے بغیر بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دو پارٹی سیاہی نظام متعارف ہوا تو یہودی صنعتکار، دانشور اور صحافی دونوں طرف برابر تقسیم ہو گئے۔ ایک جنگ کے شیدائی اور دوسری طرف انسانی حقوق کے علمبردار۔ اب سیاست ان کے پنجے میں تھی لیکن ان کا مقصد تو دنیا میں قتل و غارت، ظلم و جبر اور بے ترتیبی پیدا کرنا تھا۔ یہی ان کے نظام کا حصہ تھا۔

اب نفسیات کا مطالعہ کام آیا۔ یہودی مفکر اور نفسیات دان سگمنڈ فرائڈ کا دیا ہوا نسخہ FEAR IS THE KEY ”خوف ہی کچھ ہے“ گزشتہ 90 سالوں سے اس یہودی میڈیا نے امریکی عوام پر خوف مسلط کیا۔ کبھی مشرق بعید میں اسپین کا خوف، کبھی کیوبنٹوں کا خوف، کبھی لاطینی امریکا میں ابھرتی نفرت کا خوف اور اب مسلم امہ کا خوف۔ جب جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خوف کے عالم کو ابھارا جاتا ہے۔ کبھی 1961ء کا میزائل کرٹس تو کبھی پرل ہاربر اور پھر ورلڈ ٹریڈ سینٹر۔ خوف میں مبتلا بد معاش کی طرح جس کی بندوق سے اچانک فائر ہونے لگتا ہے، امریکا بھی جنگ کا آغاز کر دیتا ہے۔ لیکن پھر دوسرا خوف گھیر لیتا ہے۔ بچوں کی لاشیں گھروں میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لوگ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں میڈیا ان لوگوں کو جنگی جنونی بتانے لگتا ہے اور پھر حقوق انسانی کے علمبرداروں کے قہقہے لگنے لگتے ہیں۔

یہ ہے دونوں پارٹیوں کی جنگ۔ عراق میں جنگ کا آغاز کیا، افغانستان میں ظلم کا بازار گرم کیا، اب لاشیں آنے لگیں تو وہ سب یہودی دانشور دوسری جانب کھنٹے لگے۔ بش کی پارٹی ہار گئی۔ دانشور جیت گئے۔ یہ ہر دفعہ جیتتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ معاملہ مختلف ہے۔ اس دفعہ اصل ہدف مسلمان ہیں۔ اس دفعہ امن کی بات نہیں ہو رہی بلکہ غلط میدان جنگ اور غلط حکمت عملی کی بات ہو رہی ہے یعنی پہلے ایک دشمن کو تباہ کرنا تھا پھر دوسری سمت آنا تھا۔ یعنی پہلے افغانستان اور پاکستان کے شمالی علاقوں کو نیست و نابود کرنا تھا پھر عراق کی طرف بڑھنا تھا۔

اب خوف بھی مسلسل ہے۔ دشمن کا پتہ بھی دے رہا ہے۔ عراق سے شاید واپسی ہو جائے لیکن نشانہ یہ کون ہو گا؟ وہ جو سب سے قریبی ساتھی تھے، فرنٹ لائن سٹیٹ تھے۔ ظالم، جابر اور ہوس زدہ حکمران کی ایک نشانی تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے ہمیشہ جس کندھے پر سواری کی اس پر موجود گردن کو سب سے پہلے کاٹا۔

تک اس کا یہ یس پتلا رہے گا۔

ہو سکتا ہے اس کے خلاف یہ عورت چند جھوٹے گواہ بھی کھڑے کر دے اور اسے سات سال کے لیے سزا ہو جائے یا پھر وہ دو یا تین سال کے لیے جیل میں رہ کر ”باعزت“ بری ہو جائے۔

ایسی ہی کوئی فاحشہ اگر کسی شخص کو بدنام کرنا چاہیے، اس سے انتقام لینا چاہیے، اس کی عزت نیلام کرنا چاہیے تو اس نے ترمیمی قانون کے تحت تعزیرات کی دفعہ 493 الف کے تحت یہ الزام لے کر تھانہ جاسکتی ہے کہ اس نے ایک جعلی نکاح نامہ تیار کر کے یا ایک دو لوگوں کی موجودگی میں مجھے جھوٹا یقین دلا کر شادی کی کہانی بنائی اور پھر ہم بستی کی۔ جعلی نکاح نامہ تو کوئی بھی تیار کر سکتا ہے اور ہم بستی کا کوئی گواہ نہیں ہوتا، ایسے میں پولیس اس شخص کو گرفتار کرے گی۔ وہ ناقابل ضمانت جرم میں قید ہوگا۔ اس کی عزت نیلام ہوگی اور اگر کسی طرح وہ عورت ہم بستی کے دو گواہ بھی بنا لیتی ہے جو ایسی عورتوں کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتا (کیونکہ تزکیہ الشہود تو ہے نہیں) تو پھر اس شخص کو 25 سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

اب ایک ایسے معاشرے کا تصور کیجیے جس میں ایسی خواتین کو تحفظ دیا گیا ہے جو اپنی مرضی سے اپنے گھر میں محفل سجالیں۔ پورے محلے کا سکون درہم برہم کر دیں۔ اسے شرفا کے رہنے کے قابل نہ چھوڑیں اور اگر ان کے خلاف کسی نے مقدمہ درج کروانا ہو تو پولیس کے دروازے بند بلکہ اسے پہلے چار عادل گواہ ڈھونڈنے ہوں گے پھر ”جرم زنا“ آنکھوں سے دیکھنے کا اقرار کرنا ہوگا اس کے بعد وہ سیشن جج کے پاس جائے گا اور اگر جج صاحب روشن خیال، اعتدال پسند نظریات کے حامل ہوئے تو درخواست کا جو حشر ہوگا وہ الگ..... اسے واپسی پر اس خاتون کے جوابی مقدموں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ہم کس بد نصیب ملک میں رہتے ہیں جہاں ایسی عورتیں کے تحفظ کے لیے کوئی قانون نہیں بنتا، کوئی سہولت نہیں جو روز ہسپتال کے دروازوں پر دم توڑ جاتی ہیں، جو اینٹوں کے بھٹوں، کمپنیوں، کارخانوں میں مزدوری کر کے بیمار پڑ جاتی ہیں، جو 25 میل تک چل کر پانی لاتی ہیں اور تھکن سے چور گھر کی خدمت کرتے کرتے جان دے دیتی ہیں۔ جن کی زندگی میں خواب، خواہش، امید، آرزو، سب بے نام ہیں کہ غربت نے ان سے ہنسی تک چھین لی ہے۔ ان کے تحفظ کے لیے، ان کی فلاح کے لیے کوئی قانون نہ آ سکا۔ اور ایسی خواتین کے تحفظ کے لیے قانون آ گیا جن سے معاشرہ شرمندہ ہو، آنکھیں جھکا لے، لوگ کوچ کی دعائیں کرنے لگیں۔



## یہ پٹی تو اللہ کی توفیق سے پڑھی جاتی ہے

(16 ذیقعدہ 1427ھ بمطابق 08 دسمبر 2006ء)

برطانیہ کے شمال میں اسکاٹ لینڈ کے شہر کاسرینز و شاداب شہر گلاسکو، اس شہر کی تاریخ برطانیہ کے شاہی تلامذے لڑنے کی داستان ہے۔ مدتوں یہ لوگ لندن اور لیڈز کی بالادستی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ بھلے زمانے تھے، روایات زندہ تھیں۔ عورتیں VIEL یعنی حجاب پہنتی تھیں اور خاندانی نظام اس قدر مضبوط تھا کہ طلاق شہر ممنوع سمجھی جاتی تھی۔ اپنے خاوند یا بیوی سے وفا کا رشتہ محترم تھا اور ایسے رشتے کو توڑنے والے معتب تصور ہوتے تھے۔ اسی علاقے کے ادب میں ان رشتوں کا احترام مدتوں جھلکتا رہا۔ پھر زمانہ بدلا، انسانی اور آزادی حقوق اور آزادی نسواں کی ہوا چلی تو پھر نہ کسی کو آزادی و حریت یاد رہی اور نہ ہی لندن کی بالادستی..... بس حرص و ہوس نے گھروں میں ڈیرہ ڈال لیا۔ اس شہر گلاسکو کی ایک خاتون لوئیس کیمبل کی ایک پاکستانی سجاد احمد رانا سے شادی ہوئی۔ لوگوں کے مطابق لوئیس نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے۔ عمر، تہمینہ اور مصباح۔ پھر لوئیس کو اپنا ماحول اور برطانیہ کی آزادی ستانے لگی اور اس نے سجاد سے علیحدگی اختیار کر کے بغیر شادی کے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ اسٹریز نامی قصبے میں رہنے لگی۔

پہلے تینوں بچے چوں کہ جوان تھے اس لیے انہوں نے اپنی مرضی سے باپ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا کہ انہیں باپ سے بھی محبت تھی اور اس کے مذہب سے بھی لیکن مصباح کو اپنے ساتھ لے گئی جہاں اس نے اس کا نام مولیٰ کیمبل رکھ دیا۔ ادھر باپ نے عدالت کی طرف رجوع کیا لیکن گلاسکو کی عدالت نے مذہب کو پہنچاتی ہے اور نہ ہی باپ کی پریشانی کو۔ ان کے نزدیک بچی کی نگہداشت ماں ہی بہتر طور پر کر سکتی تھی خواہ وہ طوائف ہی کیوں نہ ہوں اور بچی کو بڑے ہونے پر طوائف ہی کیوں نہ بنا دے۔

باپ ادھر پریشان تھا اور بچی کی حالت یہ کہ اس سے فون چھین لیا گیا اور اسے کمپیوٹر تک سے محروم کر دیا گیا۔ کہ کہیں وہ باپ کو ای میل نہ کر دے۔ یہ بچی جس کی رگوں میں ایک مسلمان باپ کا خون تھا، برداشت نہ کر پائی کہ اس کی ماں اس کے نزدیک ایک مقدس رشتہ ہے ایک شخص کے ساتھ بغیر شادی کے ایک کمرے میں رہ رہی ہے۔ ادھر باپ اپنی بیٹی اور بیٹی کو لے کر پاکستان آ گیا۔ بڑا بیٹا عمرو ہیں رہا۔ ایسے میں بیٹے کو مصباح کی تکلیف کا پتا چلا۔ بہن تہمینہ نے کسی طرح اس کا پتا چلایا اور اسے ملی۔ مصباح اس سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بڑی بہن کو لے کر اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آ گئی۔

یہاں سے انسانی حقوق کے علمبرداروں کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ روشن خیالی کی داستان رقم ہوتی ہے۔

(23 ذیقعدہ 1427ھ بمطابق 15 دسمبر 2006ء)

جو لوگ حقوق نسواں کے مخالف ہیں، عورت کی آزادی نہیں چاہتے، اسے معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ چلنا نہیں دیکھ سکتے، ایسے قوانین کی مخالفت کرتے ہیں جو عورت کی حریت، آزادی اور مکمل اظہار کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہ سب لوگ معاشرے کا پہرہ صدیوں پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگوں کو تاریخ کے تاریک دور میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ یہ ترقی کے دشمن ہیں اور تنزل کے خواہش مند۔ ایسی باتیں آپ کو آج کل روز سننے کو ملیں گی۔

اخبار میں پڑھنے کو بیان، ٹیلی ویژن پر بحث اور ارباب اقتدار کی تقاریر۔ سب اپنے اس کارنامے پر خوش ہیں کہ انہوں نے عورت کو آزاد کر دیا ہے۔ اسے جسم و جاں کے اظہار کے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ اب فن، آرٹ، فیشن اور ثقافت روشن، خیال ہو گئی ہے اور اب ہم ایک ہزار سال پیچھے نہیں، دنیا کے ساتھ ہیں۔

لیکن شاید کسی نے تاریخ کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ انہیں علم نہیں کہ وہ اس ملک کو جس ماحول اور جس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں ایسا تو تاریخ میں کئی بار ہوا اور جس قوم میں ایسا ہوا اس پر ذلت کے بادل یوں چھائے کہ پھر تاریخ کے صفحات اور زمین کی وسعت میں اس کا نام و نشان تک ناپید ہو گیا۔ اس کا عروج زمین بوس ہو گیا اور اس پر دوسری قوموں کے غول چڑھ دوڑے جو انہیں پستی کے گڑھوں میں پھینک گئے۔

آئیے! آپ کو سن 60 قبل مسیح لے چلتا ہوں۔ آج سے دو ہزار 66 سال پیچھے۔ روم ایک ملک تھا جسے عالمی طاقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ خوشحالی تھی۔ خاندانی نظام، شرافت، نجات اور اخلاق لوگوں کے رسم و رواج کا حصہ تھے۔ حکمران سلا کی موت کے بعد جب سیزر برسرِ اقتدار آیا تو اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوش حالی اور دولت ایک اہلی کوری سیکولرازم کے لیے بنی ہے۔

آرٹ کن مذہبی لہاؤں سے پاک ہونا چاہیے اور ادب کو تمام پابندیوں سے آزاد۔ یوں جب 59 قبل مسیح میں سالانہ میلے پر شاعر آئے تو ان کی نظموں نے لوگوں کو مسحور کرنے کے لیے فحاشی اور عریانی کا سہارا لیا۔ الحاد کی بنیاد پر استوار مادیت کی باتیں ہوئیں۔ مذہب سے آزاد ہوئے تو اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پوپ نے اپنے دوست کونسل میں منتخب کرانے کے لیے ووٹ خریدے اور اس قدر رقم اُدھار لی جس کی شرح سود 96 فیصد سالانہ تھی۔ ولڈیورنٹ لکھتا ہے: ”عدالتوں نے انتخابی دھاندلی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حلف کی وقعت ختم ہو چکی تھی اور تقریباً فیصلہ خریداجا سکتا تھا۔“

ناج گانوں اور ضیافتوں کا دور دورہ ہو گیا۔ پوپے نے ان دعوتوں پر دو کروڑ دس لاکھ ڈالر خرچ کیے۔ سیز نے

برطانیہ کا قانون حدود آرڈی نیس نہیں ہے لیکن اس ”مارڈن“ قانون کے تحت پہلے بچی کی گمشدگی اور پھر بہن بھائی اور باپ پر اغوا کا مقدمہ درج ہوتا ہے۔ بچی جو پاکستان کی شہری بھی ہے۔ اس مملکت اسلامی کے قانون کے تحت پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس ملک کے قانون Guardiansss Awarda Act کی دفعہ 17 کے تحت بچی کو کسی کی تحویل میں دینے کے لیے اس کے کردار اور مذہب کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور مذہب سے مراد اس کے باپ کا مذہب ہے۔ شاید بچی کو یقین تھا کہ اس مملکتِ خدا دادِ پاکستان میں اس قانون کے تحت اسے پناہ ملے گی اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق بھی۔

میڈیا کا طوفان شروع ہوا۔ وہ لوگ جو حدود کے قانون میں 18 سال کی شرط پر شور مچاتے تھے، کہنے لگے نہیں بچی اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی۔ عدالت کے روبرو یہاں تک سننا پڑا کہ بچی کو پٹی پر ہائی گئی ہے اور یہ بات اس فقرے پر کبھی گئی کہ مصباح ارم نے کہا ہے کہ میں اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنا چاہتی ہوں۔ ان کے نزدیک 12 سالہ بچی یہ فیصلہ کیسے کر سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارے۔ انہیں علم نہیں کہ امریکا میں ہر سال دس لاکھ بچیاں کنواری مائیں بن جاتی ہیں جو بارہ سال کے آس پاس عمر کی ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں گناہ کرنے کا شعور اس عمر میں آ جاتا ہے لیکن نیکی کا شعور نہیں آتا۔

حجاب پہنے یہ بچی روز اپنی بہن اور باپ کے ساتھ عدالت آتی۔ ان تظہیروں نے کہا کہ باپ اس لڑکی کی زبردستی شادی کرے گا۔ بچی نے صاف انکار کر دیا۔ بھائی اور بہن نے کہا ہمارا باپ ایسا نہیں ہے۔ بڑے بھائی عمر نے لندن میں پریس کانفرنس کی اور کہا میرے باپ نے میری مرضی کی شادی پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بڑی بہن نے کہا: مجھے اس معاملے میں پوری آزادی ہے۔ لیکن کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔

خواتین کے حقوق کی علمبردار اسما جہانگیر بولی: یہ سب برطانیہ کی عدالت کے ماتحت ہونا چاہیے۔ پاکستان پابند ہے۔ اب CPC سول پردیمبر کوڈ کی اس دفعہ 13 کو پڑھیے، جس کا وہ حوالہ دیتی ہیں۔ اس دفعہ 13 کی شق نمبر (c) کہتی ہے کہ کسی باہر کے ملک کی عدالت کا کوئی فیصلہ اگر پاکستان کے قانون سے متصادم ہو تو وہ فیصلہ نہیں مانا جاسکتا اور پاکستان کا قانون مسلمان بچی کو غیر مسلم اور بدکردار ماں کے حوالے کرنے کا اختیار نہیں دیتا۔

لیکن آنسوؤں سے روتی مصباح ارم نے اس پاکستان میں یہ فیصلہ سنا کہ تم کو اسی ماں کے پاس جانا ہوگا۔ اس لیے ہم اس ملک کی عدالت کے فیصلے سے انکار کی جرات نہیں کر سکتے۔ میں اس فیصلے پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن سوچتا ہوں کہ ہم آج سے کئی سو سال پہلے کے حبشہ میں بسنے والے نجاشی سے بھی کم تر ایمان کے حامل ہیں۔

اگر کہیں اس وقت ہند، زوجہ ابوسفیان جوایام جاہلیت میں تھی، اپنی لخت جگر اُم المومنین حضرت اُم حبیبہ کو واپس مانگ لیتی تو نجاشی انکار کر دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میں مسلمان کو مشرک کے حوالے نہیں کر سکتا اور مصباح ارم چیخ چیخ کر کہتی رہ گئی: میری ماں خدا پر یقین نہیں رکھتی وہ ایسے کردار کی مالک ہے جو مجھے پسند نہیں اور میں اسلام کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور ہم کہتے ہیں اسے پٹی پڑھائی گئی۔ کاش! ایسی پٹی پڑھانے والے والد اور ایسی پٹی پڑھنے والی اولاد ہر گھر میں موجود ہوتی۔





ایک کروڑ ڈالر دعوتوں پر اڑائے۔ ادھر اسمبلی کا حال یہ ہوا کہ سینئر صبح تک بستروں میں سوئے رہتے اور اسمبلی کا کورم پورا نہ ہوتا۔ ان کے بیٹے طوائفوں کا لباس پہن کر شہر میں گھومتے اور یونانیوں جیسی ہم جنسی کا اظہار کرتے۔ امرا اور اہل اقتدار اپنا ایک محل یعنی دیسی بنگلہ ضرور بناتے جہاں وہ اپنے تئیش کے لیے عورتوں کو بلاتے اور داد عیش دیتے۔ میٹرو ڈورس نے اس دور میں کہا کہ یہاں ہر چیز پیٹ کے حوالے ہو جاتی ہے۔

تاریخ دان لکھتے ہیں اس دور میں جنسی شہوت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ حقوق نسواں کا شور ہوا تو عورتوں میں مردوں سے مقابلے کی ایسی دوڑ شروع ہو گئی کہ بیویاں شوہروں کو کھڑے کھڑے طلاقیں دینے لگیں اور اکثر زندگی میں پانچ سے دس شوہر بدلنے کا ریکارڈ رکھتی تھیں۔ مانع حمل طریقوں کا رواج ہوا اور درومنوں نے صرف عیاشی کی خاطر بچے پیدا کرنا ختم کر دیے۔ سیزر کو خطرہ پیدا ہوا کہ یہ نسل ہی ختم نہ ہو جائے۔ اس نے عورتوں کو بچے پیدا کرنے کے لیے لاتعداد دلکش انعامات کا وعدہ کیا لیکن کون اس بوجھ کو اٹھانے کی طرف مائل ہوتا۔

عورتوں کی اکثریت ایسے ثقافتی پیشوں میں جاگھسی جو نمائش، فن اور فیشن سے متعلق تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں پر سیلون (Salon) بنائے جن میں بحث و مباحثہ، رقص و موسیقی اور جنسی داد و دہش بھی ہوتا۔ یہ وہ دور تھا جب خواتین غلام پالتیں۔ ان سے لذت حاصل کرتیں اور پھر سال کے ایک دن جو رو من کھیلوں کا دن ہوتا ہے، انہیں بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیتیں اور تماشا دیکھتیں۔ ان غلاموں کو گلڈیٹر کہا جاتا تھا۔ تھیزوں میں فحش گفتگو عام ہو گئی۔ فلورا نام کا ایک کھیل بہت مقبول ہوا جس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتیں اور مرد برسر عام ایک ساتھ غسل کرتے اور کوئی شرمندگی محسوس نہ کرتے۔

آزادی، حریت، حقوق اور معاشرے میں روشن خیالی جب اس مقام پر پہنچی تو پھر تاریخ نے عجیب منظر دیکھا۔ اس طاقت ور روم پر صحرا کے خانہ بدوش چڑھ دوڑے اور اس عظیم سلطنت کا غرور خاک میں ملا دیا۔ یہ تاریخ ہے ڈھائی ہزار سال پرانی۔ اور شاید ہم واپس اس ڈھائی ہزار سال پہلے والی حالت کی جانب سفر کر رہے ہیں۔

